

# قصص القرآن

جلد چہارم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کے واقعات و حالات کا مبصرانہ اور محققانہ بیان

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی فریق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

تخریج و تصحیح

مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ لاہور

مکتبہ رحمانیہ

اقرأ سنٹر عترتی سٹریٹ، اردو بازار لاہور







## مکتبہ رحمانیہ

اقرا سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

جملہ حقوق ملکیت بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	قصص القرآن
تالیف	مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاری رفیق اسلی ندوۃ المصنفین دہلی
تخریج و تصحیح	مولانا محمد عرفان فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور
ناشر	مکتبہ رحمانیہ اقرا سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
مطبع	خضر جاوید پرنٹرز

### ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)



## فہرست مضامین (جلد چہارم)

- نزل ماندہ ..... ۵۱
- ”رفع الی السماء“ یعنی زندہ آسمان پر اٹھا لیا جانا ..... ۵۵
- قادیانی تلبیس اور اس کا جواب ..... ۶۶
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں ..... ۷۵
- وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ كِي تَفْسِيْر ..... ۷۶
- حیات عیسیٰ علیہ السلام ..... ۷۸
- لَيُوْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ..... ۷۸
- حیاء و نزول عیسیٰ علیہ السلام اور احادیث صحیحہ ..... ۸۲
- حیات و نزول مسیح علیہ السلام کی حکمت ..... ۸۸
- واقعات نزول صحیح احادیث کی روشنی میں ..... ۹۵
- وفات مسیح علیہ السلام ..... ۹۷
- وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِدًا ..... ۹۷
- فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ..... ۱۰۳
- حضرت مسیح کی دعوت اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے ..... ۱۰۶
- اناجیل اربعہ ..... ۱۰۷
- قرآن اور انجیل ..... ۱۱۱
- انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام ..... ۱۱۳
- حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت ..... ۱۱۶
- تثلیث؟ ..... ۱۱۶
- ازمنہ مظلمہ اور اصلاح کنیہ کی آواز ..... ۱۲۰
- قرآن اور عقیدہ تثلیث ..... ۱۲۲
- حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول ہیں ..... ۱۲۲

پیش لفظ ..... ۶

### حضرت عیسیٰ علیہ السلام

- قرآن عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ..... ۷
- عمران وحنہ ..... ۹
- مریم علیہا السلام کی ولادت ..... ۱۰
- حنہ اور ایثاع ..... ۱۲
- مریم علیہا السلام کا زہد و تقویٰ ..... ۱۳
- کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ ..... ۱۴
- نبوة النساء اور ابن حزم ..... ۱۵
- کیا حضرت مریم علیہا السلام نبی ہیں؟ ..... ۲۰
- آیت ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا مطلب ..... ۲۰
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشارات کتب سابقہ ..... ۲۲
- ولادت مبارک ..... ۲۴
- بشارات ولادت ..... ۲۹
- حلیہ مبارک ..... ۲۹
- بعثت و رسالت ..... ۳۰
- آیات بینات ..... ۳۲
- لائق توجہ بات اور حقیقت معجزات ..... ۳۵
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی تعلیمات کا خلاصہ ..... ۴۷
- حواری عیسیٰ علیہ السلام ..... ۴۸
- حواری عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن و انجیل کا موازنہ ..... ۴۹



۲۰۲	توحید
۲۰۴	رسالت
۲۰۵	یوم آخرت
۲۱۰	اسراء (معراج)
۲۱۰	واقعہ کی وحدت
۲۱۱	تحقیق تاریخ و سنہ
۲۱۱	قرآن عزیز اور واقعہ معراج
۲۱۲	احادیث اور واقعہ معراج کا ثبوت
۲۱۲	واقعہ کی نوعیت
۲۱۲	واقعہ معراج و اسراء اور قرآن عزیز
۲۱۳	سورہ بنی اسرائیل اور واقعہ معراج
۲۱۹	والنجم اور واقعہ معراج
۲۲۲	واقعہ کی تفصیلات
۲۲۳	معراج میں روایت باری
۲۲۵	ہجرت
۲۲۵	ہجرت حبش
۲۲۶	ہجرت مدینہ کے اسباب
۲۲۷	ہجرت نبوی ﷺ
۲۲۷	دارالندوہ
۲۲۸	قرآن عزیز اور ہجرت مدینہ
۲۲۹	ہجرت؟
۲۳۱	ختم نبوت
۲۳۵	غزوہ بدر
۲۳۵	غزوہ
۲۳۵	بدر
۲۳۵	واقعہ
۲۵۱	دعائے نصرت
۲۵۱	غیبی نصرت و امداد

۱۲۳	حضرت مسیح علیہ السلام نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے
۱۲۷	لائق توجہ بات
۱۲۷	کفارہ

## حضرت محمد ﷺ

۱۲۹	محمد ﷺ اور قرآن
۱۳۴	بشارات النبی ﷺ
۱۳۹	تورات اور بشارات
۱۵۴	صبح سعادت
۱۵۶	تاریخ ولادت کی تحقیق
۱۵۸	نسب مبارک
۱۶۱	یتیمی
۱۶۴	بت پرستی سے نفرت، خلوت پسندی اور عبادت الہی کا ذوق
۱۶۵	حقیقت وحی
۱۷۵	صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل
۱۷۷	بعثت
۱۷۹	حدیث بخاری اور بعض مستشرقین کی کوتاہ اندیشی
۱۸۱	بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق
۱۸۶	نبی اور مصلح
۱۹۱	کیفیت وحی
۱۹۳	کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی
۱۹۴	نزول وحی کا پہلا دور
۱۹۵	نزول وحی کا دوسرا دور
۱۹۶	اعلان دعوت و ارشاد کی پہلی منزل
۱۹۷	دعوت و ارشاد کی دوسری منزل
۱۹۸	بعثت عامہ
۱۹۹	دعوت اسلام کا مجمل خاکہ اور حضرت جعفرؓ کی تقریر
۲۰۰	قرآن اور تجدید دعوت



۲۹۴	قبول توبہ اور سورہ توبہ	۲۵۲	نتیجہ جنگ
۲۹۴	قرآن عزیز اور غزوہ تبوک	۲۵۳	جنگ بدر نے تاریخ عالم کا رخ بدل دیا
۲۹۵	اہم غزوات اور نتائج و بصائر	۲۵۳	قرآن عزیز کی روشنی میں غزوہ بدر پر دوبارہ نظر
۲۹۵	بدر الکبریٰ	۲۶۹	غزوہ احد
۲۹۵	غزوہ احد	۲۶۹	احد
۲۹۷	غزوہ احزاب	۲۶۹	غزوہ احد
۲۹۸	صلح حدیبیہ	۲۷۱	حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت
۲۹۹	فتح مکہ	۲۷۱	قرآن عزیز اور غزوہ احد
۲۹۹	غزوہ حنین	۲۷۳	غزوہ احزاب (غزوہ خندق)
۳۰۰	غزوہ تبوک	۲۷۵	قرآن عزیز اور غزوہ احزاب
۳۰۱	تین	۲۷۶	واقعہ حدیبیہ
۳۰۱	حضرت زید رضی اللہ عنہ	۲۷۷	بیعت رضوان
۳۰۳	انسداد تین	۲۷۸	معادہ صلح
۳۰۴	خرافی داستان	۲۸۰	الفتح الاعظم
۳۰۶	حاصل کلام	۲۸۱	حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ
۳۰۷	بصائر	۲۸۲	بت شکنی
۳۰۸	بنو نضیر	۲۸۲	رحمۃ اللعالمین کی شان
۳۰۹	قرآن عزیز اور بنو نضیر	۲۸۵	خطبہ
۳۰۹	بصائر	۲۸۶	فتح مکہ اور قرآن عزیز
۳۱۰	واقعہ افک	۲۸۸	غزوہ حنین
۳۱۲	موعظت	۲۸۹	غزوہ حنین اور قرآن حکیم
۳۱۳	نباء فاسق	۲۹۰	غزوہ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب واقعہ
۳۱۴	موعظت	۲۹۰	مالی استعانت
۳۱۵	مسجد ضرار	۲۹۱	عذر خواہی
۳۱۶	موعظت	۲۹۱	معاشرتی مقاطعہ
۳۱۷	وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ	۲۹۲	ضبط و نظم کی عدیم النظیر مثال
۳۱۹	عبرت و موعظت	۲۹۲	عشق رسول اور صداقت اسلام کا حیرت انگیز معیار



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَزَلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهِ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا.

وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ الْمَبْعُوْثِ كَافَّةً لِلنَّاسِ بِشِیْرًا وَنَذِیْرًا.

اما بعد! خدائے تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ آج قصص القرآن کی تالیف اپنی آخری منزل پر پہنچ کر کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گئی، میں کیا اور میری لیاقت اور میرا قلم کیا؟ یہ جو کچھ بھی خدا کے فضل اور قرآن حکیم کی برکت کی بدولت ہوا۔ فالحمد لله على ذلك۔ یہ جلد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و دعوت اور حیات طیبہ اور دیگر مباحث متعلقہ پر مشتمل، اور پہلی تین جلدوں کی خصوصیات و امتیازات کی حامل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقدس حالات میں خصوصیت کے ساتھ وہ مباحث لائق مراجعت ہیں جو قرآن حکیم کے حکیمانہ دلائل و براہین کی روشنی میں ”حیات عیسیٰ علیہ السلام“ سے متعلق ہیں یا عہد قدیم و عہد جدید (توراة و انجیل) کے مضامین الہیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ”حیات طیبہ“ تو وہ مخدوم شے ہے کہ از سلف تا خلف مسلسل ہر زندہ زبان اس خدمت پاک کو اپنا فرض یقین کرتی اور ادائے فرض سے سبکدوشی کا شرف حاصل کرتی رہی ہے۔ خصوصاً عربی زبان کے بعد اردو زبان میں اس خدمت نے بہترین ذخیرہ پیش کر دیا ہے۔ اور مختصر، متوسط مطول ہر نوع کی تالیفات اس سلسلہ میں موجود ہیں اس لیے اس تالیف میں کوشش کی گئی ہے کہ صرف ان ہی واقعات کو سپرد قلم کیا جائے جن کا قرآن حکیم سے براہ راست تعلق ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر شعبہ حیات قرآن حکیم کی جیتی جاگتی تصویر، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر اسوہ حسنہ آیات قرآن کی تفسیر ہے۔

قصص القرآن کی تالیف اپنی افادیت اور مقصد تالیف کے لحاظ سے کیا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا فیصلہ ارباب ذوق کی نگاہ بصیرت کے سپرد ہے..... خدائے تعالیٰ سے دست بدعاء ہوں کہ وہ اس خدمت کو قبول فرمائے۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ وَهُوَ حَسْبِیْ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ۝

حنادم ملت

محمد حفظ الرحمن صدیقی کان اللہ

۹ صفر المظفر ۱۳۶۵ و مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۴۶



## حضرت عیسیٰ علیہ السلام

- قرآن اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ○ عمران وحنہ ○ مریم علیہا السلام کی ولادت ○ حنہ اور ایشاع لیشیح
- مریم علیہا السلام کا زہد و تقویٰ ○ مقبولیت خداوندی ○ کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ ○ نبوت النساء اور ابن حزم
- آیت ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ○ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشارات کتب سابقہ ○ ولادت مبارک
- بشارات ولادت ○ حلیہ مبارک ○ بعثت و رسالت ○ آیات بینات لائق توجہ بات اور حقیقت معجزات
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا خلاصہ ○ حواری (عیسیٰ) علیہ السلام ○ حواری عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن و انجیل کا موازنہ
- نزول ماندہ ○ رفع الی السماء یعنی زندہ آسمان پر اٹھایا جانا ○ قادیانی تلبیس اور اس کا جواب ○ حضرت
- عیسیٰ علیہ السلام کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں ○ قادیانی کی ایک کذب بیانی ○ حیات عیسیٰ علیہ السلام ○ ﴿لَیُّوْمَئِنَّ
- بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ تفسیر بالرائے کی نمایاں مثال ○ ﴿وَإِنَّهٗ لَعَلَّمُ السَّاعَةَ... مَرَّ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْیَمَ إِلَّا رَسُوْلٌ
- ..... وَرَافِعَكَ اِلَیَّ﴾ ○ حیات عیسیٰ علیہ السلام اور احادیث صحیحہ ○ احادیث حیات و نزول ○ حیات مسیح علیہ السلام اور اجماع
- امت ○ حیات و نزول مسیح علیہ السلام کی حکمت ○ واقعات نزول صحیح احادیث کی روشنی میں ○ وفات مسیح علیہ السلام ﴿وَ
- یَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَكُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِيْ كُنْتُ اَنْتَ الرَّقِیْبُ عَلَیْهِمْ﴾ ○ نبی صادق و متنبی کاذب ○ حضرت
- مسیح علیہ السلام کی دعوت اصلاح ○ بنی اسرائیل کے فرقے ○ اناجیل اربعہ ○ قرآن اور انجیل ○ انجیل اور حواری
- عیسیٰ علیہ السلام ○ حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت ○ تثلیث؟ باپ، بیٹا، روح القدس ازمنہ مظلمہ اور اصلاح کلیسہ کی
- آواز ○ حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے مقرب رسول ہیں ○ حضرت مسیح نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے ○ لائق توجہ بات
- کفارہ؟

### قرآن عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں، اور جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء و رسل ہیں اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیاء بنی اسرائیل ہیں، اور جمہور کا اس پر اجماع ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا، اور درمیان کا یہ زمانہ جس کی مدت تقریباً پانچ سو ستر سال ہے۔ فترۃ (انقطاع وحی) کا زمانہ رہا ہے۔



عیسیٰ علیہ السلام کی جلالت قدر اور عظمت شان کا ایک امتیازی نشان یہ بھی ہے کہ اگر انبیاء بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت و رسالت کا مقام امامت حاصل ہے تو عیسیٰ علیہ السلام مجدد انبیاء بنی اسرائیل ہیں، اس لیے کہ قانون ربانی (تورات) کے بعد بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے انجیل (بائبل) سے زیادہ عظیم المرتبہ دوسری کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انجیل کا نزول قانون تورات کی تکمیل ہی کی شکل میں ہوا ہے یعنی نزول تورات کے بعد یہود نے جو قسم قسم کی گمراہیاں دین حق میں پیدا کر لی تھیں انجیل نے توراہ کی شارح بن کر بنی اسرائیل کو ان گمراہیوں سے بچنے کی دعوت دی اور اس طرح تکمیل تورات کا فرض انجام دیا اور بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فراموش شدہ پیغام ہدایت عیسیٰ علیہ السلام ہی نے دوبارہ یاد دلایا اور تازہ بارانِ رحمت کے ذریعہ اس خشک کھیتی کو دوبارہ زندگی بخشی۔ مزید برآں یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام سرور کائنات محمد ﷺ کے سب سے بڑا مناد اور مبشر ہیں اور ہر دو مقدس پیغمبروں کے درمیان ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں خاص رابطہ اور علاقہ پایا جاتا ہے۔\*

قرآن عزیز نے نبی اکرم ﷺ کی مماثلت کے سلسلہ میں جن پاک ہستیوں کے واقعات سے بہت زیادہ بحث کی ہے ان میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی مقدس ہستیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآن کے ”تذکیر بایام اللہ“ میں اس لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ جس دین تویم اور ملت بیضاء کا عروج و کمال محمد ﷺ کی تقدیس کے ساتھ وابستہ تھا اور جس ملت کی دعوت و تبلیغ کا محور و مرکز ذات اقدس ﷺ بننے والی تھی وہ ملت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے ﴿مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ﴾ کیونکہ یہی وہ بوڑھے پیغمبر ہیں جنہوں نے شرک کے مقابلہ میں سب سے پہلے توحید الہی کو حنیفیت کا لقب دیا اور آئندہ ہمیشہ کے لیے خدا کی راہ مستقیم کے لیے ”ملۃ حنیفیہ“ کا امتیاز قائم کر دیا، یعنی جو خدا کی پرستش کے لیے مظاہر کائنات کی پرستش کو وسیلہ بناتا ہے ”وہ مشرک“ ہے اور جو خالق کائنات کی یکتائی کا قائل ہو کر براہ راست اسی کی پرستش کرتا ہے وہ ”حنیف“ ہے۔ پس اس مقدس پیغمبر نے خدا پرستی کے اس حقیقی تصور کو عملی حیثیت میں اس درجہ نمایاں کیا کہ مستقبل میں ادیان حق کے لیے اس کی پیروی حق و صداقت کا معیار بن گئی اور خدائے برتر کی جانب سے قبولیت کا یہ شرف عطاء ہوا کہ یہ مقدس پیغمبر کائنات رشد و ہدایت کا امام اکبر اور مجدد اعظم قرار دیا گیا:

﴿فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيفًا﴾ (آل عمران: ۹۵)

”پس پیروی کرو ابراہیم کی ملت کی، جو سب سے کٹ کر صرف خدا کی جانب جھکنے والا ہے۔“

﴿مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ اِبْرٰهٖمَ ۙ هُوَ سَمُّكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۗ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا﴾ (الحج: ۷۸)

”یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیم کی، اس نے تمہارا نام ”مسلم“ رکھا نزول قرآن سے قبل اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام ”مسلم“ ہے۔“ اور موسیٰ علیہ السلام کی مقدس زندگی کا تذکرہ اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ ان کی دعوت و تبلیغ کے واقعات یعنی قوم کی جہالت و نافرمانی، دشمنانِ خدا سے نبرد آزمائی پیہم مصائب و آلام پر صبر و استقلال کا دوام و ثبات، اور اسی قسم کے دوسرے کوائف و حالات میں ان کے اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان بہت زیادہ مشابہت و مناسبت پائی جاتی ہے اور اس لیے وہ واقعات و حالات، قبول و انکار حق

\* تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔



اور ان سے پیدا شدہ نتائج کے سلسلہ میں بصیرت و عبرت کا سامان مہیا کرتے اور نظائر و شواہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ کا مقدس ذکر مسطورہ بالا خصوصیات و امتیازات کی بناء پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

غرض قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات کو بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کی حیات طیبہ کے دیباچہ کے طور پر ان کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے واقعات زندگی کو بھی روشن کیا ہے تاکہ قرآن کا مقصد ”تذکیر بایام اللہ“ پورا ہو۔ یہ ذکر پاک قرآن عزیز کی تیرہ سورتوں میں ہوا ہے، ان میں سے کسی جگہ نام مبارک عیسیٰ (یسوع) سے یاد کیا گیا ہے اور کسی جگہ ”مسح علیہ السلام“ اور عبد اللہ کے لقب سے اور کسی مقام پر کنیت ”ابن مریم“ کے اظہار کے ساتھ۔

نقشہ ذیل اس حقیقت کا کاشف اور ارباب مطالعہ کی بصیرت کے لیے مدد و معاون ہے:

شمار	سورہ	آیات	عیسیٰ	مسح	عبد اللہ	ابن مریم	تعداد آیات
۱	البقرہ	۲۵۳، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۸۷	۳	۰	۰	۲	۵
۲	آل عمران	۹۲، ۶۴، ۴۲	۵	۱	۰	۱	۲۴
۳	النساء	۱۷۲، ۱۷۱، ۱۵۹، ۱۵۶	۳	۳	۰	۲	۶
۴	المائدہ	۱۲۰، ۱۱۰، ۷۸، ۷۵، ۷۲، ۴۶، ۱۷	۶	۵	۰	۱۰	۱۸
۵	الانعام	۸۵	۱	۰	۰	۰	۱
۶	التوبہ	۳۱، ۲۰	۰	۱	۰	۱	۲
۷	مریم	۳۵، ۱۶	۱	۱	۱	۱	۱
۸	المومنون	۵۰	۱	۰	۰	۱	۱
۹	الاحزاب	۸، ۷	۱	۰	۰	۱	۲
۱۰	الشوریٰ	۱۳	۱	۰	۰	۰	۱
۱۱	الزخرف	۶۳، ۵۷	۱	۰	۰	۱	۲
۱۲	الحديد	۲۷	۱	۰	۰	۱	۱
۱۳	الصّف	۱۵، ۶	۲	۰	۰	۲	۲

### عمران وحنہ:

حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے حالات میں گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں عمران ایک عابد و زاہد شخص تھے اور اسی زہد و عبادت کی وجہ سے نماز کی امامت بھی ان ہی کے سپرد تھی اور ان کی بیوی حنہ بھی بہت پارساء اور عابدہ تھیں اور اپنی نیکی کی وجہ سے وہ دونوں بنی اسرائیل میں بہت زیادہ محبوب و مقبول تھے۔

تفسیر ابن کثیر (آل عمران)



محمد بن اسحاق "صاحب مغازی" نے عمران کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:

عمران بن یاشم بن میشا بن جز قیا بن ابراہیم بن عزریا بن ناوش بن اجر بن یہودا بن نازم بن مقاسط بن ایشا بن ایاز بن رخیعم (زحیعام) بن سلیمان بن داؤد (علیہ السلام) اور حافظ ابن عساکر نے ان ناموں کے علاوہ دوسرے نام بیان کیے ہیں اور ان دونوں بیانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے تاہم اس پر تمام علماء انساب کا اتفاق ہے کہ عمران حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور حنہ بنت فاقوذ بن قبیل بھی داؤد علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔\*

عمران صاحب اولاد نہیں تھے اور ان کی بیوی حنہ بہت زیادہ متمنی تھیں کہ ان کے اولاد ہو، وہ اس کے لیے درگاہ الہی میں دست بدعاء اور قبولیت دعاء کے لیے ہر وقت منتظر رہتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حنہ صحن مکان میں چہل قدمی کر رہی تھیں، دیکھا کہ ایک پرند اپنے بچہ کو بھرا رہا ہے، حنہ کے دل پر یہ دیکھ کر سخت چوٹ لگی اور اولاد کی تمنا نے بہت جوش مارا اور حالت اضطراب میں بارگاہ الہی میں دعاء کے لیے ہاتھ اٹھادیے اور عرض کیا "پروردگار اسی طرح مجھ کو بھی اولاد عطاء کر کہ وہ ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنے۔" دل سے نکلی ہوئی دعاء نے قبولیت کا جامہ پہنا اور حنہ نے چند روز بعد محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہیں۔ حنہ کو اس احساس سے اس درجہ مسرت ہوئی کہ انہوں نے نذر مان لی کہ جو بچہ پیدا ہوگا اس کو ہیکل (مسجد اقصیٰ) کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گی۔\*

بہر حال اللہ تعالیٰ نے عمران کی بیوی حنہ کی دعاء کو شرف قبولیت بخشا اور وہ مسرت و شادمانی کے ساتھ امید برآنے کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔

بشر بن اسحاق کہتے ہیں کہ حنہ ابھی حاملہ تھیں کہ ان کے شوہر عمران کا انتقال ہو گیا۔\*

### مریم علیہا السلام کی ولادت:

جب مدت حمل پوری ہو گئی اور ولادت کا وقت آ پہنچا تو حنہ کو معلوم ہوا کہ ان کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے، جہاں تک اولاد کا تعلق ہے حنہ کے لیے یہ لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر ان کو یہ افسوس ضرور ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہیں ہو سکے گی، اس لیے کہ لڑکی کس طرح مقدس ہیکل کی خدمت کر سکے گی؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے افسوس کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو ہی قبول کیا اور اس کی وجہ سے تمہارا خاندان بھی معزز اور مبارک قرار پایا، حنہ نے لڑکی کا نام مریم علیہا السلام رکھا، سریانی میں اس کے معنی "خادم" کے ہیں، چونکہ یہ ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کر دی گئیں اس لیے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کو مجزا نہ اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۳۱﴾ ذُرِّيَّتَهُمْ أَعْزَبَهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ

\* البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۶

\* بنی اسرائیل کی مذہبی رسوم میں سے یہ رسم بہت مقدس سمجھی جاتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ہیکل کی خدمت کے لئے وقف کریں۔ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۔

\* فتح الباری ج ۲ ص ۳۶۳۔ فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۵۔



وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۳﴾ إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۳۴﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ ۖ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ ۖ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذَرِّيَتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿۳۵﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ ۖ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۖ وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ ﴿۳۶﴾

(آل عمران: ۳۳-۳۷)

”بیشک اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران ﴿۳۳﴾ کو (اپنے اپنے زمانہ میں جہاں) والوں پر بزرگی عطا فرمائی (ان میں سے) بعض، بعض کی ذریت ہیں) اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے (وہ وقت یاد کرو جب عمران کی بیوی نے کہا: ”خدا یا! میں نے نذر مان لی ہے کہ میرے پیٹ میں جو (بچہ) ہے وہ تیری راہ میں آزاد ہے“ پس تو اس کو میری جانب سے قبول فرما۔ بیشک تو سننے والا، جاننے والا ہے۔“ پھر جب اس نے جنا تو کہنے لگی۔ ”پروردگار! میرے لڑکی پیدا ہوئی ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا ہے اور لڑکا اور لڑکی یکساں نہیں ہیں (یعنی ہیکل کی خدمت لڑکی نہیں کر سکتی لڑکا کر سکتا ہے) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے۔ اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان الرجیم کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ پس مریم کو اس کے پروردگار نے بہت اچھی طرح قبول فرمایا اور اس کی نشوونما اچھے طریق پر کی اور زکریا کو اس کا نگران کار بنا دیا۔“

حضرت مریم علیہا السلام جب سن شعور کو پہنچیں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدس ہیکل کی یہ امانت کس کے سپرد کی جائے تو کاہنوں ﴿۳۳﴾ میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مقدس امانت کا کفیل مجھ کو بنایا جائے مگر اس امانت کی نگرانی کا اہل حضرت زکریا علیہ السلام سے زیادہ کوئی نہ تھا، اس لیے کہ وہ مریم علیہا السلام کی خالہ ایشاع (ایشیح) کے شوہر بھی تھے اور مقدس ہیکل کے معزز کاہن اور خدائے برتر کے نبی بھی تھے، اس لیے سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنا نام پیش کیا مگر جب سب کاہنوں نے یہی خواہش ظاہر کی اور باہمی کشمکش کا اندیشہ ہونے لگا تو آپس میں طے پایا کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کا فیصلہ کر لیا جائے۔ اور بقول روایات بنی اسرائیل تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی وہ دریا میں اپنے قلم (پورے) ڈالتے مگر قرعہ کی شرط کے مطابق ہر مرتبہ زکریا علیہ السلام ہی کا نام نکلتا، کاہنوں نے جب یہ دیکھا کہ اس معاملہ میں زکریا علیہ السلام کے ساتھ تائید غیبی ہے تو انہوں نے بخوشی اسی فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اس طرح یہ ”سعید امانت“ حضرت زکریا علیہ السلام کے سپرد کر دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ مریم علیہا السلام کی کفالت کا یہ معاملہ اس لیے پیش آیا کہ وہ یتیم تھیں اور مردوں میں سے کوئی ان کا کفیل نہیں تھا اور بعض کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں قحط کا بہت زور تھا اس لیے کفالت کا سوال پیدا ﴿۳۴﴾ ہوا۔ لیکن یہ دونوں باتیں اگر نہ بھی ہوتیں تب بھی

﴿۳۳﴾ عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی ہے اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا بھی یہاں والد مریم علیہا السلام مراد ہیں۔

﴿۳۴﴾ کاہن سے وہ مقدس ہستیاں مراد ہیں جو ہیکل میں مذہبی رسوم ادا کرتی اور خدمت ہیکل پر مامور تھیں۔

﴿۳۵﴾ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۶۰۔



کفالت کا سوال اپنی جگہ پھر بھی باقی رہتا اس لیے کہ مریم علیہا السلام اپنی والدہ کی نذر کے مطابق ”نذر ہیکل“ ہو چکی تھیں اور چونکہ لڑکی تھیں اس لیے از بس ضروری تھا کہ وہ کسی مرد نیک کی کفالت میں اس خدمت کو انجام دیتیں۔

غرض زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کے صنفی احترامات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہیکل کے قریب ایک حجرہ ان کے لیے مخصوص کر دیا تاکہ وہ دن میں وہاں رہ کر عبادت الہی سے بہرہ ور ہوں اور جب رات آتی تو ان کو اپنے مکان پر ان کی خالہ ایشاع کے پاس لے جاتے اور وہ وہیں شب بسر کرتیں۔\*

### حنہ اور ایشاع:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ ایشاع (ایشیع مریم علیہا السلام کی ہم شیر تھیں اور حدیث معراج میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام کے متعلق یہ فرمایا کہ ((وہما ابنا خالۃ)) جو رشتہ ظاہر فرمایا ہے اس سے بھی جمہور کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

لیکن جمہور کا یہ قول قرآن عزیز اور ”تاریخ دونوں کے خلاف ہے اس لیے کہ قرآن نے مریم علیہا السلام کی ولادت کے واقعہ کو جس اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ عمران اور حنہ، مریم علیہا السلام کی ولادت سے قبل اولاد سے قطعاً محروم تھیں یہی وجہ ہے کہ حنہ نے مریم علیہا السلام کی ولادت پر یہ نہیں کہا ”خدایا! میرے تو پہلے بھی ایک لڑکی موجود تھی، اب تو نے دوبارہ بھی لڑکی ہی عطاء فرمائی“ بلکہ درگاہ الہی میں یہ عرض کیا کہ جس شکل میں میری دعاء تو نے قبول فرمائی ہے اس کو حسب وعدہ تیری نذر کیسے کروں؟ نیز تورات اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ عمران اور حنہ کے مریم علیہا السلام کے ماسوا کوئی اور اولاد بھی تھی بلکہ اس کے برعکس تاریخ یہود اور اسرائیلیات کا مشہور قول یہ ہے کہ ایشاع، مریم علیہا السلام کی خالہ تھیں۔

دراصل جمہور کی جانب یہ منسوب قول صرف حدیث معراج کے مسطورہ بالا جملہ کے پیش نظر ظہور میں آیا ہے حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ((وہما ابنا خالۃ)) وہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں، مجاز متعارف کی شکل میں ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ طریق توسع والدہ کی خالہ کو عیسیٰ علیہ السلام کی خالہ فرمایا ہے اور اس قسم کا توسع عام بول چال میں شائع ذائع ہے۔

علاوہ ازیں ابن کثیر رحمہ اللہ کا اس کو قول جمہور کہنا بھی محل نظر ہے اس لیے کہ محمد بن اسحاق، اسحاق بن بشر، ابن عساکر، ابن جریر اور ابن حجر رحمہم جیسے جلیل القدر اصحاب حدیث و سیر کار حجان اس جانب ہے کہ ایشاع، حنہ کی ہم شیر اور مریم علیہا السلام کی خالہ ہیں، حنہ کی بیٹی نہیں ہیں۔

\* روح المعانی سورہ آل عمران... مولانا آزاد ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں۔ قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ دو جگہ کیا گیا ہے، یہاں اور سورہ آل عمران کی آیات (۳۵-۶۳) میں یہاں یہ ذکر حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوا ہے اور اناجیل اربعہ میں سے سینٹ لوقا کی انجیل ٹھیک ٹھیک اسی طرح یہ تذکرہ شروع کرتی ہے لیکن سورہ آل عمران میں یہ تذکرہ اس سے بھی پیشتر کے ایک واقعہ سے شروع ہوتا ہے یعنی حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش اور ہیکل میں پرورش پانے کے واقعہ سے اور اس بارہ میں چاروں انجیلیں خاموش ہیں لیکن انیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ ویٹیکن کے کتب خانہ سے برآمد ہوا اس نے حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش کا یہ مفقود ٹکڑا مہیا کر دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک سرگزشت کا یہ ٹکڑا بھی ابی طرح الہامی یقین کیا جاتا تھا جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کئے جاتے ہیں۔ ج ۲ ص ۴۴۳۔



## مریم علیہا السلام کا زہد و تقویٰ:

زکریا علیہ السلام مریم علیہا السلام کی ضروری نگہداشت کے سلسلہ میں کبھی کبھی ان کے حجرہ میں تشریف لے جایا کرتے تھے لیکن ان کو یہ بات عجیب نظر آتی کہ جب وہ خلوت کدہ میں داخل ہوتے تو مریم علیہا السلام کے پاس اکثر بے موسم کے تازہ پھل موجود پاتے۔ ﴿آخر زکریا علیہ السلام سے نہ رہا گیا اور انہوں نے دریافت کیا: مریم تیرے پاس یہ بے موسم پھل کہاں سے آتے ہیں؟ مریم علیہا السلام نے فرمایا: ”یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے، وہ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق پہنچاتا ہے۔“ حضرت زکریا علیہ السلام نے یہ سنا تو سمجھ گئے کہ خدائے برتر کے یہاں مریم علیہا السلام کا خاص مقام اور مرتبہ ہے اور ساتھ ہی بے موسم تازہ پھلوں کے واقعہ نے دل میں یہ تمنا پیدا کر دی کہ جس خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ پھل بے موسم پیدا کر دیے، کیا وہ میرے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود مجھ کو بے موسم پھل (بیٹا) عطاء نہ کرے گا؟ یہ سوچ کر انہوں نے خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہ ربانی میں دعاء کی اور وہاں سے شرف قبولیت کا مشردہ عطاء ہوا۔

﴿وَ كَفَلَهَا زَكْرِيَّا ۗ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يَمْرَأَتُ أِنِّى لَكَ هٰذَا ۙ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾﴾ (آل عمران: ۳۷)

”اور اس (مریم) کی کفالت زکریا نے کی، جب اس (مریم) کے پاس زکریا داخل ہوتے تو اس کے پاس کھانے کی چیزیں رکھی پاتے۔ زکریا نے کہا: ”اے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آئیں؟“ مریم (علیہا السلام) نے کہا ”یہ اللہ کے پاس سے آئی ہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق دیتا ہے۔“

مریم علیہا السلام اسی طرح ایک عرصہ تک اپنے مقدس مشاغل کے ساتھ پاک زندگی بسر کرتی رہیں اور مقدس ہیکل کا سب سے مقدس مجاور حضرت زکریا علیہ السلام بھی ان کے زہد و تقویٰ سے بے حد متاثر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمت اور جلالت قدر کو اور زیادہ بلند کیا اور فرشتوں کے ذریعہ ان کو برگزیدہ بارگاہ الہی ہونے کی یہ بشارت سنائی۔

﴿وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يَمْرٰٓئِمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾﴾ (آل عمران: ۴۲-۴۳)

”(اے پیغمبروہ وقت یاد کیجئے) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بزرگی دی اور پاک کیا اور دنیا کی عورتوں پر تجھ کو برگزیدہ کیا، اے مریم! اپنے پروردگار کے سامنے جھک جا اور سجدہ ریز ہو جا اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز ادا کر۔“

﴿وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۗ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ

﴿ یہ تفصیل اگرچہ تفسیری روایات سے ماخوذ ہے اور آیت میں صرف لفظ رزق آیا ہے لیکن آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ مریم علیہا السلام کا یہ رزق انسانی داد و دہش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ بطور کرامت منجانب اللہ تھا۔ (مؤلف)



يَخْتَصِمُونَ ﴿۴۴﴾ (آل عمران: ۴۴)

”اور تم اس وقت ان کا ہنوں کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قلموں پوروں (کو قرعہ اندازی کے لیے) ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے اور تم اس وقت (بھی) موجود نہ تھے جب وہ اس کفالت کے بارے میں آپس میں جھگڑ رہے تھے۔“

حضرت مریم علیہا السلام جبکہ نہایت مرتاض، عابد و زاہد اور تقویٰ و طہارت میں ضرب المثل تھیں اور جبکہ عنقریب ان کو جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہونے والا تھا تو من جانب اللہ ان کی تقدیس و تطہیر کا یہ اعلان بلاشبہ حق بہ حقدار رسید کا مصداق ہے، تاہم علمی اور تاریخی اعتبار سے بلکہ خود قرآن و احادیث کے مفہوم کے لحاظ سے یہ مسئلہ قابل توجہ ہے کہ آیت ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کی مراد کیا ہے، اور کیا درحقیقت حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثناء کے کائنات کی تمام عورتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے؟ اور یہی نہیں بلکہ اس آیت فضیلت نے مریم علیہا السلام کی ذات سے متعلق علماء سلف میں چند اہم مسائل کو زیر بحث بنا دیا ہے مثلاً: ① کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ ② کیا حضرت مریم علیہا السلام نبی تھیں؟ ③ اگر نبی نہیں تھیں تو آیت کے جملہ ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا مطلب کیا ہے؟

کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟:

محمد بن اسحاق، شیخ ابوالحسن اشعری، قرطبی، ابن حزم (نور اللہ مرقدہم) اس جانب مائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے بلکہ ابن حزم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت حوا، سارہ، باجرہ، ام موسیٰ، آسیہ اور مریم علیہا السلام یہ سب نبی تھیں اور محمد بن اسحاق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اکثر فقہاء اس کے قائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے اور قرطبی فرماتے ہیں کہ مریم علیہا السلام نبی تھیں۔ ان حضرات کے اقوال کے برعکس خواجہ حسن بصری، امام الحرمین شیخ عبدالعزیز اور قاضی عیاض (نور اللہ مرقدہم) کا رجحان اس جانب ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور اس لیے مریم علیہا السلام بھی نبی نہیں تھیں۔ قاضی اور ابن کثیر یہ بھی کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے اور امام الحرمین تو اجماع تک دعویٰ کرتے ہیں۔ جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی وہ اپنی دلیل میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رَجَالًا نُوحِيْ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ۴۳)

”اور تم سے پہلے ہم نے نہیں بھیجے مگر مرد کہ وحی بھیجتے تھے ہم ان کی طرف۔“

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے انکار پر یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن عزیز نے ان کو ”صدیقہ“ کہا ہے، سورہ مائدہ میں ہے:

﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ﴾ (المائدہ: ۷۵)

”پس ابن مریم تو ایک پیغمبر ہیں جن سے پہلے اور بھی پیغمبر گزر چکے اور ان کی والدہ صدیقہ تھیں۔“



اور سورہ نساء میں قرآن عزیز نے منعم علیہم کی جو فہرست دی ہے وہ اس کے لیے نص قطعی ہے کہ ”صدیقیت“ کا درجہ ”نبوت“ سے کم اور نازل ہے۔

اور جو حضرات عورت کے نبی ہونے کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآن عزیز نے حضرت سارہ، ام موسیٰ اور حضرت مریم (علیہن السلام) کے متعلق جن واقعات کا اظہار کیا ہے ان میں بصراحت موجود ہے کہ ان پر خدا کے فرشتے وحی لے کر نازل ہوئے اور ان کو منجانب اللہ بشارات سے سرفراز فرمایا اور ان تک اپنی معرفت، عبادت کا حکم پہنچایا، چنانچہ حضرت سارہ کے لیے سورہ ہود اور سورہ الذریات اور ام موسیٰ کے لیے سورہ قصص میں اور مریم علیہا السلام کے لیے آل عمران اور سورہ مریم میں بواسطہ ملائکہ اور بلا واسطہ خطاب الہی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ ان مقامات پر وحی کے لغوی معنی (وجدانی ہدایت یا مخفی اشارہ) کے نہیں ہیں جیسا کہ آیت ﴿وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلٰی النَّحْلِ﴾ میں شہد کی مکھی کے لیے وحی کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کے نبی ہونے کی یہ واضح دلیل ہے کہ سورہ مریم میں ان کا ذکر اسی اسلوب کے ساتھ کیا گیا ہے جس طریقہ پر دیگر انبیاء و رسل کا تذکرہ ہے مثلاً:

﴿وَ اذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ مُوسٰی... وَ اذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِدْرِیْسَ... وَ اذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِسْحٰعِیْلَ... وَ

اذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِبْرٰهٖمَ... وَ اذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ مَرْیَمَ﴾ یا مثلاً: ﴿وَ اَرْسَلْنَا اِلَیْہَا رُوْحَنَا﴾

ہم نے مریم علیہا السلام کی جانب اپنے فرشتہ جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا۔ یا مثلاً ﴿قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکَ﴾ میں بلاشبہ تیرے پروردگار کی جانب سے پیغامبر ہوں“ نیز آل عمران میں مریم علیہا السلام کو ملائکہ اللہ نے جس طرح خدا کی جانب سے پیغامبر بن کر خطاب کیا ہے وہ بھی اس دعویٰ کی روشنی دلیل ہے۔

اور مریم علیہا السلام کے صدیقہ ہونے سے متعلق جو سوال ہے اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر قرآن نے حضرت مریم علیہا السلام کو ”صدیقہ“ کہا ہے تو یہ لقب ان کی شان نبوت کے اسی طرح منافی نہیں ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے مسلم نبی ہونے کے باوجود آیت ﴿یُوْسُفُ اٰیُّہَا الصِّدِّیْقُ﴾ میں ان کا صدیق ہونا ان کے نبی ہونے کو مانع نہیں ہے بلکہ ذکر پاک مقامی خصوصیت کی بناء پر مذکور ہوا ہے۔ کیونکہ جو ”نبی“ ہے وہ بہر حال ”صدیق“ ضرور ہے البتہ اس کا عکس ضروری نہیں ہے۔

ان علماء اسلام کی ترجمانی جس تفصیل کے ساتھ کتاب الفصل میں مشہور محدث ابن حزم رحمہ اللہ نے کی ہے اس تفصیل و قوت کے ساتھ دوسری جگہ نظر سے نہیں گزری اس لیے سطور ذیل میں اس پورے مضمون کا ترجمہ لائق مطالعہ ہے۔

### نبوة النساء اور ابن حزم:

یہ فصل ایسے مسئلہ کے متعلق ہے جس پر ہمارے زمانہ میں قرطبہ (اندلس) میں شدید اختلاف پیا ہوا، علماء کی ایک جماعت

﴿ اُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْہُمْ مِّنَ النَّبِیِّیْنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشَّہَدَآءِ وَ الصَّالِحِیْنَ ۗ وَ حَسَنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ۗ ﴾

﴿ سورہ ہود آیت ۴۳-۴۱، والذریات آیت ۲۹-۳ ﴾ ﴿ قصص آیت ۷ ﴾

﴿ آل عمران ۴۲-۴۳-۴۵-۴۷ سورہ مریم ۱۶-۲۶ ﴾ ﴿ سورہ یوسف



کہتی ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور جو ایسا کہتا ہے کہ عورت نبی ہو سکتی ہے وہ ایک نئی بدعت ایجاد کرتا ہے اور دوسری جماعت قائل ہے کہ عورت نبی ہو سکتی ہے اور نبی ہوئی ہیں، اور ان دونوں سے الگ تیسری جماعت کا مسلک توقف ہے اور وہ اثبات و نفی دونوں باتوں میں سکوت کو پسند کرتے ہیں مگر جو حضرات عورت سے متعلق منصب نبوت کا انکار کرتے ہیں ان کے پاس اس انکار کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی البتہ بعض حضرات نے اپنے اختلاف کی بنیاد اس آیت کو بنایا ہے ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ﴾۔

میں کہتا ہوں کہ اس بارہ میں کس کو اختلاف ہے اور کس نے دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عورت کو ہدایت خلق کے لیے رسول بنا کر بھیجتا ہے یا اس نے کسی عورت کو ”رسول“ بنایا ہے، بحث رسالت کے مسئلہ میں نہیں ہے بلکہ نبوت میں ہے، پس طلب حق کے لیے ضروری ہے کہ اول یہ غور کیا جائے کہ لغت عرب میں لفظ ”نبوت“ کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم اس لفظ کو ”انباء“ سے ماخوذ پاتے ہیں جس کے معنی ”اطلاع دینا“ ہیں، پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کے ہونے سے قبل بذریعہ وحی اطلاع دے یا کسی بھی بات کے لیے اس کی جانب وحی نازل فرمائے وہ شخص مذہبی اصطلاح میں بلاشبہ ”نبی“ ہے۔

آپ اس مقام پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وحی کے معنی اس الہام کے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کی سرشت میں ودیعت کر دیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے متعلق خدائے برحق کا ارشاد ہے ﴿وَ أَوْحِي رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ﴾ اور نہ وحی کے معنی ظن اور وہم کے لے سکتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں کو علم یقین سمجھنا (جو وحی کا قدرتی نتیجہ ہے) مجنوں کے سوا اور کسی کا کام نہیں ہے اور نہ یہاں وہ معنی مراد ہو سکتے ہیں جو باب کھانتہ سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی یہ کہ شیاطین، آسمانی باتوں کو سننے اور چرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر شہاب ثاقب کے ذریعہ رجم کیا جاتا ہے اور جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے:

﴿شَيْطَانِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا﴾ (الانعام: ۱۱۲)

کیونکہ یہ ”باب کھانتہ“ رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت سے مسدود ہو گیا اور نہ اس جگہ وحی کے معنی نجوم کے تجربات علمیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو خود انسانوں کے باہم سیکھنے اور سکھانے سے حاصل ہو جایا کرتے ہیں اور نہ اس کے معنی اس کے رویا (خواب) کے ہو سکتے ہیں جن کے سچ یا جھوٹ ہونے کا کوئی علم نہیں ہے بلکہ ان تمام معانی سے جدا ”وحی بمعنی نبوت“ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے قصد اور ارادہ سے ایک شخص کو ایسے امور کی اطلاع دے جن کو وہ پہلے سے نہیں جانتا اور مسطورہ بالا ذرا لے علم سے الگ یہ امور حقیقت ثابتہ بن کر اس شخص پر اس طرح منکشف ہو جائیں گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اس علم خاص کے ذریعہ اس شخص کو بغیر کسی محنت و کسب کے ہدایت ایسا صحیح یقین عطاء کر دے کہ وہ ان امور کو اس طرح معلوم کر لے جس طرح وہ حواس اور ہدایت عقل کے ذریعہ حاصل کر لیا کرتا ہے اور اس کو کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور خدا کی یہ وحی یا تو اس طرح ہوتی ہے کہ فرشتہ آ کر اس شخص کو خدا کا پیغام سناتا ہے اور یا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ براہ راست اس سے خطاب کرتا ہے۔

پس اگر ان حضرات کے نزدیک جو عورت کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں نبوت کے معنی یہ نہیں ہیں تو وہ ہم کو سمجھائیں کہ آخر نبوت کے معنی ہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے ماسوا اور کوئی معنی بیان ہی نہیں کر سکتے۔

اور جبکہ نبوت کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے تو اب قرآن کے ان مقامات کا بغور مطالعہ کیجئے جہاں یہ مذکور ہے کہ اللہ



عزوجل نے عورتوں کے پاس فرشتوں کو بھیجا اور فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان عورتوں کو ”وحی حق“ سے مطلع کیا۔ چنانچہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ام اسحاق (سارہ علیہا السلام) کو اسحاق کی ولادت کی بشارت سنائی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَأَمْرَاتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكْتُمْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَقَ ۗ وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَقَ يَعْقُوبَ ۗ﴾ قَالَتْ يُوَيْلَتِي  
ءَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَذَا بَعْلِي شَيْخًا ۚ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ ﴿۷۱﴾ قَالُوا اتَّعَجِبِينَ مِنَ أَمْرِ اللَّهِ ۗ تَوَيْلَتِي  
لِلَّهِ وَبَرَكَتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ ۗ ﴿سورة هود: ۷۱-۷۳﴾

ان آیات میں فرشتوں نے ام اسحاق کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسحاق اور ان کے بعد یعقوب علیہما السلام کی بشارت سنائی ہے اور سارہ علیہا السلام کے تعجب پر یہ کہہ کر دوبارہ خطاب کیا ہے ﴿اتَّعَجِبِينَ مِنَ أَمْرِ اللَّهِ﴾ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ والدہ اسحاق (سارہ) علیہا السلام نبی تو نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اس طرح ان سے خطاب کرے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جبریل علیہ السلام فرشتہ کو مریم (ام عیسیٰ علیہا السلام) کے پاس بھیجتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے یہ کہتا ہے:

﴿قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۗ﴾ (سورة مریم: ۱۹)

تو یہ ”وحی حقیقی“ کے ذریعہ نبوت نہیں تو اور کیا ہے اور کیا اس آیت میں صاف طور پر نہیں کہا گیا ہے کہ مریم علیہا السلام کے پاس جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغامبر بن کر آئے؟ نیز زکریا علیہ السلام جب مریم علیہا السلام کے حجرہ میں آتے تو ان کے پاس اللہ کا غیب سے دیا ہوا رزق پاتے تھے اور انہوں نے اسی رزق کو دیکھ کر بارگاہِ الہی میں صاحبِ فضیلت لڑکا پیدا ہونے کی دعا کی تھی، اسی طرح ہم موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ تم اپنے اس بچے کو دریا میں ڈال دو اور ساتھ ہی ان کو اطلاع دی کہ میں اس کو تمہاری جانب واپس کروں گا اور اس کو ”نبی مرسل“ بناؤں گا، پس کون شک کر سکتا ہے کہ یہ ”نبوت“ کا معاملہ نہیں ہے، معمولی عقل و شعور رکھنے والا آدمی بھی باسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے عطاء کردہ شرفِ نبوت سے وابستہ نہ ہوتا اور محض خواب کی بناء پر یا دل میں پیدا شدہ وسوسہ کی وجہ سے وہ ایسا کرتیں تو ان کا یہ عمل نہایت ہی مجنونانہ اور مہورانہ ہوتا اور اگر آج ہم میں سے کوئی ایسا کر بیٹھے تو ہمارا یہ عمل یا گناہ قرار پائے گا اور یا ہم کو مجنوں اور پاگل کہا جائے گا اور علاج کے لیے پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا یہ ایک ایسی صاف اور واضح بات ہے جس میں شک و شبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب یہ کہنا قطعاً درست ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال دینا اسی طرح وحی الہی کی بناء پر تھا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رویا ﴿(خواب) میں اپنے بیٹے (اسماعیل علیہ السلام) کا ذبح کرنا بذریعہ وحی معلوم کر لیا تھا اس لیے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی نہ ہوتے اور ان کے ساتھ وحی الہی کا سلسلہ وابستہ نہ ہوتا اور پھر وہ یہ عمل محض ایک خواب یا نفس میں پیدا شدہ ظن کی وجہ سے کر گزرتے تو ہر شخص ان کے اس عمل کو یا گناہ سمجھتا یا انتہائی جنون یقین کرتا تو اب بغیر کسی تردد کے یہ کہا جاسکتا ہے

﴿نبی کا خواب وحی ہوتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک حدیث میں ایسا ہی فرمایا ہے۔



کہ ام موسیٰ علیہا السلام نبی تھیں۔

علاوہ ازیں حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت پر ایک یہ دلیل بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ کہف میں ان کا ذکر انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں کیا ہے اور اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے:

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ﴾ (سورہ مریم: ۵۸)

” (یہی ہیں وہ انبیاء آدم کی نسل سے اور ان میں سے جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ کشتی میں سوار کیا (جن پر اللہ کا انعام و اکرام ہوا)۔“

تو آیت کے اس عموم میں مریم علیہا السلام کی تخصیص کر کے ان کو انبیاء کی فہرست میں سے الگ کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

رہی یہ بات کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مریم علیہا السلام کے لیے یہ کہا ہے ﴿وَأُمَّةً صِدِّيقَةً﴾ تو یہ لقب ان کی نبوت کے لیے اسی طرح مانع نہیں جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے نبی اور رسول ہونے کے لیے یہ آیت مانع نہیں ﴿يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ﴾ اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ (وباللہ التوفیق)

اب حضرت سارہ، حضرت مریم، حضرت ام موسیٰ (علیہن السلام) کے مسئلہ نبوت کے ساتھ فرعون کی بیوی (آسیہ) کو بھی شامل کر لیجئے۔ اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((كَمَلُ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيرٌ وَلَمْ يَكْمَلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَآسِيَةُ بِنْتُ مِزْحَمٍ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ))  
(او کما قال علیہ السلام).

”یعنی مردوں میں سے تو بہت سے آدمی کامل ہوئے ہیں مگر عورتوں میں سے صرف یہی دو کامل ہوئیں مریم بنت عمران اور آسیہ بنت مزاحم زوجہ فرعون۔“

اور واضح رہے کہ مردوں میں یہ درجہ کمال بعض رسولوں (علیہم السلام) کو حاصل ہوا ہے اور اگرچہ ان کے علاوہ انبیاء و رسل بھی درجہ نبوت و رسالت پر مامور ہیں لیکن ان مرسلین کا ملین کے درجہ سے نازل ہیں، اس لیے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا ہے ان میں صرف ان دو عورتوں کو ہی درجہ کمال تک پہنچنے کی فضیلت حاصل ہے کیونکہ حدیث میں جس درجہ کمال کا ذکر ہو رہا ہے جو ہستی بھی اس درجہ سے نازل ہے وہ کامل نہیں ہے۔

بہر حال اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگرچہ بعض عورتیں بہ نص قرآن نبی ہیں لیکن ان میں سے ان دو عورتوں کو بھی درجہ کمال حاصل ہوا۔ درجات کے اس فرق کو خود قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ حقیقت یہ ہے کہ کامل اس کو کہا جاتا ہے جس کی نوع میں سے کوئی دوسرا اس کا ہمسرنہ ہو پس مردوں میں سے ایسے کامل خدا کے چند ہی رسول ہوئے ہیں جن کی ہمسری دوسرے انبیاء و رسل کو عطا نہیں ہوئی اور بلاشبہ ان ہی کا ملین میں سے ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور

بخاری میں الفاظ حدیث یہ ہیں: ((قال رسول الله ﷺ كَمَلُ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيرٌ وَلَمْ يَكْمَلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَآسِيَةُ بِنْتُ مِزْحَمٍ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ))  
وان فضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام))



ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کے متعلق نصوص (قرآن و حدیث) نے ان فضائل کمال کا اظہار کیا ہے جو دوسرے انبیاء و رسل کو حاصل نہیں ہیں، اسی طرح عورتوں میں سے وہی درجہ کمال کو پہنچی ہیں جن کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کیا ہے۔

ابن حزم رحمہ اللہ کے اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر وحی کے ان معانی کو نظر انداز کر کے ”جن کا اطلاق بلحاظ عموم لغت جبلت یا نفس میں ظن و وہم کے درجہ کا القاء و الہام پر ہوتا ہے“ وہ اصطلاحی معنی لیے ہیں جن کو قرآن نے انبیاء و رسل کے لیے مخصوص کیا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک وہ (وحی) جس کا منشاء مخلوق خدا کی رشد و ہدایت اور تعلیم اوامر و نواہی سے ہو۔ اور دوسری یہ کہ خدائے تعالیٰ کسی شخص سے براہ راست یا فرشتہ کے واسطے سے اس قسم کا خطاب کرے کہ جس سے بشارات دینا، یا کسی ہونے والے واقعہ کی ہونے سے قبل اطلاع دینا یا خاص اس کی ذات کے لیے کوئی امر و نہی فرمانا مقصود ہو، اب اگر پہلی صورت ہے تو یہ ”نبوة مع الرسالة“ ہے اور بالاتفاق سب کے نزدیک یہ درجہ صرف مردوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے جیسا کہ سورہ النحل کی آیت سے واضح ہے اور اس مسئلہ میں قطعاً دورائے نہیں ہیں۔

اور اگر وحی الہی کی دوسری شکل ہے تو ابن حزم رحمہ اللہ اور ان کے مؤیدین علماء کی رائے میں یہ بھی نبوت ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ قرآن عزیز نے سورہ شوریٰ میں انبیاء علیہم السلام پر نزول وحی کے جو طریقے بیان کیے ہیں وہ اس وحی پر بھی صادق آتے ہیں۔ سورہ شوریٰ میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِي حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنََّّهُ عَلَىٰ حَكِيمٍ ﴿٥١﴾﴾ (الشوری: ۵۱)

”اور کسی انسان کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے (بالمشافہ) گفتگو کرے مگر یا وحی کے ذریعہ یا پس پردہ کلام کے ذریعہ اور یا اس صورت سے کہ اللہ کسی فرشتہ کو پیغام بر بنا کر بھیجے اور وہ اس کی اجازت سے جس کو کہ وہ چاہے اس بشر کو وحی لا کر سنادے بلاشبہ وہ بلند و بالا حکمت والا ہے۔“

اور جبکہ قرآن نے وحی کی اس دوسری قسم کا اطلاق بہ نص صریح حضرت مریم، حضرت سارہ، حضرت ام موسیٰ اور حضرت آسیہ علیہن السلام پر کیا ہے جیسا کہ سورہ ہود، قصص اور مریم سے ظاہر ہوتا ہے تو ان مقدس عورتوں پر ”نبی کا اطلاق“ قطعاً صحیح ہے اور اس کو بدعت کہنا سرتا سر غلط ہے۔

ابن حزم رحمہ اللہ کے مؤید علماء نے اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے اس شبہ کا جواب بھی دیا ہے ”کہ قرآن نے جس طرح صاف الفاظ میں مرد انبیاء کو نبی اور رسول کہا ہے اس طرح ان عورتوں میں سے کسی کو نہیں کہا“ جواب کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ ”نبوة مع الرسالة“ جو کہ مردوں کے لیے ہی مخصوص ہے کائنات انسانی کی رشد و ہدایت اور تعلیم و تبلیغ نوع انسانی سے متعلق ہوتی ہے تو اس کا

الفصل فی الملل والاهواء والنحل مطبوعہ مصر ۱۳۲۸ھ ج ۵ ص ۱۲-۱۳-۱۴ یہ بحث فتح الباری ج ۶ ص ۳۳۷-۳۳۸-۳۶۸ مطبوعہ مصر میں بھی قابل مراجعت ہے۔

یہاں نبی اور رسول کے اس فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو علم کلام کی خاص اصطلاح ہے کیونکہ قرآن کثرت کے ساتھ نبی اور رسول کو مترادف معنی میں استعمال کرتا ہے۔



تقاضیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو اس شرف سے ممتاز فرمایا ہے اس کے متعلق وہ صاف صاف اعلان کرے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا نبی اور رسول ہے، تاکہ امت پر اس کی دعوت و تبلیغ کا قبول کرنا لازم ہو جائے اور خدا کی حجت پوری ہو اور چونکہ نبوت کی وہ قسم جس کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے خاص اسی ہستی سے وابستہ ہوتی ہے جس کو یہ شرف ملا ہے تو اس کے متعلق صرف یہی اظہار کر دینا کافی ہے کہ جو ”وحی من اللہ“ انبیاء و رسل کے لیے ہی مخصوص ہے اس سے ان چند عورتوں کو بھی مشرف کیا گیا ہے۔

عورتوں کی نبوت کے اثبات و انکار کے علاوہ تیسری رائے ان علماء کی ہے جو اس مسئلہ میں ”سکوت اور توقف“ کو ترجیح دیتے ہیں ان میں شیخ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، فتح الباری میں ان کا یہ قول مذکور ہے:

قال السبکی اختلف في هذه المسئلة ولم يصح عندی فی ذلك شیء.... الخ

سبکی فرماتے ہیں: ”اس مسئلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں اور میرے نزدیک اس بارہ میں اثباتاً یا نفیاً کوئی بات ثابت نہیں ہے۔“

### کیا حضرت مریم علیہا السلام نبی ہیں؟

اس تفصیل سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی نبوت کے انکار پر امام الحرمین کا دعوائے اجماع صحیح نہیں ہے۔ نیز یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فہرست انبیاء میں مسطورہ بالا دوسری مقدس عورتوں کے مقابلہ میں حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے متعلق قرآنی نصوص زیادہ واضح ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام شعرانی، ابن حزم اور قرطبی رحمۃ اللہ علیہم کے درمیان حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ نبیات کی فہرست کے بارہ میں خاصہ اختلاف نظر آتا ہے ✽ اور حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے متعلق تمام مثبتین نبوت کا اتفاق ہے۔ ہم کو ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے اس دعویٰ سے بھی اختلاف ہے کہ جمہور، انکار کی جانب ہیں، البتہ اکثریت غالباً سکوت اور توقف کو پسند کرتی ہے۔

### آیت ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا مطلب:

جو علماء عورتوں میں نبوت کے قائل ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کو نبی تسلیم کرتے ہیں، ان کے مسلک کے مطابق تو آیت ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا مطلب صاف اور واضح ہے وہ یہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کو کائنات کی تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، جو عورتیں نبی نہیں ہیں ان پر اس لیے کہ مریم علیہا السلام نبی ہیں اور جو عورتیں نبی ہیں ان پر اس لیے کہ وہ ان قرآنی نصوص کے پیش نظر جو ان کے فضائل و کمالات سے تعلق رکھتی ہیں باقی نبیات پر برتری رکھتی ہیں۔

لیکن جو علماء عورتوں کی نبوت کا انکار فرماتے ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کو ”نبیہ“ نہیں تسلیم کرتے وہ اس آیت کی مراد میں دو جدا جدا خیال رکھتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ آیت کا جملہ ﴿نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ عام ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تمام عورتوں کو شامل ہے۔ اس لیے بلاشبہ حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثناء کے کائنات انسانی کی تمام عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ آیت کے لفظ ﴿الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے کائنات کی وہ تمام عورتیں مراد ہیں جو حضرت مریم علیہا السلام کی معاصر تھیں۔ یعنی قرآن عزیز حضرت مریم علیہا السلام کے زمانہ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بشارت دی کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں



میں برگزیدہ اور صاحب کمال ہیں اور ہم نے ان سب میں سے ان کو چن لیا ہے اور ﴿الْعَلَمِينَ﴾ کا یہ اطلاق وہی حیثیت رکھتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت (بنی اسرائیل) کے لیے اس آیت میں اختیار کی گئی ہے۔

﴿وَلَقَدْ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلِيَّ الْعَلَمِينَ﴾ (الدخان: ۳۲)

”اور بلاشبہ ہم نے اپنے علم سے ان (بنی اسرائیل) کو جہان والوں کے مقابلہ میں پسند کر لیا ہے۔“

اور جبکہ باتفاق آراء بنی اسرائیل کی فضیلت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ﴿الْعَلَمِينَ﴾ سے ان کی معاصر امم و اقوام مراد ہیں کہ ان میں سے امت موسیٰ علیہ السلام کو فضیلت حاصل ہے تو حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت کے باب میں بھی یہی معنی مراد لینے چاہئیں۔

حضرت مریم علیہا السلام کا تقدس اور تقویٰ و طہارت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی والدہ ہونے کا شرف، مرد کے ہاتھ لگائے بغیر معجزہ کے طور پر ان کے مشکوئے معلیٰ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت بلاشبہ ایسے امور ہیں جن کی بدولت ان کو معاصر عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل تھی۔

پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ باب فضیلت ایک وسیع باب ہے اور جس طرح کسی شے کی حقیقت بیان کرنے میں بلیغ اور عمدہ طریق بیان یہ ہے کہ وہ جامع و مانع ہو یعنی اس کی حقیقت پر اس طرح حاوی ہو کہ تمام دوسری چیزوں سے ممتاز ہو جائے، نہ ایسی کوئی کمی رہ جائے کہ اصل حقیقت پوری طرح بیان نہ ہو سکے اور نہ ایسا اضافہ ہو کہ بعض دوسری حقائق بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اسی طرح اس کے برعکس بیان فضیلت کے لیے فصاحت و بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو بیان حقیقت کی طرح حدود و قیود میں نہ جکڑ دیا جائے کیونکہ اس مقام پر حقیقت شے نہیں بلکہ فضیلت شے کا اظہار ہو رہا ہے جو اگر اسی طرح کے دوسرے افراد پر بھی صادق آجائے تو بیان حقیقت کی طرح اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا بلکہ اس موقع پر وسعت بیان ہی از بس ضروری ہوتا ہے تاکہ مخاطب کے دل میں اظہار فضیلت سے جو نفسیاتی اثر پیدا کرنا ہے وہ دل نشین اور مؤثر ہو سکے۔

تو ایسی صورت میں ﴿عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ﴾ کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ دوسری کوئی مقدس عورت اس شرف کو نہیں پہنچ سکتی یا نہیں پہنچی بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مریم علیہا السلام کو فضائل و کمالات میں بلند سے بلند مرتبہ حاصل ہے، باب فضائل کی یہی وہ حقیقت ہے جس کے فراموش کر دینے پر فضائل صحابہ وغیرہ میں اکثر ہم کو لغزش ہو جاتی اور چند مقدس اشخاص سے متعلق فضائل کے مابین تضاد و تناقض نظر آنے لگتا ہے، البتہ ان فضائل کی حدود سے گزر کر جب ہم صاحب فضائل افراد کے انفرادی و اجتماعی اعمال کا جائزہ لے کر فرق مراتب بیان کرتے ہیں تو وہ ضرور ایک دوسرے کے لیے حد فاصل ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرات صحابہ و صحابیات کے فضائل کے پیش نظر فرق مراتب کا صحیح فیصلہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ ان کے ان فضائل کے ساتھ ساتھ جو زبان وحی ترجمان سے نکلے ہیں ان سے متعلق خصوصی ارشادات قرآنی و حدیثی، ان کی اسلامی خدمات، اسلام سے متعلق ان کی سرفروشیاں و جاں سپاریاں، نصرت حق میں مالی فداکاریاں، اسلام کے نازک ترین لمحات میں ان کے علم و تدبیر کی عقدہ کشائیاں اور ان کی عملی جدوجہد کی رفیع سرگرمیاں ان سب کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے۔



## حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشارات کتب سابقہ:

ادیان و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین حق اور ملت بیضاء کی تبلیغ و دعوت کا سلسلہ اگرچہ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد ﷺ تک برابر جاری رہا ہے لیکن اس سلسلہ کو مزید قوت پہنچانے اور سر بلند کرنے کے لیے سنت اللہ یہ رہی ہے کہ صدیوں بعد ایک ایسے اولوالعزم اور جلیل القدر پیغمبر کو بھیجے جو امتداد زمانہ کی وجہ سے پیدا شدہ عام روحانی اضمحلال کو دور کر کے قبول حق کے افسردہ رجحانات میں تازگی بخشنے اور ضعیف روحانی عواطف کو قوی سے قوی تر بنادے، گویا مذہب کی خوابیدہ دنیا میں حق و صداقت کا صور پھونک کر ایک انقلاب عظیم پھا کر دے اور مردہ دلوں میں نئی روح ڈال دے اور اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ جن اقوام و امم میں اس عظیم المرتبہ پیغمبر کی بعثت ہونے والی ہوتی ہے صدیوں پہلے ان کے ہادیان ملت اور داعیان حق (انبیاء علیہم السلام) اس مقدس رسول ﷺ کی آمد کی بشارات وحی الہی کے ذریعہ سناتے رہتے ہیں تاکہ اس کی دعوت حق کے لیے زمین ہموار رہے اور جب اس نور حق کے روشن ہونے کا وقت آجائے تو ان اقوام و امم کے لیے اس کی آمد غیر متوقع حادثہ نہ بن جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان چند اولوالعزم، جلیل القدر اور مقدس رسولوں میں سے ایک ہیں اور اسی بناء پر انبیاء بنی اسرائیل میں سے متعدد انبیاء علیہم السلام ان کی آمد سے قبل ان کے حق میں منادی کرتے اور آمد کی بشارت سناتے نظر آتے ہیں اور ان ہی بشارات کی وجہ سے بنی اسرائیل مدت مدید سے منتظر تھے کہ مسیح موعود کا ظہور ہو تو ایک مرتبہ وہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کی طرح اقوام عالم میں معزز و ممتاز ہوں گے اور رشد و ہدایت کی خشک کھیتی میں روح تازہ پیدا ہوگی اور خدا کے جاہ و جلال سے ان کے قلوب ایک مرتبہ پھر چمک اٹھیں گے۔ بائبل (توراہ و انجیل) اپنی لفظی و معنوی تحریفات کے باوجود آج بھی ان چند بشارات کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہیں جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کی آمد سے تعلق رکھتی ہیں۔ توراہ استثناء میں ہے:

”اور اس موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر (ساعیر) سے ان پر طلوع ہوا، اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔“ (ب ۳۳-آیت ۲۰)

اس بشارت میں ”سینا سے خدا کی آمد“ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی جانب اشارہ ہے اور ”ساعیر سے طلوع ہونا“ نبوت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہے، کیونکہ ان کی ولادت باسعادت اسی پہاڑ کے ایک مقام ”بیت اللحم“ میں ہوئی ہے اور یہی وہ مبارک جگہ ہے جہاں سے نور حق طلوع ہوا اور ”فاران پر جلوہ گر ہونا“ آفتاب رسالت کی بعثت کا اعلان ہے کیونکہ فاران، حجاز کے مشہور پہاڑی سلسلہ کا نام ہے۔ اور حضرت یسعیاہ نبی علیہ السلام کے صحیفہ میں ہے:

”دیکھ میں اپنا پیغمبر تیرے آگے بھیجتا ہوں جو تیری راہ تیار کرے گا، بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ تیار کرو، اس کے راستے سیدھے بناؤ۔“

اسی بشارت میں ”پیغمبر“ سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور بیابان میں پکارنے والے حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مناد تھے اور ان کی بعثت سے قبل بنی اسرائیل میں ان کی بعثت رسالت کا مژدہ جانفزاسناتے تھے۔



اور متی کی انجیل میں ہے:

”جب یسوع، ہیرودیس بادشاہ کے زمانہ میں یہودیہ کے بیت لحم میں پیدا ہوا تو دیکھو کئی مجوس پورب سے یروشلم میں یہ کہتے ہوئے آئے کہ یہودیوں کا بادشاہ جو پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے؟... یہ سن کر ہیرودیس بادشاہ اور اس کے ساتھ یروشلم کے سب لوگ گھبرائے اور اس نے قوم کے سب سردار کاہنوں اور فقیہوں کو جمع کر کے ان سے پوچھا کہ مسیح کی پیدائش کہاں ہونی چاہیے؟ انہوں نے اس سے کہا کہ یہودیہ کے بیت لحم میں کیونکہ نبی (یسعیاہ علیہ السلام) کی معرفت یوں لکھا گیا ہے، اے بیت لحم یہوداہ کے علاقہ: تو یہوداہ کے حامیوں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری امت اسرائیل کی گلہ بانی کرے گا۔“

اور دوسری جگہ ہے:

”اور جب وہ یروشلم کے نزدیک پہنچے اور زیتون کے پہاڑ پر بیت فگے کے پاس آئے تو یسوع نے دو شاگردوں کو یہ کہہ کر بھیجا کہ اپنے سامنے کے گاؤں میں جاؤ وہاں پہنچتے ہی ایک گدھی بندھی ہوئی اور اس کے ساتھ بچہ تمہیں ملے گا، انہیں کھول کر میرے پاس لے آؤ اور اگر کوئی تم سے کچھ کہے تو کہنا کہ یہ خداوند کو درکار ہیں وہ فی الفور انہیں بھیج دے گا یہ اس لیے ہوا کہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ ”صیہون کی بیٹی سے کہو کہ دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے وہ حلیم ہے اور گدھے پر سوار ہے بلکہ لا دو بچہ پر۔“

اور یوحنا کی انجیل میں ہے:

”اور یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لیے اس (یحییٰ علیہ السلام) کے پاس پہنچے کہ تو کون ہے تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انہوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں، پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تا کہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں جیسا کہ یسعیاہ نبی نے کہا ہے بیابان میں پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔“

اور مرقس اور لوقا کی انجیلوں میں ہے:

”وہ لوگ منتظر تھے اور سب اپنے اپنے دل میں یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی بابت سوچتے تھے کہ آیا وہ مسیح تھے یا نہیں تو یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) نے ان سب کے جواب میں کہا: میں تو تمہیں بہتسمہ دیتا ہوں مگر جو مجھ سے زور آور ہے وہ آنے والا ہے میں اس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں، وہ تمہیں روح القدس سے بہتسمہ دے گا۔“

ان ہر دو بشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود اپنی مذہبی روایات کی بناء پر جن اولوالعزم پیغمبروں کی بعثت کے منتظر تھے ان میں مسیح علیہ السلام بھی تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ان کو بتایا کہ وہ نہ ایلیاہ ہیں نہ وہ نبی اور نہ مسیح علیہ السلام بلکہ مسیح علیہ السلام کی بعثت

✽ باب ۲ آیات ۱-۶ ✽ باب ۲ آیات ۱۹-۲۳ ✽ لوقا باب ۱ آیات ۱۵-۱۶

✽ عہد نامہ جدید (انجیل) میں یوحنا و جدا جدا شخصیتیں ہیں ایک یحییٰ علیہ السلام اور دوسری عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور شاگرد۔



کے مناد اور مبشر ہیں۔

قرآن عزیز نے بھی حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی تمہید قرار دیا ہے اور یحییٰ علیہ السلام کا مبشر اور منادی بتایا ہے۔ آل عمران میں ہے:

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّيٰ فِي الْمِحْرَابِ ۗ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا لِّكَلِمَةٍ مِّنْ

اللّٰهِ﴾ (آل عمران: ۳۹)

”پس فرشتوں نے اس (زکریا) کو اس وقت پکارا جبکہ وہ حجرہ میں کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا تھا، بیشک اللہ تعالیٰ تجھ کو یحییٰ (فرزند) کی بشارت دیتا ہے، جو اللہ کے کلمہ (عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرے گا۔“

### ولادت مبارک:

عابد و زاہد اور عفت ماب مریم علیہا السلام اپنے خلوت کدہ میں مشغول عبادت رہتی اور ضروری حاجات کے علاوہ کبھی اس سے باہر نہیں نکلتی تھیں، ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ (ہیکل) کے مشرقی جانب لوگوں کی نگاہوں سے دور کسی ضرورت سے ایک گوشہ میں تنہا بیٹھی تھیں کہ اچانک خدا کا فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ حضرت مریم علیہا السلام نے ایک اجنبی شخص کو اس طرح بے حجاب سامنے دیکھا تو گھبرا گئیں اور فرمانے لگیں ”اگر تجھ کو کچھ بھی خدا کا خوف ہے تو میں خدائے رحمان کا واسطہ دے کر تجھ سے پناہ چاہتی ہوں“ فرشتے نے کہا: ”مریم! خوف نہ کھا، میں انسان نہیں بلکہ خدا کا فرستادہ فرشتہ ہوں اور تجھ کو بیٹے کی بشارت دینے آیا ہوں“ حضرت مریم علیہا السلام نے یہ سنا تو ازراہ تعجب فرمانے لگیں: میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ مجھ کو آج تک کسی بھی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا اس لیے کہ نہ تو میں نے نکاح کیا ہے اور نہ میں زانیہ ہوں“ فرشتہ نے جواب دیا: میں تو تیرے پروردگار کا قاصد ہوں، اس نے مجھ سے اسی طرح کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ میں اس لیے کروں گا کہ تجھ کو اور تیرے لڑکے کو کائنات کے لیے اپنی قدرت کاملہ کے اعجاز کا ”نشان“ بنا دوں اور لڑکا میری جانب سے ”رحمت“ ثابت ہوگا اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو ایک ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے جو اس کا ”کلمہ“ ہوگا، اس کا لقب ”مسح“ اور اس کا نام عیسیٰ (علیہ السلام) (یسوع) ہوگا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوجاہت اور صاحب عظمت رہے گا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقربین میں سے ہوگا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نشان کے طور پر بحالت شیر خوارگی لوگوں سے باتیں کرے گا اور سن کہولت (بڑھاپے کا ابتدائی دور) بھی پائے گا تاکہ کائنات کی رشد و ہدایت کی خدمت کی تکمیل کرے اور یہ سب کچھ اس لیے ضرور ہو کر رہے گا کہ اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو اس کا محض یہ ارادہ اور حکم کہ ”ہو جا“ اس شے کو نیست سے ہست کر دیتا ہے۔ لہذا یہ یوں ہی ہو کر رہے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی کتاب عطاء کرے گا، اس کو حکمت سکھائے گا اور اس کو بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے رسول اور اولوالعزم پیغمبر بنائے گا۔

قرآن عزیز نے ان واقعات کا معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ سورہ آل عمران اور سورہ مریم میں اس طرح ذکر کیا ہے:

﴿یعنی تو والد و تناسل کے عام قانون سے جدا قانون اعجاز کے مطابق محض حکم الہی اور ارادہ باری سے ہی رحم مریم میں وجود پذیر ہو جائے گا۔

﴿مسح بمعنی مبارک یا سیاح جس کا کوئی گھر نہ ہو۔



﴿إِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ يَمْرِيءٌ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۗ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۗ ﴿٤٥﴾ وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٤٦﴾ قَالَتْ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَ لَمْ يَمَسِّنِي بَشَرٌ ۗ قَالَ كَذَلِكَ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۗ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٤٧﴾ وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرَةَ وَ الْإِنْجِيلَ ﴿٤٨﴾ وَ رَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿٤٩﴾﴾ (آل عمران: ۴۵-۴۹)

” (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب فرشتوں نے مریم (علیہا السلام) سے کہا: اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو اپنے کلمہ کی بشارت دیتا ہے اس کا نام مسیح، عیسیٰ ابن مریم ہوگا، وہ دنیا و آخرت میں صاحب وجاہت اور ہمارے مقربین میں سے ہوگا اور وہ (ماں کی) گود میں اور کہولت کے زمانہ میں لوگوں سے کلام کرے گا اور وہ نیکو کاروں میں سے ہوگا، مریم (علیہا السلام) نے کہا: ”میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ مجھ کو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا“ فرشتہ نے کہا: ”اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اسی طرح پیدا کر دیتا ہے، وہ جب کسی شے کے لیے حکم کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے ”ہو جا“ اور وہ ہو جاتی ہے، اور اللہ اس کو کتاب و حکمت اور توراہ و انجیل کا علم عطا کرے گا اور وہ بنی اسرائیل کی جانب اللہ کا رسول ہوگا۔“

﴿وَ اذْكَرُّ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ ۗ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا ۗ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَنِ مِنْكَ إِن كُنْتُ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ ۗ لِأَهَبَ لِكَ غُلَامًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ أَنَّى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَ لَمْ يَمَسِّنِي بَشَرٌ وَ لَمْ أَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذَلِكَ ۗ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَىٰ هَيْئٍ ۗ وَ لِنَجْعَلَهُ آيَةً لِلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۗ وَ كَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾﴾ (مریم: ۱۶-۲۱)

” اور اے پیغمبر! کتاب میں مریم (علیہا السلام) کا واقعہ ذکر کرو اس وقت کا ذکر جب وہ ایک جگہ پورب کی طرف تھی اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہوئی پھر اس نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا، پس ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہو گیا مریم اسے دیکھ کر گھبرا گئی، وہ بولی اگر تو نیک آدمی ہے تو میں خدائے رحمان کے نام پر تجھ سے پناہ مانگتی ہوں“ فرشتہ نے کہا: ”میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں اور اس لیے نمودار ہوا ہوں کہ تجھے ایک پاک فرزند دے دوں“ مریم بولی ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں بدچلن ہوں؟“ فرشتہ نے کہا: ”ہوگا ایسا ہی، تیرے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں وہ کہتا ہے یہ اس لیے ہوگا کہ اس (مسیح) کو لوگوں کے لیے ایک نشان بنا دوں اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے ہو چکا ہے۔“



جبرئیل امین علیہ السلام نے مریم علیہا السلام کو یہ بشارات سنا کر ان کے گریبان میں پھونک دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلمہ ان تک پہنچ گیا۔ مریم علیہا السلام نے کچھ عرصہ کے بعد خود کو حاملہ محسوس کیا تو بہ تقاضائے بشری ان پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی اور اس کیفیت نے اس وقت شدید صورت اختیار کر لی، جب انہوں نے دیکھا کہ مدت حمل ختم ہو کر ولادت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے، انہوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعہ قوم کے اندر رہ کر پیش آیا تو چونکہ وہ حقیقت حال سے واقف نہیں ہے اس لیے نہیں معلوم وہ کس کس طرح بدنام اور بہتان طرازیوں کے ذریعہ کس درجہ پریشان کرے اس لیے مناسب یہ ہے کہ لوگوں سے دور کسی جگہ چلے جانا چاہیے، یہ سوچ کر وہ یروشلم (بیت المقدس) سے تقریباً نو میل کوہ سراة (ساعیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جو اب "بیت اللحم" کے نام سے مشہور ہے، یہاں پہنچ کر چند روز بعد روزہ شروع ہوا تو تکلیف و اضطراب کی حالت میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے تنے کے سہارے بیٹھ گئیں اور پیش آنے والے نازک حالات کا اندازہ کر کے انتہائی قلق اور پریشانی کی حالت میں کہنے لگیں "کاش کہ میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور میری ہستی کو لوگ ایک قلم فراموش کر چکے ہوتے" تب نخلستان کے نشیب سے خدا کے فرشتے نے پھر پکارا "مریم علیہا السلام! غمگین نہ ہو، تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر<sup>۱</sup> جاری کر دی ہے اور کھجور کا تنا پکڑ کر اپنی جانب ہلاتو پکے اور تازہ خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے پس تو کھاپی اور اپنے بچے کے نظارہ سے آنکھیں ٹھنڈی کر اور رنج و غم کو بھول جا۔"

حضرت مریم علیہا السلام پر تنہائی، تکلیف اور نزاکت حال سے جو خوف طاری اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا فرشتے کی تسلی آمیز پکار اور عیسیٰ علیہ السلام جیسے برگزیدہ بچے کے نظارہ سے کافور ہو گیا اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھ دیکھ کر شاد کام ہونے لگیں۔ تاہم یہ خیال پہلو میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا کہ اگرچہ خاندان اور قوم میری عصمت و پاک دامنی سے نا آشنا نہیں ہے پھر بھی ان کی اس حیرت کو کس طرح مٹایا جاسکے گا کہ بن باپ کے کس طرح ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے؟

مگر جس خدائے برتر نے ان کو یہ بزرگی اور برتری بخشی وہ کب ان کو اس کرب و بے چینی میں مبتلا رہنے دیتا، اس لیے اس نے فرشتے کے ذریعہ مریم علیہا السلام کے پاس پھر یہ پیغام بھیجا کہ جب تو اپنی قوم میں پہنچے اور وہ تجھ سے اس معاملہ کے متعلق سوالات کرے تو خود جواب نہ دینا بلکہ اشارہ سے ان کو بتانا کہ میں روزہ دار ہوں اور اس لیے آج کسی سے بات نہیں کر سکتی تم کو جو کچھ دریافت کرنا ہے اس بچے سے دریافت کر لو، تب تیرا پروردگار اپنی قدرت کاملہ کا نشان ظاہر کر کے ان کی حیرت کو دور اور ان کے قلوب کو مطمئن کر دے گا۔ حضرت مریم علیہا السلام وحی الہی کے ان پیغامات پر مطمئن ہو کر بچے کو گود میں لے کر بیت المقدس کو روانہ ہوئیں، جب شہر میں پہنچیں اور لوگوں نے اس حالت میں دیکھا تو چہرہ جانب سے ان کو گھیر لیا اور کہنے لگے "مریم علیہا السلام! یہ کیا؟" تو نے تو بہت ہی عجیب بات کر دکھائی اور بھاری تہمت کا کام کر لیا، اے ہارون بنی اسرائیل کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بد چلن تھی پھر تو یہ کیا کر بیٹھی؟

مریم علیہا السلام نے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لڑکے کی جانب اشارہ کر دیا کہ جو کچھ دریافت کرنا ہے اس سے معلوم کر لو میں تو آج روزہ<sup>۲</sup> سے ہوں۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب کے ساتھ کہا: "ہم کس طرح ایسے شیر خوار بچے سے باتیں کر سکتے ہیں جو

<sup>۱</sup> سری لغت عرب میں نہر کو بھی ہتے ہیں اور بلند ہستی کو بھی، جمہور نے اس جگہ پہلے معنی مراد لئے ہیں.... اور حسن بصری، ربیع بن انس اور ابن اسلم رضی اللہ عنہم

سے دوسرے معنی منقول ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تیرے تلے ایک بلند ہستی پیدا کر دی ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲)

<sup>۲</sup> بنی اسرائیل کے یہاں روزہ میں خاموشی بھی داخل عبادت تھی۔



ابھی ماں کی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے“ مگر بچہ فوراً بول اٹھا ”میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے (اپنے فیصلہ تقدیر میں) مجھ کو کتاب (انجیل) دی ہے اور نبی بنایا ہے اور اس نے مجھ کو مبارک بنایا خواہ میں کسی حال اور کسی جگہ بھی ہوں، اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا اور خود سر اور نافرمان نہیں بنایا اور اس کی جانب سے مجھ کو سلامتی کا پیغام ہے جس دن کہ میں پیدا ہوا اور جس دن کہ میں مروں گا اور جس دن کہ پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان تفصیلات کو سورۃ انبیاء، تحریم اور سورۃ مریم میں ذکر فرمایا ہے:

﴿وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ﴿۹۱﴾﴾ (الانبیاء: ۹۱)

”اور اس عورت (مریم علیہا السلام) کا معاملہ جس نے اپنی پاکدامنی کو قائم رکھا، پھر ہم نے اس میں اپنی ”روح“ کو پھونک دیا اور اس کو اور اس کے لڑکے کو جہان والوں کے لیے ”نشان“ ٹھہرایا ہے۔“

﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا﴾ (التحریم: ۱۲)

”اور عمران کی بیٹی مریم علیہا السلام کہ جس نے اپنی عصمت کو برقرار رکھا پس ہم نے اس میں اپنی روح کو پھونک دیا۔“

﴿فَحَصَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهَا مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَلَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا وَكُنْتُ نَسِيًّا مَنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادَىٰ مِنْ تَحْتِهَا أَلَا تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسْقِطُ عَلَيْكَ رَطْبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكَلِمًا وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا ﴿۲۶﴾ فَأَمَّا تَرِينٌ مِّنَ الْبَشَرِ أَحَدًا فَقَوِي إِنَّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ﴿۲۷﴾ فَاتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحِيَّةً ﴿۲۸﴾ قَالُوا يَمْرَيْمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿۲۹﴾ يَا خَتْمَ هُرُونَ مَا كَانَ أَبُوكَ أَمْرًا سَوْءًا وَمَا كَانَتْ أُمُّكَ بَغِيًّا ﴿۳۰﴾ فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۳۱﴾ قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ؕ آتَانِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ﴿۳۲﴾ وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ ۖ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۳﴾ وَبَوَالِدَيْ ۖ وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۴﴾ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۵﴾﴾ (مریم: ۲۲-۳۳)

”پھر اس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھہر گیا وہ (اپنی حالت چھپانے کے لیے) لوگوں سے الگ ہو کر دور چلی گئی پھر اسے درد زہ (کا اضطراب) کھجور کے ایک درخت کے نیچے لے گیا (وہ اس کے تنا کے سہارے بیٹھ گئی) اس نے کہا کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی، میری ہستی کو لوگ ایک قلم بھول گئے ہوتے، اس وقت (ایک پکارنے والے فرشتے نے) اسے نیچے سے پکارا ”غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر جاری کر دی ہے، اور کھجور کے درخت کا تنا پکڑ کر اپنی طرف ہلا، تازہ اور پکے ہوئے پھلوں کے خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے، کھاپی (اور اپنے بچہ کے نظارے سے) آنکھیں ٹھنڈی کر،



پھر اگر کوئی آدمی نظر آئے (اور پوچھ گچھ کرنے لگے) تو (اشارہ سے) کہہ دے میں نے خدائے رحمان کے حضور روزہ کی منت مان رکھی ہے میں آج کسی آدمی سے بات چیت نہیں کر سکتی پھر ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی قوم کے پاس آئی، لڑکا اس کی گود میں تھا، لوگ (دیکھتے ہی) بول اٹھے ”مریم! تو نے عجیب ہی بات کر دکھائی“ اور بڑی تہمت کا کام کر گزری، اے ہارون! کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا نہ تیری ماں بدچلن تھی“ (تو یہ کیا کر بیٹھی) اس پر مریم علیہا السلام نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا (کہ یہ تمہیں بتلا دے گا کہ حقیقت کیا ہے) لوگوں نے کہا: بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی گود میں بیٹھنے والا شیر خوار بچہ ہے“ مگر لڑکا بول اٹھا ”میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا، اس نے مجھے بابرکت کیا خواہ میں کسی جگہ ہوں، اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کہ جب تک زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو۔ اس نے مجھے اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا، ایسا نہیں کیا کہ خود سر اور نافرمان ہوتا، مجھ پر اس کی طرف سے سلامتی کا پیغام ہے جس دن پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا۔“

قوم نے ایک شیر خوار بچہ کی زبان سے جب یہ حکیمانہ کلام سنا تو حیرت میں رہ گئی اور اس کو یقین ہو گیا کہ مریم علیہا السلام کا دامن بلاشبہ ہر قسم کی برائی اور تلویٹ سے پاک ہے اور اس بچہ کی پیدائش کا معاملہ یقیناً منجانب اللہ ایک ”نشان“ ہے۔ یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ پوشیدہ رہ جاتی، قریب اور بعید سب جگہ اس حیرت زا واقعہ اور عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ ولادت کے چرچے ہونے لگے اور طبائع انسانی نے اس مقدس ہستی کے متعلق شروع ہی سے مختلف کروٹیں بدلتی شروع کر دیں، اصحاب خیر نے اس کے وجود کو اگر یمین و سعادت کا ماہتاب سمجھا تو اصحاب شر نے اس کی ہستی کو اپنے لیے فال بد جانا اور بغض و حسد کے شعلوں نے اندر ہی اندر ان کی فطری استعداد کو کھانا شروع کر دیا۔

غرض اسی متضاد فضاء کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی نگرانی میں اس مقدس بچہ کی تربیت اور حفاظت کرتا رہتا کہ اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کے مردہ قلوب کو حیات تازہ بخشے اور ان کی روحانیت کے شجر خشک کو ایک مرتبہ پھر بار آور اور مثمر بنائے۔

﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ (المؤمنون: ۵۰)

کہتے ہیں کہ ہارون مریم علیہا السلام کے خاندان میں ایک عابد و زاہد انسان اور بہت نیک نفس مشہور تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

عن ابن عباس فی قوله ﴿وَآوَيْنَهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ قال المعین الماء جاری و هو النهر الذی قال اللہ تعالیٰ ﴿قَدْ جَعَلْنَا لَكَ رَبًّا حَتَّىٰ تَبْكِيَ سَرِيًّا﴾ و کذا قال الضحاک و قتادة الی ﴿إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ هو بیت المقدس و هذا واللہ اعلم هو الاظهر لانه المذکور فی الایة الاخری و القرآن یفسر بعضه بعضا و هذا اولی ما یفسر به ثم الاحادیث الاصحیحہ ثم الآثار. (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۳۶)

یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت ﴿وَآوَيْنَهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ کی تفسیر میں منقول ہے کہ ”معین“ سے نہر جاری مراد ہے اور یہ اسی نہر کا ذکر ہے جس کو آیت ﴿قَدْ جَعَلْنَا لَكَ رَبًّا حَتَّىٰ تَبْكِيَ سَرِيًّا﴾ میں بیان کیا گیا ہے اور ضحاک اور قتادہ رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے کہ ﴿إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ سے بیت المقدس کی سر زمین مراد ہے اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے اس لیے کہ دوسری آیت میں بیت المقدس (کی نہر) کا ہی ذکر ہے اور قرآن کا بعض حصہ خود ہی دوسرے حصہ کی تفسیر کر دیا کرتا ہے اور تفسیر آیات میں پہلی جگہ اسی طریق تفسیر کو حاصل ہے اس کے بعد صحیح احادیث کے ذریعہ تفسیر کا اور اس کے بعد آثار کے ذریعہ تفسیر کا درجہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)



”اور ہم نے عیسیٰ بن مریم اور اس کی ماں (مریم) کو (اپنی قدرت کا) نشان بنا دیا اور ان دونوں کا ایک بلند مقام (بیت اللحم) پر ٹھکانا بنایا جو سکونت کے قابل اور چشمہ والا ہے۔“

### بشارات ولادت:

قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات میں سے صرف اسی اہم واقعہ کا ذکر کیا ہے باقی بچپن کے دوسرے حالات کو جن کا ذکر قرآن کے مقصد تذکیر و موعظت سے خاص تعلق نہیں رکھتا تھا نظر انداز کر دیا ہے لیکن اسرائیلیات کے مشہور ناقل حضرت وہب بن منبہ سے جو واقعات منقول ہیں اور متی کی انجیل میں بھی جن کا ذکر موجود ہے ان میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو اسی شب میں فارس کے بادشاہ نے آسمان پر ایک نیا ستارہ روشن دیکھا، بادشاہ نے درباری نجومیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ اس ستارہ کا طلوع کسی عظیم الشان ہستی کی پیدائش کی خبر دیتا ہے جو ملک شام میں پیدا ہوئی ہے۔ تب بادشاہ نے خوشبوؤں کے عمدہ تحفے دے کر ایک وفد کو ملک شام روانہ کیا کہ وہ اس بچہ کی ولادت سے متعلق حالات و واقعات معلوم کریں، وفد جب شام پہنچا تو اس نے تفتیش حال شروع کی اور یہودیوں سے کہا کہ ہم کو اس بچہ کی ولادت کا حال سناؤ جو مستقبل قریب میں روحانیت کا بادشاہ ثابت ہوگا۔ یہود نے اہل فارس کی زبان سے یہ کلمات سنے تو اپنے بادشاہ ہیرودیس کو خبر کی، بادشاہ نے وفد کو دربار میں بلا کر استصواب حال کیا اور ان کی زبانی واقعہ کو سن کر بہت گھبرایا اور پھر وفد کو اجازت دی کہ وہ اس بچہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں۔ پارسیوں کا یہ وفد بیت المقدس پہنچا اور جب حضرت یسوع علیہ السلام کو دیکھا تو اپنے رسم و رواج کے مطابق اول ان کو سجدہ تعظیم کیا اور پھر مختلف قسم کی خوشبوئیں ان پر نثار کیں اور چند روز وہیں قیام کیا، دوران قیام میں وفد کے بعض آدمیوں نے خواب میں دیکھا کہ ہرودیس اس بچہ کا دشمن ثابت ہوگا اس لیے تم اب اس کے پاس نہ جاؤ اور بیت اللحم سے سیدھے فارس کو چلے جاؤ۔ صبح کو وفد نے فارس کا ارادہ کرتے وقت حضرت مریم علیہا السلام کو اپنا خواب سناتے ہوئے کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی نیت خراب ہے اور وہ اس مقدس بچہ کا دشمن ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم اس کو ایسی جگہ لے جا کر رکھو جو اس کی دسترس سے باہر ہو، اس مشورہ کے بعد حضرت مریم علیہا السلام یسوع مسیح علیہ السلام کو اپنے بعض عزیزوں کے پاس مصر لے گئیں اور وہاں سے ناصرہ چلی گئیں اور جب عیسیٰ علیہ السلام کی عمر مبارک تیرہ سال کی ہوئی تو ان کو ساتھ لے کر دوبارہ بیت المقدس واپس آئیں۔ یہی روایات یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات زندگی بھی غیر معمولی تھے اور ان سے طرح طرح کے کرامات کا صدور ہوتا رہتا تھا۔ ﴿والله اعلم بحقیقة الحال﴾

### حلیہ مبارک:

بخاری حدیث معراج میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، میری ملاقات حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہوئی تو میں نے ان کو میانہ قد سرخ سپید پایا۔ بدن ایسا صاف شفاف تھا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر آئے ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ کے کاکل کاندھوں تک لٹکے ہوئے تھے اور بعض احادیث میں ہے کہ رنگ کھلتا ہوا گندم گوں تھا۔ بخاری کی روایت اور اس



روایت میں اداء و تعبیر کا فرق ہے حسن میں اگر صباحت کے ساتھ ملاحظت کی آمیزش بھی ہوتی ہے تو اس رنگ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کسی وقت اگر سرخی جھلک آئی تو صباحت نمایاں ہو جاتی ہے اور اگر کسی وقت ملاحظت غالب آگئی تو چہرہ پر حسن و لطافت کے ساتھ کھلتا ہوا گندم گوں رنگ چمکنے لگتا ہے۔

### بعثت و رسالت:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی برائیوں میں مبتلاء تھے اور انفرادی و اجتماعی عیوب و نقائص کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو ان سے بچ رہا ہو، وہ اعتقاد و اعمال دونوں ہی قسم کی گمراہیوں کا مرکز و محور بن گئے تھے حتیٰ کہ اپنی ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل تک پر جری اور دلیر ہو گئے تھے، یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے متعلق معلوم کر چکے ہو کہ اس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اپنی محبوبہ کے اشارہ پر کیسے عبرتناک طریقہ پر قتل کر دیا تھا اور اس نے یہ سفاکانہ اقدام صرف اس لیے کیا کہ وہ حضرت علیہ السلام کی بڑھتی ہوئی روحانی مقبولیت کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی محبوبہ سے ناجائز رشتہ پر ان کی نہی عن المنکر (برائی سے بچانے کی ترغیب) کی تاب نہ لاسکا اور یہ عبرتناک سانحہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی مبارک ہی میں ان کی بعثت سے قبل پیش آچکا تھا۔

دائرة المعارف (انسائیکلو پیڈیا للبتانی) میں یہود سے متعلق جو مقالہ ہے اس کے تاریخی مواد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہود کے عقائد و اعمال کا یہ حال تھا کہ وہ مشرکانہ رسوم و عقائد کو جزء مذہب بنا چکے تھے اور جھوٹ، فریب، بغض و حسد جیسی بد اخلاقیوں کو تو عملاً اخلاق کریمانہ کی حیثیت دے رکھی تھی اور اسی بناء پر بجائے شرم سار ہونے کے وہ ان پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور ان علماء و احبار نے تو دنیا کے لالچ اور حرص میں کتاب اللہ (توراة) تک کو تحریف کیے بغیر نہ چھوڑا اور درہم و دینار پر خدا کی آیات کو فروخت کر ڈالا یعنی عوام سے نذر اور بھینٹ حاصل کرنے کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا اور اس طرح قانون الہی کو مسخ کر ڈالا۔

یہود کی اعتقادی اور عملی زندگی کا مختصر اور مکمل نقشہ ہم کو شعیا علیہ السلام کی زبانی خود توراة نے اس طرح دکھایا ہے:

”خداوند فرماتا ہے: یہ امت (بنی اسرائیل) زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ بے فائدہ

میری پرستش کرتے ہیں کیونکہ میرے حکموں کو پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کی تعلیم دیتے ہیں۔“

بہر حال ان ہی تاریک حالات میں جب حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کا واقعہ بھی ہو گیا اور بنی اسرائیل نے خدا کے حکموں کے خلاف بغاوت و سرکشی کی حد کر دی تب وہ وقت سعید آ پہنچا کہ جس مبارک بچہ نے حضرت مریم علیہ السلام کی آغوش میں پیغام حق سنا کر بنی اسرائیل کو حیرت میں ڈال دیا تھا سن رشد کو پہنچ کر اس نے یہ اعلان کر کے ”کہ وہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہے اور رشد و ہدایت خلق اس کا فرض منصبی“ قوم میں ہلچل پیدا کر دی، وہ شرف رسالت سے مشرف ہو کر اور حق کی آواز بن کر آیا اور اپنی صداقت و حقانیت کے نور سے تمام اسرائیلی دنیا پر چھا گیا، اس مقدس ہستی نے قوم کو لکارا اور احبار کی علمی مجلسوں، راہبوں کے خلوت کدوں بادشاہ اور امراء کے درباروں اور عوام و خواص کی محفلوں میں حتیٰ کہ کوچہ و برزن اور بازاروں میں شب و روز یہ پیغام حق سنایا۔

لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا رسول اور پیغمبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری اصلاح کی خدمت میرے سپرد فرمائی



ہے، میں اس کی جانب سے پیغام ہدایت لے کر آیا ہوں اور تمہارے ہاتھ میں خدا کا جو قانون (توراة) ہے اور جس کو تم نے اپنی جہالت اور کج روی سے پس پشت ڈال دیا ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس کی مزید تکمیل کے لیے خدا کی کتاب (انجیل) لے کر آیا ہوں، یہ کتاب حق و باطل کا فیصلہ کرے گی اور آج جھوٹ اور سچ کے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔ سنو اور سمجھو اور اطاعت کے لیے خدا کے حضور جھک جاؤ کہ یہی دین و دنیا کی فلاح کی راہ ہے۔

اب ان حقائق اور ان کے عواقب و نتائج کو قرآن کی زبانی سنئے اور ”احقاق حق و ابطال باطل“ کے لطف سے بہرہ مند ہو کر عبرت و موعظت حاصل کیجئے، کیونکہ ”تذکیر بایام اللہ“ سے قرآن کا مقصد عظیم یہی بصیرت عبرت ہے:

﴿ وَ لَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَ قَفَيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ ۗ وَ آتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَ اَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ اَفَكَلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى اَنْفُسُكُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ ۗ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ ۗ وَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ ۗ ۝۸۷ وَ قَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۗ ۝۸۸ بَلْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ۝۸۹ ﴾

(البقرہ: ۸۷-۸۸)

”اور بیشک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (توراة) عطاء کی اور اس کے بعد ہم (تم میں) پیغمبر بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کو واضح معجزے دے کر بھیجا اور ہم نے اس کو روح پاک (جبریل) کے ذریعہ قوت و تائید عطاء کی، کیا جب تمہارے پاس (خدا کا) پیغمبر ایسے احکام لے کر آیا جن پر عمل کرنے کو تمہارا دل نہیں چاہتا تو تم نے غرور و شیوہ (نہیں) بنا لیا؟ پس (پیغمبروں کی) ایک جماعت کو جھٹلاتے ہو تو ایک جماعت کو قتل کر دیتے ہو، اور کہتے ہو کہ ہمارے دل (قبول حق کے لیے) غلاف میں ہیں (یہ نہیں) بلکہ ان کے کفر کرنے پر خدا نے ان کو ملعون کر دیا ہے پس بہت تھوڑے سے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں۔“

﴿ وَ اِذْ كَفَفَتْ بَنِي اِسْرَائِيْلَ عَنكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۱۰ ﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

”اور (اے عیسیٰ) جب ہم نے بنی اسرائیل (کی گرفت و ارادہ قتل) کو تجھ سے باز رکھا اس وقت جبکہ تو ان کے پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے منکروں نے، یہ کچھ نہیں ہے مگر کھلا جادو ہے۔“

﴿ وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْ مِنَ التَّوْرَةِ وَ لِاحِلًّا لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۗ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اطِيعُوْنَ ۝۱۱۱ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۗ ۝۱۱۲ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۱۱۳ فَلَمَّا اَحْسَسَ عِيسَى مِنْهُمْ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ ۗ ۝۱۱۴ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۗ ۝۱۱۵ ﴾

(آل عمران: ۵۰-۵۲)

”اور میں تصدیق کرنے والا ہوں توراة کی جو میرے سامنے ہے اور (اس لیے آیا ہوں) تاکہ تمہارے لیے بعض وہ



چیزیں حلال کر دوں جو (تمہاری کج روی کی وجہ سے) تم پر حرام کر دی گئی تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی لے کر آیا ہوں پس اللہ کا خوف کرو اور میری پیروی کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے، پس اسی کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔ پس جبکہ عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کفر محسوس کیا تو فرمایا اللہ کے لیے کون میرا مددگار ہے تو شاگردوں نے جواب دیا ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار۔“

﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ﴾ (الحديد: ۲۷)

”پھر ان کے بعد (نوح و ابراہیم علیہما السلام کے بعد) ہم نے اپنے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کو رسول بنا کر بھیجا اور اس کو کتاب (انجیل) عطاء کی۔“

﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ يُعِيسَىٰ ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۗ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنجِيلَ﴾

(سورہ المائدہ: ۱۱۰)

”وہ وقت یاد کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا ”اے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام! میری اس نعمت کو یاد کر جو میری جانب سے تجھ پر اور تیری والدہ پر نازل ہوئی جبکہ میں نے روح القدس (جبرئیل) کے ذریعہ تیری تائید کی کہ تو کلام کرتا تھا آغوشِ مادر میں اور بڑھاپے میں اور جبکہ میں نے تجھ کو سکھائی کتاب، حکمت، توراہ اور انجیل۔“

﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَىٰ ابْنُ مَرْيَمَ يَلْبَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيِّ مِنَ التَّوْرَةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ (الصف: ۶)

”اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے کہا: اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراہ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت سنانے والا ہوں ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے۔“ (صلی اللہ علیہ وسلم)

## آیات بینات:

قصص القرآن جلد اول معجزات کی بحث میں گزر چکا ہے کہ حق و صداقت کے تسلیم و انقیاد میں انسانی فطرت ہمیشہ سے دو طریقوں سے مانوس رہی ہے ایک یہ کہ مدعی حق کی حقانیت و صداقت، دلائل کی قوت اور براہین کی روشنی کے ذریعہ ثابت اور واضح ہو جائے اور دوسرا طریقہ یہ کہ دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ منجانب اللہ اس کی صداقت کی تائید میں عام قانون قدرت سے جدا بغیر اسباب و وسائل اور تحصیل علم و فن کے اس کے ہاتھ پر امور عجیبہ کا مظاہرہ اس طرح ہو کہ عوام و خواص اس کے مقابلہ سے عاجز و در ماندہ ہو جائیں اور ان کے لیے اسباب و وسائل کے بغیر ان امور کی ایجاد ناممکن ہو، پہلے طریق کے ساتھ یہ دوسرا طریق انسان کے عقل و فکر اور اس کی نفسیاتی کیفیات میں ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ ان کا وجدان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ داعی حق (نبی و پیغمبر) کا



یہ عمل دراصل خود اس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ خدا کی قوت کام کر رہی ہے اور بلاشبہ یہ اس کے صادق ہونے کی مزید دلیل ہے۔ چنانچہ قرآن عزیز میں آیت ﴿وَمَا دَمِيَّتْ إِذْ دَمِيَّتْ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَفِيٌّ﴾ میں اسی حقیقت کا اظہار مقصود ہے مگر ان ہر دو طریقوں میں سے ان اصحاب علم و دانش پر جو قوت فہم و ادراک میں بلند مقام رکھتے ہیں پہلا طریقہ زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے اور وہ دوسرے طریقہ کو پہلے طریقہ کی تائید و تقویت کی حیثیت سے قبول کرتے اور داعی حق (نبی و پیغمبر) کے دعوائے نبوت و رسالت کی صداقت کا مزید عملی ثبوت یقین کر کے اس پر ایمان لے آتے ہیں اور ان حضرات ارباب عقل و فکر کے برعکس ارباب قوت و اقتدار اور ان کی ذہنیت سے متاثر عام انسانی قلوب دوسرے طریقہ تصدیق سے زیادہ متاثر ہوتے اور نبی و پیغمبر کے معجزانہ افعال کو کائنات کی طاقت و قوت کے دائرہ سے بالاتر ہستی کا ارادہ و قوت فعل یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ان امور کو ”خدائی نشان“ باور کر کے دعوت حق و صداقت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

قرآن عزیز نے اکثر و بیشتر مقامات پر پہلے طریق دلیل کو ”حجۃ اللہ“ ”برہان“ اور ”حکمتہ“ سے تعبیر کیا ہے۔ سورہ انعام میں خدا کی ہستی اس کی وحدانیت، معاد و آخرت اور دین کے بنیادی عقائد کو دلائل، نظائر اور شواہد کے ذریعہ سمجھانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

﴿قُلْ فِیْهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (الانعام: ۱۴۹)

”اے محمد ﷺ کہہ دیجئے، اللہ کے لیے ہی ہے حجت کامل (یعنی مکمل اور روشن دلیل)“ اور اس سورہ میں دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے:

﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ﴾ (الانعام: ۸۳)

”اور یہ ہماری ”دلیل“ ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطاء کی۔“ اور سورہ نساء میں ہے:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء: ۱۶۵)

”ہم نے بھیجے (پیغمبر خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں کی جانب سے خدا پر پیغمبر بھیجنے کے بعد کوئی حجت (دلیل) باقی نہ رہے) کہ ہمارے پاس دلائل کے ذریعہ راہ مستقیم بتانے کوئی نہ آیا تھا اس لیے ہم دین حق کی معرفت سے محروم رہے۔“

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ (النساء: ۱۷۴)

”اے لوگو! بیشک تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے برہان (قرآن) آ گیا۔“

اور اے پیغمبر (بدر کے غزوہ میں) جب تو نے (دشمنوں پر) مٹھی بھر خاک پھینکی تھی تو تو نے وہ مشت خاک نہیں پھینکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی مفصل بحث جلد اول میں گزر چکی ہے۔



اور سورہ یوسف میں ہے:

﴿لَوْلَا أَنْ دَابَّرَهُانَ رَبِّهِ<sup>ط</sup>﴾ (یوسف: ۲۴)

”اگر نہ ہوتی یہ بات کہ دیکھ لی تھی اس (یوسف علیہ السلام) نے اپنے پروردگار کی دلیل۔“

اور سورہ نحل میں ہے:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ<sup>ط</sup>﴾ (النحل: ۱۲۵)

”اپنے پروردگار کے راستہ کی جانب دعوت و حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور تبادلہ خیالات کروان (مخالفین) کے ساتھ

اچھے طریق گفتگو سے۔“

اور سورہ نساء ہے:

﴿وَ أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (النساء: ۱۱۳)

”اور اللہ تعالیٰ نے اتارا تجھ پر کتاب کو اور حکمت کو۔“

اسی طرح ”حکمت“ کا یہ ذکر سورہ بقرہ آل عمران، مائدہ، لقمان، ص، زخرف، احزاب اور قمر میں بہ کثرت موجود ہے اور

دوسرے طریق دلیل کو اکثر ”آیۃ اللہ“ اور آیات اللہ اور بعض مقامات پر ”آیات بینات“ اور ”بینات“ کہا گیا ہے۔

ناقہ صالح علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:

﴿هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ﴾ (الاعراف: ۷۳)

”یہ اونٹنی تمہارے لیے (خدا کی جانب سے) ایک ”نشان“ ہے۔“

اور حضرت مسیح اور ان کی والدہ مریم علیہما السلام کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ﴾ (الانبیاء: ۹۱)

”اور ہم نے کر دیا مریم اور اس کے لڑکے عیسیٰ علیہ السلام کو جہان والوں کے لیے ”نشان“ (معجزہ)“

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ارشاد باری ہے:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۱)

”اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو نشان (معجزات) عطا کیے۔“

اور حضرت مسیح علیہ السلام کو جو معجزات دیے گئے تھے ان کے متعلق ارشاد ہے:

”اور دیے ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو معجزات۔ اس وقت جبکہ تو ان کے پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل

میں سے منکروں نے یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔“



ہم نے اس مقام پر اکثر و بیشتر کا لفظ قصداً اختیار کیا ہے کیونکہ قرآن عزیز کے اسلوب بیان سے واقف اس سے بے خبر نہیں ہے کہ اس نے ان الفاظ کے استعمال میں وسعت تعبیر سے کام لیا ہے یعنی جبکہ ”معجزہ“ بھی ایک خاص قسم کا ”برہان“ ہے اور قرآن اور آیات قرآن جس طرح سرتاسر ”علم و برہان“ ہیں اسی طرح ”معجزہ“ بھی ہیں، اس لیے معجزہ پر برہان کا اطلاق اور کتاب اللہ کے جملوں پر آیت اور آیات اللہ کا اطلاق مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دو معجزوں عصاء اور ید بیضاء کے متعلق سورہ قصص میں ہے:

﴿فَذَانِكَ بُرْهَانِنِ مِنْ رَبِّكَ﴾ (القصص: ۳۲)

”پس تیرے رب کی جانب سے یہ دو دلیلیں ہیں۔“

اور کتاب اللہ اور اس کے جملوں پر آیت اور آیات کے اطلاقات سے تو قرآن کی کوئی طویل سورہ ہی خالی ہوگی، تمام قرآن میں جگہ جگہ اس کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے کہ اس کی فہرست مستقل موضوع بن سکتا ہے۔ اسی طرح ”آیات بینات“ کا اگرچہ بکثرت اطلاق کتاب اللہ (قرآن، توراہ، زبور، انجیل) اور ان کی آیات پر ہوا ہے مگر مسطورہ بالا مقامات کی طرح بعض جگہ اس کو ”معجزات“ کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

### لائق توجہ بات اور حقیقت معجزات:

نبی اور رسول کی بعثت کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی فلاح و خیر کی رہنمائی ہے اور وہ منجانب اللہ وحی کی روشنی میں اس فرض منصبی کو انجام دیتا اور علم و برہان اور حجۃ حق کے ذریعہ راہ صداقت دکھاتا ہے، وہ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فطرت اور ماوراء فطرت مامور میں تصرف و تغیر بھی اس کا کار منصبی ہے بلکہ وہ بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ میں خدا کی جانب سے بشیر و نذیر اور داعی الی اللہ بن کر آیا ہوں، میں انسان ہوں اور خدا کا اپنی، اس سے زائد اور کچھ نہیں ہوں تو پھر اس کے دعوائے صداقت کے امتحان اور پرکھ کے لیے، اس کی تعلیم، اس کی تربیت اور اس کی شخصیت کا زیر بحث آنا یقیناً معقول لیکن اس سے ماوراء فطرت اور خارق عادت عجائبات و غرائب کا مطالبہ خلاف عقل اور بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ کسی طبیب حاذق کے دعوائے صداقت طب پر اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ طلسمی کھٹکے کی ایک عمدہ الماری یا لکڑی کا ایک عجیب قسم کا کھلونا بنا کر دکھائے، طبیب نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ ماہر لوہار یا بڑھئی ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو امراض جسمانی کے علاج کا ہے، اسی طرح پیغمبر خدا کا یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی طرح کائنات پر ہمہ قسم کے تصرف و تغیر کا مالک و قادر ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ تمام امراض روحانی کے لیے طبیب کامل اور حاذق و ماہر ہے۔

پس دعویٰ نبوت اور معجزات (خارق عادات امور) کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اور کیا اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ”معجزہ“

لوازم نبوت میں سے نہیں ہے؟

بلاشبہ یہ سوال بہت زیادہ قابل توجہ ہے اور اس لیے علم کلام میں اس مسئلہ کو کافی اہمیت دی گئی ہے لیکن ہم نے ”آیات بینات“ عنوان کے ماتحت ابتداء کلام میں دعوائے نبوت کی صداقت سے متعلق دلائل کی جو تقسیم انسانی طبائع اور ان کے فطری رجحانات



کے پیش نظر کی ہے وہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور جو ہر عقل کے تفاوت درجات نے بلاشبہ انسانوں کی قوت فکر یہ کو جدا جدا دو طریقوں کی جانب مائل کر دیا ہے، ان حالات میں جب ایک نبی اور رسول یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ایک ایسے منصب پر مامور ہے جو ریاضات و مجاہدات اور نیک عملی کی قوت سے نہیں بلکہ محض خدا کی موہبت اور عطاء سے حاصل ہوتا ہے اور یہ "منصب نبوت و رسالت" ہے اور اس کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور تعلیم حق و صداقت ہے تو بعض انسانی دماغ اور ان کا جو ہر عقل اس جانب متوجہ ہو جاتا ہے کہ اگر اس ہستی کا یہ دعویٰ صحت پر مبنی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ اس درجہ قربت حاصل ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے ناممکن ہے پس جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی صدائے اصلاح اور اس کی تعلیم ہمارے قدیم رسم و رواج یا مذہب و دھرم کے ان عقائد و اعمال کے خلاف ہے جس کو ہم حق سمجھتے آئے ہیں تو ان متضاد اور متخالف تعلیمات کی صداقت و بطلان کے امتحان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ ہستی کوئی اور ماوراء فطرت یا خارق عادت امر کر دکھائے تو ہمارے لیے یہ سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا کہ بغیر اسباب و وسائل کے اس ہستی کے ہاتھ ایسے امر کا صدور یقیناً اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ خاص قرب حاصل ہے، تب ہی تو خدائے برحق نے یہ "نشان" دکھا کر اس کی صداقت پر مہر لگا دی، نیز وہ صاحب قوت و اقتدار انسان جن کے غور و فکر کی قوت ایسے سانچے میں ڈھل گئی ہے کہ ان پر کوئی امر حق اس وقت تک موثر ہی نہیں ہوتا جب تک کہ ان کی متکبرانہ طاقت کو غیبی ٹھوک سے بیدار نہ کیا جائے، وہ بھی اس کے منتظر رہتے ہیں کہ مدعی نبوت و رسالت اپنی صداقت کو دلیل و برہان کے ساتھ ساتھ ایک ایسے "کرشمہ" کے ذریعہ ناقابل انکار بنا دے کہ جس کا صدور دوسرے انسانوں سے یا تو ممکن ہی نہ ہو اور یا بغیر اسباب و وسائل کے استعمال کیے وجود پذیر نہ ہو سکتا ہوتا کہ یہ باور کیا جاسکے کہ بلاشبہ اس ہستی کی تعلیم و تبلیغ کو خدائے برتر کی تائید حاصل ہے۔ اسی لیے علماء کلام نے دعوائے نبوت اور معجزہ کے درمیان تعلق پر بحث کر چتے ہوئے یہ مثال بیان کی ہے کہ ایک شخص جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو بادشاہ وقت نے اپنا نائب مقرر کر کے بھیجا ہے تو اس ملک یا صوبے کے باشندے خواستگار ہوتے ہیں کہ مدعی نیابت اپنے دعویٰ کی صداقت کے لیے کوئی سند اور علامت پیش کرے۔ چنانچہ مدعی نیابت ایک جانب اگر سند دکھاتا ہے تو دوسری جانب ایسی "نشانی" بھی پیش کرتا ہے جس کے متعلق یہ یقین کیا جاسکے کہ بادشاہ کی عطاء کردہ یہ نشانی اس کے عطیہ اور اس منصب کی تصدیق کے علاوہ اور کسی طرح بھی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً بادشاہ کی انگشتری (مہر حکومت) یا ایسا خاص عطیہ جو صرف اس منصب پر فائز ہستی کو عطاء کیا جاتا ہو۔

تو اگرچہ بظاہر دعویٰ نیابت اور انگشتری یا عطیہ خاص کے درمیان کوئی مطابقت نہیں ہے تاہم اس تعلق خاص نے جو شاہی تصدیق سے وابستہ ہے ان دونوں کے درمیان اہم ربط پیدا کر دیا ہے۔

لیکن جبکہ طریق تصدیق، معیار صداقت و حقانیت میں دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقتاً معیاری حیثیت صرف طریق اول (حجتہ و برہان حق) کو ہی حاصل ہے، اس لیے معجزہ کے وقوع و صدور کا معاملہ پہلے طریق کے وجود و صدور سے قطعاً جدا ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک مدعی نبوت و رسالت کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ اپنے دعویٰ حق و صداقت کو حجتہ و برہان کی روشنی اور علم و یقین کی قوت کے ذریعہ ثابت کرے اور اپنی تعلیم و تربیت، اور شخصی حیات کے ہر پہلو میں دعویٰ اور دلیل و برہان کی مطابقت کو واضح کرے اور انسانی جو ہر عقل کے فکر و تدبیر کی رہنمائی کا فرض اس طرح انجام دے کہ ہر قسم کے ظن و وہم اور فاسد و کاسد خیالات کے مقابلہ میں



”یقین محکم“ روز روشن کی طرح نمودار ہو جائے اور اس ادائے فرض کے لیے کسی کی جانب سے نہ مطالبہ شرط ہے اور نہ جستجو لازم بلکہ یہ نبی اور رسول کا براہ راست وہ فرض ہے جس کے لیے خدائے تعالیٰ نے اس کو منتخب اور مامور کیا ہے اور اگر ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو گویا اپنے فرض کی پوری عمارت کو اپنے ہاتھ سے برباد کر دیتا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۗ﴾ (المائدہ: ۶۷)

”اے پیغمبر! جو تم پر نازل کیا گیا ہے تم اس کو پورا پورا پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو منصب رسالت کو ادا نہ کیا۔“

اس کے برعکس معجزہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ نبی اور رسول اس کو ضرور ہی دکھائے یا مخالفین کے ہر مطالبہ پر اس کی تعمیل کرے بلکہ ”معجزہ“ حجت و برہان کی وہ قسم ہے جو اکثر معاندین کے مطالبہ پر وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس سے اس کا صدور صرف عالم الغیب کی اپنی ”حکمت و مصلحت“ پر ہی موقوف رہتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ معجزہ کے بارہ میں کسی کا سوال جو یائے حق کی حیثیت میں ہے اور کس کا تعنت اور انکار مزید کے لیے کن سعید روحوں پر اس کا یہ اثر پڑے گا کہ وہ کہہ اٹھیں گی ﴿أَمَّا بِرَبِّ هُرُونَ وَمُوسَىٰ﴾ اور کن بد بختوں پر اس طرح اثر انداز ہوگا کہ یوں گویا ہوں گے: ﴿إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾

پس قرآن عزیز نے اگر ایک جانب بہ نصوص قطعہ یہ ظاہر کیا ہے کہ اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو حجت و برہان کے ساتھ مزید تائید و تقویت کے لیے معجزات عطا کیے ہیں تو دوسری جانب یہ بھی صاف صاف نبی کی زبانی کہلا دیا ہے کہ میں خدا کی جانب سے فقط ”نذیر مبین“ بشیر و نذیر“ اور ”رسول و نبی“ ہوں۔ میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ میں کائنات خداوندی کے تصرفات و تغیرات اور ماوراء فطرت امور پر قادر ہوں، ہاں خدائے برتر اگر چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس نے ایسا کیا بھی ہے مگر وہ جب ہی کرتا ہے کہ اس کی حکمت و مصلحت اس کی متقاضی ہو۔

چنانچہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو منطق الطیر اور تسخیر ہوا، طیور و جن کے نشان دیے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ”تسع آیات بینات“ نو کھلے نشان“ عطاء کیے گئے جن میں سے دو نشان اعضاء اور ید بیضاء کو قرآن نے ”بڑے نشان“ کہا ہے اور بحر قلزم میں غرق فرعون اور نجات قوم موسیٰ علیہ السلام کا عجیب و غریب واقعہ مستقل ایک ”نشان عظیم“ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دہکتی آگ کے شعلوں کو ”برد و سلام“ بنا دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے لیے ”ناقہ صالح“ کو نشان بنایا کہ جوں ہی اس کو کسی نے ستایا اسی وقت خدا کا عذاب قوم کو تباہ و برباد کر جائے گا۔ چنانچہ ٹھیک اسی طرح پیش آیا۔ حضرت ہود اور حضرت نوح علیہما السلام سے ان کی قوموں نے عذاب طلب کیا اور کافی سمجھانے کے بعد بھی جب ان کا اصرار قائم رہا تو ان پیغمبروں نے عذاب الہی کی جو وعیدیں سنائی تھیں وہ ٹھیک اپنے اپنے وقت پر پوری ہوئیں حالانکہ ان سب مواقع میں بظاہر اسباب نزول عذاب اور وقوع حوادث ہلاکت کے کوئی سامان نہیں تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو مختلف نشان (معجزات) دیے گئے ان کو بھی قرآن نے صاف صاف بیان کر دیا ہے جو ابھی زیر بحث آئیں گے اور آخر میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی معجزہ قرآن عطا کیا جس کی تحدی (مقابلہ کے چیلنج) کا کوئی جواب نہ دے سکا، نیز بدر کے معرکہ میں فرشتوں کا نزول اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کی نصرت و یاری اور ﴿وَمَا دَمِيَّتْ اِذْ دَمِيَّتْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَٰحِمٌ﴾ کے اعلان سے اس مشہور معجزہ کا اظہار فرمایا جس نے بدر کے میدان میں مٹھی بھر خاک کو ایک ہزار دشمنوں کی آنکھوں کا آزار بنا دیا اور



”شق القمر“ کا معجزہ عطا فرمایا۔ معاملہ زیر بحث کا یہ ایک پہلو یا ایک رخ ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب خاتم الانبیاء محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ارشاد و تبلیغ حق کے روشن دلائل و براہین کا کوئی جواب مخالفین سے نہ بن پڑا تو ازراہ تعنت و سرکشی عجائبات اور خارق عادات امور کا مطالبہ کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ ان کا مقصد طلب حق اور جستجوئے صداقت نہیں ہے بلکہ یہ جو کہہ رہے ہیں سرکشی، ضد اور تعصب کی راہ سے کہتے ہیں اس لیے ان کا جواب یہ نہیں ہے کہ خدا کے نشانات کو بھان متی کا تماشا یا مداری کا کھیل بنا دیا جائے بلکہ اصل جواب یہ ہے کہ ان سے کہہ دو میں ان تصرفات کا مدعی نہیں ہوں میں تو نیک و بد امور میں تمیز پیدا کرنے، خدا کے بندوں کا خدا کے ساتھ رشتہ ملانے اور نیک و بد کاموں کے انجام کو واضح کرنے کے لیے ”نذیر مبین“ اور ”نبی رسول“ ہوں:

﴿وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا ۙ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ تَحْتِهَا عَيْنٌ فَتَفْجُرَ الْأَنْهَارَ خِلَافًا تَفْجِيرًا ۙ أَوْ تَسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمَتْ عَلَيْنَا كِسْفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۙ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ ۗ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزَّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرُؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ۖ﴾ (بنی اسرائیل: ۹۰-۹۳)

”اور انہوں نے (مشرکوں نے) کہا: ہم اس وقت تک ہرگز تیری بات نہیں مانیں گے کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ ابال دے یا تیرے واسطے کھجوروں کا اور انگوروں کا باغ ہو اور تو اس کے درمیان زمین پھاڑ کر نہریں بہا دے یا تو جیسا گمان کرتا ہے ہمارے اوپر آسمان گرا دے یا تو اللہ اور اس کے فرشتوں کو (ہمارے) مقابل لائے یا تیرے واسطے ایک سونے کا (طلائی) مکان ہو اور یا تو چڑھ جائے آسمان پر اور ہم تیرے چڑھ جانے کو بھی ہرگز اس وقت تک نہیں تسلیم کریں گے تا وقتیکہ تو ہمارے پاس (آسمان سے) کتاب لے کر نہ آئے کہ اس کو ہم پڑھیں (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے پاکی ہے میرے پروردگار کے لیے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ہوں، خدا کا پیغامبر ہوں۔“

﴿وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ أَبَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ۙ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكَّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ۗ﴾ (الحجر: ۱۴-۱۵)

”اور اگر کھول دیں ہم ان پر آسمان کا ایک دروازہ اور یہ اس پر چڑھنے لگیں تب بھی ضرور یہی کہیں گے کہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مست کر دی گئی ہیں ہماری آنکھیں بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔“

﴿وَإِنْ يَرَوْا كَلًّاٰ آيَةً لَا يُؤْمِنُوا بِهَا ۗ﴾ (الانعام: ۲۵)

”اور اگر یہ ہر قسم کے نشان بھی دیکھ لیں تب بھی (ضد اور تعصب کی بناء پر) ایمان لانے والے نہیں ہیں۔“  
اب ان تفصیلات سے یہ بھی بخوبی روشن ہو گیا کہ علم کلام میں جن علماء کی رائے یہ ظاہر کی گئی ہے کہ ”معجزہ دلیل نبوت نہیں



ہے ان کی مراد کیا ہے؟ وہ دراصل دعویٰ نبوت کی صداقت سے متعلق مسطورہ بالا ہر دو دلائل کے فرق کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو ہستی نبوت و رسالت کا دعویٰ کرتی ہے اس پر لازم اور ضروری ہے کہ اپنے دعویٰ کی تصدیق کے لیے ”حجت و برہان“ پیش کرے اور دلائل کی روشنی میں اپنی حقانیت کو ثابت کرے اور وحی الہی کی جو تعلیم وہ کائنات کی ہدایت کے لیے پیش کرتی ہے برہان و حجت کے ذریعہ اس کی حقیقت کو واضح کرے تو گویا اس طرح نبوت و رسالت اور حجت و برہان صداقت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے اس کے برعکس نبوت کے ساتھ معجزات اور آیات اللہ (نشانات خداوندی) کا تعلق اس طرح کا نہیں ہے بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مخالفین کے مطالبہ پر یا بہ تقاضائے حکمت الہی نبی اور رسول از خود اپنی صداقت کی تائید میں کوئی نشان (معجزہ) دکھائے تو بلاشبہ وہ اس ہستی کے نبی و رسول ہونے کی ناقابل انکار ”دلیل“ ہے اور اس کا انکار درحقیقت اس رسول کی صداقت کا انکار ہے کیونکہ اس صورت میں یہ انکار حقیقت اور واقعہ کا انکار ہے اور حقیقت کا انکار ”حق“ نہیں بلکہ ”باطل“ ہوتا ہے جو نبوت و رسالت کے مقصد کے ساتھ کسی طرح بھی جمع نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر حکمت الہی کا تقاضا یہ ہو کہ تعلیم حق کی روشنی، وحی الہی پر دلائل و براہین کا یقین، اور اصول دین پر حجت و برہان کا قیام ہوتے ہوئے اب مخالفین کے بار بار طلب معجزات و عجائبات کی پروا نہ کی جائے اور نبی و رسول، وحی الہی کی روشنی میں حجت و برہان کے ذریعہ تعلیم حق جاری رکھے اور مخالفین کے جواب میں صاف صاف کہہ دے کہ میں نے ماوراء فطرت پر قدرت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا تو اس صورت میں بندوں پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور کسی امت اور قوم کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ تعلیم حق کے دلائل و براہین اور روشن حجت و بینہ سے اس لیے منہ پھیرے اور اس لیے اس کا انکار کر دے کہ اس کی طلب پر اچھٹھوں اور عجائبات کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا گیا۔

پس قرآن عزیز نے جن انبیاء و رسل کے واقعات و حالات تذکیر ”بایام اللہ“ کے سلسلہ میں بیان کرتے ہوئے نصوص قطعہ کے ذریعہ صراحت و وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہم نے ان کی صداقت کے نشان کے طور پر نشانات (معجزات) ان کو عطا اور مخالفین کے سامنے ان کا مظاہرہ کیا تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بے چون و چرا ان کو قبول اور ان کی تصدیق کریں اور عجائب پرستی کے الزام سے خائف ہو کر عالم غیب کی اس تصدیق سے گریز نہ کریں اور نہ رکیک و باطل تاویلات کے پردہ میں ان کے انکار پر آمادہ ہو جائیں کیونکہ ایسا کرنا اس آیت کا مصداق بن جانا ہے۔

﴿ وَيَقُولُونَ نُوْمُنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا ۝۱۵۰ ﴾ (النساء: ۱۵۰)

”اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کتاب الہی کے بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ایمان و کفر کے درمیان میں ایک راہ بنا لیں۔“

اور ظاہر ہے کہ یہ مومن و مسلم کی نہیں بلکہ کافر و منکر کی راہ ہے، مومن و مسلم کی راہ تو سیدھی راہ یہ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۗ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ

مُبِينٌ ۝۲۰۸ ﴾ (البقرہ: ۲۰۸)

”اے پیروان دعوت ایمانی! اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ (اور اعتقاد و عمل کی ساری باتوں میں مسلم بن جاؤ۔ مسلم



ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ زبان سے اسلام کا اقرار کر لو) اور دیکھو شیطانی وسوسوں کی پیروی نہ کرو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔“

بہر حال ”سنت اللہ“ یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم کی ہدایت یا تمام کائنات انسانی کی فوز و فلاح کے لیے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو اس کو منجانب اللہ محکم دلائل و براہین اور آیات اللہ (معجزات) دونوں سے نوازا جاتا ہے، وہ ایک جانب وحی الہی کے ذریعہ کائنات کے معاش معاد سے متعلق اوامر و نواہی اور بہترین دستور و نظام پیش کرتا ہے تو دوسری جانب حسب مصلحت خداوندی ”خدائی نشانات“ کا مظاہرہ کر کے اپنی صداقت اور منجانب اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے نیز ہر ایک پیغمبر کو اسی قسم کے معجزات و نشانات عطا کیے جاتے ہیں جو اس زمانہ کی علمی ترقیوں یا قومی و ملکی خصوصیتوں کے مناسب حال ہونے کے باوجود معارضہ کرنے والوں کو عاجز و درماندہ کر دیں اور کوئی ان کے مقابلہ میں تاب مقاومت نہ لاسکے اور اگر تعصب اور ضد درمیان میں حائل نہ ہوں تو اپنی اکتسابی ترقیوں اور خصوصیتوں کے حقائق سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اس اعتراف پر مجبور ہو جائیں کہ یہ جو کچھ سامنے ہے انسانوں کی قدرت سے بالاتر، ان کی دسترس سے باہر، اور صرف خدائے واحد ہی کی جانب سے ہے۔

مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں علم نجوم (Astronomy) اور علم کیمیا (Chemistry) کا بہت زور تھا اور ساتھ ہی ان کی قوم کو اکب و نجوم کے اثرات کو ان کے ذاتی اثرات سمجھتی اور ان کو موثر حقیقی یقین کر کے خدائے واحد کی جگہ ان کی پرستش کرتی تھی اور ان کا سب سے بڑا دیوتا شمس (سورج) تھا کیونکہ وہ روشنی اور حرارت دونوں کا حامل تھا اور یہی دونوں چیزیں ان کی نگاہ میں کائنات کی بقاء و فلاح کے لیے اصل الاصول تھیں اور اسی بناء پر کرۂ ارضی میں ”آگ“ کو اس کا مظہر مان کر اس کی بھی پرستش کی جاتی تھی، علاوہ ازیں ان کو اشیاء کے خواص و اثرات اور ان کے عمل پر بھی کافی عبور تھا گویا آج کی علمی تحقیقات کے لحاظ سے وہ کیمیاوی طریق ہائے عمل سے بھی بڑی حد تک واقف تھے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کی قوم کی ہدایت اور خدا پرستی کی تعلیم و تلقین کے لیے ایک جانب ایسے روشن حجۃ و برہان عطا فرمائے جن کے ذریعہ وہ قوم کے غلط عقائد کے ابطال اور احقاق حق کی خدمت انجام دیں اور مظاہر پرستی کی وجہ سے حقیقت کے چہرہ پر تاریکی کا جو پردہ پڑ گیا تھا اس کو چاک کر کے رخ روشن کو نمایاں کر سکیں۔

﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۖ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ نَّشَأٍ ۖ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۸۳﴾﴾

(الانعام: ۸۳)

اور دوسری جانب جب کو اکب پرست اور بت پرست بادشاہ سے لے کر عام افراد قوم نے ان کے دلائل و برہان سے لاجواب ہو کر اپنی مادی طاقت کے گھمنڈ پر دہکتی آگ میں جھونک دیا تو اسی خالق اکبر نے جس کی دعوت و ارشاد کی خدمت حضرت ابراہیم علیہ السلام انجام دے رہے تھے ﴿يُنَادُ كُوْنِي بَرْدًا وَسَلَامًا﴾ کہہ کر اپنی قدرت کا وہ عظیم الشان نشان (معجزہ) عطا کیا جس نے باطل کے پر ہیبت ایوان میں زلزلہ پیدا کر دیا اور تمام قوم اس خدائی مظاہرہ سے عاجز، حیران و پریشان اور ذلیل و خاسر ہو کر رہ گئی:

﴿وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ﴿۷۰﴾﴾ (الانبیاء: ۷۰)



اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر (Magic) مصری علوم و فنون میں بہت زیادہ نمایاں اور امتیازی شان رکھتا تھا اور مصریوں کو فن سحر میں کمال حاصل تھا اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قانون ہدایت (توراة) کے ساتھ ساتھ ”ید بیضاء“ اور ”عصا“ جیسے معجزات دیے گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساحرین مصر کے مقابلہ میں جب ان کا مظاہرہ کیا تو سحر کے تمام ارباب کمال اس کو دیکھ کر یک زبان ہو کر پکار اٹھے کہ بلاشبہ یہ سحر نہیں یہ تو اس سے جدا اور انسانی طاقت سے بالاتر مظاہرہ ہے جو خدائے برحق نے اپنے سچے پیغمبروں کی تائید کے لیے ان کے ہاتھ پر کرایا ہے کیونکہ ہم سحر کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور یہ کہہ کر انہوں نے فرعون اور قوم فرعون کے سامنے بے خوفی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ وہ آج سے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے خدائے واحد ہی کے پرستار ہیں:

﴿وَأَلْقَى السَّحْرَةَ سِجْدِينَ ۝ قَالَ آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۝﴾ (الاعراف: ۲۰-۲۲)

مگر فرعون اور امراء دربار اپنی بدنہی سے یہی کہتے رہے:

﴿قَالَ لِمَلَا حَوْلَهُ إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ عَلِيمٌ ۝﴾ (الشعراء: ۳۴) ... ﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا

بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ۝﴾ (قصص: ۳۶)

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں علم طب (Medical Science) اور علم الطبیعیات (Physics) کا بہت چرچا تھا اور یونان کے اطباء و حکماء (فلاسفہ) کی طب و حکمت گرد و پیش کے ممالک و امصار کے ارباب کمال پر بہت زیادہ اثر انداز تھی اور ملکوں میں صدیوں سے بڑے طبیب اور فلسفی اپنی حکمت و دانش اور کمالات طب کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر خدائے واحد کی توحید اور دین حق کی تعلیم سے خواص و عوام یکسر محروم تھے اور خود بنی اسرائیل بھی جو کہ نبیوں کی نسل میں ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے رہتے تھے جن گمراہیوں میں مبتلاء تھے سطور گزشتہ میں ان پر روشنی پڑ چکی ہے۔

پس ان حالات میں ”سنت اللہ“ نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رشد و ہدایت کے لیے منتخب کیا تو ایک جانب ان کو حجت و برہان (انجیل) اور حکمت سے نوازا تو دوسری جانب زمانہ کے مخصوص حالات کے مناسب چند ایسے نشان (معجزات) بھی عطا فرمائے جو اس زمانہ کے ارباب کمال اور ان کے پیرووں پر اس طرح اثر انداز ہوں کہ جو یائے حق کو اس اعتراف میں کوئی جھجک باقی نہ رہے کہ بلاشبہ یہ اعمال اکتسابی علوم سے جدا محض خدائے تعالیٰ کی جانب سے رسول برحق کی تائید میں رونما ہوئے ہیں اور متعصب اور متہرد کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ رہے کہ ان کو ”صریح جادو“ کہہ کر اپنے بغض و حسد کی آگ کو اور مشتعل کرے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان معجزات میں سے جن کا مظاہرہ انہوں نے قوم کے سامنے کیا قرآن عزیز نے ”چار معجزات کا بصراحت ذکر کیا ہے:

① وہ خدا کے حکم سے مردہ کو زندہ۔ ② اور پیدائشی نابینا کو بینا اور جذامی کو چنگا کر دیا کرتے تھے۔

③ وہ مٹی سے پرند بنا کر اس میں پھونک دیتے تھے اور خدا کے حکم سے اس میں روح پڑ جاتی تھی۔

④ وہ یہ بھی بتا دیا کرتے تھے کہ کس نے کیا کھایا اور خرچ کیا اور کیا گھر میں ذخیرہ محفوظ رکھا ہے؟

قوموں میں ایسے مسیحا موجود تھے جن کے علاج و معالجے اور اکتسابی تدابیر سے مایوس مریض شفاء پاتے تھے، ان میں ماہر طبیعات ایسے فلسفی بھی کم نہ تھے جو روح و مادہ کے حقائق اور ارضی و سماوی اشیاء کی ماہیات پر بے نظیر نظریات و تجربات کے مالک



سمجھے جاتے تھے اور حقائق اشیاء میں ان کی باریک بینی اور مہارت ارباب کمال کے لیے باعث صدنازش تھی لیکن جب ان کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام نے اسباب و وسائل اختیار کیے بغیر ان امور کا مظاہرہ کیا تو ان پر بھی ہدایت و ضلالت کی قدرتی تقسیم کے مطابق یہی اثر پڑا کہ جس شخص کے قلب میں حق کی طلب موجزن تھی اس نے اقرار کیا کہ بلاشبہ اس قسم کا مظاہرہ انسانی دسترس سے باہر اور نبی برحق کی تائید و تصدیق کے لیے منجانب اللہ ہے اور جن دلوں میں رعونت، حسد اور بغض و عناد تھا ان کے تعصب نے وہی کہنے پر مجبور کیا جو ان کے پیشرو انبیاء و رسل سے کہتے آئے تھے۔ ﴿إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾

چوتھے معجزے کے بارے میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے مظاہرہ کی وجہ یہ پیش آئی کہ مخالفین جب ان کی دعوت رشد و ہدایت سے نفور ہو کر ان کو جھٹلاتے اور ان کے پیش کردہ آیات بینات (معجزات) کو سحر اور جادو کہتے تو ساتھ ہی ازراہ تمسخریہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر تم خدائے تعالیٰ کے ایسے مقبول بندے ہو تو بتاؤ آج ہم نے کیا کھایا ہے اور کیا بچا رکھا ہے تب عیسیٰ علیہ السلام ان کے تمسخر کو سنجیدگی سے بدل دیتے اور وحی الہی کی نصرت سے ان کے سوال کا جواب دے دیا کرتے تھے۔

مگر قرآن عزیز نے اس معجزہ کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس کو غور کے ساتھ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ”نشان“ کے مظاہرہ کی وجہ مفسرین کی بیان کردہ توجیہ سے زیادہ دقیق اور وسیع معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام پیغام ہدایت و تبلیغ حق کی خدمت انجام دیتے ہوئے اکثر و بیشتر لوگوں کو دنیا میں انہماک، دولت و ثروت کے لالچ، اور عیش پسند زندگی کی رغبت سے باز رکھنے پر مختلف اسالیب بیان کے ذریعہ توجہ دلایا کرتے تھے تو جس طرح بعض سعید روحمیں اس کلمہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی تھیں اس کے برعکس شریک النفس انسان ان کے مواعظ حسنہ سے قلبی نفرت و اعراض کے باوجود امتثال امر کرنے والی ہستیوں سے زیادہ ان کو یہ باور کراتیں کہ ہم تو ہمہ وقت آپ کے اس ارشاد کی تعمیل میں سرگرم رہتے ہیں۔ لہذا قدرت حق نے یہ فیصلہ کیا کہ ان منافقین کی منافقت کی مضرت کو زائل کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسا ”نشان“ عطا کیا جائے کہ اس ذریعہ سے حق و باطل منکشف ہو جائے اور حقوق اللہ اور حقوق انسانی کے اتلاف پر جو ذخیرہ اندوزی کا سامان کیا جا رہا ہے اس کا پردہ چاک کر دیا جائے۔

ان چہارگانہ خدائی نشان (معجزات) کے علاوہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش بھی ایک عظیم الشان ”خدائی نشان“ تھا جس کے متعلق ابھی تفصیلات سن چکے ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ پر جن معجزات کا ظہور ہوا یا ان کی ولادت جس معجزانہ طریق پر ہوئی یہود نے ازراہ حسد ان کا انکار کیا تو کیا لیکن بعض فطرت پرست مدعی اسلام حضرات نے بھی ان کے انکار کے لیے راہ پیدا کرنے کی ناکام سعی فرمائی ہے ان میں سے بعض حضرات وہ ہیں جنہوں نے اس انکار کو ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ فطرت پرست اور منکرین خدا یورپین علماء جدید سے مرعوبیت کی بناء پر یہ روش اختیار کی ہے تاکہ ان کی مذہبیت پر عجائب پرستی کا الزام عائد نہ ہو سکے، ان میں سرسید اور مولوی چراغ علی صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور بعض وہ یہود صفت اشخاص ہیں جو اپنی ذاتی غرض اور ناپاک مقصد کی خاطر ازراہ حسد و بغض حضرت مسیح علیہ السلام کے ان معجزات کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ تاویلات باطل کے پردہ میں ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں ان میں سے متنبی کاذب مرزا قادیانی اور مسٹر محمد علی لاہوری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔



قادیانی اور لاہوری نے تو یہ ظلم کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزہ ﴿اِنِّیْ اَخْلَقْتُ لَکُمْ مِّنَ الطَّیْرِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخْ فِیْهِ فِیْکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ کے متعلق یہ کہہ دیا کہ مسیح کا یہ عمل ایک تالاب کی مٹی کا رہین منت تھا، معجزہ کچھ نہیں تھا اس تالاب کی مٹی کی یہ خاصیت تھی کہ جس کسی پرند کی شکل بنائی جاتی اور منہ سے دم تک سوراخ رکھ دیا جاتا تو ہوا بھر جانے سے اس میں آواز بھی پیدا ہو جاتی تھی اور حرکت بھی، گویا العیاذ باللہ! ان بدبختوں کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب سے منکروں کے مقابلہ میں یہ معجزانہ صداقت نہیں تھی بلکہ مداری یا شعبدہ باز کا تماشہ تھا۔

اسی طرح احياء موتی (مردہ کو زندہ کر دینا) کے معجزہ کا بھی انکار کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن عزیز نے یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ موت کے بعد کسی کو اس دنیا میں قبل از قیامت زندگی نہیں بخشے گا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ اگر پورے قرآن کو از اول تا آخر پڑھ جائے تو کسی ایک آیت میں بھی آپ کو یہ فیصلہ نہیں ملے گا بلکہ اس دعویٰ کے خلاف متعدد مقامات پر اس کا اثبات پائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں موت دینے کے بعد حیات تازہ بخشی ہے مثلاً سورہ بقرہ کی آیات ذبح بقرہ کے واقعہ میں ارشاد ہے:

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۗ كَذٰلِكَ يُحْيِی اللّٰهُ الْمَوْتٰی﴾ (البقرہ: ۷۳)

یا سورہ بقرہ ہی کی اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةً عَامًا ثُمَّ بَعَثَهُ ۗ قَالَ كَمْ لَبِثْتُ ۗ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۗ قَالَ بَلٰ

لَبِثْتُ مِائَةً عَامًا﴾ (البقرہ: ۲۵۹)

یا اسی سورہ میں تیسری جگہ مذکور ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِی الْمَوْتٰی ۗ قَالَ اَوْ لَمْ تُؤْمِنْ ۗ قَالَ بَلٰی وَا لٰكِن لَّیَطْبِیْنَ

قَلْبِی ۗ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ

ادْعُهُنَّ یٰٰتٰیْنِکَ سَعِیًّا﴾ (البقرہ: ۲۶۰)

چنانچہ ان تمام واقعات میں ”احیاء موتی“ کے صاف اور صریح معانی ثابت ہیں اور جن حضرات نے ان مقامات میں احياء موتی سے مجازی یا کنائی معنی لیے ہیں ان کو طرح طرح کی تاویلات کی پناہ لینی پڑی ہے مگر ان کی تاویلات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احياء موتی کی یہ تاویل اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ قرآن کے نزدیک اس کا دنیا میں وقوع ممنوع ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آیات مسطورہ بالا کے سیاق و سباق کے پیش نظر یہی معنی مناسب حال ہیں۔

غرض یہ دعویٰ کہ قرآن ممنوع قرار دیتا ہے کہ دار دنیا میں ”احیاء موتی“ وقوع پذیر ہو صرف مرزا قادیانی اور مسٹر لاہوری کے دماغ کی ایج ہے جو قطعاً باطل اور غیر ثابت ہے اور اس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے، رہا یہ امر کہ خدا کے عام قانون فطرت کے ماتحت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بحث گزر چکی ہے ملاحظہ ہو قصص القرآن ج ۲۔

قصص القرآن جلد اول میں بحث گزر چکی ہے۔



ایسا نہیں پیش آتا رہتا سوا اگر ایسا ہوتا رہتا تو پھر یہ ”معجزہ“ ہرگز نہ کہلاتا اور خدائے برتر کا قانون خاص جو تصدیق انبیاء علیہم السلام کے مقصد سے کبھی کبھی مخالفین کے مقابلہ میں بطور تحدی (چیلنج) کے پیش آتا ہے کوئی خصوصیت نہ رکھتا۔

اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی بن باپ پیدائش کے مسئلہ کا بھی انکار کیا گیا ہے اور قادیانی اور لاہوری نے بھی اس کے خلاف بے دلیل ہرزہ سرائی کی ہے لیکن اس مسئلہ کی موافق و مخالف آراء سے قطع نظر ایک غیر جانبدار منصف جب حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے متعلق تمام آیات قرآنی کا مطالعہ کرے گا تو اس پر یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جائے گی کہ قرآن حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق یہود کی تفریط اور نصاریٰ کی افراط دونوں کے خلاف اپنا وہ فرض منصبی ادا کرنا چاہتا ہے جس کے لیے قرآن کی دعوت حق کا ظہور ہوا ہے یہود اور نصاریٰ اس بارہ میں دو قطعاً مخالف اور متضاد سمتوں میں چلے گئے ہیں یہود کہتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام مفتری اور کاذب اور شعبدہ باز تھے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ وہ خدا، خدا کے بیٹے یا ثالثِ ثلاثہ تھے ان حالات میں قرآن نے ان اوبام و ظنون کے خلاف علم و یقین کی راہ دکھاتے ہوئے دونوں کے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ راہ حق افراط و تفریط کے درمیان ہے اور صراطِ مستقیم کی یہی سب سے بڑی شناخت ہے۔

وہ کہتا ہے واضح رہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام مفتری اور کاذب نہیں تھے بلکہ خدا کے سچے پیغمبر اور راہ حق کے داعی صادق تھے انہوں نے دعوت حق کی تصدیق کے لیے جو بعض عجیب باتیں کر دکھائیں وہ معجزات انبیاء کی فہرست میں شامل ہیں نہ کہ ساحروں اور شعبدہ بازوں کی اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی مگر اس سے یہ کیسے لازم آ سکتا ہے کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہو گئے کیا جو شخص پیدائش کا محتاج ہو اور پیدائش میں بھی ماں کے پیٹ کا محتاج اور جو شخص بشری لوازم کھانے پینے کا محتاج ہو وہ عبد اور بشر کے ماسوا خدا یا معبود ہو سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق الوہیت کا جو عقیدہ قائم کیا تھا اس کا بہت بڑا سہارا یہی واقعہ تھا جیسا کہ وفدِ نجران اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے۔

تو جبکہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کے ان تمام باطل عقائد کی واضح الفاظ میں تردید کر کے جو انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق قائم کر لیے تھے اپنا فریضہ اصلاح انجام دیا یہ کیسے ممکن تھا کہ اگر بن باپ کے پیدائش کا واقعہ باطل اور غیر واقعی تھا اور جو سہارا بن رہا تھا الوہیت مسیح علیہ السلام کا، اس کے متعلق واضح طرز سے قرآن تردید نہ کرتا بلکہ اس کے برعکس وہ جگہ جگہ اس واقعہ کو ٹھیک اس طرح بیان کرتا جاتا جیسا کہ متی کی انجیل میں بیان کیا گیا ہے اس کا فرض تھا کہ سب سے پہلے اسی پر ضرب کاری لگاتا اور صرف اس قدر کہہ کر کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا باپ فلاں شخص تھا اس ساری عمارت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا جس پر الوہیت مسیح علیہ السلام کی بنیاد رکھی گئی ہے مگر اس نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ یہ بات کسی طرح بھی مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی دلیل نہیں بن سکتی، کیوں؟ اس لیے کہ

﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (آل عمران: ۵۹)

پس اگر بن باپ کی پیدائش مسیح علیہ السلام کو درجہ الوہیت دے سکتی ہے تو آدم علیہ السلام کو اس سے زیادہ الوہیت کا حق حاصل

ہے کہ وہ بن ماں باپ کے پیدا ہوئے ہے۔

بہر حال جن تاویل پرستوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی بن باپ پیدائش سے متعلق آیات کے جملوں کو جدا جدا کر کے غلط احتمالات پیدا کیے ہیں وہ اس لیے باطل ہیں کہ جب اس واقعہ سے متعلق آیات کو یکجا کر کے مطالعہ کیا جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی



آیات کے معانی میں بن باپ پیدائش کے معنی کے ماسوا دوسرے کسی بھی احتمال کی گنجائش باقی نہیں رہتی مگر یہ کہ عربی زبان کے الفاظ کے معین مدلولات و اطلاقات میں تحریف معنوی پر بیجا جسارت کی جائے۔

نیز بقول مولانا ابوالکلام جن اصحاب نے بغیر باپ کے پیدائش سے متعلق آیات میں تاویل باطل کی ہے ان کی دلیل کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کا نکاح اگرچہ یوسف سے ہو چکا تھا مگر رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی ایسی صورت میں میاں بیوی کے درمیان مقاربت گو شریعت موسوی کے خلاف نہیں تھی تاہم وقت کے رسم و رواج کے قطعاً خلاف تھی اس لیے حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش لوگوں پر گراں گزری لیکن اول تو اس واقعہ کا ثبوت ہی موجود نہیں سب بے سند بات ہے دوسرے یہودیوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر جو بہتان لگایا تھا "انسائیکلو پیڈیا آف بائبل" میں تصریح ہے کہ اس بہتان کی نسبت ایک شخص پینتھر اٹالی کی جانب کی تھی نہ کہ یوسف نجار کی جانب اس لیے تاویل کی یہ بنیاد ہی از سر تا پا غلط اور بے اصل ہے۔

علاوہ ازیں جہاں تک اس مسئلہ کا عقلی پہلو ہے سو عقل بھی اس کے امکان کو ممنوع اور محال قرار نہیں دیتی بلکہ اس کو ممکن الوقوع تسلیم کرتی ہے کیا سائنس کی موجودہ دنیا سے آشنا حضرات اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ آج جبکہ سائنس کی جدید تحقیق نے نظریوں سے آگے قدم بڑھا کر مشاہدہ اور تجربہ سے یہ ثابت کر دیا کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسان کی خلقت و پیدائش بھی بیضہ سے ہوتی ہے اور اس کو اصطلاح میں خلیہ <sup>۴</sup> تخم کہتے ہیں یہ خلیہ مرد اور عورت دونوں میں ہوتا ہے اور حمل قرار پا جانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد کے خلیات تخم عورت کے بیضہ میں داخل ہو جاتے ہیں یہی خلیہ زندگی اور حیات کا تخم ہے اور قدرت حق نے اس کو بہت باریک جثہ عطا فرمایا <sup>۴</sup> ہے تو اس تحقیق نے امریکہ اور انگلینڈ کے سائنسدانوں کو اس جانب متوجہ کر دیا ہے کہ کیوں وہ ایک ایسی کوشش نہ کریں کہ بغیر مرد کی مقاربت کے جنس رجال کے خلیات تخم کو آلات کے ذریعہ جنس اناث کے مبیض میں داخل کر کے وجود انسانی حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ سائنس والوں کا یہ تخیل ابھی عملی حیثیت سے کتنا ہی دور ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ عقل یہ ممکن سمجھتی ہے کہ انسانی پیدائش آنکھوں دیکھے عام طریق ولادت کے علاوہ بعض دوسرے طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے اور ان کو قانون قدرت کے خلاف اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ ہم نے قدرت کے تمام قوانین کا احاطہ نہیں کر لیا ہے بلکہ انسان جس قدر علم و دانش کی جانب بڑھتا جاتا ہے اس کے سامنے قدرت حق کے قانون کے نئے نئے گوشے کھلتے جاتے ہیں۔

پس اگر یہ صحیح ہے کہ جو بات کل ناممکن نظر آتی تھی آج وہ ممکن کہی جا رہی ہے اور جلد یا بدیر اس کے وقوع پر یقین کیا جا رہا ہے تو نہیں معلوم پھر اس قانون قدرت سے انکار کر دینے کے کیا معنی ہیں جس کا علم اگرچہ ابھی تک ہم کو حاصل نہیں ہے مگر انبیاء و رسل جیسی قدسی صفات ہستیوں پر اس علم کی حقیقت آشکارا ہے تو کیا علمی دلیل کا یہ بھی کوئی پہلو ہے کہ جس بات کا ہم کو علم نہ ہو اور عقل اس کو ناممکن اور محال نہ ثابت کرتی ہو اس کا انکار صرف "عدم علم" کی وجہ سے کر دیا جائے خصوصاً جب یہ انکار ایک مدعی مسیحیت و نبوت کی جانب سے ہو تو اس کے لیے تو یہی کہا جاسکتا ہے۔

اب ان "آیات بینات" کو قرآن حکیم سے سنئے اور موعظت و عبرت کے حصول کا سروسامان کیجئے کہ ماضی کے ان واقعات کی تذکیر سے قرآن کا یہی عظیم مقصد ہے۔

۴ ترجمان القرآن ج ۲ ۴ خلیہ کو انگریزی میں (Cell) کہتے ہیں۔ ۴ اس کا قطر انچ کا 1/500 ہوتا ہے۔



﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۗ وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۚ إِنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۚ إِنِّي أَخْلَقْتُ لَكُمْ مِنَ الطَّيْرِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَ أُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَ أُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَ أُنبِئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَ مَا تَدْخُرُونَ ۚ فِي بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُمْ إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝۵۱ وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَ لِأَحْلِ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۗ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا ۝۵۲ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝۵۳﴾ (آل عمران: ۴۸-۵۱)

”اور خدا سکھاتا ہے اس (عیسیٰ) کو کتاب، حکمت، توراہ اور انجیل، اور وہ رسول ہے بنی اسرائیل کی جانب (وہ کہتا ہے) کہ بیشک میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے ”نشان“ لے کر آیا ہوں، وہ یہ کہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرند کی شکل بناتا پھر اس میں پھونک دیتا ہوں اور وہ خدا کے حکم سے زندہ پرند بن جاتا ہے اور پیدائشی اندھے کو سوا نکھا کر دیتا اور سفید داغ کے جذام کو اچھا کر دیتا ہوں، اور خدا کے حکم سے مردہ کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم کو بتا دیتا ہوں جو تم کھا کر آتے ہو اور جو تم گھر میں ذخیرہ رکھ آتے ہو سوا اگر تم حقیقی ایمان رکھتے ہو تو بلاشبہ ان امور میں (میری صداقت اور منجانب اللہ ہونے کے لیے) ”نشان“ ہے اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور (اس لیے بھیجا گیا ہوں) تاکہ بعض ان چیزوں کو جو تم پر حرام ہو گئی ہیں تمہارے لیے حلال کر دوں تمہارے لیے پروردگار ہی کے پاس سے ”نشان“ لایا ہوں ”پس تم اللہ سے ڈرو“ اور (اس کے دیے ہوئے احکام میں) میری اطاعت کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے سو اس کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔“

﴿وَ إِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطَّيْرِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَ تُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَ الْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۗ وَ إِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۗ﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

”اور (اے عیسیٰ ابن مریم! تو میری اس نعمت کو یاد کر) جبکہ تو میرے حکم سے گارے سے پرند کی شکل بنا دیتا اور پھر اس میں پھونک دیتا تھا اور وہ میرے حکم سے زندہ پرند بن جاتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے پیدائشی اندھے کو سوا نکھا اور سفید داغ کے کوڑھ کو اچھا کر دیتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے مردہ کو زندہ کر کے قبر سے نکالتا تھا۔“

﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝۶﴾ (الصف: ۶)

”پھر جب وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ان کے پاس کھلے نشان لے کر آیا تو انہوں نے (بنی اسرائیل نے) کہا ”یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔“ انبیاء علیہم السلام نے جب کبھی بھی قوموں کے سامنے آیات اللہ کا مظاہرہ کیا ہے تو منکروں نے ہمیشہ ان کے متعلق ایک بات ضرور کہی ہے ”یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔“ پس کیا ایک جو یائے حق اور غیر متعصب انسان کے لیے یہ جواب اس جانب رہنمائی نہیں کرتا کہ



انبیاء علیہم السلام کے اس قسم کے مظاہرے ضرور عام قوانین قدرت سے جدا ایسے علم کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے تھے جو صرف ان قدسی صفات ہستیوں کے لیے ہی مخصوص رہا ہے اور ان کے علاوہ انسانی دنیا اس کے فہم حقیقت سے بہرہ مند نہیں ہوئی تب ہی ان لوگوں کے پاس جو ازراہ عناد و ضد انکار پر تلے ہوئے تھے، اس کے انکار کے لیے اس سے بہتر دوسری تعبیر نہیں تھی کہ وہ ان امور کو ”سحر و جادو“ کہہ دیں۔ لہذا ان امور کو سحر و جادو کہنا بھی ان کے ”معجزہ“ اور ”نشان خداوندی“ ہونے کی زبردست دلیل ہے۔

### حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی تعلیمات کا خلاصہ:

بہر حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو حجت و برہان اور آیات اللہ کے ذریعہ دین حق کی تعلیم دیتے رہتے اور ان کے بھولے ہوئے سبق کو یاد دلا کر مردہ قلوب میں حیات تازہ بخشتے رہتے تھے۔

خدا اور خدا کی توحید پر ایمان، انبیاء و رسل علیہم السلام کی تصدیق، آخرت (معاد) پر ایمان، ملائکہ اللہ پر ایمان، قضاء و قدر پر ایمان، خدا کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان، اخلاق حسنہ کے اختیار اعمال سیدہ سے پرہیز و اجتناب، عبادت الہی سے رغبت، دنیا میں انہماک سے نفرت اور خدا کے کنبہ (مخلوق خدا) سے محبت و مودت یہی وہ تعلیم و تلقین تھی جو ان کی زندگی کا مشغلہ اور فرض منصبی بنا ہوا تھا وہ بنی اسرائیل کو توراہ، انجیل، اور حکیمانہ پند و نصائح کے ذریعہ ان امور کی جانب دعوت دیتے مگر بد بخت یہود اپنی فطرت کج، صدیوں کی مسلسل سرکشی اور تعلیم الہی سے بغاوت کی بدولت اس درجہ متشدد ہو گئے تھے اور انبیاء و رسل کے قتل نے ان کے قلوب کو حق و صداقت کے قبول میں اس درجہ سخت بنا دیا تھا کہ ایک مختصر سی جماعت کے علاوہ ان کی جماعت کی بڑی اکثریت نے ان کی مخالفت اور ان کے ساتھ حسد و بغض کو اپنا شعار اور اپنی جماعتی زندگی کا معیار بنا لیا اور اس لیے انبیاء کی سنت راشدہ کے مطابق رشد و ہدایت کے حلقہ بگوشوں میں دنیوی جاہ و جلال کے لحاظ سے کمزور و ناتواں اور زبردست پیشہ ور طبقہ کی اکثریت نظر آتی تھی، ضعفاء کا یہ طبقہ اگر اخلاص و دیانت کے ساتھ حق کی آواز پر لبیک کہتا تو بنی اسرائیل کا وہ سرکش و مغرور حلقہ ان پر اور خدا کے پیغمبر پر پھبتیاں کستا، توہین و تذلیل کا مظاہرہ کرتا اور اپنی عملی جدوجہد کا بڑا حصہ معاندت و مخالفت میں صرف کرتا رہتا تھا۔

﴿وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِابْيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۗ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا اللَّهَ ۗ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿٦٣﴾﴾ (الزخرف: ٦٣-٦٥)

”اور جب عیسیٰ علیہ السلام ظاہر دلائل لے کر آئے تو کہا: ”بلاشبہ میں تمہارے پاس ”حکمت“ لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا ہوں تاکہ ان بعض باتوں کو واضح کر دوں جن کے متعلق تم آپس میں جھگڑ رہے ہو، پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، بیشک اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے سو اس کی پرستش کرو یہی سیدھی راہ ہے“ پھر وہ آپس میں گروہ بندی کرنے لگے، سو ان لوگوں کے لیے دردناک عذاب کے ذریعہ ہلاکت اور خرابی ہے۔“

﴿وَ إِذْ قَالَ عِيسَىٰ ابْنُ مَرْيَمَ يَبْنِيْ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيِّ مِنْ



التَّورَةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدٌ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٦﴾ (الصف: ۶)

”اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں تو راتہ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا نام اس کا احمد ہے، پس جب (عیسیٰ علیہ السلام) آیا ان کے پاس معجزات لے کر تو وہ (بنی اسرائیل) کہنے لگے، یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔“

﴿ فَلَمَّا أَحْسَسَ عِيسَى مِنْهُمْ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ ۗ أَمْنَا بِاللَّهِ ۗ وَ اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٥٢﴾ رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٥٣﴾ ﴾ (آل عمران: ۵۲-۵۳)

”پھر جب عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان (بنی اسرائیل) سے کفر محسوس کیا تو کہا ”اللہ کی جانب میرا کون مددگار ہے“ حواریوں نے جواب دیا: ”ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار۔ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور تم گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں، اے ہمارے پروردگار جو تو نے اتارا ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم نے رسول کی پیروی اختیار کر لی پس تو ہم کو (دین حق کی) گواہی دینے والوں میں سے لکھ لے۔“

### حواری عیسیٰ علیہ السلام :

مگر عیسیٰ علیہ السلام معاندین و مخالفین کی دراندازیوں اور ہرزہ سرائیوں کے باوجود اپنے فرض منصبی ”دعوة الی الحق“ میں سرگرم عمل رہتے اور شب و روز بنی اسرائیل کی آبادیوں اور بستیوں میں پیغام حق سناتے اور روشن دلائل اور واضح آیات اللہ کے ذریعہ لوگوں کو قبول حق و صداقت پر آمادہ کرتے رہتے تھے اور خدا اور حکم خدا سے سرکش اور باغی انسانوں کی اس بھیڑ میں ایسی سعید روئیں بھی نکل آتی تھیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت حق پر لبیک کہتی اور سچائی کے ساتھ دین حق کو قبول کر لیتی تھیں، ان ہی پاک بندوں میں وہ مقدس ہستیاں بھی تھیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شرف صحبت سے فیضیاب ہو کر نہ صرف ایمان ہی لے آئی تھیں بلکہ دین حق کی سربلندی اور کامیابی کے لیے انہوں نے جان و مال کی بازی لگا کر خدمت دین کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا اور اکثر و بیشتر حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ رہ کر تبلیغ و دعوت کو سرانجام دیتی تھیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ ”حواری“ (رفیق) اور ”انصار اللہ“ (اللہ کے دین کے مددگار) کے مقدس القاب سے معزز و ممتاز کی گئیں۔ چنانچہ ان بزرگ ہستیوں نے پیغمبر خدا کی حیات پاک کو اپنا اسوہ بنایا اور سخت سے سخت اور نازک سے نازک حالات میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہر طرح معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔

﴿ وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَ بِرَسُولِي ۗ قَالُوا آمَنَّا وَ اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿١١١﴾ ﴾ (المائدہ: ۱۱۱)

”اور (اے عیسیٰ وہ وقت یاد کرو) جبکہ میں نے حواریوں کی جانب (تیری معرفت) یہ وحی کی کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ تو انہوں نے جواب دیا ”ہم ایمان لائے اور اے خدا! تو گواہ رہنا کہ ہم بلاشبہ مسلمان ہیں۔“



﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ۚ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ فَأَمَنْتَ طَائِفَةٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرْتُ طَائِفَةٌ ۗ فَأَيُّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَاصْبَحُوا ظَاهِرِينَ ﴿١٤﴾﴾ (الصف: ۱۴)

”اے ایمان والو! تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہو جاؤ جیسا کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے جب حواریوں سے کہا: ”اللہ کے راستے میں کون میرا مددگار ہے“... تو حواریوں نے جواب دیا ”ہم ہیں اللہ (کی راہ) کے مددگار پس بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لائی اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا سو ہم نے مومنوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی پس وہ (مومن) غالب رہے۔“

گزشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے یہ حواری بیشتر غریب اور مزدور طبقہ میں سے تھے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ کے ساتھ ”سنت اللہ“ یہی جاری رہی ہے کہ ان کی صدائے حق پر لبیک کہنے اور دین حق پر جان سپاری کا مظاہرہ کرنے کے لیے اول غریب اور کمزور طبقہ ہی آگے بڑھتا ہے اور زبردست ہی فداکاری کا ثبوت دیتے ہیں اور وقت کی صاحب اقتدار اور زبردست ہستیاں اپنے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ مقابلہ اور معارضہ کے لیے سامنے آتی اور معاندانہ سرگرمیوں کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں سنگ گراں بن جاتی ہیں لیکن جب خدائے تعالیٰ کا قانون پاداش عمل اپنا کام کرتا ہے تو نتیجہ میں فلاح و کامرانی ان کمزور فداکاران حق ہی کا حصہ ہو جاتا ہے اور متکبر و مغرور ہستیاں یا ہلاکت کے قعر مذلت میں جا گرتی ہیں اور یا مقہور و مغلوب ہو کر سرنگوں ہو جانے کے ماسوا کوئی چارہ کار نہیں دیکھتیں۔

### حواری عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن و انجیل کا موازنہ :

قرآن عزیز نے عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی منقبت بیان کی ہے، سورہ آل عمران کی آیات تمہارے سامنے ہیں، حضرت مسیح علیہ السلام جب دین حق کی نصرت و یاری کے لیے پکارتے ہیں تو سب سے پہلے جنہوں نے ”نحن انصار اللہ“ کا نعرہ بلند کیا وہ یہی پاک ہستیاں تھیں، سورہ صف میں اللہ رب العالمین نے جب مسلمانوں کو مخاطب کر کے ﴿كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ﴾ کی ترغیب دی تو ”تذکیر بایام اللہ“ کے پیش نظر ان ہی مقدس ہستیوں کا ذکر کیا اور ان ہی کی مثال اور نظیر دے کر نصرت حق کے لیے براہیختہ کیا اور سورہ مائدہ میں ان کے قبول ایمان اور دعوت حق کے سامنے انقیاد و تسلیم کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی ان کے خلوص، حق طلبی اور حق کوشی کی زندہ جاوید تصویر ہے۔ یہ سب کچھ تو اس وقت کا حال ہے جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے درمیان موجود ہیں لیکن آپ کے ”رفع الی السماء“ کے بعد بھی ان کی پرستقامت اور دین توہم کی فداکارانہ خدمت کے متعلق سورہ صف کی آیت ۱۴ ﴿فَأَيُّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَاصْبَحُوا ظَاهِرِينَ﴾ میں کافی اشارہ موجود ہے اور شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) نے اسی بناء پر آیت زیر بحث کی تفسیر کرتے ہوئے تاریخی شہادت کا اس طرح ذکر فرمایا ہے:

”حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے یاروں (حواریوں) نے بڑی محنتیں کی ہیں تب ان کا دین نشر ہوا، ہمارے حضرت کے پیچھے بھی خفیوں نے اس سے زیادہ کیا۔“



مگر اس کے برعکس بائبل (انجیل) بعض مقامات میں اگر ان کی منقبت اور مدح سرائی میں رطب اللسان ہے تو دوسری جانب ان کو بزدل اور منافق ثابت کرتی ہے۔ انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشہور و معتمد علیہ حواری یہودا کے متعلق اس وقت کا حال جب حضرت یسوع علیہ السلام کو یہودی گرفتار کرنا چاہتے ہیں، اس طرح مذکور ہے:

”یہ باتیں کہہ کر یسوع اپنے دل میں گھبرایا اور یہ گواہی دی کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑا دے گا۔ شاگرد شبہ کر کے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے.... ایک شخص جس سے یسوع محبت کرتا تھا.... اس نے یسوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا اے خداوند وہ کون ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ جسے میں نوالہ ڈبو کر دے دوں گا وہی ہے، پھر اس نے نوالہ ڈبو دیا اور لے کر شمعون اسکر یوتی کے بیٹے یہوداہ کو دے دیا اور اس نوالہ کے بعد شیطان اس میں سما گیا۔“

اور انجیل متی میں اس شمعون پطرس حواری کے متعلق جو بقول انا جیل ساری عمر حضرت یسوع کا پیارا اور معتمد علیہ رہا یہ مسطور ہے:

”شمعون پطرس نے اس سے کہا، اے خداوند تو کہاں جاتا ہے، یسوع نے جواب دیا کہ جہاں میں جاتا ہوں اب تو میرے پیچھے نہیں آ سکتا مگر بعد میں میرے پیچھے آئے گا۔ پطرس نے اس سے کہا اے خداوند میں اب تیرے پیچھے کیوں نہیں آ سکتا، میں تو تیرے لیے اپنی جان دوں گا، یسوع نے جواب دیا، کیا تو میرے لیے اپنی جان دے گا؟ میں تجھ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ مرغ بانگ نہ دے گا جب تک کہ تو تین بار میرا انکار نہ کرے گا۔“

اور اسی متی کی انجیل میں تمام شاگردوں (حواریوں) کی بزدلی اور حضرت یسوع کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو جانے کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

”اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔“

ان حوالجات سے تین ایسی باتیں ثابت ہوتی ہیں جن کو کسی طرح بھی عقل و نقل تسلیم کرنے کو تیار نہیں اول یہ کہ جو شاگرد اور حواری حضرت یسوع کے زیادہ قریب، ان کے معتمد علیہ اور ان کی نگاہوں میں محبوب تھے وہ نتیجہ میں نہ صرف بزدل بلکہ ”منافق نکلے مگر عقل و نقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر ایک پیغمبر اور مصلح کی جماعت میں ایک چھوٹا سا گروہ منافقین کا عموماً ہوتا ہے جو اپنی دنیوی اغراض کی خاطر بہ کراہت قلب ظاہر داری کے طور پر شریک جماعت ہونا مفید سمجھتا ہے مگر ایک مصلح اور پیغمبر کے درمیان ہمیشہ سے یہ فرق رہا ہے کہ مصلح خواہ اپنی جماعت کے منافقین سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے لیکن نبی اور پیغمبر کو ”وحی الہی“ کے ذریعہ شروع ہی سے مخلص اور منافق کی اطلاع دے دی جاتی ہے تاکہ ایک منکر و کافر سے زیادہ جس گروہ سے جماعت حق اور اس کی دعوت و اصلاح کو ضرر پہنچ سکتا ہے، نبی اس کے حالات سے غافل نہ رہے۔ پس اسی پر کوئی منافق کسی وقت اور کسی حالت میں بھی نبی اور پیغمبر کا محبوب، معتمد علیہ اور مقرب نہیں ہو سکتا، البتہ یہ ایک جدا امر ہے کہ نبی دین حق کی صالح کی وجہ سے اس کے ساتھ اغراض اور درگزر کا طریق عمل مناسب سمجھے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک صحابی کے اس سوال پر کہ ”جب آپ منافقین کے حالات منافقت سے آگاہ ہیں تو ان کا مقابلہ کر کے کیوں ان کو کیفر کردار تک نہیں پہنچا دیتے تاکہ جماعت مسلمین کو ان کی منافقت سے نجات ملے“ یہ جواب دیا:



”اس لیے کہ ان کے قبول ایمان کی ظاہر داری کے بعد ہمارے سخت گیر طریقہ کے متعلق غیر مسلموں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ وہ کہہ اٹھیں ”محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرنے سے نہیں چوکتے۔“

دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ یہوداہ کے اندر شیطان نے اس وقت حلول کیا جب حضرت یسوع نے اپنے ہاتھ سے اس کو نوالہ ڈبو کر دیا، مگر یہ بات بھی اس لیے عقل و نقل کے خلاف ہے کہ بزرگوں اور مقدس انسانوں کے ہاتھوں سے جو کچھ ہوتا ہے اس کا اثر برکت، طہارت اور تقدیس تو ہوا کرتا ہے لیکن شیطان کا حلول اور بدی کا نفوذ نہیں ہوا کرتا، بیشک یہ درست ہے کہ جب حق کا ترازو قائم ہوتا ہے تو اس سے کھرا اور کھوٹا دونوں کی حقیقت کا انکشاف ہو جایا کرتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اس پیمانہ کے مس کرنے سے کسی کھرے میں کھوٹ پیدا ہو جائے اور انجیل کے اس بیان میں صورت حال پہلی نہیں بلکہ دوسری ہے۔

تیسری بات یہ کہ حضرت یسوع کے تمام ان حواریوں میں سے ”جن کی مدح و ستائش میں جگہ جگہ بائبل رطب اللسان ہے“ ایک، دو، یا دس پانچ نہیں سب کے سب نہایت بزدلی اور غداری کے ساتھ اس وقت حضرت مسیح علیہ السلام سے کنارہ کش ہو گئے، جب دین حق کی حمایت و نصرت کے لیے سب سے زیادہ ان کی ضرورت تھی اور جب کہ پیغمبر خدا علیہ السلام دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے ہوئے تھے۔

مگر انجیل کی اس شہادت کے خلاف سورہ آل عمران میں قرآن عزیز نے یہ شہادت دی ہے کہ اس نازک وقت میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو دین حق کی نصرت و یاری کے لیے پکارا تو سب نے اولوالعزمی اور فداکارانہ جذبہ کے ساتھ یہ جواب دیا: ”نحن انصار اللہ“ اور پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے سامنے اپنی استقامت دین اور اپنے مخلصانہ ایمان کے متعلق شہادت دے کر نصرت کا پورا پورا یقین دلایا اور پھر سورہ صف میں قرآن عزیز نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ان حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو کچھ کہا تھا ان کی موجودگی میں اور ان کے بعد سچی وفاداری کے ساتھ نباہا اور بلاشبہ مومنین صادقین ثابت ہوئے اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی مدد فرمائی اور ان کو دشمنان حق کے مقابلہ میں کامیاب کیا۔

انجیل اور قرآن کے اس موازنہ کو دیکھ کر ایک انصاف پسند یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس معاملہ میں ”حق“ قرآن کے ساتھ ہے اور علماء نصاریٰ نے انجیل میں تحریف کر کے اس قسم کے گھڑے ہوئے واقعات کا اضافہ اس لیے کیا ہے تاکہ صدیوں بعد کے خود ساختہ عقیدہ ”عقیدہ“ ”صلیب مسیح“ سے متعلق یہ داستان صحیح ترتیب پر قائم ہو سکے کہ جب مسیح علیہ السلام کو صلیب پر لٹکایا گیا تو انہوں نے یہ کہتے کہتے جان دے دی:

”ایلی ایلی لما سقتنی.“ ”اے خدا اے خدا! تو نے مجھے کیوں یکہ و تنہا چھوڑ دیا“

اور کسی ایک شخص نے بھی مسیح علیہ السلام کا ساتھ نہ دیا..... بہر حال حواریوں سے متعلق بائبل کی یہ تصریحات محرف اور خود ساختہ داستان سرائی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

### نزول مائدہ :

مخلص اور فداکار حواریوں کی جماعت اگرچہ صادق الایمان اور راسخ الاعتقاد تھی مگر علمی و مجلسی تکلفات گفت و شنید کے لحاظ سے سادہ لوح اور ضروریات زندگی کے سروسامان کے اعتبار سے غرباء اور ضعفاء کی جماعت تھی اس لیے انہوں نے ازراہ سادگی سادہ



دلی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ درخواست کی کہ جس خدائے برتر میں یہ لامحدود طاقت ہے کہ اس کا ایک نمونہ آپ کی ذات اقدس اور وہ نشان (معجزات) ہیں خدائے تعالیٰ نے جن کو آپ کی تصدیق نبوت و رسالت کے لیے آپ کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا اس خدا میں یہ طاقت بھی ضرور ہوگی کہ وہ ہمارے لیے غیب سے ایک دسترخوان نازل کر دیا کرے تاکہ ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو کر باطمینان قلب یاد خدا اور دین حق کی دعوت و تبلیغ میں مصروف رہا کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ سن کر ان کو نصیحت فرمائی کہ اگرچہ خدا کی طاقت بے غایت اور بے نہایت ہے لیکن کسی سچے بندہ کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ اس طرح خدا کو آزمائے، پس خدا سے ڈرو اور ایسے خیالات سے بچو، یہ سن کر حواریوں نے جواب دیا ”ہم اور خدا کو آزمائیں، حاشا ہمارا تو یہ مقصد نہیں، ہمارا تو یہ مطلب ہے کہ رزق کی جدوجہد سے دل کو مطمئن کر کے خدا کے اس عطیہ کو زندگی کا سہارا بنالیں اور آپ کی تصدیق میں ہم کو حق الیقین کا اعتقاد راسخ حاصل ہو جائے اور ہم اس کی خدائی پر کائنات انسانی کے لیے شاہد عدل بن جائیں۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب ان کا بڑھتا ہوا اصرار دیکھا تو بارگاہِ الہی میں دعا کی ”اے خدا! تو ان کے سوال کو پورا کر اور آسمان سے ایسا ماندہ (دسترخوان نعمت) نازل فرما کہ وہ ہمارے لیے تیرے غضب کا مظہر ثابت نہ ہو بلکہ ہمارے اول و آخر سب کے لیے خوشی کی یادگار (عید) بن جائے اور تیرا ”نشان“ کہلائے اور اس ذریعہ سے ہم کو اپنے غیبی رزق سے شاد کام کرے کیونکہ تو ہی بہتر رزق رساں ہے“ اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی: عیسیٰ تمہاری دعاء قبول ہے، میں اس کو ضرور نازل کروں گا لیکن یہ واضح رہے کہ اس کھلی نشانی نازل ہونے کے بعد اگر ان میں سے کسی نے بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی تو پھر ان کو عذاب بھی ایسا ہولناک دوں گا جو کائنات کے کسی انسان کو نہیں دیا جائے گا۔ قرآن عزیز نے نزول ماندہ کے واقعہ کا اس معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ ذکر کیا ہے:

﴿إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يُعِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنْزِلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْبِخَ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشُّهَدَائِينَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنْكَ ۗ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللَّهُ إِنَّي مُنْزِلُهَا عَلَيْكُمْ ۖ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدَ مَنكُم مِّنكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ﴿۱۱۵﴾﴾

(المائدہ: ۱۱۲-۱۱۵)

”اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ حواریوں نے کہا تھا ”اے عیسیٰ بن مریم! کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ آسمان سے ہم پر ایک خوان اتار دے؟“ (یعنی ہماری غذا کے لیے آسمان سے غیبی سامان کر دے) عیسیٰ علیہ السلام نے کہا خدا سے ڈرو (اور ایسی فرمائشیں نہ کرو) اگر تم ایمان رکھتے ہو، انہوں نے کہا (مقصود اس سے قدرت الہی کا امتحان نہیں ہے بلکہ) ہم چاہتے ہیں (ہمیں غذا میسر آئے تو) اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل آرام پائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہمیں سچ بتایا تھا اور اس پر ہم گواہ ہو جائیں۔ اس پر عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے دعا کی ”اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان



سے ایک خوان بھیج دے کہ اس کا آنا ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے (فضل و کرم کی) ایک نشانی ہو۔ ہمیں روزی دے تو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے“ اللہ نے فرمایا: ”میں تمہارے لیے خوان بھیجوں گا، لیکن جو شخص اس کے بعد بھی (راہ حق سے) انکار کرے گا تو میں اسے (پاداش عمل میں) عذاب دوں گا، ایسا عذاب کہ تمام دنیا میں کسی آدمی کو بھی ویسا عذاب نہیں دیا جائے گا۔“

یہ ماندہ نازل ہوا یا نہیں؟ قرآن عزیز نے اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور نہ کسی مرفوع حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ پایا جاتا ہے، البتہ آثار صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم میں ضرور تفصیلات مذکور ہیں:

مجاہد اور حسن بصری رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ماندہ کا نزول نہیں ہوا، اس لیے کہ خدائے تعالیٰ نے اس کے نزول کو جس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا مطلب کرنے والوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ انسان ضعیف البنیان اور کمزوریوں کا مجسمہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لغزش یا معمولی خلاف ورزی کی بدولت اس دردناک عذاب کے سزاوار ٹھہریں اپنے سوال کو واپس لے لیا، علاوہ ازیں اگر ماندہ کا نزول ہوا ہوتا تو وہ ایسا نشانِ الہی (معجزہ) تھا کہ نصاریٰ اس پر جس قدر بھی فخر کرتے وہ کم تھا اور ان کے یہاں اس کی جس قدر بھی شہرت ہوتی وہ بے جا نہ ہوتی تاہم ان کے یہاں اس نزول ماندہ کا اس طرح کوئی تذکرہ نہیں پایا جاتا۔\*

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا اور ماندہ کا نزول ہوا جمہور کا رجحان اسی جانب ہے البتہ اس کے نزول کی تفصیلات میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں مثلاً صرف ایک دن نازل ہوا یا چالیس روز تک نازل ہوتا رہا؟ اور پھر اترنا بند ہو گیا تو کیوں؟ اور صرف یہی ہوا کہ نازل نہ ہوا یا جن لوگوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے بند ہوا ان پر سخت قسم کا عذاب بھی آپہنچا؟ جو نقول یہ کہتی ہیں کہ ماندہ کا نزول صرف ایک دن نہیں بلکہ چالیس دن تک برابر جاری رہا وہ بند ہو جانے کا سبب یہ بیان کرتی ہیں کہ نزول ماندہ پر حکم یہ ہوا کہ اس کو فقیر مسکین اور مریض ہی کھائیں تو نگر اور بھلے چنگے نہ کھائیں مگر چند روز تعمیل کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ اس کی خلاف ورزی شروع کر دی یا یہ حکم ملا تھا کہ اس کو کھائیں سب مگر اگلے روز کے لیے ذخیرہ نہ کریں مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی خلاف ورزی ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف ماندہ کا نزول ہی بند ہو گیا بلکہ خلاف ورزی کرنے والے خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے۔\*

بہر حال ان آثار میں جو قدر مشترک ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی تو مشیت باری کا یہ حکم ہوا کہ ماندہ طیار ہو چنانچہ لوگوں کی آنکھوں دیکھتے خدا کے فرشتہ فضاء آسمانی سے اس کو لے کر اترے ادھر فرشتے آہستہ آہستہ اس کو لیے ہوئے اتر رہے تھے اور ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ درگاہِ الہی میں دست بدعا تھے کہ ماندہ آپہنچا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اول دو رکعت نماز شکر ادا کی اور پھر ماندہ (خوان) کو کھولا تو اس میں تلی ہوئی مچھلیاں اور تروتازہ پھل اور روٹیاں موجود پائیں اور خوان کھولتے ہی ایسی نفیس خوشبو نکلی کہ اس کی مہک نے سب کو مست کر دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام

\* تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۱۶ مگر یوحنا کی انجیل باب ۶ میں تو یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ”عید“ کے موقع پر پیش آیا۔

\* نزول ماندہ کا سوال اگرچہ کیا تھا حواریوں نے مگر کیا تھا سب کی جانب سے اس لئے یہ واضح رہے کہ جن نقول میں خلاف ورزی اور اس سے متعلق عذاب کا ذکر ہے اس کا اشارہ حواریوں میں سے کسی کی جانب مطلق نہیں ہے کیونکہ یہ بات نصوص قرآنی کے خلاف ہے۔



نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کھائیں مگر لوگوں نے اصرار کیا کہ ابتدا آپ کریں، آپ نے ارشاد فرمایا یہ میرے لیے نہیں ہے، تمہاری طلب پر نازل ہوا ہے، یہ سن کر سب گھبرائے کہ نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو کہ خدا کا رسول تو نہ کھائے اور ہم کھائیں، آپ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا ”اچھا فقراء، مساکین، معذورین اور مریضوں کو بلاؤ، یہ ان کا حق ہے تب ہزار ہا بندگانِ خدا نے شکم سیر ہو کر کھایا مگر ماندہ کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آیا۔“

اس مسئلہ میں حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) مجاہد اور حسن بصری رضی اللہ عنہما کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں اور نزول ماندہ سے متعلق ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک اور لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں۔ موضح القرآن میں ہے:

﴿هَلْ يَسْتَطِيعُ﴾ ”ہو سکے“ یہ معنی کہ ہمارے واسطے تمہاری دعا سے اس قدر خرق عادت کرے یا نہ کرے فرمایا ﴿اتَّقُوا اللَّهَ﴾ ”ڈرو اللہ سے“ یعنی بندہ کو چاہیے کہ اللہ کو نہ آزمائے کہ میرا کہا مانتا ہے یا نہیں اگرچہ خداوند! (آقا و مالک) بہتیری مہربانی کرے ﴿وَنَكُونَ عَلَيْهِم مِّنَ الشَّاهِدِينَ﴾ یعنی برکت کی امید پر مانگتے ہیں اور (تاکہ) معجزہ ہمیشہ مشہور رہے۔ آزمانے کو نہیں کہتے ہیں۔ وہ خوان اتر ایک شنبہ کو وہ نصاریٰ کی عید ہے جیسے ہم کو روز جمعہ۔ بعض کہتے ہیں وہ خوان اتر چالیس روز تک اور پھر بعض نے ناشکری کی یعنی حکم ہوا تھا کہ فقراء اور مریض کھائیں نہ محظوظ (توانگر) اور چنگے پھر قریب اسی آدمی سوار اور بندر ہو گئے (مگر) یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا پیچھے کسی کو نہیں ہوا۔“

اور بعضے کہتے ہیں (ماندہ) نہ اتر، تہدید سن کر مانگنے والے ڈر گئے نہ مانگا، لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کلام (قرآن) میں نقل کرنا بے حکمت نہیں، شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت (نصاریٰ) میں آسودگی مال سے ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پائے۔ اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرق عادت کی راہ سے نہ چاہے پھر اس کی شکرگزاری بہت مشکل ہے، اسباب ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے۔ اس قصہ میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں جاتی۔“

اس سلسلہ میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے موعظت و بصیرت سے متعلق بہت خوب بات ارشاد فرمائی ہے:

”عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی قوم نے نزول ماندہ کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب ملا ”تمہاری درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی جاتی ہے کہ نہ اس میں خیانت کرنا نہ اس کو چھپائے رکھنا اور نہ اس کو ذخیرہ کرنا اور نہ یہ بند کر دیا جائے گا اور تم کو ایسا عبرت ناک عذاب دوں گا جو کسی کو نہ دیا جائے گا۔“

اے معشر عرب! تم اپنی حالت پر غور کرو کہ اونٹوں اور بکریوں کی دم پکڑ کر جنگلوں میں چراتے پھرتے تھے، پھر خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے درمیان ہی سے ایک برگزیدہ رسول مبعوث فرمایا جس کے حسب و نسب سے تم اچھی طرح واقف ہو، اس نے تم کو یہ خبر دی کہ عنقریب تم عجم پر غالب آ جاؤ گے اور اس پر چھا جاؤ گے۔ اور اس نے تم کو سختی

❖ یہ واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ تمام کتب تفسیر میں موجود ہیں۔

❖ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ واقعہ صحیح نہیں ہے۔

❖ موضح القرآن سورۃ ماندہ



کے ساتھ منع فرمایا کہ مال و دولت کی فراوانی دیکھ کر ہرگز تم چاندی اور سونے کے خزانے جمع نہ کرنا مگر قسم بخدا کہ زیادہ لیل و نہار نہ گزریں گے کہ تم ضرور سونے چاندی کے خزانے جمع کرو گے اور اس طرح خدائے برتر کے دردناک عذاب کے مستحق بنو گے۔ ❀

### ”رفع الی السماء“ یعنی زندہ آسمان پر اٹھایا جانا:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نہ شادی کی اور نہ بود و ماند کے لیے گھر بنایا، وہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں خدا کا پیغام سناتے اور دین حق کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے اور جہاں بھی رات آ پہنچتی وہیں کسی سر و سامان راحت کے بغیر شب بسر کر دیتے تھے اور چونکہ ان کی ذات اقدس سے مخلوق خدا جسمانی و روحانی دونوں طرح کی شفا اور تسکین پاتی تھی اس لیے جس جانب بھی ان کا گزر ہو جاتا خلقت کا انبوه حسن عقیدت کے ساتھ جمع ہو جاتا اور الہانہ محبت کے ساتھ ان پر نثار ہو جانے کو تیار رہتا تھا۔

یہود کو اس دعوت حق کے ساتھ جو بغض و عناد تھا اس نے اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو انتہائی حسد اور سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور جب ان کے مسخ شدہ قلوب کسی طرح اس کو برداشت نہ کر سکے تو ان کے سرداروں، فقیہوں، فریسیوں اور صدوقیوں نے ذات اقدس کے خلاف سازش شروع کی اور طے یہ پایا کہ اس ہستی کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کی بجز اس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ بادشاہ وقت کو مشتعل کر کے اس کو دار پر چڑھا دیا جائے۔

گزشتہ چند صدیوں سے یہود کے ناگفتہ بہ حالات کی بدولت اس زمانہ میں یہودیہ کے بادشاہ ہیروڈیس کی حکومت اپنے باپ دادا کے علاقہ میں سے بمشکل ایک چوتھائی پر قائم تھی اور وہ بھی برائے نام اور اصل حکومت و اقتدار، وقت کے بت پرست شہنشاہ قیصر روم کو حاصل تھا اور اس کی نیابت میں پلاطیس یہودیہ کے اکثر علاقہ کا گورنر یا بادشاہ تھا۔

یہود اگرچہ اس بت پرست بادشاہ کے اقتدار کو اپنی بدبختی سمجھ کر اس سے متنفر تھے مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے خلاف قلوب میں مشتعل حسد کی آگ نے اور صدیوں کی غلامی سے پیدا شدہ پست ذہنیت نے ایسا اندھا کر دیا کہ انجام اور نتیجہ کی فکر سے بے پرواہ ہو کر پلاطیس کے دربار میں جا پہنچے اور عرض کیا: ”عالی جاہ! یہ شخص نہ صرف ہمارے لیے بلکہ حکومت کے لیے بھی خطرہ بنتا جا رہا ہے اگر فوراً ہی اس کا استیصال نہ کیا تو نہ ہمارا دین ہی صحیح حالت میں باقی رہ سکے گا اور اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی نہ چلا جائے اس لیے کہ اس شخص نے عجیب و غریب شعبدے دکھا کر خلقت کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ہر وقت اس گھات میں لگا ہے کہ عوام کی اس طاقت کے بل پر قیصر اور آپ کو شکست دے کر خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو صرف دنیوی راہ سے ہی گمراہ نہیں کیا بلکہ اس نے ہمارے دین تک کو بھی بدل ڈالا اور لوگوں کو بد دین بنانے میں منہمک ہے۔ پس اس فتنہ کا انسداد از بس ضروری ہے تاکہ بڑھتا ہوا یہ فتنہ ابتدائی منزل ہی میں کچل ڈالا جائے۔“

غرض کافی گفت و شنید کے بعد پلاطیس نے ان کو اجازت دے دی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گرفتار کر لیں اور شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کریں، بنی اسرائیل کے سردار، فقیہ اور کاہن یہ فرمان حاصل کر کے بے حد مسرور ہوئے اور فخر و مباہات



کے ساتھ ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے کہ آخر ہماری سازش کارگر ہوئی اور ہماری تدبیر کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاص موقع کا منتظر رہا جائے اور کسی خلوت اور تنہائی کے موقع پر اس طرح اس کو گرفتار کیا جائے کہ عوام میں ہیجان نہ ہونے پائے۔ انجیل یوحنا میں اس واقعہ سے متعلق یہ کہا گیا ہے:

پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا ہم کرتے کیا ہیں؟ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے، اگر ہم اسے یونہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے اور رومی آ کر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کر لیں گے اور ان میں سے کانفا نامی ایک شخص نے جو اس سال سردار کاہن تھا ان سے کہا تم نہیں جانتے اور نہ سوچتے ہو کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی امت کے واسطے مرے نہ کہ ساری قوم ہلاک ہو۔

یہ اس مشورہ کا تذکرہ ہے جو بادشاہ کے پاس جانے سے قبل آپس میں ہوا اور یہ خطرہ ظاہر کیا گیا کہ اگر اس ہستی کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو بادشاہ وقت (قیصر) کہیں سلطنت کے لیے خطرہ سمجھ کر رہی سہی برائے نام حکومت یہود کا بھی خاتمہ نہ کر دے۔ اور مرقس کی انجیل میں ہے:

دو دن کے بعد صبح اور عید الفطر ہونے والی تھی اور سردار کاہن اور فقیہ موقع ڈھونڈ رہے تھے کہ اسے کیونکر فریب سے پکڑ کر قتل کریں کیونکہ کہتے تھے کہ عید کو کہیں ایسا نہ ہو کہ بلوہ ہو جائے۔

دوسری جانب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کے مکالمہ کو سورہ آل عمران اور سورہ صف کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہود کے کفر و انکار اور معاندانہ ریشہ دوانیوں کو محسوس کیا تو ایک جگہ اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں اور کاہنوں کی معاندانہ سرگرمیاں تم سے پوشیدہ نہیں ہیں، اب وقت کی نزاکت اور کڑی آزمائش و امتحان کی گھڑی کی قربت تقاضا کرتی ہے کہ میں تم سے سوال کروں کہ تم میں کون وہ افراد ہیں جو اس کفر و انکار کے سیلاب کے سامنے سینہ سپر ہو کر خدا کے دین کے ناصر و مددگار بنیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد مبارک سن کر سب نے بڑے جوش و خروش اور صداقت ایمانی کے ساتھ جواب دیا ”ہم ہیں اللہ کے مددگار خدائے واحد کے پرستار، آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلم و فاشعار ہیں، اور درگاہ باری میں اپنی اس اطاعت کوشی پر استقامت کے لیے یوں دست بدعا ہیں اے پروردگار! ہم تیری اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لے آئے اور صدق دل کے ساتھ تیرے پیغمبر کے پیرو ہیں، خدایا! تو ہم کو صداقت و حقانیت کے فداکاروں کی فہرست میں لکھ لے۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے فریضہ دعوت و تبلیغ کے خلاف یہود بنی اسرائیل کی مخالفانہ سرگرمیوں سے متعلق حالات کا یہ حصہ تو اکثر و بیشتر ایسا ہے کہ قرآن اور انجیل کے درمیان اصولاً اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس کے مابعد کے پورے حصہ بیان میں دونوں کی قطعاً جدا جدا راہیں ہیں اور ان کے درمیان اس درجہ تضاد ہے کہ کسی طرح بھی ایک کو دوسری راہ کے قریب نہیں لایا جا سکتا۔ البتہ اس جگہ پہنچ کر یہود اور نصاریٰ دونوں کا باہمی اتحاد ہو جاتا ہے اور دونوں کے بیانات واقعہ سے متعلق ایک ہی عقیدہ پیش کرتے ہیں، فرق ہے تو یہ کہ یہود اس واقعہ کو اپنا کارنامہ اور اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں اور نصاریٰ اس کو یہود بنی اسرائیل کی ایک



قابل لعنت جدوجہد یقین کرتے ہیں۔

یہود اور نصاریٰ دونوں کا مشترک بیان یہ ہے کہ یہود کے سرداروں اور کاہنوں کو یہ اطلاع ملی کہ اس وقت یسوع علیہ السلام لوگوں کی بھیڑ سے الگ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک بند مکان میں موجود ہیں، یہ موقع بہترین ہے، اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے فوراً ہی یہ لوگ موقع پر پہنچ گئے اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر کے یسوع علیہ السلام کو گرفتار کر لیا اور توہین و تذلیل کرتے ہوئے پیلاطیس کے دربار میں لے گئے تاکہ وہ ان کو سولی پر لٹکائے اور اگرچہ پیلاطیس نے عیسیٰ علیہ السلام کو بے قصور سمجھ کر چھوڑ دینا چاہا مگر بنی اسرائیل کے اشتعال پر مجبوراً سپاہیوں کے حوالہ کر دیا۔ سپاہیوں نے ان کو کانٹوں کا تاج پہنایا، منہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور ہر طرح کی توہین و تذلیل کرنے کے بعد مجرموں کی طرح سولی پر لٹکا دیا اور دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دیں، سینہ کو برچھی کی آنی سے چھید دیا اور اس کسمپرسی کی حالت میں انہوں نے یہ کہتے ہوئے جان دے دی "ایلی ایلی لما سبقتنی" انجیل متی میں اس واقعہ کی تفصیلات کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

"سردار کاہن نے اس سے کہا: میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح علیہ السلام ہے تو ہم سے کہہ دے۔ یسوع نے اس سے کہا: تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتا دیکھو گے اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر بکا ہے، اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی، دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے تمہاری کیا رائے ہے، انہوں نے جواب میں کہا وہ قتل کے لائق ہے اس پر انہوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور اس کے مکے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا "اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا.... جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اسے مار ڈالیں اور اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطیس حاکم کے حوالہ کیا.... اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں (بنی اسرائیل) کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا اس وقت برابر ان کا ایک مشہور قیدی تھا پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطیس نے ان سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر چھوڑ دوں؟ برابر کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے؟.... وہ بولے برابر کو، پیلاطیس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے، کیا کروں، سب نے کہا اس کو صلیب دی جائے اس نے کہا کہ کیوں؟ اس نے کہا برائی کی ہے؟ مگر وہ اور بھی چلا چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دی جائے، جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا الثابلوہ ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا "میں اس راست باز کے خون سے بری ہوں تم جانو" سب لوگوں نے جواب دے کر کہا "کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر" اس پر اس نے برابر کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا تاکہ صلیب دی جائے۔ اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لے جا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چوخہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ آداب اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چونغے کو اس پر سے اتار کر پھر اس کے کپڑے اسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے۔ اس وقت



اس کے ساتھ دو ڈاکو صلیب پر چڑھائے گئے ایک داہنے اور ایک بائیں اور راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے اے مقدس کے ڈھانے والے اور تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اتر آ، اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں بزرگوں کے ساتھ مل کر ٹھٹھے کے ساتھ کہتے تھے اس نے اوروں کو بچایا اپنے تئیں نہیں بچا سکتا.... اور دو پہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا: ”ایلی ایلی لہما سبقتنی“۔ ”اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھ کو کیوں چھوڑ دیا“ جو وہاں کھڑے تھے ان میں سے بعض نے سن کر کہا، یہ ایلیا کو پکارتا ہے.... یسوع پھر بڑی آواز سے چلایا اور جان دے دی۔“

تفصیلات میں کم و بیش فرق کے ساتھ یہی مفروضہ داستان باقی تینوں انجیلوں میں بھی مذکور ہے۔ چاروں انجیلوں کی اس متفقہ مگر مفروضہ داستان کو مطالعہ کرنے کے بعد طبیعت پر قدرتی اثر یہ پڑتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی موت انتہائی بیکسی اور بے بسی کی حالت میں دردناک طریقہ سے ہوئی اور اگرچہ خدا کے پاک اور مقدس بندوں کے لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی بلکہ مقررین بارگاہِ صمدی کے لیے اس قسم کی کڑی آزمائشوں کا مظاہرہ اکثر ہوتا رہا ہے لیکن اس واقعہ کا یہ پہلو اس کے مفروضہ اور گھڑے ہوئے ہونے پر روز روشن کی طرح شاہد ہے کہ حضرت یسوع نے ایک اولوالعزم پیغمبر بلکہ مرد صالح کی طرح اس واقعہ کو صبر و رضاء الہی کے ساتھ انگیز نہیں کیا بلکہ ایک انتہائی مایوس انسان کی طرح خدا سے شکوہ کرتے کرتے جان دے دی ”ایلی ایلی لہما سبقتنی“ کہتے ہوئے جان دے دینا مایوسی اور شکوہ کی وہ صورت حال ہے جو کسی طرح بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے شایان شان نہیں کہی جاسکتی، پھر اس واقعہ کا یہ پہلو بھی کم حیرت زا نہیں ہے کہ بقول انجیل کے یسوع مسیح نے اس حادثہ سے قبل تین مرتبہ خدائے تعالیٰ سے یہ درخواست کی ”اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ (موت کا) پیالہ مجھ سے ٹل جائے“ اور جب یہ درخواست کسی طرح قبول نہ ہوئی تو مایوس ہو کر یہ کہنا پڑا ”اگر یہ میرے پیئے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو۔“

باعث حیرت یہ بات ہے کہ جبکہ عقیدہ ”کفارہ“ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ معاملہ خدا اور اس کے بیٹے (العیاذ باللہ) کے درمیان طے شدہ تھا تو پھر اس درخواست کے کیا معنی اور اگر لو ازم بشریت کی بناء پر تھا تو خدا کی مرضی معلوم ہو جانے اور اس پر قناعت کر لینے کے بعد پھر یہ بے صبر اور مایوس انسانوں کی طرح جان دینے کا کیا سبب؟

یہود کی گھڑی ہوئی اس داستان کو چونکہ نصاریٰ نے قبول کر لیا تو یہود از راہ فخر و غرور اس پر بے حد مسرور ہیں اور کہتے ہیں کہ مسیح ناصری اگر ”مسیح موعود“ ہوتا تو خدائے تعالیٰ اس بے بسی اور بے کسی کے ساتھ اس کو ہمارے ساتھ میں نہ دیتا کہ وہ مرتے وقت تک خدا سے شکوہ کرتا رہا کہ اس کو بچائے مگر خدا نے اس کی کوئی مدد نہ کی حالانکہ ہمارے باپ دادا اس وقت بھی کافی اشتعال دیتے رہے کہ اگر تو حقیقتاً خدا کا بیٹا اور ”مسیح موعود“ ہے تو کیوں تجھ کو خدا نے ہمارے ہاتھوں اس ذلت سے نہ بچالیا۔

واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ کے پاس جبکہ اس چبھتے ہوئے الزام کا کوئی جواب نہیں تھا اور واقعہ کی ان تفصیلات کو مان لینے کے بعد ”عقیدہ کفارہ“ کی کوئی قیمت باقی نہیں رہ جاتی تھی تب انہوں نے واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد ایک پارہ بیان کا اور اضافہ کیا۔



یرحنا کی انجیل میں ہے:

لیکن جب انہوں نے یسوع کے پاس آ کر دیکھا کہ وہ مر چکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑ دیں مگر ان میں سے ایک سپاہی نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اس سے خون اور پانی بہ نکلا۔۔۔۔ ان باتوں کے بعد ارملیتہ کے رہنے والے یوسف نے جو یسوع کا شاگرد تھا یہودیوں کے خوف سے خفیہ طور پر پیلاطیس سے اجازت چاہی کہ یسوع کی لاش لے جائے، پیلاطیس نے اجازت دے دی پس وہ آ کر اس کی لاش لے گیا اور نیکدیمس بھی آیا جو پہلے یسوع کے پاس رات کو گیا تھا اور پچاس سیر کے قریب مر اور عود ملا ہوا لایا۔ پس انہوں نے یسوع کی لاش لے کر اسے سوتی کپڑے میں خوشبودار چیزوں کے ساتھ کفنایا جس طرح کہ یہودیوں میں دفن کرنے کا دستور ہے اور جس جگہ اسے صلیب دی گئی وہاں ایک باغ تھا اور اس باغ میں ایک نئی قبر تھی جس میں کبھی کوئی نہ رکھا گیا تھا پس انہوں نے یہودیوں کی تیاری کے دن کے باعث یسوع کو وہیں رکھ دیا۔ ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدینی ایسے تڑکے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا قبر پر آگئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا پس وہ شمعون پطرس اور اس کے دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی گئی اور ان سے کہا کہ خداوند کو قبر سے نکال لے گئے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھ دیا۔۔۔۔ لیکن مریم باہر قبر کے پاس کھڑی روتی رہی اور جب روتے روتے قبر کی طرف جھک کے اندر نظر کی تو دو فرشتوں کو سپید پوشاک پہنے ہوئے ایک کو سر ہانے اور دوسرے کو پائنتی بیٹھے دیکھا جہاں یسوع کی لاش پڑی تھی انہوں نے اس سے کہا اے عورت تو کیوں روتی ہے اس نے ان سے کہا اس لیے کہ میرے خداوند کو اٹھالے گئے اور معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھا یہ کہہ کر وہ پیچھے پھری اور یسوع کو کھڑے دیکھا اور نہ پہچانا کہ یہ یسوع ہے۔ یسوع نے اس سے کہا مریم! وہ پھر کر اس سے عبرانی زبان میں بولی ”ربونی“ یعنی اے استاد! یسوع نے اس سے کہا مجھے نہ چھو، کیونکہ میں اب تک باپ کے پاس اوپر نہیں گیا لیکن میرے بھائیوں کے پاس جا کر ان سے کہو کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ کے اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں، مریم مگدینی نے آ کر شاگردوں کو خبر دی کہ میں نے خداوند کو دیکھا اور اس نے مجھ سے یہ باتیں کہیں۔ پھر اسی دن جو ہفتہ کا پہلا دن تھا شام کے وقت جب وہاں کے دروازے جہاں شاگرد تھے یہودیوں کے ڈر سے بند تھے یسوع آ کر بیچ میں کھڑا ہوا اور ان سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ اور پسلی انہیں دکھائی، پس شاگرد خداوند کو دیکھ کر خوش ہوئے یسوع نے پھر ان سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے اسی طرح میں بھی تمہیں بھیجتا ہوں اور یہ کہہ کر ان کو پھونکا اور ان سے کہا ”روح القدس“ لو۔

ہر ایک شخص معمولی غور و فکر کے بعد بہ سہولت سمجھ سکتا ہے کہ یہ پارہ بیان پہلے حصہ بیان کے ساتھ غیر مربوط اور قطعاً بے جوڑ ہے بلکہ یہ اندازہ لگانا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں تفصیلات ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں کیونکہ پہلا پارہ بیان ایک ایسی شخصیت کا مرقع ہے جو بے بس و بیکس مایوس اور خدا سے شاکی نظر آتی ہے اور دوسرا حصہ بیان ایسی ہستی کا رخ روشن پیش کرتی ہے جو خدائی صفات سے متصف ذات باری کی مقرب اور پیش آمدہ واقعات سے مطمئن و مسرور ہے بلکہ ان کے وقوع کی متمنی اور ان کو اپنے



ادائے فرض کا اہم جزو سمجھتی ہے۔

ہیں تفاوت رہ از کجاست تا کجا

بہر حال حقیقت چونکہ دوسری تھی اور ایک عرصہ دراز کے بعد ”عقیدہ کفارہ“ کی بدعت نے نصاریٰ کو اس کے خلاف اس گھڑے ہوئے افسانہ کی تصنیف پر مجبور کر دیا اس لیے قرآن عزیز نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق دوسرے گوشوں کی طرح اس گوشہ سے بھی جہالت و تاریکی کا پردہ ہٹا کر حقیقت حال کے رخ روشن کو جلوہ آرا کرنا ضروری سمجھا اور اس نے اپنا وہ فرض انجام دیا جس کو مذاہب عالم کی تاریخ میں قرآن کی دعوت تجدید و اصلاح کہا جاتا ہے۔

اس نے بتایا کہ جس زمانہ میں بنی اسرائیل، پیغمبر حق اور رسول خدا (عیسیٰ بن مریم علیہما السلام) کے خلاف خفیہ تدبیروں اور سازشوں میں مصروف اور ان پر نازاں تھے اسی زمانہ میں خدائے برتر کے قانون قضاء و قدر نے یہ فیصلہ نافذ کر دیا کہ کوئی طاقت اور مخالف قوت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام پر قابو نہیں پاسکتی اور ہماری محکم تدبیر اس کو دشمنوں کے ہر ”مکر“ سے محفوظ رکھے گی اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب بنی اسرائیل نے ان پر زغہ کیا تو ان کو پیغمبر خدا پر کسی طرح دسترس حاصل نہ ہو سکی اور ان کو بحفاظت تمام اٹھالیا گیا اور جب بنی اسرائیل مکان میں گھسے تو صورت حال ان پر مشتتبہ ہو گئی اور وہ ذلت اور رسوائی کے ساتھ اپنے مقصد میں ناکام رہے اور اس طرح خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا جو عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی حفاظت کے لیے کیا گیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے یہ محسوس فرمایا کہ اب بنی اسرائیل کے کفر و انکار کی سرگرمیاں اس درجہ بڑھ گئی ہیں کہ وہ میری توہین و تذلیل بلکہ قتل کے لیے سرگرم سازش ہیں تو انہوں نے خاص طور سے ایک مکان میں اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے صورت حال کا نقشہ پیش فرما کر ارشاد فرمایا: امتحان کی گھڑی سر پر ہے، کڑی آزمائش کا وقت ہے، حق کو مٹانے کی سازشیں پورے شباب پر ہیں، اب میں تمہارے درمیان زیادہ نہیں رہوں گا اس لیے میرے بعد دین حق پر استقامت، اس کی نشرو اشاعت اور یاری و نصرت کا معاملہ صرف تمہارے ساتھ وابستہ ہو جانے والا ہے، اس لیے مجھے بتاؤ کہ خدا کی راہ میں سچا مددگار کون کون ہے۔ حواریوں نے یہ کلام حق سن کر کہا: ”ہم سب ہی خدا کے دین کے مددگار ہیں، ہم سچے دل سے خدا پر ایمان لائے ہیں اور اپنی صداقت ایمانی کا آپ ہی کو گواہ بناتے ہیں، اور یہ کہنے کے بعد انسانی کمزوریوں کے پیش نظر اپنے دعویٰ پر ہی بات ختم نہیں کر دی بلکہ درگاہ الہی میں دست بدعا ہو گئے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تو اس پر ہم کو استقامت عطا فرما اور ہم کو اپنے دین کے مددگاروں کی فہرست میں لکھ لے۔“

اس جانب سے مطمئن ہو کر اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے فریضہ دعوت و ارشاد کے ساتھ ساتھ منتظر رہے کہ دیکھتے معاندین کی سرگرمیاں کیا رخ اختیار کرتی ہیں اور خدائے برحق کا فیصلہ کیا صادر ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں قرآن عزیز کے ذریعہ یہود و نصاریٰ کے ظنون و اوہام فاسدہ کے خلاف ”علم و یقین کی روشنی“ بختے ہوئے یہ بھی بتایا کہ جس وقت معاندین اپنی خفیہ تدبیروں میں سرگرم عمل تھے اسی وقت ہم نے بھی اپنی قدرت کاملہ کی مخفی تدبیر کے ذریعہ یہ فیصلہ کر لیا کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے متعلق معاندین حق کی تدبیر کا کوئی گوشہ بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی پوشیدہ تدابیر کے مقابلہ میں کسی کی پیش نہیں جاسکے گی اس لیے کہ اس کی تدبیر سے بہتر کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی۔



﴿وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرٌ الْمَكْرِبِينَ﴾ (آل عمران: ۵۴)

”اور انہوں نے (یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے (یہود کے مکر کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کا مالک ہے۔“

لغت عرب میں ”مکر“ کے معنی خفیہ تدبیر (اور دھوکا کرنے) کے ہیں اور علم معانی کے قاعدہ ”مشاکلہ“ کے مطابق جب کوئی شخص کسی کے جواب یا دفاع (Defence) میں خفیہ تدبیر کرتا ہے تو وہ اخلاق اور مذہب کی نگاہ میں کتنی ہی عمدہ تدبیر کیوں نہ ہو اس کو بھی ”مکر“ ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ ہر ایک زبان کے محاورہ میں بولا جاتا ہے ”برائی کا بدلہ برائی ہے“ حالانکہ ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ برائی کرنے والے کے جواب میں اسی قدر مقابلہ کا جواب دینا اخلاق اور مذہب دونوں کی نگاہ میں ”برائی“ نہیں ہے تاہم تعبیر میں دونوں کو ہم شکل ظاہر کر دیا جاتا ہے اور اسی کو ”مشاکلہ“ کہتے ہیں اور یہ فصاحت و بلاغت کا اہم جز سمجھا جاتا ہے۔

غرض خفیہ تدبیر دونوں جانب سے تھی، ایک جانب برے بندوں کی بری تدبیر اور دوسری جانب خدائے برتر کی بہترین تدبیر، نیز ایک جانب قادر مطلق کی تدبیر کامل تھی جس میں نقص و خامی کا امکان نہیں اور دوسری جانب دھوکے اور فریب کی خام کاریاں تھیں جو تار عنکبوت ہو کر رہ گئیں۔

آخر وہ وقت آ پہنچا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں، کاہنوں، اور فقیہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا، ذات اقدس اور حواری مکان کے اندر بند ہیں اور دشمن چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے ہیں، لہذا اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کیا صورت ہو کہ جس سے دشمن ناکام رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کسی طرح کا بھی گزند نہ پہنچا سکے تاکہ خدائے قادر کا وعدہ حفاظت اور دعویٰ تدبیر خیر پورا ہو تو اس کے متعلق قرآن نے بتایا کہ بیشک خدا کا وعدہ پورا ہوا اور اس کی تدبیر محکم نے عیسیٰ علیہ السلام کو دشمنوں کے ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رکھا اور صورت یہ پیش آئی کہ اس نازک گھڑی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی الہی نے بشارت سنائی: ”عیسیٰ! خوف نہ کر تیری مدت پوری کی جائے گی (یعنی تم کو دشمن قتل نہیں کر سکیں گے اور نہ تم اس وقت موت سے دو چار ہو گے) اور ہو گا یہ کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاء اعلیٰ کی جانب) اٹھالوں گا اور ان کافروں سے ہر طرح تجھ کو پاک رکھوں گا (یعنی یہ تجھ پر کسی قسم کا قابو نہ پاسکیں گے) اور تیرے پیروں کو ان کافروں پر ہمیشہ غالب رکھوں گا (یعنی بنی اسرائیل کے مقابلہ میں قیامت تک عیسائی اور مسلمان غالب رہیں گے اور ان کو کبھی ان دونوں پر حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا، پھر انجام کار میری جانب (موت کے بعد) لوٹ آنا ہے پس میں ان باتوں پر فیصلہ حق دوں گا جن کے متعلق تم آپس میں اختلاف کر رہے ہو۔“

﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ خُذْ هَذِهِ نَفْسًا مِّنْ ذُرِّيَّتِكَ فَألقِهَا فِي السَّمَاءِ فَاتَّبِعْنَهَا فَاكْفُرُوا فِيهَا وَكُفِّرُوا بِنَفْسِكُمْ فَخَرَقْنَا غِيبَابَكَ فَآخَذْنَاكَ بِأَعْيُنِنَا فَوَقَّعْنَاكَ عَلَى الْوَعْدِ أَلَم تَظُنُّ أَنَّكَ مِنَّا بِذُنُوبٍ وَأَنْتَ مُنْجِيٌّ مِّنَّا وَاللَّهُ مَنَّانٌ﴾ (آل عمران: ۵۵)

” (وہ وقت ذکر کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ (علیہ السلام) سے کہا: ”اے عیسیٰ! بے شبہ میں تیری مدت کو پوری کروں گا اور تجھ کو اپنی جانب اٹھالینے والا ہوں اور تجھ کو کافروں (بنی اسرائیل) سے پاک رکھنے والا ہوں اور جو تیری پیروی کریں



گے ان کو تیرے منکروں پر قیامت تک کے لیے غالب رکھنے والا ہوں، پھر میری جانب ہی لوٹنا ہے، پھر میں ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن کے بارے میں (آج) تم جھگڑ رہے ہو۔“

﴿وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۱۱۰﴾﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

(قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اپنے احسانات شمار کراتے ہوئے فرمائے گا) اور وہ وقت یاد کرو جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا (یعنی وہ کسی طرح تجھ پر قابو نہ پاسکے) جبکہ تو ان کے پاس معجزات لے کر آیا اور ان میں سے کافروں نے کہہ دیا: یہ تو جادو کے ماسوا اور کچھ نہیں ہے۔“

تو اب جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ اس سخت محاصرہ کے باوجود دشمن تم کو قتل نہ کر سکیں گے اور تم کو غیبی ہاتھ ملائے اعلیٰ کی جانب اٹھالے گا اور اس طرح دشمنان دین کے ناپاک ہاتھوں سے آپ ہر طرح محفوظ کر دیے جائیں گے تو اس جگہ پہنچ کر ایک دوسرا سوال پیدا ہوا کہ یہ کس طرح ہوا اور واقعہ نے کیا صورت اختیار کر لی؟ کیونکہ یہود و نصاریٰ تو کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کو سولی پر بھی لٹکایا اور مار بھی ڈالاتا قرآن نے بتایا کہ مسیح بن مریم علیہ السلام کے قتل و صلیب کی پوری داستان سرتا سر غلط اور جھوٹ ہے بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب مسیح علیہ السلام کو بقید حیات ملائے اعلیٰ کی جانب اٹھالیا گیا اور اس کے بعد دشمن مکان کے اندر گھس پڑے تو ان پر صورت حال مشتبه کر دی گئی اور وہ کسی طرح نہ جان سکے کہ آخر اس مکان میں سے مسیح علیہ السلام کہاں چلا گیا۔

﴿وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ ۗ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ ۗ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۗ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۱۵۸﴾﴾ (النساء: ۱۵۷-۱۵۸)

اور (یہود ملعون قرار دیے گئے) اپنے اس قول پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم پیغمبر خدا کو قتل کر دیا حالانکہ انہوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ (خدا کی خفیہ تدبیر کی بدولت) اصل معاملہ ان پر مشتبه ہو کر رہ گیا اور جو لوگ اس کے قتل کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں بلاشبہ وہ اس (عیسیٰ علیہ السلام) کی جانب سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس حقیقت حال کے بارے میں ظن (انکل) کی پیروی کے سوا علم کی روشنی نہیں ہے اور انہوں نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے اپنی جانب (ملاء اعلیٰ کی جانب) اٹھالیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔“

قرآن عزیز کا یہ وہ بیان ہے جو یہود و نصاریٰ کے اختراعی فسانہ کے خلاف اس نے حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام کے متعلق دیا ہے اب دونوں بیانات آپ کے سامنے ہیں، اور عدل و انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں۔ پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے دعوت و ارشاد کے مشن کو تاریخی حقائق کی روشنی میں معلوم کیجئے اور اس کے بعد ایک مرتبہ پھر ان تفصیلی واقعات پر نظر ڈالیے جو ایک اولوالعزم پیغمبر، مقرب بارگاہ الہی اور نصاریٰ کے عقیدہ باطل کے مطابق خدا کے بیٹے کو خدا کے فیصلہ کے سامنے مایوس، مضطرب،



بے یار و مددگار اور خدا سے شاکہ کی ظاہر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس تضاد بیان پر بھی غور فرمائیے کہ ایک جانب عقیدہ کفارہ کی بنیاد صرف اس پر قائم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام خدا کا بیٹا بن کر آیا ہی اس غرض سے تھا کہ مصلوب ہو کر دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور دوسری جانب صلیب اور قتل مسیح علیہ السلام کی داستان اس اساس پر کھڑی کی گئی ہے کہ جب وہ وقت موعود آ پہنچتا ہے تو خدا کا یہ فرضی بیٹا اپنی حقیقت اور دنیا میں وجود پذیری کو یکسر فراموش کر کے ”ایلی ایلی لہما سبقتنی“ کا حسرت ناک جملہ زبان سے کہتا اور مرضی الہی پر اپنی ناخوشی کا اظہار کرتا ہوا نظر آیا ہے، کیا کسی شخص کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے کہ اگر نصاریٰ کے بیان کردہ واقعات کے دونوں حصے صحیح اور درست ہیں تو ان دونوں کے باہم یہ تضاد کیسا اور اس عدم مطابقت کے کیا معنی؟

پس اگر ایک حقیقت میں اور دوسری نگاہ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور واقعات و حالات کی ان تمام کڑیوں کو باہم جوڑ کر اس مسئلہ کا مطالعہ کرے تو وہ تصدیق حق کے پیش نظر بلا تامل یہ فیصلہ کرے گی کہ بائبل کی یہ داستان تضاد کی حامل اور گھڑی ہوئی داستان ہے اور قرآن نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ دیا ہے وہی حق اور مبنی بر صداقت ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد سے سینٹ پال سے قبل تک نصاریٰ ”یہود“ کی اس خرافی داستان سے قطعاً بے تعلق تھے لیکن جب سینٹ پال (پولوس رسول) نے تثلیث اور کفارہ پر جدید عیسائیت کی بنیاد رکھی تو کفارہ کے عقیدہ کی استواری کے لیے یہود کی اس خرافی داستان کو بھی مذہب کا جز بنا لیا گیا۔

لیکن واقعہ سے متعلق حد درجہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب کہ چودہ صدیوں سے قرآن حکیم نے عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و جلالت قدر کا اعلان کرتے ہوئے ان کے ”رفع الی السماء“ کی حقیقت کو یہود و نصاریٰ کی خرافی داستان کے خلاف علم و یقین کی روشنی میں نمایاں اور یہود و نصاریٰ کو دلائل و براہین کے ذریعہ لاجواب اور سرنگوں کر دیا تھا تو اس کے مقابلہ میں آج ایک مدعی اسلام، دعویٰ نبوت و مسیحیت کے شوق یا ہندوستان پر مسلط عیسائی حکومت کی خود غرضانہ خوشامد میں یہود و نصاریٰ کے اسی عقیدہ کو دوبارہ زندہ کرنا اور اس پر اپنے ”باطل عقیدہ نبوت“ کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اور پنجاب (قادیان) کا یہ متمنی قرآن عزیز کی تصریحات سے بے نیاز ہو کر نہایت جسارت کے ساتھ ان تمام واقعات کی تصدیق کرتا ہے جو اس سلسلہ میں یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے باطل مزعومہ عقائد کی تکمیل کے لیے اختراع کیے ہیں، وہ کہتا ہے کہ بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود نے اسیر کیا، ان کا ٹھٹھا اڑایا، ان کے منہ پر تھوکا، ان کے طمانچے بھی لگائے، ان کو کانٹوں کا تاج بھی پہنایا اور ان کے علاوہ ہر قسم کی توہین و تذلیل کا سلوک کرنے کے بعد ان کو صلیب پر بھی چڑھایا اور اپنے زعم میں ان کو قتل بھی کر ڈالا البتہ یہود و نصاریٰ کی حرف بحرف تصدیق کے بعد بغیر کسی قرآنی نص، حدیثی روایت اور تاریخی شہادت کے اپنی جانب سے یہ اضافہ کرتا ہے کہ جب شاگردوں کے مطالبہ پر نعرش ان کے حوالہ کر دی گئی اور وہ تجہیز و تکفین کے لیے آمادہ ہوئے تو دیکھا کہ جسم میں جان باقی ہے تب انہوں نے خفیہ طور پر ایک خاص مرہم کے ذریعہ ان کے زخموں کا علاج کیا اور جب وہ چنگے ہو گئے تو پوشیدہ رہ کر کشمیر کو چلے گئے اور وہاں بھی حیات کے آخری لمحوں تک خود کو چھپائے رکھا اور گمنامی میں وہیں انتقال پا گئے، گویا یوں کہیے کہ یہود و نصاریٰ کی مفروضہ داستان میں حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق توہین و تذلیل کے جس قدر بھی پہلو تھے وہ سب تو متمنی کاذب نے قبول کر لیے باقی ان کی عظمت شان اور جلالت مرتبہ سے متعلق پہلو کو داستان سے خارج کر کے اس کے ساتھ ایک ایسا فرضی حصہ جوڑ دیا جس سے ایک جانب نیچر پرستوں کو اپنی جانب مائل کرنے کا سامان مہیا ہو سکے اور دوسری جانب



عیسیٰ علیہ السلام کی باقی زندگی مبارک کو گناہی کے ساتھ وابستہ کر کے توہین و تذلیل کا ایک اور گوشہ جو تشنہ سامان رہ گیا تھا اس کی تکمیل ہو جائے۔ ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾

متنبی پنجاب کو یہ سب کچھ کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس کی جانب ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے اور اس کی تفصیل کے لیے پروفیسر برنی کی کتاب ”قادیانی مذہب“ لائق مطالعہ ہے یا خود متنبی کا ذب کی تصنیفی ہفتوات اس حقیقت کو عریاں کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

ہمارے پیش نظر تو یہ مسئلہ ہے کہ متنبی پنجاب نے کس طرح قرآن حکیم کی نصوص قطعہ کے خلاف یہود و نصاریٰ کے عقیدہ ”توہین“ ”تصلیب“ اور قتل عیسیٰ علیہ السلام کی تائید پر بے جا جسارت کا اقدام کیا اور جس حد تک اختلاف کیا اس میں بھی دعویٰ قرآنی کے خلاف ان کی حیات طیبہ کو نامراد و ناکام اور گناہ ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کی۔

آپ ابھی سن چکے ہیں کہ قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں خدائے تعالیٰ کی نجات سے دعویٰ حفاظت و برتری کو کس قوت بیان کے ساتھ نمایاں کیا ہے:

﴿وَمَكْرُؤًا وَّمَكْرَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَكْرِيْنَ ۗ اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ

كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ (آل عمران: ۵۴-۵۵)

اور پھر کس زور کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دعوائے حفاظت کو اس شان کے ساتھ پورا کیا کہ دشمن کسی حیثیت سے بھی مسیح بن مریم علیہ السلام پر قابو نہ پاسکے اور ہاتھ تک نہ لگا سکے۔

تو اب قابل غور ہے یہ بات کہ ہم دنیا میں روز و شب یہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ اگر کسی صاحب قوت و اقتدار ہستی کے عزیز دوست یا مصاحب کے خلاف ان کا دشمن درپے آزار یا قتل کے درپے ہوتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ ہم صاحب اقتدار ہستی کی اعانت کے بغیر دشمن کے مقابلہ میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے وہ صاحب اقتدار کی جانب رجوع کرتے ہیں اور یہ ہستی ان کو پوری طرح اطمینان دلاتی ہے کہ دشمن ان کو کسی طرح نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ ان تک اس کی دسترس ہی نہیں ہونے دی جائے گی تو ہر ایک اہل عقل اس کا یہی مطلب لیتا ہے کہ اب کسی بھی حالت میں ان کو دشمن کا خطرہ باقی نہیں رہا مگر یہ کہ صاحب اقتدار ہستی یا اپنے وعدہ کا ایفاء نہ کرے اور جھوٹا ثابت ہو اور یا دشمن کی طاقت اتنی زیادہ ہو کہ وہ خود بھی اس حمایت و نصرت میں مغلوب و مقہور ہو کر رہ جائے۔

پس جب انسانی دنیا میں یہ اطلاع موصول ہو کہ صاحب اقتدار ہستی کے عزیز، دوست یا مصاحب کو اس کے دشمن نے گرفتار کر لیا، مارا پیٹا، منہ پر تھوکا اور ہر طرح ذلیل و رسوا کر کے اپنے گمان میں مار بھی ڈالا اور مردہ سمجھ کر نعش اس کے عزیزوں کے سپرد کر دی مگر حسب اتفاق نبض دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کہیں جان انکی رہ گئی ہے لہذا علاج معالجہ کیا گیا اور وہ رو بصحت ہو گیا تو دنیا انسانی اس صاحب اقتدار ہستی کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی جس نے اس مظلوم کی حمایت و نصرت کا وعدہ کیا تھا؟ یہ کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا یا نہیں کیا؟ ظاہر ہے کہ نہیں کیا خواہ قصداً نہیں کیا یا اس لیے کہ وہ مجبور رہا۔

پس اگر دنیا انسانی کے معاملات میں صورت حال یہ ہے کہ معلوم نہیں کہ متنبی پنجاب کے عقل و دماغ نے قادر مطلق خدا کے



متعلق کس ذہنیت کے ماتحت یہ فیصلہ کیا کہ خدا نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو ہر قسم کی حفاظت و صیانت کے وعدہ کے باوجود دشمن کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہونے دیا جس کو یہود و نصاریٰ کی اندھی تقلید میں متنبی پنجاب نے تسلیم کر لیا اور اشک شوقی کے لیے صرف اس قدر اضافہ کر دیا کہ اگرچہ یہود نے صلیب و قتل کے بعد سمجھ لیا تھا کہ روح نفس عنصری سے نکل چکی ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ رمتق جان ابھی غیر محسوس طور پر باقی تھی اس لیے اسی طرح ان کی جان بچ گئی جس طرح موجودہ زمانہ میں اب سے چند سال قبل جیلوں میں پھانسی دینے کا جو طریقہ رائج تھا اس کی وجہ سے کبھی پھانسی پانے کے بعد رمتق جان باقی رہ جاتی تھی اور نعش کی سپردگی کے بعد علاج معالجہ سے وہ اچھا ہو جاتا تھا۔

بہر حال ہم تو اس ذات واحد، قادر مطلق خدا پر ایمان رکھتے ہیں جس نے جب کبھی بھی اپنے خاص بندوں (نبیوں اور رسولوں) سے اس قسم کا وعدہ حفاظت و صیانت کیا ہے تو پھر اس کو پورا بھی ایسی شان سے کیا ہے جو قادر مطلق ہستی کے لیے شایاں اور لائق ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم کے منکرین حق کا معاملہ سورہ نمل میں جس معجزانہ شان کے ساتھ بیان ہوا ہے اس پر غور فرمائیے۔ ارشاد باری ہے:

﴿وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿۵۸﴾ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصٰدِقُونَ ﴿۵۹﴾ وَكَرَرُوا مَكْرًا وَكَرَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۶۰﴾ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۚ إِنَّا دَمَرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۶۱﴾ فَتِلْكَ بَيُوتُهُمْ خَاوِيَةٌ بِمَا ظَلَمُوا ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۶۲﴾ وَانجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۶۳﴾﴾ (النمل: ۵۸-۵۳)

”اور شہر میں نو شخص تھے جو (بہت) مفسد تھے اور کوئی کام صلاح کاری کا نہیں کرتے تھے، انہوں نے آپس میں کہا ”باہم قسمیں کھاؤ کہ ہم ضرور صالح (علیہ السلام) اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے اور پھر اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت موقع پر موجود ہی نہیں تھے اور قسم بخدا ہم ضرور سچے ہیں“ اور انہوں نے (صالح علیہ السلام کے خلاف) خفیہ سازش کی اور ہم نے بھی (ان کی سازش کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور وہ ہماری مخفی تدبیر کو نہیں سمجھتے تھے پس (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) دیکھو! کہ ان کی خفیہ سازشی تدبیر کا کیا حشر ہوا؟ یہ کہ ہم نے ان کو (مفسدوں کو) اور ان کی سرکش قوم کو سب کو ہلاک کر دیا (نگاہ اٹھا کر) دیکھو یہ (قریب ہی) ہیں ان کے گھروں کے کھنڈر ویران ہیں ان کے ظلم کی وجہ سے، بیشک اس واقعہ میں نشانی ہے سمجھ والوں کے لیے اور ہم نے نجات دی ایمان والوں کو جو کہ پرہیزگار تھے۔“ اور پھر مطالعہ کیجئے اس عظیم الشان واقعہ کا جو ہجرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھتا ہے اور سورہ انفال میں دشمنان حق کی ذلت و رسوائی کا ابدی اعلان ہے۔

ان دونوں واقعات میں حق و باطل کے معرکوں، دشمنوں کی خفیہ سازشوں اور انبیاء علیہم السلام کی حفاظت کے لیے وعدہ الہی اور



اس کے بے غل و غش پورا ہونے کا جو نقشہ قرآن عزیز نے پیش کیا ہے، تاریخی نگاہ سے ان پر غور فرمائیے اور فیصلہ کیجئے کہ جس خدا نے صالح علیہ السلام اور خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے وعدہ حفاظت کو اس شان رفیع کے ساتھ پورا کیا ہو۔ کیا متنبی پنجاب کے عقیدہ کے مطابق اسی شان معجزانہ کے ساتھ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں پورا ہوا؟ نہیں ہرگز نہیں، حالانکہ آیات قرآنی شاہد ہیں کہ ان دونوں واقعات کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے کیے گئے وعدے زیادہ واضح تفصیلات رکھتے ہیں اور ان میں صاف کہا گیا ہے کہ خدا کے بہترین مخفی فیصلہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کے دشمن ان کو ہاتھ تک نہ لگا سکیں گے، تب ہی تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے جن احسانات و انعامات کو شمار کرائے گا ان میں سے ایک بڑا انعام و احسان یہ بھی ہوگا۔

﴿وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

اور جبکہ ہم نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا تھا۔

متنبی پنجاب کو اگر اپنی نبوت اور مسیحیت کے افتراء اور ڈھونگ کو مضبوط کرنے کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے خلاف اس درجہ ناگواری تھی جیسا کہ متنبی کا ذب کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے تب بھی یہود و نصاریٰ کی اس اندھی تقلید کے لیے مقابلہ میں جو نصوص قرآنی کے خلاف ”کفر بواح“ تک پہنچاتی اور حضرت مسیح علیہ السلام کی شان رفیع کے حق میں باعث توہین و تذلیل وعدۃ الہی کی تکذیب کرتی ہے ”کیا یہ کافی نہیں تھا۔ کہ تاویل باطل\* کے پردہ میں اتنا ہی کہہ دیا جاتا کہ وہ اگرچہ بقید حیات آسمان پر نہیں اٹھائے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے بند مکان سے کسی طریق پر ان کو دشمنوں کے زرعے سے نکال کر محفوظ کر دیا اور دشمن کسی طرح ان کو نہ پاسکے، لیکن وائے بر حال متنبی قادیان کہ خدا کے سچے پیغمبر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے ساتھ بغض و عناد نے ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ﴾ کا مصداق بنا کر ہی چھوڑا۔

### فتادیانی تلبیس اور اس کا جواب:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس معرکہ الآراء مسئلہ میں ”جو ان کی عظمت اور جلالت کا زبردست نشان ہے“ سورہ آل عمران کی آیات کا باہمی ربط اور ترتیب ذکر کی خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے کہ متنبی کا ذب نے اس میں بھی ”تلبیس الحق بالباطل“ کا ثبوت دے کر ناواقف کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآن عزیز، سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے دشمنوں کے زرعہ میں گھر جانے سے متعلق جس تسلی اور وعدہ کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطری شکل و صورت یہ پیش آئی کہ جب دشمنان دین نے حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا تو ایک اولوالعزم پیغمبر اور خدائے برحق کے درمیان تقرب کا جو رشتہ قائم ہے اس کے پیش نظر قدرتی طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب کیا پیش آنے والا ہے، راہ حق میں جاں سپاری یا قدرت الہی کا کوئی اور کرشمہ؟ اور اگر دشمنوں سے تحفظ کے لیے کوئی کرشمہ پیش آنے والا ہے تو اس کی کیا شکل ہوگی کیونکہ بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا؟ اور اگر تحفظ ہوا بھی تو کیا کچھ مصائب

\* تاویل باطل اس لئے کہ حیات عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دیگر نصوص قرآنی، حدیثی اور اجماع امت کے پیش نظر اس مقام پر یہ تاویل بلاشبہ ”باطل“ ہے مگر اس سے کم از کم حضرت مسیح علیہ السلام کی توہین اور وعدۃ الہی کی تکذیب کا پہلو نہیں نکلتا۔



وآلام اٹھانے کے بعد تحفظ جان ہوگا یا دشمن کسی بھی صورت میں قابو نہ پاسکیں گے؟ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قلب میں فطری طور پر پیدا ہونے والے سوالات کا ترتیب وار اس طرح جواب دیا: ”عیسیٰ! میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں تیری مقررہ مدت حیات پوری کروں گا یعنی مطمئن رہو کہ تجھ کو دشمن قتل نہ کر پائیں گے“ ﴿إِنِّي مُتَوَقِّئُكَ﴾ اور صورت یہ ہوگی کہ اس وقت میں تجھ کو اپنی جانب یعنی ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھالوں گا“ ﴿وَرَأْفَعُكَ إِلَيَّ﴾ اور یہ بھی اس طرح نہیں کہ پہلے سب کچھ مصائب ہو گزریں گے اور پھر ہم تجھ کو آخر میں علاج معالجہ کرا کر اٹھائیں گے، نہیں بلکہ یوں ہوگا کہ تو دشمن کے ناپاک ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رہے گا اور کوئی دشمن تجھ کو ہاتھ تک نہ لگا سکے گا ﴿وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ یہ تو تمہارے فطری سوالات کا جواب ہوا لیکن اس سے بھی زیادہ ہم یہ کریں گے کہ جو تیرے پیرو ہیں (خواہ غلط کار ہوں جیسا کہ نصاریٰ اور خواہ صحیح العقیدہ ہوں جیسا کہ مسلمان) ان کو قیامت تک یہود پر غالب رکھیں گے اور تا قیامت قیامت کبھی ان کو حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا، باقی رہا تمام معاملات کا فیصلہ، سو اس کے لیے (قیامت کا) دن مقرر ہے اس روز سب اختلافات ختم ہو جائیں گے اور حق و باطل کا دو ٹوک فیصلہ کر دیا جائے گا۔

زیر بحث آیات کی یہ تفسیر جس طرح سلف صالحین اور اجماع امت کے مطابق ہے اسی طرح اس میں آیات میں کیے گئے متعدد وعدوں کی ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر مرزائے قادیانی نے اپنی ”مسند مسیحیت و نبوت“ کو قائم کرنے کے لیے قرآن، احادیث صحیحہ اور اجماع امت کے خلاف جبکہ یہ دعویٰ کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت ہو چکی تو اس سلسلہ کی آیات میں تحریف معنوی کی ناکام سعی کو بھی ضروری سمجھا اور دعویٰ کیا کہ اگر مسیح علیہ السلام کی موت کے وقوع کو رفع الی السماء اور تطہیر اور تفوق المطہین علی الکافرین سے قبل تسلیم نہ کیا جائے گا تو ترتیب ذکر میں فرق آ جائے گا اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم ماننا پڑے گا اور یہ قرآن عزیز کی شان بلاغت کے خلاف ہے۔ لہذا یہ ماننا چاہیے کہ ﴿إِنِّي مُتَوَقِّئُكَ﴾ کے وعدہ کا وقوع ہو چکا اور عیسیٰ علیہ السلام پر موت آ چکی۔

مرزائے قادیانی کی یہ ”تلبیس“ اگرچہ ان حضرات سے تو پوشیدہ نہیں رہ سکتی جو عربیت اور قرآن کے اسلوب بیان کا ذوق رکھتے ہیں لیکن عوام کو مغالطہ میں ڈال سکتی ہے اس لیے اس عنوان کے شروع ہی میں آیات کی تفسیر کو اس طرح بیان کر دیا گیا کہ مرزا کی جانب سے جو تلبیس کی گئی ہے وہ خود بخود ذائل ہو جائے تاہم مزید تشریح کے لیے یہ اور اضافہ ہے کہ ترتیب ذکر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام میں اگر چند باتیں ترتیب وار ذکر کی گئی ہیں تو ان کا وقوع بھی اس طرح ہونا چاہیے کہ اس کلام میں ذکر کردہ ترتیب بگڑنے نہ پائے اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنا نہ پڑے اور یہ جب ضروری ہے کہ کلام کی فصاحت و بلاغت کا تقاضا ہی یہ ہو کہ ترتیب ذکر میں فرق نہ آنے پائے ورنہ تو بعض مقامات پر تقدیم و تاخیر کو بھی فصاحت کی جان سمجھا جاتا ہے اور یہ علم معانی کا مشہور مسئلہ ہے۔

پس قرآن کی ان آیات میں جمہور اہل اسلام کی تفسیر کے مطابق ترتیب ذکر بحالہ قائم ہے اس لیے کہ خدا کی جانب سے پہلا وعدہ یہ ہے کہ میں تمہاری مقررہ مدت پوری کروں گا ﴿إِنِّي مُتَوَقِّئُكَ﴾ یعنی تمہاری موت ان دشمنوں کے ہاتھ سے نہیں ہوگی بلکہ تم اپنی طبعی موت سے مرو گے مگر اس پہلے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے متعدد صورتیں ہو سکتی تھیں، یہ کہ دشمنوں پر باہر سے اچانک حملہ ہو جائے اور وہ فرار ہو جائیں یا سب وہیں کھیت رہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام ان کی زد سے بچ جائیں، یا یہ کہ قوم عاد و ثمود کی طرح زمین یا آسمان سے قدرتی عذاب آ کر ان سب کو ہلاک کر دے، یا یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کسی ترکیب سے ان کے نرغہ میں سے محفوظ نکل



جائیں اور ان کی دسترس سے باہر ہو جائیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرشمہ قدرت سے عیسیٰ علیہ السلام کو مکان بند رہتے ہوئے ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھالے وغیرہ وغیرہ۔ تو قرآن نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ پہلے وعدہ کا ایفاء مسطورہ بالا آخری شکل یعنی ﴿وَرَافِعُكَ اِلٰی﴾ کی شکل میں ہوگا اور ہوگا بھی ایسی قدرت کاملہ کے ہاتھوں کہ اس محاصرہ کے باوجود دشمن اپنے ناپاک ہاتھ تجھ کو نہیں لگا سکیں گے اور میں ان کافروں کے ہاتھ سے تجھ کو پاک رکھوں گا ﴿وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ اور ان باتوں کے علاوہ یہ بھی ہوگا کہ میں تیرے پیروؤں کو تیرے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا، بہر حال بعد کے یہ تینوں وعدے بالترتیب جب ہی عمل میں آئیں گے کہ پہلے وعدہ اول وقوع پذیر ہو جائے یعنی تیری موت ان کے ہاتھوں نہ ہو بلکہ اپنی مقررہ مدت پر پہنچ کر طبعی موت آئے۔ ان آیات میں پہلے وعدہ کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ میں اول تجھ کو ماروں گا اور پھر بالترتیب یہ سب امور انجام دوں گا، کیونکہ یہ قول صرف جاہل ہی کہہ سکتا ہے لیکن جس کو گفتگو کا معمولی بھی سلیقہ ہے وہ ہرگز ایسا کہنے کی جزأت نہیں کرے گا کیونکہ ترتیب ذکر کے لیے یہ تو ہونا چاہیے کہ ان امور کے وقوع میں ایسی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ ترتیب میں فرق لا کر تقدیم و تاخیر کا عمل جراحی کرنا پڑے لیکن اگر کوئی شے زمانہ کا امتداد اور طوالت چاہتی ہے اور اس کا آخری حصہ وقوع ان تمام امور کے بعد پیش آتا ہے جو اس کے بعد مذکور تھے مگر ترتیب ذکر میں مطلق کوئی فرق نہیں آتا تو ایسی شکل میں اس وقوع کے متاخر ہو جانے سے کسی عالم کے نزدیک بھی کلام کی فصاحت و بلاغت میں نقص واقع نہیں ہوتا اور نہ اس قسم کے وقوع ترتیبی کا ترتیب ذکر کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا ہے۔

پس مسئلہ زیر بحث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی موت کا وقوع کبھی بھی ہو اس کا ترتیب ذکر سے مطلق کوئی علاقہ نہیں ہے یہاں تو ﴿اِنِّیْ مُتَوَقِّئُكَ﴾ کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ دیے گئے متعدد وعدوں میں پہل اور اولیت اس وعدہ کو حاصل ہے کہ تمہاری موت کا سبب یہ یہود بنی اسرائیل نہیں ہوں گے بلکہ جب بھی یہ مقررہ مدت پوری ہوگی اس طریق پر ہوگی جو عام طور سے میری جانب منسوب کی جاتی ہے (یعنی طبعی موت) اور یہ وعدہ بہر حال باقی تین وعدوں سے پہلے ہی رہا تب ہی تو یہ تینوں وعدے وقوع میں آسکے، اور اگر کہیں دشمن حضرت مسیح علیہ السلام کی موت کا سبب بن گئے ہوتے تو پھر ”رفع“ اور ”تطہیر“ کے لیے کوئی صورت ہی نہ رہ جاتی اور مرزا قادیانی کی طرح باطل اور رکیک تاویلات کی آڑ لینی پڑتی اور آیات زیر بحث کی ”روح“ فنا ہو کر رہ جاتی اور یہ اس لیے کہ اگر ”رفع“ سے رفع روحانی اور ”تطہیر“ سے روحانی پاکی مراد لیے جائیں تو یہ قطعاً بے محل اور بے موقع ہوگا کیونکہ قرآن کے ارشاد کے مطابق یہ وعدے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیے جا رہے ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ بتانا کہ تمہارے متعلق یہود کا یہ اعتقاد ”کہ تم کاذب اور ملعون ہو“ غلط ہے اور تم مطمئن رہو کہ میں تمہارا رفع روحانی کرنے والا ہوں قطعاً عبث تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر خدا ہیں اور جانتے ہیں کہ یہود کا افتراء کیا حقیقت رکھتا ہے، نیز یہود کو حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع روحانی کا پتہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ معاملہ عالم غیب سے متعلق ہے تو خدائے برتر کا یہ ارشاد نہ حضرت مسیح علیہ السلام کی بر محل تسلی کا باعث ہو سکتا تھا اور نہ یہود کے لیے سود مند اور یہی حال دوسرے وعدہ ”تطہیر“ کا ہے بلکہ جب بقول قادیانی یہود کے ہاتھوں حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھا دیے گئے تو نعرش پالینے کے بعد شاگردوں کا مرہم عیسیٰ لگا کر چنکا کر لینے اور پھر منجانب اللہ جن کی ہدایت و ارشاد کے لیے مامور کیے گئے تھے ان سے جان بچا کر بھاگ جانے اور زندگی بھر گنہامی میں زندگی بسر کرتے رہنے کے بعد ﴿رَافِعُكَ اِلٰی﴾ اور ﴿وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ کہہ دینے سے نہ یہود کے عقیدہ متعلق حضرت مسیح علیہ السلام کی ہی تردید ہوگی اور نہ ایک غیر جانبدار انسان ہی یہ سمجھ سکے گا کہ ایسے موقع پر



جبکہ عیسیٰ علیہ السلام دشمنوں کے زرخے میں ہیں اور جبکہ ان کو یہ یقین ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور موت کے بعد روحانی اور تطہیر لازم شے ہے، ان تسلیوں اور وعدوں کا کیا فائدہ ہے خصوصاً جبکہ ان کے ساتھ دشمن نے وہ سب کچھ کر لیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔

البتہ جمہور اہل حق کی تفسیر کے مطابق آیات قرآنی کی روح اپنی معجزانہ بلاغت کے ساتھ پوری طرح ناطق ہے کہ یہ وعدے حضرت مسیح علیہ السلام سے جس طرح کیے گئے وہ بر محل اور فطری اضطراب کے لیے بلاشبہ باعث تسکین ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کا وقت کے یہود و نصاریٰ کے وراثتی عقائد باطلہ کی تردید کے لیے کافی اور مدلل۔

جمہور اہل حق کی یہ تفسیر ”توفی“ کے معنی ”مقررہ مدت پوری کرنا“ اختیار کر کے کی گئی ہے جس کا حاصل (توفی بمعنی موت) نکلتا ہے لیکن توفی کے یہ حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ بطور کنایہ کے مستعمل ہوئے ہیں کیونکہ لغت عرب میں اس کا مادہ (میٹر) وئی، یفی، وفاء ہے جس کے معنی ”پورا کرنے“ کے آتے ہیں اور اس کو جب باب تفاعل میں لے جا کر ”توفی“ بناتے ہیں تو اس کے معنی ”کسی شے کو پورا پورا لے لینا“ یا ”کسی شے کو سالم قبضہ میں کر لینا“ آتے ہیں (توفی اخذہ وافیاً تاماً یقال ”توفیت من فلان مالی علیہ“) اور چونکہ موت میں بھی، اسلامی عقیدہ کے مطابق روح کو پورا لے لیا جاتا ہے اس لیے کنایہ کے طور پر ”کہ جس میں حقیقی معنی بحالہ محفوظ رہا کرتے ہیں ”توفی بمعنی موت“ مستعمل ہوتا ہے اور کہتے ہیں ”توفاه اللہ ای اماتہ“ لیکن اگر موقع پر دوسرے دلائل ایسے موجود ہوں جن کے پیش نظر توفی کے حقیقی معنی لیے جاسکتے ہوں یا حقیقی کے ماسوا دوسرے معنی بن ہی نہ سکتے ہوں تو اس مقام پر خواہ فاعل ”اللہ تعالیٰ“ اور مفعول ”ذی روح انسان“ ہی کیوں نہ ہو وہاں حقیقی معنی ”پورا لے لینا“ ہی مراد ہوں گے مثلاً آیت:

﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا﴾ (الزمر: ۴۲)

اللہ پورا لے لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو جن کو ابھی موت نہیں آئی ہے پورا لے لیتا ہے نیند میں ﴿وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ﴾ کے لیے بھی لفظ ”توفی“ بولا گیا یعنی ایک جانب یہ صراحت کی جا رہی ہے کہ یہ وہ جانیں (نفوس) ہیں جن کو موت نہیں آئی اور دوسری جانب یہ بھی بصراحت کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیند کی حالت میں ان کے ساتھ ”توفی“ کا معاملہ کرتا ہے تو یہاں اللہ تعالیٰ فاعل ہے ”متوفی“ اور نفس انسانی مفعول ہے ”متوفی“ مگر پھر بھی کسی صورت سے ”توفی بمعنی موت“ صحیح نہیں ہیں ورنہ تو قرآن کا جملہ ﴿وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ﴾ العیاذ باللہ مہمل ہو کر رہ جائے گا، یا مثلاً:

﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ﴾ (الانعام: ۶۰)

(اور وہی (اللہ) ہے جو پورا لے لیتا یا قبضہ میں کر لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو تم کھاتے ہو دن میں) میں بھی کسی طرح توفی بمعنی موت نہیں بن سکتے حالانکہ توفی کا فاعل اللہ اور مفعول انسانی نفوس ہیں یا مثلاً آیت:

﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾ (الانعام: ۶۱)

یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت قبض کر لیتے ہیں یا پورا لے لیتے ہیں اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) میں ذکر موت ہی کا ہو رہا ہے لیکن پھر بھی ﴿تَوَفَّتْهُ﴾ میں توفی کے معنی موت کے نہیں بن سکتے ورنہ بے فائدہ تکرار لازم آئے گا، یعنی



﴿أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ میں جب لفظ ”موت“ کا ذکر آچکا تو اب ﴿تَوَفَّيْتَهُ﴾ میں بھی اگر توفی کے معنی موت ہی کے لیے جائیں تو ترجمہ یہ ہوگا، یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت، موت لے آتے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں دوبارہ لفظ موت کا ذکر بے فائدہ ہے اور کلام فصیح و بلیغ اور معجز تو کیا روزمرہ کے محاورہ اور عام بول چال کے لحاظ سے بھی پست اور لا طائل ہو جاتا ہے البتہ اگر ”توفی“ کے حقیقی معنی ”کسی شے پر قبضہ کرنا یا اس کو پورا لے لینا“ مراد لیے جائیں تو قرآن عزیز کا مقصد ٹھیک ٹھیک ادا ہوگا اور کلام بھی اپنے حد اعجاز پر قائم رہے گا۔

اب ہر ایک عاقل غور کر سکتا ہے کہ یہ دعویٰ کرنا کہ ”توفی“ کے حقیقی معنی موت کے ہیں۔ خصوصاً جبکہ فاعل خدا ہو اور مفعول ذی روح کہاں تک صحیح اور درست ہے۔

بہر حال اس موقع پر ”موت“ اور ”توفی“ دونوں کا ساتھ ساتھ بیان ہونا اور دونوں کا ایک ہی معمول ہونا اور پھر دونوں کے معنی میں فرق و تفاوت اس بات کے لیے واضح دلیل ہے کہ یہ دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں اور جس طرح لیٹ و اسد بمعنی شیر) ابل و جل بمعنی اونٹ) نون و حوت بمعنی مچھلی) وغیرہ اسماء کا اور جمع، شمل، کسب بمعنی جمع ہونا) اور لبث مکث بمعنی ٹھہرنا) اور عطش، ظما پیاس) اور جوع، سغب بمعنی بھوک) مصادر کا حال ہے، موت اور توفی کے درمیان وہ معاملہ نہیں ہے بلکہ ان کے حقیقی معانی میں نمایاں فرق ہے۔ اور مثلاً آیت:

﴿فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّيَهُنَّ الْمَوْتُ﴾ (النساء: ۱۵)

”پس رو کے رکھو ان (عورتوں) کو گھروں میں یہاں تک کہ لے لے ان کو موت“

میں موت کو فعل توفی کا فاعل قرار دیا گیا ہے اور ہر ایک زبان کی نحو (گرامر) کا یہ مسئلہ ہے کہ فاعل اور فعل ایک نہیں ہوتے کیونکہ فعل، فاعل سے صادر ہوتا ہے، عین ذات فاعل نہیں ہوا کرتا تو اس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ توفی کے حقیقی معنی ”موت“ کے ہرگز ہرگز نہیں ہیں، ورنہ اس کا اطلاق جائز نہیں ہو سکتا تھا۔ ان تین مقامات کے علاوہ سورہ بقرہ کی آیت:

﴿ثُمَّ تَوَفَّي كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ (البقرہ: ۲۸۱)

پھر پورا دیا جائے گا ہر ایک نفس کو جو کچھ اس نے کمایا ہے۔  
اور سورہ نحل کی آیت:

﴿وَتَوَفَّي كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ﴾ (النحل: ۱۱۱)

”اور پورا دیا جائے گا ہر نفس کو جو کچھ اس نے کمایا۔“

میں بھی توفی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول نفس انسانی ہے تاہم یہاں توفی بمعنی موت نہیں بن سکتے اور بہت واضح اور صاف بات ہے۔ غرض ان آیات میں باوجود اس امر کے کہ ”توفی“ کا فاعل اللہ تعالیٰ اور اس کا مفعول ”انسان یا نفس انسانی“ ہے پھر بھی باجماع اہل لغت و تفسیر ”موت کے معنی“ نہیں ہو سکتے خواہ اس لیے کہ دلیل اور قرینہ اس معنی کے خلاف ہے اور یا اس لیے کہ اس مقام



پر توفی کے حقیقی معنی (پورالے لینا یا قبض کر لینا) کے ماسواء ”موت کے معنی“ کسی طرح بن ہی نہیں سکتے۔  
تو مرزائے قادیانی کا یہ دعویٰ کہ ”توفی“ اور ”موت“ مرادف الفاظ ہیں یا یہ کہ توفی کا فاعل اگر اللہ تعالیٰ اور مفعول،  
انسان یا نفس انسانی ہو تو اس جگہ صرف ”موت“ ہی کے معنی ہوں گے، دونوں دعوے باطل اور نصوص قرآنی کے قطعاً مخالف ہیں۔  
﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝﴾

توفی اور موت یقیناً مترادف الفاظ نہیں ہیں اور توفی کے حقیقی معنی ”موت“ نہیں بلکہ ”پورالے لینا یا قبض کر لینا“ ہیں۔ قرآن  
عزیز سے اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ پورے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی موت کا فاعل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا گیا  
مگر اس کے برعکس توفی کا فاعل متعدد مقامات پر ملائکہ (فرشتوں) کو ٹھہرایا ہے مثلاً سورہ نساء میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْتُمُ الْمَلَائِكَةَ﴾ (النساء: ۹۷)

”بیشک وہ لوگ جن کو فرشتوں نے قبض کر لیا یا پورا پورا لے لیا۔“

اور سورہ انعام میں ہے: ﴿تَوَفَّيْتَهُ رُسُلَنَا﴾ ”قبض کر لیا یا پورا لے لیا“ اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتوں) نے اور سورہ  
سجدہ میں ہے ﴿قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ﴾ (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے، قبض کرے گا تم کو موت کا فرشتہ)“ اور سورہ انفال میں  
ہے: ﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ﴾ (الانفال: ۵۰) ”اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ قبض کرتے ہیں فرشتے ان  
لوگوں (کی روحوں) کو جنہوں نے کفر کیا ہے۔“

ان تمام مقامات پر اگرچہ توفی ”کنایہ“ بمعنی موت استعمال ہوا ہے لیکن پھر بھی چونکہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی بجائے ملائکہ  
اور ملک الموت کی جانب ہو رہی تھی اس لیے لفظ ”توفی“ کا اطلاق کیا گیا اور لفظ ”موت“ استعمال نہیں کیا گیا اور یہ صرف اس لیے کہ  
موت تو اللہ کا فعل ہے اور موت کے وقت انسان کا یعنی روح انسانی کا قبض کرنا اور اس کا پورا پورا لے لینا یہ فرشتوں کا عمل ہے، تو جن  
مقامات میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جب خدا کسی کی اجل پوری کر دیتا اور موت کا حکم صادر فرماتا ہے تو اس کی صورت عمل کیا پیش آتی ہے  
ان مقامات میں موت کا اطلاق ہرگز موزوں نہیں تھا بلکہ ”توفی“ کا لفظ ہی اس حقیقت کو ادا کر سکتا تھا۔

موت اور توفی کے درمیان قرآنی اطلاقات کے پیش نظر ایک بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ ”موت“ اور  
”حیات“ کو تو مقابل ٹھہرایا ہے لیکن ”توفی“ کو کسی ایک مقام پر بھی ”حیات“ کا مقابل قرار نہیں دیا۔ مثلاً سورہ ملک میں ہے:

﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ.....﴾ (الملك: ۲)

”خدا ہی وہ ذات ہے جس نے پیدا کیا موت کو اور زندگی کو۔“ اور سورہ فرقان میں ہے:

﴿وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيَاةً﴾ (الفرقان: ۳)

”اور وہ نہیں مالک ہیں موت کے اور نہ حیات کے۔“

اور اسی طرح ان دونوں کے مشتقات کو مقابل ٹھہرایا ہے مثلاً: ﴿كَيْفَ تَحْيِي الْمَوْتَى﴾ (البقرہ) ﴿يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (روم)



﴿فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (البقرہ) ﴿وَأُنحَى الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (آل عمران) ﴿وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَى﴾ (شوری) (وغیر ذلک کثیراً) البتہ توفی کے حقیقی معنی میں چونکہ یہ وسعت موجود ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے موت کی جو حقیقت ہے بطریق کنایہ اس پر بھی حسب موقعہ اس کا اطلاق ہو سکتا ہے تو یہ استعمال اور اطلاق بھی جائز ٹھہرا اور اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔

”توفی“ کے معنی کی اس مفصل تشریح و توضیح کا حاصل یہ ہوا کہ لغت عرب اور قرآنی اطلاقات دونوں اس کے شاہد ہیں کہ توفی اور موت دونوں کے حقیقی معنی میں بھی اور دونوں کے اطلاقات میں بھی واضح فرق ہے اور دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں خواہ توفی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول ”انسان اور روح انسانی“ ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اسلامی نقطہ نظر سے چونکہ موت ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس پر بطریق ”توسع“ اور ”کنایہ“ توفی کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ پس جس مقام پر قرینہ اور محل استعمال کا تقاضا یہ ہوگا کہ وہاں توفی بول کر کنایہ موت کے معنی لیے جانے چاہئیں تو اس جگہ ”موت“ کے معنی مراد ہوں گے لیکن اس کے برعکس اگر دلیل، قرینہ اور محل استعمال حقیقی معنی کا متقاضی ہے تو اس جگہ وہی معنی مراد ہوں گے اور ان ہی کو مقدم سمجھا جائے گا خواہ کنائی معنی وہاں قطعاً نہ بن سکتے ہوں اور خواہ بن سکتے ہوں مگر محل استعمال اور دوسرے دلائل اس کو مرجوح یا ممنوع قرار دیتے ہوں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد لغت کے مشہور امام ابوالبقاء نے یہ تصریح کی ہے کہ عوام میں توفی کے معنی اگرچہ ”موت“ کے سمجھے جاتے ہیں مگر خواص کے نزدیک اس کے معنی ”پورالے لینا“ اور ”قبض کرنا“ ہیں فرماتے ہیں:

التوفى الاماتة وقبض الروح وعليه استعمال العامة والاستيفاء واخذ الحق وعليه استعمال البلغاء.

الحاصل، سورہ مائدہ کی آیت ﴿إِنِّي مُتَوَقِّئُكُمْ﴾ میں اگر حقیقی معنی مراد ہوں، جیسا کہ جلیل القدر علماء تفسیر و لغت نے اختیار کیے ہیں۔ تب بھی مرزائے قادیانی کے علی الرغم آیات زیر بحث کا یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ تسلی دی گئی ”اے عیسیٰ! میں تجھ کو پورا پورالے لینے والا ہوں یا تجھ کو قبض کرنے والا ہوں اور صورت یہ ہوگی کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاء اعلیٰ کی جانب) اٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں سے پاک رکھنے والا ہوں۔۔۔ الخ“ یعنی جب شروع میں یہ بتایا کہ تجھ کو قبض کر لیا جائے گا یا پورا لے لیا جائے گا تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ قبض کرنے اور پورا لے لینے کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً ایک یہ کہ موت آجائے اور روح کو قبض کر لیا جائے اور پورا لے لیا جائے اور دوسری یہ کہ زندہ ملاء اعلیٰ کی جانب (اپنی جانب) اٹھا لیا جائے تو یہاں کون سی صورت پیش آئے گی۔ پس اس کو صاف اور واضح کرنے کے لیے کہا گیا کہ دوسری شکل اختیار کی جائے گی تاکہ دشمنوں کی سازشوں کے مقابلہ میں معجزانہ تدبیر کے ذریعہ وعدہ الہی ﴿وَمَكْرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْكَائِبِينَ﴾ پورا ہو اور ﴿وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ﴾ کا عظیم الشان مظاہرہ ہو جائے اور ”توفی“ اور ”رفع“ ہو جانے پر نتیجہ یہ نکلے کہ ذات اقدس کافروں کے ہاتھ سے ہر طرح محفوظ ہو جائے اور اس طرح وعدہ ربانی ﴿وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ بغیر کسی تاویل کے صحیح ہو جائے اور تاویل باطل کے ذریعہ شک اور تردد یا حقیقت حال سے انکار صرف ان ہی قلوب کا حصہ رہ جائے جو قرآن سے علم حاصل کرنے کی بجائے اول اپنے ذاتی اوہام و ظنون کو راہنما بناتے اور پھر قرآن کے منطوق و مفہوم کے خلاف اس کے منہ میں اپنی زبان رکھ دینا چاہتے ہیں اور اس سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جو وہ خود کہنا نہیں چاہتا مگر وہ قرآن عزیز کی اس صفت سے غافل رہتے ہیں:



﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَبِيدٍ﴾ (السجده: ۴۲)

”اس قرآن کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے سے (کسی جانب سے بھی) باطل نہیں پھٹک سکتا، یہ اتارا ہوا ہے ایسی ہستی کی جانب سے جو حکمت والی، خوبیوں والی ہے۔“

متنبی پنجاب کو جب قرآن عزیز کی ان نصوص سے متعلق تحریف معنوی میں ناکامی ہوئی اور خسران کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تو مجبور ہو کر اور قرآن عزیز کے اطلاقات، احادیث صحیحہ کی اطلاعات اور اجماع امت کے فیصلہ کو پس پشت ڈال کر ”فلسفہ“ کی آغوش میں پناہ لینے کا ارادہ کیا اور اپنی تصانیف میں یہ ہرزہ سرائی کی کہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام آسمان پر زندہ اٹھالیے گئے تو یہ عقل کے خلاف ہے اس لیے کہ کوئی مادی جسم ملاء اعلیٰ تک پرواز نہیں کر سکتا اور کبھی جاتا تو اتنی طویل مدت کیسے زندہ ہے اور وہاں کھانے، پینے اور رفع حاجت کرنے کی صورت کیسے عمل میں آ سکتی ہے؟

قدرت الہی کے معجزانہ افعال کو خلاف عقل کہہ کر بات اگر ختم ہو سکتی تو شاید قادیانی کی یہ فلسفیانہ موشگافی درخور اعتناء سمجھی جا سکتی۔ لیکن آج فلسفہ جدید بہ شکل سائنس ترقی کر کے جس حد تک پہنچ چکا ہے وہاں نظریات (Theores) نہیں بلکہ مشاہدات اور عملیات (Practicles) اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ فضاء کے موانعات کو اگر آہستہ آہستہ ہٹا دیا جائے یا ان کو ضبط (Control) میں لے آیا جائے تو مادی جسم کے لیے غیر معلوم بلندی تک پہنچنا ممکن العمل ہو جائے گا اور اس کے لیے جو جدوجہد وہ کر رہے ہیں اس کو ممکن العمل سمجھ کر ہی کر رہے ہیں اور سائنٹیفک (Scientific) طریقہ پر کر رہے ہیں، پس اگر آج کا انسان میلوں اوپر ہوائی جہاز کے ذریعہ جاسکتا ہے اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہزاروں میل سے مادی انسان کے ساتھ باتیں کرتے وقت اس کے جسم کی تصویر لے سکتا ہے اور ہوا اور آفتاب کی لہروں اور شعاعوں پر کنٹرول کر کے ہزاروں میل تک اپنی آواز کو بذریعہ ریڈیو نشر کر سکتا ہے اور ہزاروں برس کے گزرے ہوئے واقعات کو فضاء میں نظم کر کے آج اس طرح سنا سکتا ہے گویا وہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے تو اس انسان کے خالق بلکہ خالق کائنات کے متعلق ازراہ تفلسف یہ کہنا کہ وہ مادی جسم کو ملاء اعلیٰ تک کیسے لے جاسکتا ہے اپنی غباوت پر مہر کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

اور اگر ادویات اور غذاؤں اور حفظان صحت کے مختلف طریقوں سے عمر طبعی کو دو گنا اور تین گنا کیا جاسکتا اور کیا جا رہا ہے نیز اگر مختلف غذاؤں کے اثرات و نتائج میں یہ فرق ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ کسی سے فضلہ زیادہ بنے اور کسی سے بہت کم بنے اور کسی سے قطعاً نہ بنے بلکہ وہ خالص خون کی شکل میں تحلیل ہو جائے اور اگر انسان اپنی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ روحانی قوت کو بڑھا کر آج اس دنیا میں دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں بغیر خورد و نوش زندہ رہ سکتا ہے تو مجبور انسانوں کی ان کامیاب کوششوں کو صحیح سمجھنے کے باوجود خالق ارض و سماوات کی جانب حضرت مسیح علیہ السلام کی رفعت آسمانی پر مسطورہ بالاشکوک پیش کرنا یا ان کے پیش نظر ان کی بجمد عنصری ملاء اعلیٰ تک پہنچنے اور وہاں زندہ رہنے کا انکار کرنا اگر جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص علمی حقائق سے نا آشنا اور علوم قرآن سے محروم ہے وہ ”خلاف عقل“ اور ”ماوراء عقل“ ان دونوں باتوں کے درمیان فرق کرنے سے عاجز ہے اور اس لیے ہمیشہ ماوراء عقل کو خلاف عقل کہہ کر پیش کرتا رہتا ہے۔

دراصل انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ صرف دو ہی باتیں ہیں ایک یہ کہ انسان ”عقل“ سے اس درجہ بے بہرہ ہو جائے



کہ ہر ایک بات بے سمجھے بوجھے مان لے اور اندھوں کی طرح ہر ایک راہ پر چلنے لگے، دوسری بات یہ کہ جو حقیقت بھی عقل سے بالاتر نظر آئے اس کو فوراً جھٹلا دے اور یہ یقین کر لے کہ جس شے کو اس کی سمجھ یا چند انسانوں کی سمجھ ادراک نہیں کر سکتی وہ شے حقیقتاً وجود نہیں رکھتی اور تکذیب کے لائق ہے حالانکہ بہت سی باتیں وہ ہیں جو ایک دور کے تمام عقلاء کے نزدیک ماوراء عقل سمجھی جاتی ہیں، اس لیے کہ ان کی عقلیں ان باتوں کا ادراک کرنے سے عاجز رہیں مگر وہی باتیں علمی ترقی کے دوسرے دور میں جا کر نہ صرف ممکن الوقوع قرار پاتی بلکہ مشاہدہ اور تجربہ میں آ جاتی ہیں پس اگر ہر ایک وہ شے جو کسی ایک انسان یا جماعت یا اس کے دور کے تمام اہل عقل کے نزدیک ماوراء عقل تھی ”خلاف عقل“ کہلانے کی مستحق تھی تو وہ دوسرے دور میں کیوں عقل کے لیے ممکن ہوئی بلکہ مشاہدہ میں آ گئی۔

قرآن عزیز نے گمراہی کی اس پہلی حالت کو (جہل، ظن، خرس، انکل) سے تعبیر کیا ہے اور دوسری حالت کو ”الحاذ“ کہا ہے اور یہ دونوں حالتیں ”علم و عرفان“ سے محرومی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ خلاف عقل اور ماوراء عقل کے درمیان یہ فرق ہے کہ خلاف عقل بات وہ ہو سکتی ہے جس کے نہ ہو سکنے کے متعلق علم و یقین کی روشنی میں مثبت دلائل و براہین موجود ہوں اور عقل، دلیل و برہان اور علم یقین سے یہ ثابت کرتی ہو کہ ایسا ہونا ناممکن اور محال ذاتی ہے اور ماوراء عقل اس بات کو کہتے ہیں کہ بعض باتوں کے متعلق عقل ہی کا یہ فیصلہ ہے کہ چونکہ انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا اور حقیقت اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی، لہذا ہر وہ بات جو عقل کے احاطہ میں نہ آ سکتی ہو مگر اس کے انکار پر علم و یقین کے ذریعہ برہان و دلیل بھی دی جاسکتی ہو تو ایسی بات کو خلاف عقل نہیں بلکہ ماوراء عقل کہیں گے۔

خلاف عقل اور ماوراء عقل کے درمیان امتیاز ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن چیزوں کو کل کی دنیا میں عام طور پر خلاف عقل کہا جاتا رہا ان کو اہل دانش و بینش نے خلاف عقل نہ سمجھتے ہوئے موجودہ دور میں ممکن بلکہ موجود کر دکھایا اور کل یہی عقل کی ترقی آج کی بہت سی ماوراء عقل باتوں کو احاطہ عقل میں لاسکے گی اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

پس جو شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بجمد عنصری رفع الی السماء کا اس لیے منکر ہے کہ عقلی فلسفہ اس کا انکار کرتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ ”برہان و دلیل اور علم و یقین کی جگہ محض جہل، ظن، انکل کے ماتحت ہے“ اور ایسے حضرات کے لیے پھر عالم غیب کی تمام ماوراء عقل باتوں، مثلاً وحی، فرشتہ، جنت، جہنم، حشر، معاد، معجزہ وغیرہ تمام باتوں کو خلاف عقل کہہ کر جھٹلا دینا چاہیے۔ قرآن عزیز نے ان ہی جیسے منکرین حق کے متعلق صاف صاف مکذبین کا لقب تجویز کر دیا ہے:

﴿بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعَلَمِهِ وَ لَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۗ كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ  
فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ﴿۳۹﴾﴾ (یونس: ۳۹)

”نہیں یہ بات نہیں ہے (جیسا کفار کہتے ہیں) اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح انہوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تو دیکھو ظلم کرنے والوں کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے۔“

آیت ﴿بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعَلَمِهِ﴾ کہہ کر جس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے ”یعنی انسان کی عقل جس بات کا ادراک نہ



کر سکے اس کو دلیل و برہان اور علم یقین کے بغیر ہی جھٹلا دینا اور صرف اس بناء پر انکار کر دینا کہ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اس کی ایک نظیر مرزائے قادیانی کا وہ انکار ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ”رفع الی السماء“ سے متعلق ہے اور اس کے خلیفہ مسٹر لاہور کی فلسفیانہ موٹگیافیاں بھی اسی بے دلیل انکار و جھوٹ کا شعبہ ہیں۔

اس حربہ کو بھی کمزور سمجھ کر متنبی پنجاب نے پھر رخ بدلا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس موقع کے علاوہ قرآن کے کسی مقام سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ ”رفع“ سے ”رفع روحانی“ کے ماسواء کوئی معنی لیے گئے ہیں یعنی مادی شے کی جانب رفع کی نسبت کی گئی ہو لہذا اس مقام پر بھی رفع روحانی کے علاوہ معنی لینا قرآن کے اطلاق استعمال کے خلاف ہے۔

مگر متنبی کا زب کا یہ دعویٰ اول تو بنیاداً ہی غلط ہے کیونکہ اگر کسی لفظ کے محل استعمال سے یا قرآن ہی کی دوسری نصوص سے ایک معنی متعین ہیں تب یہ سوال پیدا کرنا کہ ”یہی استعمال دوسرے کسی مقام پر جب تک ثابت نہیں ہوگا قابل تسلیم نہیں“ حد درجہ کی نادانی ہے تا وقتیکہ دلیل سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ لغت عرب میں اس لفظ کا اس معنی میں استعمال جائز ہی نہیں اور اگر اتمام حجت کے طور پر اس قسم کے لچر سوال یا دعوے کو قابل جواب، یا لائق رد سمجھا ہی جائے تو سورۃ والنازعات کی یہ آیت کافی و وافی ہے:

﴿ءَأَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا ۗ رَفَعَهَا فَسَوَّيْنَاهَا ۗ وَالنَّازِعَاتُ﴾ (النَّازِعَاتُ: ۲۷-۲۸)

”(اے افراد نسل انسانی) خلقت اور پیدائش کے لحاظ سے کیا تم زیادہ بھاری اور بوجھل ہو یا آسمان، جس کو خدا نے بنایا اور اس کے بوجھل جسم کو بلند کیا۔“

اور ایک آسمان پر ہی کیا موقوف ہے یہ ہم سے لاکھوں اور کروڑوں میل دور فضاء میں سورج، چاند اور ستاروں کو خدائے برتر نے جو بلندی اور رفعت عطاء کی ہے کیا یہ سب کے سب مادی اجسام نہیں ہیں؟ اور اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو جس خالق ارض و سماوات نے ان مادی اجسام کا رفع کیا ہے، وہ اگر ایک انسانی مخلوق کا رفع آسمانی کر دے تو اس کو قرآن کے اطلاق و استعمال کے خلاف کہنا غباوت اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے، البتہ ثبوت درکار ہے تو اس کے لیے قرآن عزیز کی نصوص، صحیح احادیث اور اجماع امت سے زیادہ موثق ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

### حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں:

مرزائے قادیانی نے اگرچہ اس مسئلہ میں جمہور کے خلاف یہود و نصاریٰ کی پیروی میں تحریف مطالب کی کافی سعی ناکام کی ہے اور مسٹر لاہوری نے بھی تفسیر قرآن میں تحریف معنوی کے ذریعہ اپنے مقتداء کی مدد کی، تاہم دل کا چور ان کو مطمئن نہیں کر سکا اور اس لیے انہوں نے دلائل و براہین کی جگہ جذبات کو دلیل راہ بنایا اور کبھی تو یہ کہا کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ تسلیم کرتے ہیں وہ ان کو خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر ہوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر، یہ تو سخت توہین کی بات ہے۔

لیکن علمی حلقوں میں اس لچر اور لوچ جذبہ کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے جبکہ ہر ایک مذہبی انسان اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ اگرچہ فرشتے، ہمیشہ بقید حیات ملاء اعلیٰ میں موجود اور سکونت پذیر ہیں تاہم ان سب کے مقابلہ میں بلکہ ان کی جلیل القدر



ہستیوں مثلاً جبرئیل و میکائیل کے مقابلہ میں بھی ایک مفضول سے مفضول نبی کا رتبہ بہت بلند اور عالی ہے، حالانکہ وہ نبی زمین پر مقیم رہا ہے اور جبرئیل کا قیام ملاء اعلیٰ کے بھی بلند تر مقام پر رہتا ہے چہ جائیکہ خاتم الانبیاء ﷺ کا مرتبہ جلیل کہ جس کی عظمت..... ”بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر“ میں مضمر ہے، علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ نے شب معراج میں ”قاب قوسین اودنی“ کا جو تقرب پایا ہے وہ نہ کسی ملک اور فرشتہ کو حاصل ہوا اور نہ کسی نبی اور رسول کو، اس لیے حضرت مسیح علیہ السلام کا رفع آسمانی اس ”رفعت“ کو پہنچ ہی نہیں سکتا جو اسرئیل میں آپ کو حاصل ہوئی۔ بہر حال فاضل و مفضول کے درمیان فرق مراتب کے لیے تنہا ملاء اعلیٰ کا قیام معیار فضیلت نہیں ہے خصوصاً اس ”افضل ہستی“ کے مقابلہ میں جس کی فضیلت کا معیار خود اس کا وجود باوجود ہو اور جس کی ذات قدسی صفات خود ہی منبع فضائل اور مرجع کمالات ہو ایسی ہستی سے تو ”مقام“ عزت و مرتبہ پاتا ہے نہ کہ وہ ذات گرامی۔

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضاء داری      آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور کبھی یہ کہا کہ جو شخص عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ تسلیم کرتا ہے وہ ”العیاذ باللہ“ نبی اکرم ﷺ کی اس لیے توہین کرتا ہے کہ وہ بقید حیات نہیں رہے اور اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھر ذات اقدس پر برتری حاصل ہوگئی۔

یہ مقولہ پہلے سے بھی زیادہ بے کیف اور بے معنی ہے بلکہ سرتاسر غلط بنیاد پر قائم، اس لیے کہ کون اہل عقل اور ذی ہوش کہہ سکتا ہے کہ ”زندگی“ بھی فاضل و مفضول کے درمیان معیار فضیلت ہے، اس لیے کہ زندگی کی قیمت ذاتی کمالات و فضائل سے ہے نہ اس لیے کہ وہ زندگی ہے، پھر ”معیار فضیلت“ کی اس بحث سے قطع نظر اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کے مسئلہ فضیلت کو درمیان لانا اس لیے بھی قطعاً بے محل ہے کہ جبکہ قرآن عزیز کی نصوص نے تمام کائنات پر آپ ﷺ کی برتری کو ثابت کر دیا اور آپ کی سیرت نے زندہ شہادت بن کر ان نصوص کی تصدیق کر دی تو کسی بھی انسان کی ”زندگی“ یا ”رفع آسمانی“ یا اور کوئی ”وجہ فضیلت“ اس کے مقابلہ میں نہیں لائی جاسکتی، اور ہر ایک حالت و صورت میں ”فضل کلی“ اسی جامع کمالات ہستی کو حاصل رہے گا۔

### وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ كِتَابُ

اس مسئلہ کو ختم کرنے سے پہلے اب ایک بات باقی رہ جاتی ہے کہ سورہ نساء کی مسطورہ بالا آیت میں ﴿وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ کی کیا تفسیر ہے؟ یعنی وہ کیا اشتباہ تھا جو یہودیوں پر طاری کر دیا گیا تو قرآن عزیز اس کا جواب اس مقام پر بھی اور آل عمران میں بھی ایک ہی دیتا ہے اور وہ ”رفع الی السماء“ ہے، آل عمران میں اس کو وعدہ کی شکل میں ظاہر کیا ﴿وَرَأْفَعُكَ إِلَى﴾ اور نساء میں ایفاء وعدہ کی صورت میں یعنی ﴿بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ﴾ جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ محاصرہ کے وقت جب منکرین حق گرفتاری کے لیے اندر گھسے تو وہاں عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پایا، یہ دیکھا تو سخت حیران ہوئے اور کسی طرح اندازہ نہ لگا سکے کہ صورت حال کیا پیش آئی اور اس طرح ﴿وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ کا مصداق بن کر رہ گئے، اس کے بعد قرآن کہتا ہے:

﴿وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ

يَقِينًا ﴿١٥٧﴾ (النساء: ۱۵۷)

یہ اشتباہ کے بعد جو صورت حال پیش آئی اس کا نقشہ بیان کیا گیا ہے اور اس سے دو باتیں بصراحت ظاہر ہوتی ہیں: ایک یہ



کہ یہود اس سلسلہ میں اس طرح شک میں پڑ گئے تھے کہ گمان اور اٹکل کے ماسوا ان کے پاس علم و یقین کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی اور دوسری بات یہ کہ انہوں نے کسی کو قتل کر کے یہ مشہور کیا کہ انہوں نے ”مسیح علیہ السلام“ کو قتل کر دیا اور یا پھر آیت زمانہ نبوت محمدی کے یہود کا حال بیان کر رہی ہے۔

پس قرآن عزیز کے ان واضح اعلانات کے بعد جو حضرت مسیح علیہ السلام کی حفاظت و صیانت کے سلسلہ میں کیے گئے ہیں اور جن کو تفصیل کے ساتھ سطور بالا میں بیان کر دیا گیا ہے ان دو باتوں کی جزئی تفصیلات کا تعلق آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور تاریخی روایات پر رہ جاتا ہے اور اس سلسلہ میں صرف ان ہی روایات و آثار کو قابل تسلیم سمجھا جائے گا جو اپنی صحت روایت کے ساتھ ساتھ ان بنیادی تصریحات سے نہ ٹکراتی ہوں جن کا ذکر متعدد مقامات پر قرآن عزیز نے بصراحت کر دیا ہے اور (القرآن یفسد بعضہ بعضاً) قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی خود ہی تفسیر کر دیتا ہے“ کے اصول پر جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دشمن ہاتھ تک نہ لگا سکے اور وہ محفوظ ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھالیے گئے اور جیسا کہ حیاة عیسیٰ علیہ السلام کی بحث میں ابھی نصوص قرآنی سے ثابت ہوگا کہ وہ وقوع قیامت کے لیے ”نشان“ ہیں۔ اور اس لیے دوبارہ کائنات ارضی میں واپس آ کر اور مفوضہ خدمت انجام دے کر پھر موت سے دوچار ہوں گے۔

شخص مقتول و مصلوب سے متعلق آثار و تاریخ کی جو ملی جلی روایات ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ ”سبت کی شب“ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت المقدس کے ایک بند مکان میں اپنے حواریوں کے ساتھ موجود تھے کہ بنی اسرائیل کی سازش سے دمشق کے بت پرست بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے لیے ایک دستہ بھیجا، اس نے آ کر محاصرہ کر لیا۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھالیا۔ جب سپاہی اندر داخل ہوئے تو انہوں نے حواریوں میں ایک ہی شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہم شبیہ پایا۔ اور اس کو گرفتار کر کے لے گئے اور پھر اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ ان ہی روایات میں بعض اس کا نام یودس بن کریا یوٹا بیان کرتے ہیں اور بعض جرجس اور دوسرے داؤد بن لوزا کہتے ہیں۔

پھر ان روایات میں سے بعض میں ہے کہ یہ شخص مقتول اپنی خلقت ہی میں حضرت مسیح علیہ السلام کا مشابہ اور ان کا نقش ثانی تھا، اسرائیلیات انجیلی میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے یہود اسخر لوطی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شبیہ تھا اور بعض روایات میں ہے کہ جب یہ نازک گھڑی آ پہنچی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کو دعوت و تبلیغ حق سے متعلق تلقین و ہدایات کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھ کو مطلع کر دیا ہے کہ میں ایک مدت تک کے لیے ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھالیا جاؤں گا اور یہ واقعہ مخالفین اور متبعین دونوں کے لیے سخت آزمائش و امتحان بن جانے والا ہے۔ لہذا تم میں سے جو شخص اس پر آمادہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو میرا شبیہ بنا دے اور وہ خدا کی راہ میں جام شہادت پائے اس کو جنت کی بشارت ہے تب ایک حواری نے پہل کی اور خود کو اس کے لیے پیش کیا اور منجانب اللہ وہ حضرت کا ہم شکل ہو گیا اور سپاہیوں نے اس کو گرفتار کر لیا۔ ❀

یہ تفصیلات نہ قرآن میں مذکور ہیں اور نہ احادیث مرفوعہ میں اس لیے وہ صحیح ہوں یا غلط نفس مسئلہ اپنی جگہ اٹل ہے اور قرآن کی آیات میں منصوص، اس لیے اصحاب ذوق کو اختیار ہے کہ وہ صرف قرآن کے اس اجمال پر ہی قناعت کریں کہ حضرت مسیح علیہ السلام



کارِفع الی السماء اور ہر طرح دشمنوں سے تحفظ نیز یہود پر معاملہ کا مشتبہ ہو کر کسی دوسرے کو قتل کرنا یہود و نصاریٰ کے پاس اس سلسلہ میں علم و یقین سے محروم ہو کر ظن و تخمین اور شک و شبہ میں مبتلا ہو جانا اور قرآن کا حقیقت واقعہ کو علم و یقین کی روشنی میں ظاہر کر دینا یہ سب حقائق ثابتہ ہیں: ﴿وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ اور ﴿إِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ...﴾ الایۃ کی تفسیر میں ان روایات کی تفصیلات کو بھی قبول کر لیں اور یہ سمجھ کر تسلیم کریں کہ زیر بحث آیات کی تفسیر ان تفصیلات پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ امر زائد ہے جو آیات کی تفسیر صحیح کے لیے موید ہے۔

### حیات عیسیٰ علیہ السلام:

سورہ آل عمران، مائدہ اور نساء کی زیر بحث آیات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق حکمت الہی کا یہ فیصلہ صادر ہوا کہ ان کو بقید حیات ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھایا جائے اور وہ دشمنوں اور کافروں سے محفوظ اٹھالیے گئے۔ لیکن قرآن نے اس مسئلہ میں صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ حسب موقعہ ان کی حیات امروز پر نصوص قطعہ کے ذریعہ متعدد جگہ روشنی ڈالی ہے اور ان مقامات میں اس جانب بھی اشارات کیے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات طویل اور رفع الی السماء میں کیا حکمت مستور تھی تاکہ اہل حق کے قلوب تازگی ایمان سے شگفتہ ہو جائیں اور باطل کوش اپنی کور باطنی پر شرمائیں۔

لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۗ

﴿وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۗ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا﴾

(النساء: ۱۵۹)

”اور کوئی اہل کتاب میں سے باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ وہ ضرور ایمان لائے گا عیسیٰ (علیہ السلام) پر اس (عیسیٰ علیہ السلام) کی موت سے پہلے اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کے دن ان پر (اہل کتاب پر) گواہ بنے گا۔“

اس آیت سے قبل آیات میں وہی مسطورہ بالا واقعہ مذکور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ صلیب پر چڑھایا گیا اور نہ قتل کیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب اٹھالیا، یہ یہود و نصاریٰ کے اس عقیدہ کی تردید ہے جو انہوں نے اپنے باطل زعم اور انکل سے قائم کر لیا تھا، ان سے کہا جا رہا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق صلیب پر چڑھائے جانے اور قتل کیے جانے کا دعویٰ قابل لعنت ہے کیونکہ بہتان اور لعنت تو ام ہیں، اس کے بعد اس آیت میں امر اول کی تصدیق میں اس جانب توجہ دلائی جا رہی ہے کہ آج اگر اس ملعون عقیدہ پر فخر کر رہے ہو تو وہ وقت بھی آنے والا ہے جب عیسیٰ بن مریم علیہا السلام خدائے برتر کی حکمت و مصلحت کو پورا کرنے کے لیے کائنات ارضی پر واپس تشریف لائیں گے اور اس عینی مشاہدہ کے وقت اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے ہر ایک موجود ہستی کو قرآن کے فیصلہ کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے گا اور پھر جب وہ اپنی مدت حیات ختم کر کے موت کی آغوش سے دو چار ہو جائیں گے تو قیامت کے دن اپنی امت (اہل کتاب) پر اسی طرح گواہ ہوں گے جس طرح تمام انبیاء و مرسلین اپنی اپنی امتوں پر شاہد بنیں گے۔

یہ حقیقت کچھ مخفی نہیں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں واقعہ صلیب و قتل پر متفق ہیں لیکن اس سلسلہ



میں دونوں کے عقائد کی بنیاد قطعاً متضاد اصول پر قائم ہے، یہود، حضرت مسیح علیہ السلام کو مفتری اور کاذب کہتے اور دجال <sup>❦</sup> سمجھتے ہیں اور اس لیے فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے یسوع مسیح علیہ السلام کو صلیب پر بھی چڑھایا اور پھر اس حالت میں مار بھی ڈالا۔ اس کے برعکس نصاریٰ کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کا پہلا انسان آدم علیہ السلام گنہگار تھا اور ساری دنیا گنہگار تھی اس لیے خدا کی صفت ”رحمت“ نے ارادہ کیا کہ دنیا کو گناہوں سے نجات دلائے اس لیے اس کی صفت ”رحمت“ نے ابنیت (بیٹا ہونا) کی شکل اختیار کی اور اس کو دنیا میں بھیجا تا کہ وہ یہود کے ہاتھوں سولی پر چڑھے اور مارا جائے اور اس طرح ساری کائنات ماضی و مستقبل کے گناہوں کا ”کفارہ“ بن کر دنیا کی نجات کا باعث بنے۔

سورہ نساء کی آیات میں قرآن عزیز نے صاف صاف کہہ دیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے دعویٰ کی بنیاد کسی بھی عقیدہ پر بنی ہو لائق لعنت اور باعث ذلت و خسران ہے۔ خدا کے سچے پیغمبر کو مفتری سمجھ کر یہ عقیدہ رکھنا بھی لعنت کا موجب اور خدا کے بندے اور سریم علیہ السلام کے بطن سے پیدا انسان کو خدا کا بیٹا بنا کر اور ”کفارہ“ کا باطل عقیدہ تراش کر مسیح علیہ السلام کو مصلوب و مقتول تسلیم کرنا بھی گمراہی اور علم و حقیقت کے خلاف اٹکل کا تیر ہے اور اس سلسلہ میں صحیح اور بنی برحقیقت فیصلہ وہی ہے جو قرآن نے کیا ہے اور جس کی بنیاد ”علم و یقین اور وحی الہی“ پر قائم ہے۔

پس آج جبکہ تمہارے سامنے اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے جو شک و ظن کی شکستہ بنیادوں پر قائم تھا علم و یقین کی روشنی آ چکی ہے پھر بھی تم اپنے ظنون کا سدھ اور اوہام فاسدہ پر اصرار کر رہے ہو اور حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق باطل عقیدہ کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہو تو قرآن کا ایک دوسرا فیصلہ اور وحی الہی کا یہ اعلان بھی سن لو کہ تمہاری نسلوں پر وہ وقت بھی آنے والا ہے جب قرآن کے اس صحیح فیصلہ اور اعلان حق کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام ملاء اعلیٰ سے کائنات ارضی کو واپس ہوں گے اور ان کی یہ آمد ایسی مشاہد ہوگی کہ یہود و نصاریٰ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہے گا جو بادل خواستہ یا بادل ناخواستہ اس ذات گرامی پر یہ ایمان نہ لے آئے کہ بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں، خدا کے بیٹے نہیں برگزیدہ انسان ہیں، مصلوب و مقتول نہیں ہوئے تھے، بقید حیات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں:

﴿وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ﴾

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ سورہ آل عمران اور سورہ مائدہ کی طرح اس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے لفظ ”توفی“ نہیں بولا گیا بلکہ بصراحت لفظ ”موت“ استعمال کیا گیا ہے، یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ان دونوں مقامات پر جس حقیقت کا اظہار مقصود ہے اس کے لیے ”توفی“ ہی مناسب ہے جیسا کہ سورہ آل عمران سے متعلق آیات کی تشریح و تفسیر میں گزر چکا اور سورہ مائدہ سے متعلق آیت کی تفسیر میں عنقریب بیان ہوگا اور اس جگہ چونکہ براہ راست ”موت“ ہی کا تذکرہ مطلوب ہے اور اس حالت کا ذکر ہے جس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام بھی ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ کا مصداق بننے والے ہیں اس لیے یہاں ”موت“ کو بصراحت لانا ہی از بس ضروری تھا اور یہ مزید برہان ہے اس دعویٰ کے لیے کہ آل عمران اور مائدہ میں لفظ ”موت“ کی جگہ ”توفی“ کا اطلاق بلاشبہ



خاص مقصد رکھتا ہے ورنہ جس طرح ان دونوں مقامات پر ”توفی“ کا اطلاق کیا گیا تھا اسی طرح یہاں بھی کیا جاتا، یا جس طرح اس جگہ لفظ ”موت“ کا اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح ان دونوں مقامات پر بھی لفظ موت ہی کا استعمال ہونا چاہیے تھا مگر قرآن عزیز کے ان دقیق اسالیب بیان کے فرق کا فہم طالبین حق کا ہی حصہ ہے نہ کہ مرزائے قادیانی اور مسٹر لاہوری جیسے اصحاب زلیغ کا جو اپنی خاص اغراض ذاتی کے پیش نظر پہلے ایک نظریہ ایجاد کر لیتے ہیں اور بعد ازاں اس سلسلہ کی تمام آیات قرآنی کو اسی کے سانچے میں ڈھال کر اس کا نام ”تفسیر قرآن“ رکھتے ہیں۔

ابہر حال جمہور کے نزدیک آیت زیر عنوان کی تفسیر یہی ہے جو سپرد قلم کی جا چکی، مشہور محدث، جلیل القدر مفسر اور اسلامی مورخ عماد الدین بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس تفسیر کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

قنادہ، عبدالرحمن اور بہت سے مفسروں کا یہی قول ہے اور یہی قول حق ہے جیسا کہ عنقریب ہم دلیل قاطع سے اس کو ثابت کریں گے۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) ❀

اور سرتاج محدثین ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اسی تفسیر پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یقین کیا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تفسیر کو ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت سعید بن جبیر اور ابورجاء نے بھی حسن رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ﴿قَبْلَ مَوْتِهِ﴾ یعنی قبل موت عیسیٰ علیہ السلام قسم بخدا بیشک و شبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بقید حیات ہیں اور جب وہ آسمان سے اتریں گے تو سب اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تفسیر کو اکثر اہل علم سے نقل کیا ہے اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسی تفسیر کو ”ترجیح دی ہے۔“ ❀

مگر اس صحیح تفسیر کے علاوہ کتب تفسیر میں احتمال عقلی کے طور پر دو قول اور بھی منقول ہیں مگر وہ دونوں بلحاظ سند ضعیف اور ناقابل اعتماد اور بلحاظ سیاق و سباق (یعنی آیت زیر بحث سے قبل اور بعد کی آیات کے لحاظ سے) غلط اور ناقابل التفات ہیں یعنی ایسے احتمالات عقلی جو نقل اور آیات کے باہمی نظم و ترتیب کے خلاف ہیں۔

ان ہر دو معنی میں سے ایک معنی یہ ہے کہ ”موت“ میں جو ضمیر ہے اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بجائے اہل کتاب کی جانب لوٹایا جائے اور آیت کا ترجمہ یوں کیا جائے ”اور اہل کتاب میں سے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لے آتا ہو“ یعنی اگرچہ یہود و نصاریٰ اپنی زندگی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قرآن کے بتائے ہوئے عقیدے پر ایمان نہیں لاتے اور اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہیں لیکن جب ان کو ”موت“ آدباتی ہے تو وہ اس آخری حالت میں ”جو نزاع کا وقت کہلاتا ہے“ صحیح عقیدہ کے مطابق ایمان لے آتے ہیں اور اہل کتاب کے ہر ایک فرد پر بلا استثناء یہی حالت گزرتی ہے اور دوسرے معنی یہ ہے کہ ”اہل کتاب کا ہر ایک فرد اپنی موت سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتا ہے“ یعنی جب وہ عالم دنیا سے منقطع ہو کر عالم غیب سے وابستہ ہو رہا ہوتا ہے اس وقت اس پر اصل حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیشک خدا کے سچے پیغمبر تھے۔



پس اس بات سے قطع نظر کہ یہ دونوں تفسیریں نقل روایت کے اعتبار سے ناقابل اعتماد اور غیر صحیح اور آیات کے سیاق و سباق کے خلاف ہیں عقلی نقطہ نظر سے بھی غلط ہیں اس لیے کہ اگر آیت کے معنی یہ ہیں جو سطور بالا میں نقل کیے گئے تب یہ آیت اپنے مقصد بیان کے خلاف بے معنی اور بے نتیجہ ہو جاتی ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ قرآن عزیز دوسرے مقامات پر صاف کہہ چکا ہے کہ جب انسان عالم دنیا سے کٹ کر عالم غیب سے وابستہ ہو جاتا ہے اور نزع کی یہ کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے کہ جو معاملات اس ساعت سے قبل تک اس کے لیے غیب کے معاملات تھے وہ مشاہدہ میں آنے شروع ہو جاتے ہیں تو اس وقت اس کے اعمال و کردار کا صحیفہ لپیٹ دیا جاتا ہے اور اب تبدیلی اعتقاد کا کوئی نتیجہ اور ثمرہ نہیں ملتا یعنی اس وقت کا نہ اقرار و اعتراف معتبر اور نہ انکار مستند۔

﴿فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۸۳﴾ فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَ حُدَّاهُ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ ﴿۸۴﴾ فَلَمَّا يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ۚ سُنَّتَ اللَّهُ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۗ وَ خَسِرَ هُنَاكَ الْكٰفِرُونَ ﴿۸۵﴾﴾ (الزمر: ۸۳-۸۵)

”پس جب آئے ان کے پاس پیغمبر واضح دلائل لے کر تو اس چیز سے خوش ہوئے جو ان کے پاس علم سے تھی اور گھیر لیا ان کو اس چیز نے جس کی وہ مذاق بناتے تھے پس جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو انہوں نے کہا ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور جن چیزوں کو ہم اس کا شریک بناتے تھے اس سے منکر ہوئے، پس نہیں نافع ہو ان کا (یہ) ایمان جب انہوں نے ہمارے عذاب کا مشاہدہ کر لیا یہ اللہ کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں ہمیشہ جاری رہی اور اس موقع پر کافروں نے زیاں پایا۔“

﴿وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْعَنَ وَ لَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَ هُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۱۸﴾﴾ (النساء: ۱۸)

”لیکن ان لوگوں کی توبہ، توبہ نہیں ہے جو (ساری عمر تو) برائیاں کرتے رہے لیکن جب ان میں سے کسی کے آگے موت آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا اب میں توبہ کرتا ہوں، (ظاہر ہے کہ ایسی توبہ سچی توبہ نہیں ہوتی) اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے جو دنیا سے کفر کی حالت میں جاتے ہیں ان تمام لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔“

تو ایسی صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟ انسان جب اس حالت پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے سامنے سے غیب کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور برزخ، ملائکہ اللہ، عذاب یا راحت، جنت و جہنم، غرض دین حق کی تعلیم کردہ غیب کی ساری حقیقتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں اور اس میں یہود و نصاریٰ کی ہی خصوصیت کیا ہے یہ حالت تو ہر ایک ابن آدم پر گزرنے والی ہے نیز جب اس قسم کا ایمان قابل قبول ہی نہیں ہے تو اس کا ذکر اسی اسلوب کے ساتھ ہونا چاہیے تھا جو غرق فرعون کے وقت فرعون کے ایمانی اعتراف و اقرار کے لیے اختیار کیا گیا اور جس میں اس وقت کی ایمانی پکار کی بے وقتی ظاہر کی گئی ہے نہ کہ



ایسے اسلوب بیان کے ساتھ گویا مستقبل میں ہونے والے کسی ایسے عظیم الشان واقعہ کی خبر دی جا رہی ہے جو مخاطبین (یہود و نصاریٰ) کے عقائد و عزائم کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قرآن کی تصدیق اور اس کے اٹل فیصلہ کی زندہ شہادت بن کر پیش آئے والا ہے ورنہ تو ایک عیسائی اور یہودی بچہ موت میں آجانے کے وقت جان عزیز سپرد کر دینے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا تب کیا اور نہ لایا تب کیا، اس کی یہ تصدیق کائنات انسانی کے علم و ادراک سے باہر صرف اس کے اور خدا کے درمیان تعلق رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی بات کا ایسے موقع پر تذکرہ کرنا قطعاً بے محل ہے جہاں ایک قوم کو اس کے ایک خاص عقیدہ پر ملزم و مجرم بنانے کے لیے فیصلہ حق کی تائید کے لیے ماضی اور مستقبل میں کائنات ارضی پر پیش آنے والے واقعات کو پیش کیا جا رہا ہے جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہو رہا ہے علاوہ ازیں ان احتمالات کی یہاں اس لیے بھی گنجائش نہیں ہے کہ غرغہ کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا محمد ﷺ پر اس قسم کا ایمان تو ہر اس اہل کتاب سے متعلق ہے جو اس آیت کے نزول سے کچھ دن قبل یا صدیوں قبل گزر چکے اور مر کھ چکے ہیں۔ لہذا اگر آیت میں یہ مضمون بیان کرنا مقصود تھا تو اس کے لیے مؤکد مستقبل کی یہ تعبیر ﴿لَيُؤْمِنَنَّ﴾ فصاحت و بلاغت کلام کے بالکل خلاف ہے اس کے لیے تو ایسی تعبیر کی ضرورت تھی جو ماضی، حال اور استقبال تینوں زمانوں پر حاوی ہوتی تاکہ قرآن کا مقہوم اپنے توسع کے لحاظ سے پوری طرح ادا ہوتا۔

نیز دوسرے معنی تو اس لیے بھی قطعاً غلط اور بے محل ہیں کہ اس آیت سے قبل اور بعد کی آیات میں یعنی سیاق و سباق میں خاتم الانبیاء محمد ﷺ کا ذکر ہی نہیں ہے کیونکہ شروع آیات میں صرف حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے اور اس آیت کے آخر میں یہ ارشاد ہوا ہے: ﴿وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا﴾ اور واضح ہے یہ بات کہ اس جگہ شاہد سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور ﴿عَلَيْهِمْ﴾ کی ضمیر سے ان کی امت تو پھر نبی اکرم ﷺ کا ذکر کیے بغیر درمیان کی کسی ضمیر کا مرجع ذات اقدس کو قرار دینا نہ صرف یہ کہ فصاحت و بلاغت کے منافی ہے بلکہ قاعدہ عربیت کے قطعاً خلاف اور انتشار ضمائر کا موجب ہے۔

غرض بے غل و غش صحیح معنی وہی ہیں جو جمہور نے اختیار کیے ہیں اور یہ دونوں خود ساختہ احتمالات آیت کی تفسیر تو کیا صحیح احتمال کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ ❀

### حیاء و نزول عیسیٰ علیہ السلام اور احادیث صحیحہ:

قرآن عزیز نے جس معجزانہ اختصار کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی، حیات امروز اور علامت قیامت بن کر نزول من السماء کے متعلق تصریحات کی ہیں صحیح ذخیرہ احادیث نبوی میں ان آیات ہی کی تفصیلات بیان کر کے ان حقائق کو روشن کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام حدیث بخاری اور مسلم نے صحیحین (صحیح بخاری، صحیح مسلم) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت متعدد طریقہ ہائے

❀ اس مقام کے علاوہ سورہ زخرف کی آیت ﴿مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ اور سورہ آل عمران کی ابتداء سے بیسی آیات تک جو وفد نجران سے تعلق رکھتی ہیں یہ سب مقامات و دلالت النص یا اشارۃ النص کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے لئے دلیل و برہان ہیں اور اگرچہ ان کی تفصیلات اور وجود استشہاد میرے پاس مدون و مرتب ہیں تاہم کتاب کی طوالت کے خوف سے اس جگہ ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بقوت فرصت انشاء اللہ مستقل مضمون کی صورت میں ہدیہ ناظرین ہوگا، اور یا پھر حجۃ الاسلام علامہ محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہ کی کتاب ”عقیدۃ الاسلام فی حیاء عیسیٰ علیہ السلام“ اس مقصد کے لئے قابل مراجعت ہے۔



سند سے نقل کی ہے:

قال رسول الله ﷺ والذي نفسي بيده ليوشكن ان ينزل فيكم ابن مريم حكما عدلا فيكسر الصليب ويقتل الخنزير ويضع الجزية ويفيض المال حتى لا يقبله احد وحتى تكون السجدة الواحدة خيرا له من الدنيا وما فيها ثم قال ابو هريرة رضي الله عنه اقرؤا ان شئتم ﴿وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ﴾ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ﴿٥٥﴾

”رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور وہ وقت آنے والا ہے کہ تم میں عیسیٰ بن مریم حاکم عادل بن کر اتریں گے، وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے (یعنی موجودہ عیسائیت کو مٹائیں گے) اور جزیہ اٹھادیں گے (یعنی نشان الہی کے مشاہدہ کے بعد اسلام کے سوا کچھ بھی قبول نہیں ہوگا اور اسلامی احکام میں بارشاد رسول اللہ ﷺ جزیہ کا حکم اسی وقت تک کے لیے ہے) اور مال کی اس درجہ کثرت ہوگی کہ کوئی اس کو قبول کرنے والا نہیں ملے گا اور خدا کے سامنے ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمت رکھے گا (یعنی مالی کثرت کی وجہ سے خیرات و صدقات کے مقابلہ میں عبادت نافلہ کی اہمیت بڑھ جائے گی) پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تم (قرآن سے اس کا استشہاد) چاہو تو یہ آیت پڑھو ﴿وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ﴾... الا یہ کہ اور کوئی اہل کتاب میں سے نہ ہوگا مگر (عیسیٰ علیہ السلام کی) موت سے پہلے اس پر (عیسیٰ پر) ضرور ایمان لے آئے گا اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا۔“

② بخاری اور مسلم میں بسند نافع مولیٰ البوقادہ انصاری رضی اللہ عنہما حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی منقول ہے:

قال رسول الله ﷺ كيف اذ انزل ابن مريم فيكم واما مكم منكم. ﴿٥٥﴾  
”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم میں ابن مریم اتریں گے اور اس حالت میں اتریں گے کہ تم ہی میں سے ایک شخص تمہاری امامت کر رہا ہوگا۔“

ان دونوں روایات کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعدد طریقہ ہائے سند سے اور روایات بھی صحیحین: مسند احمد اور سنن میں درج ہیں جو یہی مفہوم و معنی ادا کرتی ہیں، ان میں سے ایک زیادہ مفصل ہے اور مسئلہ زیر بحث کے بعض دوسرے پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ مسند احمد میں ہے:

③ ان النبي ﷺ قال الانبياء اخوة لعلات امهاتهم شتى و دينهم واحد و اتى اولى الناس بعيسى بن مريم لانه لم يكن نبى بينى و بينه و انه نازل فاذا رائتسوة فاعرفوه رجلٌ مربوعٌ الى الحنرة و البياض عليه ثوبان مصفران كان رأسه يقطر ان لم يصبه بلل فيدق الصليب و يقتل الخنزير و يضع الجزية و يدعوا الناس الى الاسلام و يهلك الله في زمانه السبيح الدجال ثم تقع الامانة على الارض حتى ترتع الاسود مع الابل و النار مع القبر و الذئب مع الغنم و يلعب الصبيان بالحيات لا تضرهم فيمكث اربعين سنة ثم يتوفى و يصله عليه المسلمون



”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمام انبیاء اصول دین میں علاقی بھائیوں کی طرح ہیں، دین سب کا ایک اور فروع دین مختلف اور میں دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم علیہا السلام سے زیادہ قریب ہوں اس لیے کہ ان کے اور میرے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا اور بلاشبہ وہ کائنات ارضی پر اتریں گے، پس جب تم ان کو دیکھو تو اس حلیہ سے پہچان لینا: میانہ قد، سرخ و سفید رنگ ہوگا ان کے جسم پر دوسرخی مائل رنگ کی چادریں ہوں گی ایسا معلوم ہوگا گویا فی الحال غسل کر کے آ رہے ہیں اور سر سے پانی کے قطرے موتی کی طرح ٹپک پڑنے والے ہیں۔ وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے (موجودہ عیسائیت کا خاتمہ کر دیں گے) اور جزیہ اٹھا دیں گے اور لوگوں کو ”اسلام“ کی دعوت دیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے زمانہ میں تمام ادیان و ملل کو مٹا دے گا اور صرف ایک ہی دین ”دین اسلام“ باقی رہ جائے گا اور اللہ تعالیٰ ان ہی کے زمانہ میں مسیح دجال کو ہلاک کرے گا پھر کائنات میں ”امانت“ (امر خیر) جگہ کر لے گی حتیٰ کہ شیر اونٹوں کے ساتھ، چیتے گائے بیلوں کے ساتھ، بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چرتے نظر آئیں گے اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے، اور ان کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا، پس عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال اس زمین پر زندہ رہیں گے پھر وفات پا جائیں گے اور مسلمان ان کے جنازہ کی نماز ادا کریں گے۔“

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی گئی اس میں خروج دجال کا ذکر کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک مذکور ہے:

④ فاذا جاء الشام خرج فيناهم يعدون القتال يسرون الصفوف اذا قيت الصلوة فينزل عيسى بن مريم... الخ

”پس جب مسلمان ملک شام پہنچیں گے تو دجال کا خروج ہوگا ابھی مسلمان اس کے مقابلہ میں جنگ کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ صفیں درست کرتے ہوں گے کہ نماز کے لیے اقامت ہونے لگے گی۔ اس درمیان میں عیسیٰ علیہ السلام بن مریم کا نزول ہوگا اور وہ مسلمانوں کی امامت کا فرض انجام دیں گے۔“

اور صحیح مسلم میں حضرت نواس بن سمران رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت منقول ہے جس میں یہ مذکور ہے:

اذا بعث الله المسيح بن مريم (عليه السلام) فينزل عند المنارة البيضاء شرقي دمشق بين مهرودتين واضعاً كفيه على اجنحة ملكين اذا طأ رأسه قطروا اذا رفعه تحدر منه حبان كاللؤلؤء.... الخ

”ابھی دجال ایک مسلمان پر اپنے شیطانی کرشموں کی آزمائش کر رہی رہا ہوگا) کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم علیہا السلام کو بھیج دے گا وہ جب کائنات ارضی پر اتریں گے تو مسجد دمشق کے مشرقی جانب کے سفید منارہ پر اتریں گے اور ان کے بدن پر (سرخی مائل) گہری زرد رنگ کی دو چادریں ہوں گی (یعنی ایک بدن کے اوپر کے حصہ پر اور دوسری زیریں حصہ بدن پر لپٹی ہوگی) اور دو فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا لیے ہوں گے۔ جب سر جھکائیں گے تو سر سے پانی ٹپک پڑنے لگے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو پانی کے قطرے موتیوں کی طرح ٹپکیں گے (یعنی غسل کیے آ رہے ہوں گے)۔“

اور مختلف طریقہ ہائے سند سے امام احمد نے مسند میں اور ترمذی رحمہ اللہ نے سنن میں حضرت مجمع بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح یہ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:



یقتل ابن مریم الدجال بیاب لُد۔

”ابن مریم، دجال کو باب لد پر قتل کریں گے۔“

امام ترمذی اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں ”ہذا حدیث صحیح“ اور اس کے بعد ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی فہرست شمار کراتے ہیں جن سے نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اور ان کے ہاتھوں قتل دجال سے متعلق روایات کتب حدیث میں منقول ہیں فرماتے ہیں:

اور اس باب میں حضرت عمران بن حصین، نافع بن عیینہ، ابو برزہ اسلمی، حذیفہ بن اسید، ابو ہریرہ، کیسان، عثمان بن العاص، جابر بن عبد اللہ، ابو امامہ باہلی، ابن مسعود، عبد اللہ بن عمرو بن العاص، سمرۃ بن جندب، نو اس بن سمعان، عمرو بن عوف، حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہم سے بھی روایات منقول ہیں۔

امام احمد رضی اللہ عنہ نے مسند میں امام مسلم رضی اللہ عنہ نے صحیح میں اور اصحاب سنن نے سنن میں، بروایت حضرت حذیفہ بن الاسیدی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے:

قال اشرف علينا رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ من غرفة ونحن نتذكر الساعة فقال: لا تقوم الساعة حتى تروا  
عشرا ايات، طلوع الشمس من مغربها والدخان والدابة، و خروج ياجوج و ماجوج و نزول عيسى بن مريم و  
الدجال و ثلاثة خسوف بالمشرق و خسف بالمغرب و خسف بجزيرة العرب و نار تخرج من  
قعر عدن تسوق و تحشم الناس تبیت معهم حيث باتوا و تقيل معهم حيث قالوا.

”حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم (صحابہ) ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے قیامت کے متعلق بات چیت کر رہے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالا خانہ سے جھانکا اور ارشاد فرمایا: ”قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس نشان نہ دیکھ لو گے۔ آفتاب کا مغرب سے طلوع، دخان (دھواں) دابة الارض، خروج ياجوج و ماجوج، عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول، دجال کا خروج، تین مقامات میں خسوف کا پیش آنا (زمین میں دھنس جانا) مشرق میں مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں، آگ کا قعر عدن سے نکلنا جو لوگوں کو سمیٹ لے جائے گی اور جب رات کو لوگ آرام کریں گے تو وہ بھی ٹھہر جائے گی اور جب دوپہر کو قیلولہ کریں گے تب بھی وہ ٹھہری رہے گی۔“

اور محدث ابن ابی حاتم نے اور جلیل القدر محدث و مفسر ابن جریر طبری رضی اللہ عنہ نے بروایت حسن بصری رضی اللہ عنہ، بسند صحیح حیات و نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے متعلق ایک روایت نقل کی ہے اس میں ہے:

قال رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اليهود ان عيسى لم يبت و انه راجع اليكم قبل يوم القيامة.

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا: ”عیسیٰ علیہ السلام مرے نہیں اور بلاشبہ وہ قیامت سے پہلے تمہاری جانب لوٹ کر آئیں گے۔“

اسی طرح ابن ابی حاتم اور ابن جریر رضی اللہ عنہما نے سورہ نساء کی آیات متعلقہ وفد نجران کی تفسیر کرتے ہوئے اصول حدیث کے

شہر دمشق کی شہر پناہ کا ایک دروازہ ہے۔ ترمذی باب نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام

اس حدیث میں جن علامات کا ذکر ہے وہ سب تشریح طلب ہیں مگر یہاں ان کی تشریحات بے محل ہیں اس لئے نظر انداز کر دی گئیں، عام تشریحات کتب تفسیر و حدیث میں اور شاہ رفیع الدین دہلوی نور اللہ مرقدہ کے رسالہ علامات قیامت میں قابل مطالعہ ہیں۔



نقطہ نظر سے بہ سند حسن ایک طویل روایت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے اس میں بھی بصراحت یہ مذکور ہے:

فقال لهم النبي صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الستم تعلمون ان ربنا حي لا يموت وان عيسى يأتي عليه الفناء.

”نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے وفد سے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ بلاشبہ ہمارا پروردگار زندہ ہے جس کے لیے موت نہیں ہے اور بلاشبہ عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کو فنا (موت) سے دوچار ہونا ہوگا۔“

نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے اس جگہ لفظ ”یأتی“ فرمایا ہے جو مستقبل کے لیے بولا جاتا ہے لفظ ”اتی“ نہیں فرمایا جو ماضی کے لیے مخصوص ہے۔

اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں اور محدث علی متقی گجراتی نے کنز العمال میں باسناد حسن و صحیح اس سلسلہ میں جو روایات نقل فرمائی ہیں ان میں نزول عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے ذکر کے ساتھ ”من السماء“ کا لفظ صراحت سے موجود ہے۔

یہ اور اسی قسم کا کثیر ذخیرہ حدیث ہے جو حیات و نزول عیسیٰ بن مریم عَلَیْہِ السَّلَام پیغمبر بنی اسرائیل (عَلِیْہِ السَّلَام) سے متعلق کتب حدیث و تفسیر میں منقول ہے اور جو قوت سند کے لحاظ سے صحیح اور حسن سے کم رتبہ نہیں رکھتا اور باعتبار شہرت و تواتر روایات جن کا یہ حال ہے کہ حسب تصریح امام ترمذی، حافظ حدیث عماد الدین بن کثیر، حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی اور دیگر آئمہ حدیث سولہ جلیل القدر صحابہ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ نے ان کو روایت کیا ہے جن میں سے بعض صحابہ کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے یہ تصریحات سینکڑوں صحابہ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ کے مجمع میں خطبہ دے کر فرمائیں اور صحابہ کرام رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ بغیر کسی انکار و اجنبیت کے ان روایات کو خلفائے راشدین رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ کے دورِ خلافت میں علی رؤس الاشہاد سناتے تھے۔ چنانچہ ان جلیل القدر صحابہ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ سے جن ہزار ہا شاگردوں نے سنا ان میں سے یہ عظیم المرتبہ ہستیاں قابل ذکر ہیں جن میں ہر فرد روایت حدیث میں ضبط و حفظ، ثقاہت و علمی تبحر کے پیش نظر امامت و قیادت کا درجہ رکھتا ہے: مثلاً سعید بن المسیب، نافع مولیٰ ابوقادہ، حنظلہ بن علی الاسلمی، عبدالرحمن بن آدم، ابوسلمہ، ابو عمرہ، عطاء بن بشار، ابوسہیل، مؤثر بن غفارہ، یحییٰ بن ابی عمرو، جبیر بن نصیر، عروہ بن مسعود ثقفی، عبداللہ بن زید انصاری، ابوزرعہ، یعقوب بن عامر، ابونصرہ ابوالطفیل رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ۔

پھر ان علماء کبار اور محدثین اعلام سے جن بے شمار تلامذہ نے سنا ان میں سے راویان حدیث کے طبقہ میں جن کو حدیث اور علوم قرآن کا رتبہ بلند حاصل ہے اور جو اپنے اپنے وقت کے ”امام الحدیث“ اور ”امیر المؤمنین فی الحدیث“ تسلیم کیے گئے ہیں، بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں: ابن شہاب زہری، سفیان بن عیینہ، لیث، ابن ابی ذئب، اوزاعی، قتادہ، عبدالرحمن بن ابی عمرہ، سہیل، جبلیہ بن سہیم، علی بن زید، ابورافع، عبدالرحمن بن جبیر، نعمان بن سالم، معمر، عبداللہ بن عبید اللہ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ۔

غرض ان روایات و احادیث صحیحہ کا صحابہ، تابعین، تبع تابعین یعنی خیر القرون کے طبقات میں اس درجہ شیوع ہو چکا تھا اور وہ بغیر کسی انکار کے اس درجہ لائق قبول ہو چکی تھیں کہ آئمہ حدیث کے نزدیک حضرت مسیح عَلَیْہِ السَّلَام کی حیات و نزول سے متعلق ان احادیث کو مفہوم و معنی کے لحاظ سے درجہ ”تواتر“ حاصل تھا اور اسی لیے وہ بے جھجک اس مسئلہ کو ”احادیث متواترہ“ سے ثابت اور مسلم کہتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ روایت حدیث کے تمام طبقات و درجات میں ان روایات کو ”تلقی بالقبول“ کا یہ درجہ حاصل رہا ہے کہ ہر دور میں اس کے رواۃ میں ”ائمہ حدیث“ اور روایت حدیث کے ”مدار“ نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان مرفوع و موقوف بر



صحابہ رضی اللہ عنہم احادیث اور روایات کے ناقلین میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ جیسے اصحاب صحیح و سنن، ائمہ حدیث کے اسماء گرامی شامل ہیں اور وہ باتفاق ان روایات کی صحت و حسن کے قائل ہیں، چنانچہ یہ اور اسی قسم کی احادیث صحیحہ کا ذکر کرتے ہوئے مشہور محدث و مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں اول یہ عنوان قائم کرتے ہیں:

ذکر الاحادیث الواردة فی نزول عیسیٰ بن مریم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) الی الارض من السماء فی اخر الزمان قبل یوم القیامة.

”ان احادیث کا ذکر جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے آسمان سے زمین پر اترنے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔“

اور اس کے بعد سلسلہ کی احادیث کو نقل کرنے کے بعد آخر میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

فهذه احادیث متواترة عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم من رواية ابی هريرة و ابن مسعود و عثمان بن العاص و ابی امامة و النواس بن سبعمان و عبد الله بن عمرو بن العاص و مجتبع بن حارثة و ابی شریحة و حذیفة بن اسید رضی اللہ عنہم و فیہا دلالة علی صفة نزوله و مکانہ.... الخ

”پس یہ ہیں وہ احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے درجہ تک منقول ہوئی ہیں اور یہ نقل روایت (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ) ابو ہریرہ، ابن مسعود، عثمان بن العاص، ابو امامہ، نواس بن سمعان، عبد اللہ بن عمرو بن العاص، مجتبع بن حارثہ، ابی شریحہ، حذیفة بن اسید رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے اور ان روایات میں عیسیٰ بن مریم کے طریقہ نزول اور مکان نزول سے متعلق بھی رہنمائی موجود ہے۔“

اور حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی (نور اللہ مرقدہ) علامہ ابوالحسین آبری رحمۃ اللہ علیہ سے نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق احادیث کے

تواتر کو فتح الباری میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

”ابوالحسن نسعی ابری سے منقول ہے کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس بارہ میں تواتر کو پہنچ چکی ہیں کہ مہدی اسی امت میں سے ہوں گے اور عیسیٰ علیہ السلام ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔“

اور تلخیص الجبیر کتاب الطلاق کے ضمن میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

قال ابوالحسن الخسعی الابری بان البہدی من هذه الامة و ان عیسیٰ یصلی خلفہ.... الخ

”لیکن رفع عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ تو تمام علماء حدیث و تفسیر کا اس پر اجماع ہے کہ وہ اپنے جسد عنصری کے ساتھ ہنوز زندہ ہیں (اور وہی قریب قیامت نازل ہوں گے)۔“

اور محدث عصر محقق وقت علامہ سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ ”عقیدۃ الاسلام“ میں اس ”تواتر“ کی تائید میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

و للمحدث العلامة الشوکانی رسالة سماها المتوضیح فی تواتر ماجاء فی المنتظر و الدجال و المسیح ذکر

\* تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۸۳، ۵۷۸

\* حضرت استاذ کا یہ رسالہ اپنے موضوع میں بے نظیر تصنیف ہے، عربی زبان میں تحریر ہے اور علماء و طلبہ دونوں کے لئے لائق مطالعہ ہے۔

مصنف قصص القرآن اس سلسلہ کے اکثر مباحث میں اسی رسالہ کا خوشہ چمین ہے۔



فیہا تسعة وعشرون حدیثاً فی نزولہ علیہ السلام ما بین صحیح و حسن و صالح هذا و ازید منه مرفوع و اما الآثار فتفوت الاحصاء.... الخ

اور محدث علامہ شوکانی نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے جس کا نام یہ رکھا ہے ”التوضیح فی التواتر ما جاء فی المنتظر والدجال والمسیح“ اس رسالہ میں انہوں نے اسی احادیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے متعلق نقل کی ہیں جو اصول حدیث کے لحاظ سے صحیح، حسن، صالح تینوں درجات کو شامل ہیں اور مرفوع احادیث اس تعداد سے بھی زیادہ موجود ہیں اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم تو بی شمار ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی اور حیات و نزول من السماء پر امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ چنانچہ علم عقائد و کلام کی مشہور و مستند کتاب عقیدہ سفارینی میں امت کے اس اجماع کی تصریح موجود ہے۔

و منها ای من علامات الساعة العظی العلامة الثالثة ان ينزل من السماء سید (المسیح) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) و نزولہ ثابت بالكتاب والسنة و اجماع الامة و اما الاجماع فقد اجمعت الامة علی نزولہ و لم يخالف فیہ احد من اهل الشریعة و انما انكر ذلك الفلاسفة والملاحدة بما لا يعتد بخلافه. \*

”اور علامات قیامت میں سے تیسری علامت یہ ہے کہ حضرت (مسیح علیہ السلام) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) آسمان سے اتریں گے اور ان کا آسمان سے اترنا کتاب (قرآن) سنت (حدیث) اور اجماع امت سے قطعاً ثابت ہے (قرآن و حدیث سے نزول ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں) جہاں تک اجماع امت کا تعلق ہے تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے پر امت کا اجماع ہے اور اس بارہ میں پیروان شریعت اسلامی میں سے کسی ایک کا بھی خلاف موجود نہیں البتہ فلسفیوں اور ملحوظوں نے نزول عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا ہے اور اسلام میں ان کا انکار قطعاً بے وقعت ہے۔“

### حیات و نزول مسیح علیہ السلام کی حکمت:

گذشتہ سطور میں حیات نزول مسیح علیہ السلام کو دلائل و براہین کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے جو ایک منصف اور طالب حق کو علم یقین عطا کرتے ہیں، اب مزید طمانیت قلب کے لیے ان چند حکمتوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو علماء حق نے اس سلسلہ میں بیان فرمایا ہے لیکن اس کے مطالعہ سے قبل یہ حقیقت بہر حال پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اس کی مشیت کی مصلحتوں کا احاطہ عقل انسانی کے لیے ناممکن ہے اور مخلوق، خالق کائنات کے اسرار و حکم پر عبور بھی کیسے کر سکتی ہے؟ تاہم علماء امت، فراست مومن اور علم حق کی راہ سے دین اور احکام دین کے اسرار و مصالح پر قلم فرسائی کرتے اور اپنی محدود دسترس کے مطابق اس موضوع پر علمی حقائق کا اظہار کرتے آئے ہیں۔

\* صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے تین زمانوں کو ”خیر القرون“ کہا جاتا ہے چونکہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے ((خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونہم، ثم الذین یلونہم)) سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان لوگوں کا جو اس زمانہ سے قریب ہیں اور پھر ان کا جو اس دوسرے زمانہ سے متصل ہیں اور اس کے بعد فرمایا ”پھر جھوٹ کی کثرت ہو جائے گی یعنی اس ہر سہ ادوار کے بعد اکثریت کے اندر دین انحطاط پیدا ہو جائے گا اور اسلامی خصوصیات اخلاق مٹ جائے گی۔



اسلامی دور کی علمی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دورِ اوّل میں علم الاسراء کی امامت کا شرف عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب اور صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو حاصل تھا، اور اس کے بعد اگرچہ ہر ایک صدی میں دو چار علماء ربانی اس کے ماہر و محقق رہے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ خلیفہ اموی عمر بن عبدالعزیز، امام ابوحنیفہ، علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری، حافظ ابن تیمیہ، امام غزالی، روحی، سید مرتضیٰ زبیدی اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہم کو اس علم سے خاص مناسبت تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں ان کو فطری ملکہ عطا فرمایا تھا۔

بہر حال حکمت کی حیثیت لطائف و نکات کی ہوتی ہے اور اس کو دلیل و حجت کا مرتبہ نہیں دیا جاسکتا اس لیے زیر بحث مسئلہ میں بھی ”حکمت و مصلحت“ کا ذکر اسی نقطہ نظر سے سمجھنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب و لکل شیء عندہ فصل الخطاب۔

① یہود بنی اسرائیل اپنی مذہبی کتابوں کی پیشین گوئیوں اور بشارتوں میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ان کو دو شخصیتوں ”مسح ہدایت“ اور ”مسح ضلالت“ سے سابقہ پڑے گا، اس لیے وہ منتظر تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ”مسح ہدایت“ کا ظہور کب ہوتا ہے لیکن شومی قسمت کہ جب مسح ہدایت کا ظہور ہوا تو انہوں نے بغض و حسد کی راہ سے اس کو ”مسح ضلالت“ کہہ کر رد کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ آمادہ قتل ہو گئے اور چونکہ قتل انبیاء ان کا دستور رہا تھا اس لیے وہ اس پر ہر وقت جری رہتے تھے، پس جبکہ وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح ان کے قتل کے بھی قائل ہو گئے تو یہ تعجب خیز بات نہ ہوئی کہ جب مسح ضلالت (دجال) کا خروج ہو تو یہود اس کو مسح ہدایت کہہ کر قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں کیونکہ مذہبی تعلیم کے پیش نظر ان پر مسح ہدایت کا اتباع ضروری تھا اور جب وہ مسح ہدایت کو مسح ضلالت کہہ کر قتل کر چکے تو اب مسح ضلالت کو ہی اس کے دعوے کے مطابق مسح ہدایت تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے مگر مشیت الہی فیصلہ کر چکی تھی کہ مسح ضلالت کی گمراہی کا فتنہ چونکہ عظیم الشان ہو گا اور وہ اول خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اس کے بعد مسح ہدایت بنے گا اس لیے اس کا خروج قیامت کے قریب ہی ہونا چاہئے جو دورِ فتن یعنی فتنوں کی آماجگاہ ہو گا اس لیے حکمت الہی کا یہ بھی منشاء ہوا کہ ”مسح ہدایت“ کو یہود کے فتنہ سے اس طرح بچالیا جائے کہ وہ اس کو ہاتھ بھی نہ لگا سکیں اور جب وہ وقت آ پہنچے کہ مسح ضلالت اپنی گمراہی کا علم بلند کرے تو مسح ہدایت ملاء اعلیٰ سے کائنات ارضی پر اترے اور یہود بنی اسرائیل جو کہ بہ تعداد کثیر مسح ضلالت کے پیرو ہو رہے ہوں گے، اپنی آنکھوں سے حق و باطل کا مشاہدہ کر لیں اور جب مسح ہدایت کے مقدس ہاتھوں سے مسح ضلالت کا خاتمہ ہو جائے تو ﴿جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۗ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ حق الیقین بن کر ان کی نگاہوں کے سامنے آ جائے اور اس طرح قبول حق کے ماسواء ان کے لیے دوسرا چارہ کار باقی ہی نہ رہے اور یا پھر وہ بھی مسح ضلالت کے ساتھ ”فی النار“ کر دیے جائیں۔

نیز یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ادیان و ملل کی تاریخ میں صرف یہود ہی ایک ایسی جماعت ہے جس نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے خون ناحق سے ہاتھ رنگے تھے وہ صرف ”نبی“ ہی تھے جو ﴿علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل﴾ کے مصداق تھے مگر کوئی صاحب شریعت رسول ان کے اس قتل ناحق کا مظلوم نہیں بنا تھا اس لیے یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہوں نے ایک جلیل القدر رسول (عیسیٰ بن مریم علیہ السلام) کو قتل کرنے کا نہ صرف ارادہ کیا بلکہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے مکمل تیاری کر لی تھی تب مشیت حق نے یہ فیصلہ کیا کہ مسح ہدایت کو اس طرح بچالیا جائے کہ خود یہود کو بھی محسوس ہو جائے کہ وہ مسح بن مریم علیہم السلام پر دسترس نہ پاسکے، لہذا فیصلہ مشیت بروئے کار آیا اور حضرت مسح علیہ السلام کو ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھالیا گیا اور تمام دنیوی اسباب ہیچ ہو کر رہ گئے لیکن اس احساس کے باوجود چونکہ حقیقت



حال تک نہ پہنچ سکے اور ظن و گمان ہی کے قعر میں پڑے رہے گواہی بات رکھنے کے لیے مشہور یہی کرتے رہے کہ ہم نے مسیح بن مریم علیہ السلام کو قتل کر دیا۔ ادھر متبعین مسیح ہدایت (نصاری) کی بدبختی دیکھے کہ کچھ عرصہ کے بعد پولوس رسول نے ان میں عقیدہ تسلیم و کفارہ کی بدعت پیدا کر کے یہود کے گھڑے ہوئے افسانہ صلیب کو بھی داخل عقیدہ کر دیا اور اب یہود و نصاریٰ دونوں جماعتیں اس گمراہی میں مبتلا ہو گئیں کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام صلیب پر چڑھا کر قتل کر دیئے گئے۔ تب قرآن عزیز نے نازل ہو کر حق و باطل کے درمیان فیصلہ سنایا اور حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق دونوں جماعتوں نے جو دو الگ الگ رخ اختیار کیے تھے اور پھر ایک مسئلہ میں دونوں کا اتفاق بھی ہو گیا تھا ان سب کے متعلق علم یقین کے ذریعہ حقیقت حال کو واشگاف اور دونوں گمراہیوں کو واضح کر کے قبول حق کے لیے دعوت دی مگر جماعتی حیثیت سے دونوں نے انکار کر دیا اور حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق اپنے اپنے گمراہ کن عقیدہ پر قائم رہے مگر عالم الغیب والشہادۃ چونکہ ان حقائق کا ان کے وقوع سے قبل عالم و دانا تھا اس لیے اس کی حکمت کا یہ بھی تقاضا ہوا کہ مسیح ہدایت کو کائنات ارضی پر اس وقت دوبارہ بھیجا جائے جب مسیح ضلالت کا بھی خروج ہو چکے تاکہ یہود و نصاریٰ کے سامنے حقیقت حال مشاہدہ کے درجہ میں روشن ہو جائے یہود آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جس کے قتل کے مدعی تھے قدرت الہی کے کرشمے کی بدولت وہ بقید حیات موجود ہے اور نصاریٰ نادم ہوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی سچی پیروی چھوڑ کر جو گمراہ کن عقیدہ اختیار کیا تھا وہ سرتا پا باطل اور ہیچ تھا اور اس طرح ہدایت و ضلالت کے معرکہ میں حق کی سر بلندی اور باطل کی پستی کا دونوں مشاہدہ کر کے قرآن عزیز کی تصدیق پر مجبور ہو جائیں اور دونوں جماعتیں ”ایمان حق“ کو برضاء و رغبت اختیار کر لیں اور اپنے باطل عقائد پر شرمسار و سرنگوں ہو جائیں۔ اور چونکہ ان دونوں جماعتوں کے علاوہ ہدایت و ضلالت کا یہ مشاہدہ و مظاہرہ دوسرے اہل باطل بھی کریں گے اس لیے وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح احادیث صحیحہ کے مطابق اس زمانہ میں کائنات ارضی کا صرف ایک ہی مذہب ہوگا اور وہ ”اسلام“ ہوگا۔

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۗ وَ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝۲۸﴾

(الفتح: ۲۸)

ادیان و ملل کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور معاندین حق کے درمیان ”سنت اللہ“ کے دو مستقل دور رہے ہیں۔ پہلا دور حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت لوط علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے اس دور میں سنت اللہ یہ رہی کہ جب قوموں نے اپنے پیغمبروں کی صدائے حق پر کان نہ دھرا بلکہ برابر اس کا تمسخر کرتی اور اس کے پیغام حق کے آڑے آتی رہیں، تب اللہ تعالیٰ کے عذاب نے ان کو ہلاک کر دیا اور دوسروں کے لیے ان کو باعثِ عبرت و بصیرت بنا دیا اور دوسرا دور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہے اس دور میں سنت اللہ کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ جب اعداء حق اور دشمنان دین تویم نے کلمہ حق کی مخالفت پر اصرار کیا اپنے پیغمبروں کو ایذا دہی اور ان کے ساتھ تمسخر کو اپنا نصب العین بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو ہلاک کرنے کی بجائے اپنے پیغمبروں کو یہ حکم دیا کہ وہ خدا کی راہ میں وطن چھوڑ دیں اور ہجرت کر جائیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں جنہوں نے قوم کے سامنے یہ اعلان کیا:

﴿یہ حضرت ابراہیم کی اپنی قوم نہیں تھی اس لئے کہ یہ نبی سام (سامی) تھے اور نماردہ عراق اور ان کی قوم بنی حام (حامی) تھے۔



﴿إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۗ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۲۶﴾﴾ (عنکبوت: ۲۶)

اور عراق سے شام کی جانب ہجرت فرمائے۔

پھر یہی صورت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیش آئی اور وہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے شام کو ہجرت کر گئے مگر فرعون اور اس کے لشکریوں نے چونکہ مزاحمت کی اور ہجرت کے بھی آڑے آئے اس لیے وہ بحر قلزم میں غرق کر دیئے گئے۔

اور یہی صورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئی کہ جب قریش مکہ نے اذیت، تمسخر، دین حق کے ساتھ تصادم، اعمال دین کی مزاحمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تب مشیت الہی کا فیصلہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر جائیں، چنانچہ ہر قسم کی نگرانی اور مکان کے ہر طرف محاصرہ کے باوجود کرمہ قدرت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ و مامون مدینہ ہجرت کر گئے۔

”سنت اللہ“ کے اسی دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور ان کی قوم بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ اور ان کی دعوت حق کے ساتھ بھی وہ سب کچھ کیا جو معاندین حق اور دشمنان دین اپنے پیغمبروں کے ساتھ کرتے رہے تھے اور ان میں ایک یہ خصوصیت زیادہ تھی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل چند انبیاء کو قتل کر چکے تھے اور اب حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے درپے تھے، اسی کے ساتھ یہ مسطورہ بالا حقیقت بھی فراموش نہیں رہنی چاہیے کہ یہود مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت دو مسیح کے منتظر تھے اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو مسیح ضلالت قرار دے کر آج بھی مسیح ہدایت کے منتظر ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ہجرت، کائنات ارضی کی بجائے ملاء اعلیٰ کی جانب ہوتا کہ مقررہ وقت آنے پر وہ مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت کے درمیان مشاہدہ سے امتیاز کر سکیں اور ایک جانب اگر مسیح ہدایت کو مسیح ہدایت سمجھیں تو دوسری جانب قرآن کے فیصلہ حق کی صداقت و حقانیت کو دیکھ کر دین حق ”اسلام“ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور ساتھ ہی نصاریٰ کو بھی اپنی جہالت اور یہود کی کورانہ تقلید پر ندامت ہو اور وہ بھی تعلیم قرآن کی صداقت پر یقین و اعتقاد کے ساتھ شہادت دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

کچھ عجیب صورت حال ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور خاتم الانبیاء محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دعوت و تبلیغ حق، اور معاندین کی جانب سے حق کی معاندت و مخالفت، اور پھر اس کے نتائج و ثمرات میں بہت ہی زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے دونوں کی اپنی قوم نے دونوں کو جھٹلایا دونوں کی قوموں نے سازش قتل کے بعد مکانوں کا محاصرہ کیا قدرت حق کے کرمہ اعجاز نے دونوں کو دشمنوں کی دسترس سے ہر طرح محفوظ رکھا، دونوں کے لیے ہجرت کا معاملہ پیش آیا، البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چونکہ بعثت عامہ تھی اور اس کی دعوت و تبلیغ کے لیے ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کرہ ارضی پر قیام مسلسل ضروری تھا، اس لیے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کا حکم ہوا اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام چونکہ قوم کو دعوت حق پہنچا چکے تھے اور ایک خاص مقصد عظیم کے پیش نظر ان کا مدت مدید کے بعد کائنات ارضی پر موجود ہونا ضروری تھا اس لیے ان کو ہجرت ارضی کی بجائے ہجرت سماوی پیش آئی پھر جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے قائد ضلالت ”امیہ بن خلف“ کو اپنے حربہ سے قتل کیا، عیسیٰ بن مریم علیہ السلام بھی اپنی قوم کے مسیح ضلالت دجال کو قتل کریں گے اور جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن مکہ پر قدرت حق نے اقتدار عطا فرمادیا، عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول بھی شام ہی کے اس مشہور شہر میں ہوگا جس سے اپنی قوم کی معاندانہ سازشوں کی بناء پر ملاء اعلیٰ کی جانب ہجرت پیش آئی تھی اور بیت المقدس، دمشق اور شام کے پورے ملک پر



یہود کے علی الرغم ان کی حکومت ہوگی۔

③ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے قتل انبیاء علیہم السلام نے یہود کو اس درجہ گستاخ اور بے باک بنا دیا تھا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ کسی ہستی کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ نبی صادق ہے یا متنبی کاذب ہمارے ہاتھ میں ہے اور جس کو ہم اور ہمارے فقیہ "کاذب" قرار دے دیں وہ واجب القتل ہے۔ چنانچہ اسی زعم باطل میں انہوں نے عیسیٰ بن مریم علیہا السلام کو مسیح ضلالت کہا اور ان کے فقیہوں نے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ حالانکہ وہ جلیل القدر ہستی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں اس پایہ کا کوئی پیغمبر مبعوث ہی نہیں ہوا تھا اور اس نے جدید پیغام حق (انجیل) کے ذریعہ روحانیت کی مردہ کھیتی میں دوبارہ جان ڈال دی تھی، تب اللہ تعالیٰ کی مشیت کا فیصلہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے بنی اسرائیل کے اس زعم باطل کو پاش پاش کر دیا جائے اور دکھا دیا جائے کہ رب العالمین، خالق کائنات جس کی حفاظت کا وعدہ کر لے کائنات کی کوئی ہستی یا مجموعہ کائنات بھی اس پر دسترس نہیں پاسکتی چنانچہ یہ قدرت نے اس وقت اس مقدس ہستی کو جسد عنصری کے ساتھ ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھالیا جبکہ مکان کے محاصرہ کے ساتھ دشمنوں نے اس کی حفاظت جان کے تمام وسائل دنیوی مسدود کر دیئے تھے۔

پھر اس واقعہ نے ایک نئی صورت پیدا کر دی وہ یہ کہ مذاہب کی تاریخ میں صرف حضرت مسیح علیہ السلام ہی کی شخصیت ایسی ہے جن کے قتل و عدم قتل کے متعلق حق و باطل کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوا اور یہود و نصاریٰ کے باہم واقعہ صلیب و قتل پر اتفاق کے باوجود باطل اور متضاد عقائد کی کشمکش نظر آنے لگی۔

یہود قتل و صلیب کی وجہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک وہ مسیح ضلالت تھے اور نصاریٰ وجہ صلیب یہ بتاتے ہیں کہ وہ خدا کے بیٹے تھے جو کائنات کے گناہوں کا کفارہ بننے کے لیے بھیجے گئے تھے تاکہ پاپی دنیا پاپ سے پاک ہو جائے اور صدیوں بعد جب قرآن نے "امر حق" کو واضح اور مسیح بن مریم علیہا السلام سے متعلق حقیقت حال کو روشن کیا تب بھی دونوں جماعتوں نے جماعتی حیثیت سے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لہذا قدرت حق کا فیصلہ ہوا کہ خود مسیح بن مریم علیہا السلام ہی وقت موعود پر نازل ہو کر قرآن کے فیصلہ کی تصدیق کر دیں اور یہود و نصاریٰ کے باطل عقائد کا خود بخود اس طرح خاتمہ ہو جائے اور اس کے بعد مدعیان اہل کتاب کو شرک و باطل کی پیروی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور خدا کی حجت ان پر تمام ہو جائے۔

نیز جبکہ اللہ تعالیٰ نے کائنات ہست و بود کے لیے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خدا کی ہستی کے ماسوا ہر ایک وجود کو فنا اور موت ہے ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ..... ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ اور یہ ظاہر ہے کہ ملاء اعلیٰ اور عالم قدس مقام موت نہیں ہے بلکہ مقام حیات ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہا السلام بھی موت کا ذائقہ چکھیں اور اس کے لیے کائنات ارضی پر اتریں تاکہ زمین کی امانت زمین ہی کے سپرد ہو اس لیے "حیات و رفع" کے بعد "نزول ارضی" مقدر ہوا۔

علماء حق نے حیات و نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جو "اسرار و حکم" بیان فرمائے ہیں یہاں ان کا احاطہ مقصود نہیں ہے اس لیے مختصر چند حکمتوں کا ذکر کر دیا گیا ورنہ محدث عصر علامہ سید محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے اس سلسلہ میں ایک طویل مقالہ عقیدۃ الاسلام میں سپرد قلم فرمایا ہے جو لائق مطالعہ ہے حضرت استاد نے نہایت لطیف مگر دقیق پیرایہ بیان میں کائنات عالم کو "انسان کبیر" اور



انسان کو ”عالم صغیر“ قرار دے کر ان ہر دو عالم کی حیات و موت پر جو بحث فرمائی ہے اس سے حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع اور قرب قیامت میں کائنات ارضی کی جانب رجوع کی حکمت بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے لیکن یہ کتاب چونکہ اس دقیق بحث کی متحمل نہیں ہے اس لیے اپنی جگہ قابل مراجعت ہے۔

آخر میں اب اپنی جانب سے چند جملے اس سلسلہ میں اضافہ کر کے اس بحث کو ختم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

④ قرآن عزیز میں ”میثاق انبیاء“ سے متعلق یہ ارشاد باری ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ ۚ قَالَ ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذٰلِكُمْ إِصْرِي ۚ قَالُوا ءَأَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا ۚ وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝۸۱﴾ (آل عمران: ۸۱)

”اور وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ اللہ نے نبیوں سے (یہ) عہد لیا کہ جب تمہارے پاس (خدا کی جانب سے) کتاب اور حکمت آئے پھر ایسا ہو کہ تمہاری موجودگی میں ایک رسول (محمد ﷺ) آئے جو تصدیق کرتا ہو ان کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں ضرور تم اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا، اللہ نے کہا: کیا تم نے اقرار کیا؟ انہوں نے جواب دیا ہاں ہم نے اقرار کیا، اللہ نے کہا: پس تم اپنے اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔“

آل عمران کی ان آیات میں حسب تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس عہد و پیمانہ کا تذکرہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ازل میں خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے متعلق انبیاء و رسل علیہم السلام سے لیا، قرآن کے اسلوب بیان کے مطابق اگرچہ یہ خطاب انبیاء و رسل کی معرفت ان کی امتوں سے تھا کہ ان میں سے جو امتیں خاتم الانبیاء ﷺ کا زمانہ مبارک پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور دعوت حق میں ان کی نصرت و یاری کریں۔ چنانچہ ہر ایک پیغمبر نے اپنے اپنے دور میں تعلیم حق کے ساتھ ساتھ خدا کے اس وعدہ کو بھی یاد دلایا اور ان میں سے اہل حق نے وعدہ دیا اور اقرار کیا کہ ضرور ان پر ایمان لائیں گے اور پیغام حق میں ان کی مدد کریں گے۔

تو یہ ”میثاق النبیین“ اگرچہ اس طرح پورا ہوتا رہا تاہم ازل میں چونکہ اس عہد و میثاق کے اول مخاطب حضرات انبیاء و رسل تھے اس لیے اس میثاق کی عملی حیثیت کا تقاضا تھا کہ خود انبیاء و رسل میں سے بھی کوئی نبی یا رسول اس عہد و میثاق کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے تاکہ یہ خطاب اولین براہ راست بھی موثر ثابت ہو مگر ﴿ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ﴾ میں بقاعدہ عربیت خطاب تھا ان تمام انبیاء و رسل سے جو ذات اقدس ﷺ سے پہلے اس کائنات ارضی میں مبعوث ہونے والے تھے کیونکہ ازل ہی میں محمد ﷺ کے لیے یہ مقرر ہو چکا تھا ﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾ پس محمد ﷺ کی صفت ”خاتم النبیین“ اور ازل سے مقدر ”میثاق النبیین“ کا

﴿عن علی و ابن عباس فی تفسیر آیہ ما بعث اللہ نبیاً من الانبیاء الا اخذ علیہ الميثاق لئن بعث اللہ محمداً و هو حی لیؤمنن بہ و لینصرنہ و امرہ ان یاخذ الميثاق علی امتہ لئن بعث محمداً و ہم احياء لیؤمنن بہ و لینصرنہ﴾ (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں سے جس نبی کو بھی کسی قوم کی رشد و ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تو اس سے یہ عہد ضرور لیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اس وقت زندہ ہو جبکہ محمد ﷺ کی بعثت ہوگی تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا اور ان سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی اپنی امتوں سے بھی یہی عہد و پیمانہ لیں کہ ان میں سے جو اس وقت موجود ہوں وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں۔



اجتماع صرف اسی ایک شکل میں ممکن تھا کہ انبیاء سابقین میں کوئی ایک پیغمبر بعثت محمد ﷺ کے بعد نزول فرمائیں اور وہ اور ان کی امت دنیا انسان کے سامنے خاتم الانبیاء ﷺ پر ایمان لائیں اور ”دین حق“ کی مدد و نصرت کا مظاہرہ کریں تاکہ ﴿لَتَنْصُرُنَّهُ﴾ کا وعدہ حق پورا ہو۔

گذشتہ صفحات میں یہ حقیقت بخوبی عیاں ہو چکی ہے کہ اگرچہ تمام انبیاء و رسل اپنے اپنے زمانہ میں محمد ﷺ کی بشارات دیتے چلے آتے تھے لیکن یہ خصوصیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے حصہ میں آئی کہ وہ ذات اقدس ﷺ کی بعثت کے لیے تمہید اور براہ راست منادی و مبشر بنے اور بنی اسرائیل کو تعلیم حق دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ

بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ (سورۃ الصف: ۶)

اور حقیقت یہ ہے کہ خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہی کا یہ حق تھا کہ وہ خاتم الانبیاء و الرسل کی بعثت کا ”مناد“ اور ”مبشر“ ہو اس لیے حکمت ربانی کا یہ فیصلہ ہوا کہ میثاق النبیین کے وقار کے لیے ان ہی کو منتخب کیا جائے اور اس معاملہ میں وہی تمام انبیاء و رسل کی نمائندگی کریں تاکہ امتوں کی جانب سے ہی نہیں بلکہ براہ راست انبیاء و رسل کی جانب سے وفاء عہد کا عملی مظاہرہ ہو سکے، اسی حقیقت کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

((انا اولی الناس بعیسی ابن مریم والانبیاء اولاد علات لیس بینی و بینہ نبی)).

مگر قرآن چونکہ خدا کا آخری پیغام ہے اور ﴿إِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ کے وعدہ الہی نے رہتی دنیا تک اس کو تحریف سے محفوظ کر دیا ہے اس لیے قدرتی طور پر اس کی تعلیم کے ثمرات دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے مقابلہ میں مدت طویل تک اپنا کام کرتے رہیں گے اور اس کی روشنی سے قلوب کو گرمانے اور اطاعت ربانی کے لیے مشتعل کرنے کے لیے علماء امت انبیاء بنی اسرائیل کی طرح خدمت حق انجام دیتے رہیں گے۔ لیکن جب بعثت محمد ﷺ کو گزرے ہوئے بہت ہی طویل عرصہ ہو جائے گا اور امت مرحومہ کے عملی قومی اور اجتماعی اعضاء میں انتہائی اضمحلال پیدا ہو کر یہ کیفیت ہو جائے گی کہ ان کی بیداری اور تیز روی کے لیے صرف علماء حق کی روحانیت ہی کافی ثابت نہیں ہوگی وہ وقت اس کا متقاضی ہوگا کہ کوئی ”قائم بالحجة“ ان کو سنبھالے اور اس لیے مشیت الہی نے مقدر کیا کہ جو ہستی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام انبیاء و رسل کے میثاق ازل کی نمائندگی کے لیے مامور ہے اس کا ایسے ہی وقت نزول ہو اور وہ امت محمد ﷺ کے درمیان رہ کر ذات اقدس ﷺ کی نیابت اور امت کی امامت کا فرض انجام دے اور ﴿لَتَنْصُرُنَّهُ﴾ کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے۔

اب کرشمہ قدرت دیکھئے کہ ازل کے ان مقدرات نے جو کہ ملاء اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے کائنات ارضی میں کس طرح اپنی بساط بچھائی؟ بنی اسرائیل اپنے جلیل القدر پیغمبر کے قتل کے لیے سازش مکمل کر چکے ہیں شاہی دستہ چہار جانب سے مکان کو محصور کیے ہوئے ہے مگر قدرت حق اپنا کام اس طرح نہیں کرتی کہ معجزانہ کرشمہ کے ذریعہ ان کو محفوظ وہاں سے نکال کر خدا کی وسیع زمین کے دوسرے حصہ میں ”ہجرت“ کر ادیتی نہیں بلکہ ہوا یہ کہ ان کو ملاء اعلیٰ کی ہجرت کے لیے محفوظ و مامون زندہ اٹھالیا اور سازش و محصور



کرنے والوں کو ظن و ریب کی دلدل میں پھنسا کر ان کے لیے خسر الدنیا والآخرۃ کا نشان عطاء کر دیا اور پھر ارضی انسان کے ارضی احکام کے لیے وہ وقت مقرر کر دیا جو ”مِثَاقِ النَّبِیِّیْنَ“ کی نمائندگی کے لیے موزوں تھا، یہی ہے وہ حقیقت جس کو زبان وحی ترجمان نے اس طرح ظاہر فرمایا: ”وَالذِّیْ نَفْسِیْ بَیْدَہٗ لَیْوَ شَکْنِ اِنْ یَنْزِلْ فِیْکُمْ اِبْنُ مَرْیَمَ حَکْمًا عَدْلًا“ اور اسی کو نص قرآن نے یوں واضح کیا ہے: ﴿وَ اِنَّہٗ لَعَلَّمٌ لِّلسَّاعَۃِ﴾۔

پھر یہ ہستی میثاق انبیاء و رسل کی نمائندگی کا اس طرح حق ادا کرے گی کہ جب اس کا نزول ہوگا تو اس کرشمہ قدرت کو دیکھ کر مسلمانوں کے قلوب تصدیق قرآن اور تازگی ایمان سے روشن ہو جائیں گے اور وہ حق الیقین کے درجہ میں یقین کریں گے کہ بلاشبہ راہ مستقیم صرف اسلام ہی ہے اور مخبر صادق کی جس طرح یہ خبر صادق نکلی عالم غیب سے متعلق اس کی تمام خبریں اسی طرح حق اور بلاشبہ حق ہیں اور نصاریٰ بحیثیت قوم اپنے باطل عقیدہ تسلیم و کفارہ پر نادم و شرمسار ہوں گے اور قرآن اور محمد ﷺ پر ایمان لانے کو اپنے لیے راہ نجات اور راہ سعادت یقین کریں گے اور یہود جب مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت کے معرکہ حق و باطل کا مشاہدہ کر لیں گے اور مسیح ہدایت کے نزول سے اپنے دعوائے قتل و صلیب کے ملعون عقیدہ کو باطل پالیں گے تو اب ان کو بھی ”ایمان بالحق“ کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہے گا اور مسیح ضلالت کے رفقاء کے علاوہ وہ سب ہی ”مسلم“ بن جائیں گے یہی ہے قرآن کی وہ خبر صادق ﴿وَ اِنْ قَمْنَ اٰہِلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُّوْمِئِنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ﴾ مسلمانوں میں ایمان کی تازگی و شکستگی نصاریٰ اور یہود میں تبدیلی عقائد کا حیرت انگیز انقلاب دیکھ کر اب مشرک جماعتوں پر بھی قدرتی اثر پڑے گا اور ساتھ ہی خدا کے مقدس پیغمبر کے زبردست روحانی اثرات کا رفرما ہوں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح وحی ترجمان حامل قرآن محمد ﷺ کا یہ ارشاد اپنی صداقت کو نمایاں کرے گا۔

ویدعو الناس الی الاسلام و یہلک اللہ فی زمانہ الملل کلہا الا السلام و یہلک اللہ فی زمانہ الدجال۔  
اس تفصیل سے یہ بھی روشن ہو گیا کہ قرآن اور احادیث کی تصریحات ثابت کر رہی ہیں کہ اگر اس فرض کی انجام دہی کے لیے کوئی جدید نبی مبعوث ہوتا تو ایک جانب نبی اکرم ﷺ کا خصوصی شرف ”خاتم النبیین“ باقی نہ رہتا اور دوسری جانب ”میثاق النبیین“ کے خطاب اولین کا عملی مظاہرہ عالم وجود میں نہ آتا کیونکہ وہ ہستی بہر حال محمد ﷺ کی امت ہی میں سے ہوتی۔ البتہ سابقہ نبی کی آمد نقلاً اور عقلاً دونوں حیثیت سے شرف خصوصی ”خاتم النبیین“ کے لیے بھی قاصر نہیں ہے اور ”میثاق النبیین“ کو بھی پورا کرتی ہے۔

### واقعات نزول صحیح احادیث کی روشنی میں:

گذشتہ صفحات میں نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جو صحیح احادیث ذکر کی گئیں اور ان سے اور بعض دوسری صحیح احادیث سے جو تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں ان کو ترتیب کے ساتھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

قیامت کا دن اگرچہ معین ہے مگر ذات باری کے ماسوا کسی کو اس کا علم نہیں ہے اور اس کا وقوع اچانک ہوگا ﴿عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ﴾ اور قیامت کا علم خدا ہی کو ہے ﴿حَتّٰی اِذَا جَآءَتْہُمْ السَّاعَۃُ بَغْتَةً﴾ حتیٰ کہ ان پر اچانک قیامت کی گھڑی آجائے گی ﴿لَا تَاتِیْہُمْ بَغْتَةً﴾ ”قیامت ان پر نہیں آئے گی مگر اچانک“ اور حدیث جبرئیل علیہ السلام میں ہے:

((ما المسئول عنها با علم من السائل))

”جبرئیل علیہ السلام نے کہا) قیامت کے بارہ میں آپ سے زیادہ مجھے بھی علم نہیں جو اجمالی علم آپ کو ہے اسی قدر مجھ کو بھی ہے۔“



اور ایک اور حدیث میں ہے:

((سعت رسول الله ﷺ يقول قبل ان يسوت بشهر: تساءلون عن الساعة وانا عليها عند الله)).

”تم مجھ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہو تو اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔“

البتہ قرآن عزیز اور احادیث صحیح نے چند ایسی علامات بیان کی ہیں جو قیامت کے قریب پیش آئیں گی اور ان سے صرف اس کے نزدیک ہو جانے کا پتہ چل سکتا ہے، ان ”اشرط ساعت“ میں سے ایک بڑی علامت حضرت مسیح علیہ السلام کا ملاء اعلیٰ سے نزول ہے جس کی تفصیلات یہ ہیں:

”مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان سخت معرکہ جنگ بپا ہو رہا ہوگا اور مسلمانوں کی قیادت و امامت سلالہ رسول اللہ ﷺ میں سے ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوگی جس کا لقب ”مہدی“ ہوگا اس معرکہ آرائی کے درمیان ہی میں مسیح ضلالت ”دجال“ کا خروج ہوگا یہ نسلآ یہودی اور یک چشم ہوگا کرشمہ قدرت نے اس کی پیشانی پر (ک، ا، ف، ر) کا فر لکھ دیا ہوگا جس کو اہل ایمان فراست ایمانی سے پڑھ سکیں گے اور اس کے دجل و فریب سے جدا رہیں گے۔ یہ اول خدائی کا دعویٰ کرے گا اور شعبدہ بازوں کی طرح شعبدے دکھا کر لوگوں کو اپنی جانب توجہ دلائے گا مگر اس سلسلہ کو کامیاب نہ دیکھ کر کچھ عرصہ کے بعد مسیح ہدایت ہونے کا مدعی ہوگا یہ دیکھ کر یہود بکثرت بلکہ قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں گے اور یہ اس لیے ہوگا کہ یہود مسیح ہدایت کا انکار کر کے ان کے قتل کا ادعاء کر چکے ہیں اور مسیح ہدایت کی آمد کے آج تک منتظر ہیں اسی حالت میں ایک روز دمشق (شام) کی مسجد جامع میں مسلمان منہ اندھیرے نماز کے لیے جمع ہوں گے نماز کے لیے اقامت ہو رہی ہوگی اور مہدی موعود امامت کے لیے مصلے پر پہنچ چکے ہوں گے کہ اچانک ایک آواز سب کو اپنی جانب متوجہ کر لے گی مسلمان آنکھ اٹھا کر دیکھیں گے تو سپید بادل چھایا ہوا نظر آئے گا اور تھوڑے سے عرصہ میں یہ مشاہدہ ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام دوزرد حسین چادروں میں لپٹے ہوئے اور فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا دیئے ہوئے ملاء اعلیٰ سے اتر رہے ہیں فرشتے ان کو مسجد کے منارہ شرقی پر اتار دیں گے اور واپس چلے جائیں گے اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق کائنات ارضی کے ساتھ دوبارہ وابستہ ہو جائے گا اور وہ عام قانون فطرت کے مطابق صحن مسجد میں اترنے کے لیے سیرھی کے طالب ہوں گے فوراً تعمیل ہوگی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز کی صفوں میں آکھڑے ہوں گے مسلمانوں کا امام (مہدی موعود) از راہ تعظیم پیچھے ہٹ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے امامت کی درخواست کرے گا۔ آپ فرمائیں گے کہ یہ اقامت تمہارے لیے کہی گئی ہے اس لیے تم ہی نماز پڑھاؤ۔ فراغت نماز کے بعد اب مسلمانوں کی امامت حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھوں میں آجائے گی اور وہ حربہ لے کر مسیح ضلالت (دجال) کے قتل کے لیے روانہ ہو جائیں گے اور شہر پناہ کے باہر اس کو باب لد پر مقابل پائیں گے دجال سمجھ جائے گا کہ اس کے دجل اور زندگی کے خاتمہ کا وقت آ پہنچا اس لیے خوف کی وجہ سے رانگ کی طرح گپھلنے لگے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگے بڑھ کر اس کو قتل کر دیں گے اور پھر جو یہود دجال کی رفاقت میں قتل سے بچ جائیں گے وہ اور عیسائی سب اسلام قبول کر لیں گے اور مسیح ہدایت کی سچی پیروی کے لیے مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آئیں گے اس کا اثر مشرک جماعتوں پر بھی پڑے گا اور اس طرح اس زمانہ میں اسلام کے ماسوا کوئی مذہب باقی نہیں رہے گا۔

ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد یا جوج ماجوج کا خروج ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو اس فتنہ



سے محفوظ رکھیں گے، حضرت مسیح علیہ السلام کا دور حکومت چالیس سال رہے گا اور اس درمیان میں وہ ازدواجی زندگی بسر کریں گے اور ان کے دور حکومت میں عدل و انصاف اور خیر و برکت کا یہ عالم ہوگا کہ بکری اور شیر ایک گھاٹ پر پانی پیئیں گے اور بدی اور شرارت کے عناصر دب کر رہ جائیں گے۔

### وفات مسیح علیہ السلام:

چالیس سالہ دور حکومت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہو جائے گا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہوں گے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے:

((فیبکث اربعین سنة ثم یتوفی ویصلی علیہ المسلمون ودفنونه)).

”پھر وہ کائنات ارضی پر اتر کر چالیس سال قیام کریں گے اور اس کے بعد وفات پا جائیں گے اور مسلمان ان کے جنازہ کی نماز پڑھیں گے اور ان کو دفن کر دیں گے۔“

اور ترمذی نے بسند حسن محمد بن یوسف بن عبداللہ بن سلام کے سلسلہ سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے:

((قال مکتوب فی التوراة صفة محمدا وعیسیٰ ابن مریم یدفن معہ)).

”عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا تورات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت (حلیہ و سیرت) مذکور ہے اور یہ بھی مسطور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ (پہلو میں) دفن ہوں گے۔“

### وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا:

سورہ مائدہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کے مختلف حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر آخر سورہ بھی ان ہی کے تذکرہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اول قیامت کے اس واقعہ کا نقشہ کھینچا ہے جب انبیاء علیہم السلام سے ان کی امتوں کے متعلق سوال ہوگا اور وہ غایت ادب سے اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے اور عرض کریں گے خدایا! آج کا دن تو نے اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ ہر معاملہ میں حقائق امور کے پیش نظر فیصلہ سنائے اور ہم چونکہ صرف ظواہر ہی پر کوئی حکم لگا سکتے ہیں اور قلوب اور حقائق کا دیکھنے والا تیرے سوا کوئی نہیں اس لیے آج ہم کیا شہادت دے سکتے ہیں، صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں تو علام الغیوب ہے اس لیے تو ہی سب کچھ جانتا ہے۔

﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ ۗ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا ۗ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝﴾ (المائدہ: ۱۰۹)

اور مسلم میں ہے کہ دور حکومت سات سال رہے گی حافظ ابن کثیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جب مسیح علیہ السلام کا رفع سماوی ہو اس وقت ان کی عمر تینتیس سال تھی اور نزول کے بعد سات سال مزید بقید حیات رہیں گے، اس طرح کائنات ارضی میں کل مدت حیات چالیس سال ہو جائے گی۔

ماخوذ از صحیح احادیث عن ابن عساکر فی تاریخہ

اس سے قبل یہ حدیث مکمل نقل کی گئی ہے۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، امام احمد نے مسند میں، ابوداؤد نے سنن میں، ابن جریر نے تفسیر میں اور ابن حبان نے صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۸۴



”وہ دن (قابل ذکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو جمع کرے گا پھر کہے گا تم (اپنی اپنی امتوں کی جانب سے) کیا جواب دیئے گئے؟ وہ (پیغمبر) کہیں گے (تیرے علم کے سامنے) ہم کچھ نہیں جانتے بلاشبہ تو ہی غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے۔“

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا ﴿لَا عِلْمَ لَنَا﴾ فرمانا علم حقیقی کی نفی پر ہی مبنی ہوگا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ درحقیقت اپنی امتوں کے جواب سے لاعلم ہیں کہ کس نے ایمان کو قبول کیا اور کس نے انکار کیا کیونکہ جواب کا مقصد اگر یہ ہو تو یہ صریح جھوٹ اور کذب بیانی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی جانب اس عمل بد کی نسبت ناممکن ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام کا یہ جواب مسطورہ بالا حقیقت کے ہی پیش نظر ہوگا۔ ظاہر حالات کے علم سے انکار پر مبنی نہیں ہوگا اس کے لیے خود قرآن عزیز ہی شاہد عدل ہے کیونکہ وہ متعدد جگہ یہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں پر شہادت دیں گے کہ ہم نے ان تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا اور یہ کہ انہوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا یا رد کر دیا۔ تو ان ہر دو مقامات پر نظر رکھنے کے بعد یوں کہا جائے گا کہ پاس ادب کے طریقہ پر اول انبیاء علیہم السلام کا یہی جواب ہوگا جو ماندہ میں مذکور ہے لیکن جب ان کو خدائے برتر کا یہ حکم ہوگا کہ وہ صرف اپنے علم کے مطابق شہادت دیں تب وہ شہادت دیں گے۔

﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ (النساء: ۴۱)

”پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اس دن (یعنی قیامت کے دن) جب ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ طلب کریں گے (یعنی اس کے پیغمبر کو طلب کریں گے جو اپنی امت کے اعمال و احوال پر گواہ ہوگا) اور ہم تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے طلب کریں گے۔“

﴿وَجَاءِيَاءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ﴾ (الزمر: ۶۹)

”اور لائے جائیں گے (قیامت کے دن) انبیاء اور شہداء اور فیصلہ کیا جائے گا ان لوگوں کے درمیان اچھائی اور برائی کا حق کے ساتھ۔“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی ﴿لَا عِلْمَ لَنَا﴾ کی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے:

عن ابن عباس ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ... الْآيَةَ﴾ يقولوا الرب عز وجل لا علم لنا الا علم انت اعلم به منا.

”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما آیت ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ... الْآيَةَ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: انبیاء علیہم السلام رب

عز وجل سے عرض کریں گے، ہم کو کوئی علم نہیں ہے مگر ایسا علم کہ جس کے متعلق تو ہم سے بہتر جانتا ہے۔“

اور شیخ المحققین علامہ سید انور شاہ صاحب رضی اللہ عنہ آیت کے جملہ ﴿لَا عِلْمَ لَنَا﴾ کو ”علم حقیقی کے انکار“ پر محمول کرتے ہوئے

ارشاد فرماتے ہیں:



”یہ بات مسلم ہے کہ ایک انسان کو... خواہ وہ کسی درجہ اور رتبہ کا ہو... دوسرے انسان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوتا ہے وہ علم حقیقی کے لحاظ سے ”ظن“ کے درجہ سے آگے ”علم“ تک نہیں پہنچتا، اس بناء پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((نحن نحکم بالظواہر واللہ متولی السرائر)).

”ہم ظاہر معاملات پر حکم لگاتے ہیں اور بھیدوں اور حقیقتوں پر تو صرف خدا کو ہی قابو حاصل ہے۔“

نیز ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ذات اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو اور بعض تم میں سے زیادہ چرب زبان ہوتے ہیں اور مجھ کو علم غیب نہیں ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہو جایا کروں اس لیے جو بھی فیصلہ دیتا ہوں ظاہر حالات پر ہی دیتا ہوں تو یاد رہے کہ جو شخص بھی اپنی چرب زبانی سے کسی بھائی کا ادنیٰ سا ٹکڑا بھی ناحق حاصل کرے گا تو بلاشبہ جہنم کا ٹکڑا حاصل کر لے گا۔“

بہر حال قرآن عزیز، احادیث رسول ﷺ، آثار صحابہ رضی اللہ عنہم، اور اقوال علماء سب یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس موقع پر انبیاء علیہم السلام کا جواب ”عدم علم“ کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ازراہ پاس ادب ”حقیقی علم پر انکار“ کو واضح کرتا ہے۔

غرض ذکر یہ تھا کہ اصل مقام پر اصل تذکرہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ کا ہو رہا ہے جو قیامت میں پیش آئے گا جبکہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے انعامات شمار کرانے کے بعد ان سے ان کی امت کے متعلق سوال کرے گا اور حسب حال جوابات پیش کریں گے مگر سابق آیات میں چونکہ دوسرے مطالب ذکر ہوئے تھے اس لیے ان سے امتیاز پیدا کرنے کے لیے تمہیداً قیامت میں ہونے والے ان سوال و جواب کا ذکر ضروری ہوا جو عام طور پر انبیاء علیہم السلام سے ان کی امتوں کے متعلق کیے جائیں گے اور اس لیے بھی یہ تذکرہ ضروری تھا کہ اگلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کا ذکر کیا گیا ہے اس کا پیراہ بیان بھی انبیاء علیہم السلام کے جواب کے ساتھ مطابق رکھتا ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۗ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِيٓ بِحَقِّ ۗ إِن كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۗ تَعَلَّمُ مَا فِي نَفْسِيٓ وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۗ إِنَّكَ أَنْتَ عَلٰمُ الْغُيُوبِ ۗ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِيٓ بِهِ ۗ إِنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّيٓ وَرَبَّكُمْ ۗ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۗ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۗ وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۗ إِن تَعَذِّبُهُمْ فَلَهُمْ عِبَادَتُكَ ۗ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۗ﴾ (المائدہ: ۱۱۶-۱۱۸)

”اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام سے کہے گا ”کیا تو نے لوگوں (بنی اسرائیل) سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو دونوں کو اللہ کے ماسواہ خدا بنا لینا“ عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے ”پاکی تجھ کو ہی زیبا ہے میرے لیے کیسے ممکن



تھا کہ میں وہ بات کہتا جو کہنے کے لائق نہیں اگر میں نے یہ بات ان سے کہی ہوتی تو یقیناً تیرے علم میں ہوتی (اس لیے کہ) تو وہ سب کچھ جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں تیرا بھید نہیں پاسکتا بلاشبہ تو غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے، میں نے اس بات کے ماسواء جس کا تو نے مجھ کو حکم دیا ان سے اور کچھ نہیں کہا ”وہ یہ کہ صرف اللہ ہی کی پوجا کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے“ اور میں ان پر اس وقت تک کا گواہ ہوں جب تک میں ان کے درمیان رہا پھر جب تو نے مجھ کو قبض کر لیا تب تو ہی ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے اگر تو ان سب کو عذاب چکھائے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دے پس تو ہی بلاشبہ غالب حکمت والا ہے۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اپنا جواب دے چکیں گے تب اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرمائے گا:

﴿قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمٌ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ ۗ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۗ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۗ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۱۹﴾﴾ (المائدہ: ۱۱۹)

”اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ ایسا دن ہے کہ جس میں راستبازوں کی راستبازی ہی کام آسکتی ہے، ان ہی کے لیے بہشت ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ خدا سے راضی اور خدا ان سے راضی (کا مقام اعلیٰ پائیں گے) یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ایک جلیل القدر پیغمبر کی عظمت و شان کے عین مطابق ہے وہ پہلے بارگاہ رب العزت میں عذر خواہ ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ایسی نامناسب بات کہتا جو قطعاً حق کے خلاف ہے ﴿سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ﴾ پھر پاس ادب کے طور پر خدا کے علم حقیقی کے سامنے اپنے علم کو ہیچ اور بے علمی کے مترادف ظاہر کریں گے ﴿اِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۗ تَعَلَّمْ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۗ اِنَّكَ اَنْتَ عَلٰمُ الْغُيُوْبِ﴾ اور اس کے بعد اپنے فرض کی انجام دہی کا حال گزارش کریں گے ﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِيْ بِهٖ اَنْ اَعْبُدُ وَاللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ﴾ اور پھر امت نے اس دعوت حق کا جواب کیا دیا؟ اس کے متعلق ظاہر امور کی شہادت کا بھی اس اسلوب کے ساتھ ذکر کریں گے جس میں ان کی شہادت خدا کی شہادت کے مقابلہ میں بے وقعت نظر آئے ﴿وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۗ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتُ اَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۗ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ اور اس کے بعد یہ جانتے ہوئے کہ امت میں مومنین قانتین بھی ہیں اور منکرین جاحدین بھی، وقوع عذاب اور طلب مغفرت کا اس انداز میں ذکر کریں گے جس سے ایک جانب خدا کے مقرر کردہ پاداش عمل کے قانون کی خلاف ورزی بھی مترشح نہ ہو اور دوسری جانب امت کے ساتھ رحمت و شفقت کے جذبہ کا جو تقاضا ہے وہ بھی پورا ہو جائے ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۗ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيْمُ﴾ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض داشت یا جواب کے مضمون کو ختم کر چکے تو رب العالمین نے اپنے قانون عدل کا یہ فیصلہ سنا دیا تا کہ مستحق رحمت و مغفرت کو مایوسی نہ پیدا ہو بلکہ مسرت و شادمانی سے ان کے قلوب روشن ہو جائیں اور مستحق عذاب غلط توقعات قائم نہ کر سکیں ﴿هٰذَا يَوْمٌ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ ۗ... الاية﴾

ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ آیات زیر بحث کا سیاق و سباق صراحت کرتا ہے کہ یہ واقعہ قیامت کے روز پیش آئے



گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ملاء اعلیٰ پر اٹھا لیے جانے کے وقت پیش نہیں آیا۔ اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی ابتداء ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ...﴾ سے کرنا اور انتہاء واقعہ ﴿هَذَا يَوْمٌ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ...﴾ الایۃ پر ہونا روز قیامت کے ماسواء اور کسی دن پر صادق نہیں آسکتا اور اس ایک قطعی بات کے علاوہ دوسرے کسی احتمال کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔

نیز یہ تفصیلات واضح کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی امت کے قبول و انکار کے حالات سے آگاہی کے باوجود آیات ماندہ میں مذکور اسلوب بیان اس لیے اختیار فرمائیں گے کہ دوسرے انبیاء و رسل علیہم السلام بھی مقام کی نزاکت حال اور رب العزت کے دربار میں غایت پاس ادب کے لیے یہی اسلوب بیان اختیار فرمائیں گے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور انبیاء علیہم السلام کے جوابات میں اسلوب بیان کی یکسانیت کے باوجود اجمال و تفصیل کا فرق صرف اس لیے ہے کہ زیر بحث آیات میں اصل مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت کے قبول و انکار اور ان کے نتائج و ثمرات کا تذکرہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کا ذکر صرف واقعہ کی تمہید کے طور پر ہے۔

حقیقت حال کے اس انکشاف کے بعد اب جمہور امت مسلمہ کے خلاف خلیفہ قادیانی مسٹر محمد علی لاہوری کی تحریف معنوی بھی قابل مطالعہ ہے کہتے ہیں کہ سورہ ماندہ میں مذکور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور پروردگار عالم کا یہ سوال و جواب اس وقت پیش آچکا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نعش ملنے پر شاگردوں نے ان کا علاج کر کے چنگا کر لیا اور پھر وہ شام سے فرار ہو کر مصر اور مصر سے کشمیر پہنچے اور گمنامی کی حالت میں انتقال فرما گئے۔ مسٹر لاہوری نے اپنے دعوے میں دو دلائل پیش کیے ہیں: ایک یہ کہ عربیت کے قاعدے سے لفظ ”اذ“ ماضی کے لیے مستعمل ہے نہ کہ مستقبل کے لیے اور دوسری دلیل یہ کہ اگر جمہور کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کا انتقال نہیں ہوا اور وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے تو ضروری ہے کہ ان کو اپنی امت (نصاری) کے عقیدہ الوہیت مسیح علیہ السلام اور تثلیث کا علم ہو چکا ہوگا کیونکہ نصاریٰ نے ان کے رفع کے زمانہ تک تثلیث کو نہیں اپنایا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ایسے اسلوب پر نہ ہوتا جس سے ان کی لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔

مسٹر لاہوری نے قرآن کی تحریف معنوی پر یہ اقدام یا تو اس لیے کیا کہ اپنے مرشد متنبی قادیان (علیہ ما علیہ) کے دعوائے مسیحیت کو قوت پہنچائیں اور مغالطہ اور سفسطہ سے کام لے کر ”خسران مبین“ کا سامان مہیا کریں اور یا پھر وہ قواعد عربیت سے اس درجہ ناواقف ہیں کہ نہ ان کو نحو کے معمولی استعمالات ہی کا علم ہے اور نہ وہ آیات قرآنی کے سیاق و سباق کا ہی کچھ درک رکھتے ہیں اور صرف جاہلانہ دعاوی پر دلیر نظر آتے ہیں۔

جن قوانین عربیت میں ”اذ“ اور ”اذا“ کے درمیان یہ فرق بیان کیا گیا ہے کہ ”اذ“ اگر فعل مستقبل پر بھی داخل ہو تب بھی ”ماضی“ کے معنی دیتا ہے اور ”اذا“ اگرچہ فعل ماضی پر بھی داخل ہو تب بھی مستقبل کے معنی دیا کرتا ہے ان ہی قوانین میں علماء معانی و بلاغت یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی گزرے ہوئے واقعہ کو اس طرح پیش کرنے کے لیے گویا وہ زمانہ حال میں پیش آ رہا ہے صیغہ مستقبل سے تعبیر کر لیا کرتے ہیں یعنی اس کے لیے ”اذا“ کا استعمال جائز رکھتے بلکہ مستحسن سمجھتے اور اس کو ”استحضار“ اور ”حکایۃ الحال“ کہتے ہیں اور اسی طرح مستقبل میں ہونے والے ایسے واقعہ کو جس کے وقوع سے متعلق یہ یقین دلانا ہو کہ وہ ضرور ہو کر رہے گا اور ناممکن ہے کہ اس کے خلاف ہو سکے اکثر ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرنا مستحسن سمجھتے بلکہ بلاغت تعبیر کے لحاظ سے ضروری اور



مفید یقین کرتے ہیں کیونکہ اس طرح مخاطب اور سامع کے سامنے ہونے والے واقعہ کا نقشہ اس طرح آجاتا ہے گویا وہ ہوگزر رہا ہے اور یہ بھی ”استحضار“ ہی کی ایک صورت سمجھی جاتی ہے دور کیوں جائیے لفظ ”اذ“ کا استعمال مستقبل کے لیے خود قرآن عزیز میں متعدد مقامات پر ثابت ہے:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبُ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الانعام: ۲۷)

”اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ وہ کھڑے کیے جائیں گے آگ (جہنم) کے اوپر پس کہیں گے اے کاش کہ ہم لوٹا دیئے جائیں دنیا میں اور نہ جھٹلائیں ہم اپنے رب کی نشانیوں کو اور ہو جائیں ہم ایمان والوں میں سے۔“  
اسی طرح سورہ انعام میں روز قیامت مجرموں کی حالت کا اس طرح ذکر کیا ہے:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۖ قَالَ الْيَاسُ هَذَا بِالْحَقِّ ۖ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۖ قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ﴾ (الانعام: ۳۰)

”اور کاش کہ تو دیکھے، جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو (پروردگار) کہے گا کیا یہ حق نہیں ہے؟ وہ کہیں گے قسم ہے پروردگار کی یہ (روز حشر) حق اور سچ ہے پس پروردگار کہے گا تو چکھو اس کے بدلہ میں عذاب جو تم کفر کیا کرتے تھے۔“

اور ان ہی مجرمین کی روز قیامت حالت کا نقشہ سورہ سبأ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فِرَعُونَ قَالَ فَوْتُ وَأُخِذُوا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ۖ وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ ۗ﴾ (سبأ: ۵۱-۵۲)

”اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ وہ (منکرین) گھبرائیں گے، پس نہیں بھاگ سکیں گے اور پکڑے جائیں گے قریب سے اور کہیں گے ہم (اب) اس پر ایمان لے آئے۔“

اور سورہ سجدہ میں اس حقیقت کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ﴾ (السجدہ: ۱۲)

”اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ مجرم اپنا سر نیچے ڈالے ہوئے ہوں گے اپنے رب کے سامنے۔“

یہ اور اسی قسم کے متعدد مقامات ہیں جن میں مستقبل کے واقعات کو ماضی کے ساتھ تعبیر کیا گیا اور اس لیے لفظ ”اذ“ کا استعمال مفید سمجھا گیا پس جس طرح ان مقامات میں ﴿اذوقفوا، قال، قالوا اذفرعوا، واخذوا، اذالمجرمون ناكسوا﴾ تمام افعال لفظ ”اذ“ کے باوجود مستقبل کے معنی دے رہے ہیں اسی طرح ﴿اذقال الله يعيسى﴾ کے استعمال کو مستقبل کے لیے سمجھئے اور جس طرح ان تمام مقامات کے سیاق و سباق دلالت کر رہے ہیں کہ ان واقعات کا تعلق روز قیامت سے ہے ٹھیک آیات ماندہ کی زیر بحث آیات کا سیاق و سباق صراحت کر رہا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق قیامت کے دن سے ہے۔



قاعدہ عربیت کی اس حقیقت افروز تحقیق کے بعد مسٹر لاہوری کی دوسری دلیل پر نظر ڈالیے تو وہ اس سے بھی زیادہ لچر نظر آئے گی اس لیے کہ گذشتہ تحقیق سے یہ واضح ہو چکا کہ سورہ مانکہ کی آیات زیر بحث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ہرگز اس بات پر مبنی نہیں ہے کہ ان کو اپنی امت کی گمراہی کا علم نہیں ہوگا اور وہ اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے، ایک مرتبہ ان آیات پر پھر غور کرو گے تو صاف نظر آئے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصل جواب صرف یہ ہے:

﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَّا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ أَعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ﴾

اور اول آخر باقی آیات میں یا جواب کے مناسب حال تمہید ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی جلالت و جبروت اور اپنی بیچارگی و در ماندگی بلکہ عبودیت کا اظہار ہے جس میں ایک جلیل القدر پیغمبر کی شان کے مناسب حضرة القدس کے سامنے شہادت پیش کی گئی ہے علاوہ ازیں اگر مسٹر لاہوری کا یہ قول صحیح مان لیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی تک نصاریٰ نے چونکہ تثلیث کا عقیدہ نہیں اختیار کیا تھا اس لیے انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ سوال کیا معنی رکھتا ہے:

﴿أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمَّيَ الْهَيْدِينَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾

کیا العیاذ باللہ اس کا یہ مطلب نہ ہوا کہ خدا نے عیسیٰ علیہ السلام کی امت پر جھوٹا الزام لگایا؟ پھر یہ کیا کم حیرت کی بات ہے کہ قادیانی اور لاہوری ایک جانب تو یہ کہہ رہے ہیں مگر اس کے قطعاً متضاد ”آئینہ کمالات“ میں قادیانی نے یہ کہا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی روح کو یہ معلوم ہوا اور اس کو بتایا گیا کہ اس کی امت کس طرح شرک میں مبتلاء ہو گئی تب عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی، خدایا! تو میرا مثیل نازل فرماتا کہ میری امت اس شرک سے نجات پائے اور تیری سچی پرستار بنے۔

بہیں تفاوت رہ از کجا ست تا کجا

حقیقت یہ ہے کہ قادیانی اور لاہوری کی تفسیر کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے مطالب قرآن کی زبان سے سننا چاہتے ہیں بلکہ پہلے سے ایک باطل عقیدہ کو عقیدہ بتاتے ہیں اور پھر اس کے سانچے میں قرآن کو ڈھالنا چاہتے ہیں اور جب قرآن اس سانچے میں ڈھلنے سے انکار کرتا ہے تو تحریف کے حربہ سے زبردستی اس پر مشق ستم کرنا چاہتے ہیں مگر وہ ایسا کرتے وقت میں اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ قرآن امت کی ہدایت کے لیے رہتی دنیا تک امام الہدیٰ ہے۔ اس لیے کوئی ”طحد و زندیق“ خواہ کتنی ہی تحریف معنوی کی کوشش کرے ہمیشہ ناکام اور خاسر رہے گا اور خود قرآنی اطلاقات ہی اس کے عقیدہ و فکر کے بطلان کے لیے ناطق ہوں گے بلکہ بمصداق، دروغ گور حافظہ نہ باشد، وہ اکثر اپنے ہی متضاد اقوال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر اپنی کذب بیانی اور تفسیری افتراء پر مہر لگا لیتا ہے جس کی تازہ شہادت ابھی سطور بالا میں نقل ہو چکی ہے۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۖ

حیات و رفع مسیح علیہ السلام سے متعلق گزشتہ مباحث میں ”تونی“ کی حقیقت پر کافی روشنی پڑ چکی ہے اور سورہ مانکہ کی آیات مسطورہ بالا کی تفسیر کے بھی تمام پہلو واضح ہو چکے ہیں تاہم قرآن کے اعجاز بلاغت اور اسلوب بیان کی لطافت سے مستفید ہونے کے



لیے چند سطور اس مسئلہ پر بھی سپرد قلم کر دینا مناسب ہے کہ اس مقام پر قرآن نے عیسیٰ علیہ السلام کے قیام ارضی کو ﴿مَا دُمْتُ فِيهِمْ﴾ سے اور کائنات ارضی سے انقطاع تعلقات کو ﴿تَوَفَّيْتَنِي﴾ سے کیوں تعبیر کیا۔

گزشتہ سطور میں لغت اور معانی کے حوالوں سے یہ تو ثابت ہو چکا کہ ”توفی“ کے حقیقی معنی ”اخذ و تناول“ (لے لینے اور قبضہ میں کر لینے) کے ہیں اور نبوت کے معنی میں بطور کنایہ اس کا استعمال ہوتا ہے اور یہ کہ کنایہ میں حقیقی معنی برابر ساتھ ساتھ رہتے ہیں مجاز کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ حقیقی معنی سے جدا ہو کر لفظ غیر موضوع لہ میں استعمال ہونے لگے۔ پس اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن کا عقیدہ یہ ہوتا کہ ان کو موت آچکی اور سوال و جواب کا یہ سلسلہ موت کے اسی وقت سے متعلق ہے نہ کہ قیامت کے دن سے تو پھر بلاغت و معانی کا تقاضا یہ تھا کہ اس موقع پر ”حیات“ اور ”موت“ ایک دوسرے کے متضاد الفاظ کو استعمال کیا جاتا تاکہ یہ حیثیت واضح ہو سکتی کہ سوال و جواب کا معاملہ ”موت“ کے ہم قریں ہے اور پھر لفظ ”موت“ کی صراحت اپنے مقابل لفظ ”حیات“ کی طالب ہوتی مگر قرآن نے ان دونوں الفاظ کی بجائے ﴿مَا دُمْتُ فِيهِمْ﴾ کو ”حیات“ کی اور ”توفی“ کو ”موت“ کی جگہ استعمال کیا ہے تو یہ کس لیے اور کس مقصد سے یا بغیر کسی حکمت و مصلحت کے یہ اسلوب اختیار کر لیا؟ جمہور امت تو اس کا ایک ہی جواب رکھتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے دوسرے مقامات کی طرح اس مقام پر بھی اعجاز و ایجاز سے کام لیا ہے اور ان دو لفظوں میں وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی، رفع، نزول اور موت تمام مراحل کو سمو دینا چاہتا ہے وہ اگر یہ کہتا ”ما حییت“ ”میں جب تک زندہ رہا“ اور ”فلما امتنی“ ”پس جب تو نے مجھ کو موت دے دی“ تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی عام حالات کے مطابق دو ہی مراحل پیش آئے ہیں ”زندگی“ اور ”موت“ ان دونوں مرحلوں کے درمیان کوئی خاص صورت حال پیش نہیں آئی، لیکن جبکہ یہ خلاف واقعہ تھا اور ان کی زندگی اور موت کے درمیان دو اہم مراحل پیش آچکے ہوں گے: ایک ”ملاء اعلیٰ کی جانب بقید حیات رفع، اور دوسرے کائنات ارضی پر دوبارہ رجوع (نزول)“ اس لیے از بس ضروری ہوا کہ حیات اور موت کی جگہ دو ایسے الفاظ اختیار کیے جائیں جو ان چاروں مراحل پر صادق آسکیں اور جبکہ متعدد مقامات پر حسب حال ان مراحل کی تفصیل بیان ہو چکی ہے تو اعجاز بلاغت کا یہی تقاضا ہے کہ اب ان کو ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

صورت حال کا یہی نقشہ تھا جس کے لیے قرآن عزیز نے ”ما حییت“ کی جگہ ”ما دمت فیہم“ استعمال کیا تاکہ یہ جملہ اختصار کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے دونوں حصوں پر حاوی ہو جائے اس حصہ پر بھی جو ابتداء زندگی سے شروع ہو کر ”رفع الی السماء“ پر ختم ہوتا ہے اور اس حصہ پر بھی جو ”نزول ارضی“ سے شروع ہو کر ”موت“ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور اسی طرح قرآن نے ”فلما امتنی“ کا اسلوب بیان اختیار کیا تاکہ یہ جملہ بھی پہلے کی طرح باقی دونوں مرحلوں کو اپنے اندر سمو لے اس مرحلہ کو بھی جو ”رفع الی السماء“ کی صورت میں پیش آیا اور اس مرحلہ کو بھی جو نزول کے بعد ”موت“ کی صورت میں نمودار ہوا کیونکہ موت سے صرف ایک ہی حقیقت ظاہر ہو سکتی تھی مگر ”توفی“ میں بیک وقت دونوں حقیقتیں موجود تھیں، حقیقی معنی کے لحاظ سے صرف ”اخذ و تناول“ اور کنایہ کے اعتبار سے اخذ و تناول کے ساتھ ساتھ ”موت“ جیسا کہ سطور بالا میں ”کنایہ“ اور ”مجاز“ کے باہمی فرق سے معلوم ہو چکا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے خدایا! جو وقت میں نے ان کے درمیان گزارا اس کے لیے تو بیشک میں شاہد ہوں لیکن ”توفی“ کے اوقات میں ان پر فقط تو ہی نگہبان رہا باقی تیری شہادت تو ہر حالت میں ہر وقت ہر شے پر حاوی ہے۔



مسئلہ متعلقہ کی یہ پوری بحث اس سے قطع نظر کہ نبی معصوم ﷺ نے آیات کی تفسیر میں کیا ارشاد فرمایا ہے لغت، معانی، بلاغت کے پیش نظر تھی ورنہ ان آیات کی تفسیر میں ایک مومن صادق کے لیے وہ صحیح مرفوع احادیث کافی ہیں جن کو محدثین نے بسند صحیح روایت کیا ہے مثلاً مشہور محدث حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے بروایت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے جو حدیث نقل کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

جب قیامت کا دن ہوگا تو تمام انبیاء علیہم السلام کو اور ان کی امتوں کو بلایا جائے گا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی بلائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اول ان کے سامنے اپنی ان نعمتوں کو شمار کرائے گا جو دنیا میں ان پر نازل ہوتی رہیں اور عیسیٰ علیہ السلام ان سب کا اعتراف کریں گے اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا:

﴿أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمَّيَ الْهَيْئِ مِنْ دُونِ اللَّهِ ط﴾

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام انکار فرمائیں گے پھر نصاریٰ بلائے جائیں گے اور ان سے سوال کیا جائے گا تو وہ دروغ بیانی کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہاں عیسیٰ علیہ السلام نے ہم کو یہی تعلیم دی تھی، یہ سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سخت خوف طاری ہو جائے گا، بدن کے بال کھڑے ہو جائیں گے اور خشیت الہی سے ان کا رواں رواں بارگاہِ صمدی میں سجدہ ریز ہو جائے گا اور یہ مدت ایک ہزار سال معلوم ہوگی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نصاریٰ کے خلاف حجت قائم کر دی جائے گی اور ان کی خود ساختہ صلیب پرستی کا راز فاش کر دیا جائے گا اور پھر ان کو جہنم میں جھونک دیئے جانے کا حکم ہو جائے گا۔

اور محدث ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح یہ روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”کہ اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی امت کے متعلق سوال کرے گا تو اپنی جانب سے عیسیٰ علیہ السلام پر جواب بھی القاء کر دے گا“ اور اس القاء کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر القاء ہوگا کہ وہ یہ جواب دیں:

﴿سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقِّكَ ط﴾

اور صحیحین (بخاری و مسلم) اور سنن میں جو حدیث شفاعت منقول و مشہور ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح قیامت میں تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور معاملہ کے پیش آنے سے قبل خائف و ہراساں ہوں گے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان میں سے ایک ہوں گے اور ان پر یہ خوف طاری ہو رہا ہوگا کہ جب ان سے امت کی مشرکانہ بدعت پر سوال ہوگا تو وہ درگاہِ صمدی میں کس طرح اس سے عہدہ برآ ہو سکیں گے؟

الحاصل سورہ مائدہ کی ان آیات کی تفسیر وہی صحیح ہے جو جمہور امت کی جانب سے منقول ہے اور قادیانی اور لاہوری کی تفسیر بالرائے الحاد و زندقہ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔



### حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے:

گزشتہ مباحث میں پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطاء کی تھی اور یہ الہامی کتاب دراصل توراہ کا تکملہ تھی یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمی اساس اگرچہ توراہ ہی پر قائم تھی مگر یہودی گمراہیوں مذہبی بغاوتوں اور سرکشوں کی وجہ سے جن اصلاحات کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی معرفت انجیل کی شکل میں ان کے سامنے پیش کر دیا تھا، حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہودی اعتقادی اور عملی گمراہیاں اگرچہ بے شمار حد تک پہنچ چکی تھیں اور حضرت مسیح علیہ السلام نے مبعوث ہو کر ان سب کی اصلاح کے لیے قدم اٹھایا، تاہم چند اہم بنیادی باتیں خصوصیت کے ساتھ قابل اصلاح تھیں جن کی اصلاح کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام بہت زیادہ سرگرم عمل رہے۔

① یہودی ایک جماعت کہتی تھی کہ انسان کے اعمال نیک و بد کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے باقی قیامت، آخرت، آخرت میں جزا و سزا، حشر و نشر، یہ سب باتیں غلط ہیں یہ ”صدوقی“ تھے۔

② دوسری جماعت اگرچہ ان تمام چیزوں کو حق سمجھتی تھی مگر ساتھ ہی یہ یقین رکھتی تھی کہ وصول الی اللہ کے لیے از بس ضروری ہے کہ لذات دنیا اور اہل دنیا سے کنارہ کش ہو کر ”زہادت“ کی زندگی اختیار کی جائے۔ چنانچہ وہ بستیوں سے الگ خانقاہوں اور جھونپڑیوں میں رہنا پسند کرتے تھے مگر یہ جماعت حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے کچھ پہلے اپنی یہ حیثیت بھی کھو چکی تھی اور اب ترک دنیا کے پردہ میں دنیا کی ہر قسم کی گندگی میں آلودہ نظر آتی تھی ظاہر رسم و طریق زاہدوں کا سا ہوتا مگر خلوت کدوں میں وہ سب کچھ نظر آتا جن سے رندان بادہ خوار بھی ایک مرتبہ حیا سے آنکھیں بند کر لیں، یہ ”فریسی“ کہلاتے تھے۔

③ تیسری جماعت مذہبی رسوم اور خدمت ہیکل سے متعلق تھی لیکن ان کا بھی یہ حال تھا کہ جن رسوم اور خدمات کو لوجہ اللہ کرنا چاہیے تھا اور جن اعمال کے نیک نتائج خلوص پر مبنی تھے ان کو تجارتی کاروبار بنا لیا تھا اور جب تک ہر ایک رسم اور خدمت ہیکل پر بھینٹ اور نذر نہ لے لیں قدم نہ اٹھائیں حتیٰ کہ اس مقدس کاروبار کے لیے انہوں نے توراہ کے احکام تک میں تحریف کر دی تھی یہ ”کاہن“ تھے۔

④ چوتھی جماعت ان سب پر حاوی اور مذہب کی اجارہ دار تھی اس جماعت نے عوام میں آہستہ آہستہ یہ عقیدہ پیدا کر دیا تھا کہ مذہب اور دین کے اصول و اعتقادات کچھ نہیں ہیں مگر ”وہ“ جن پر وہ صاد کر دیں، ان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیں، احکام دین میں اضافہ یا کمی کر دیں جس کو چاہیں جنت کا پروانہ لکھ دیں اور جس کو چاہیں جہنم کی سند تحریر کر دیں۔ خدا کے یہاں ان کا فیصلہ اٹل اور امنٹ ہے غرض بنی اسرائیل کے ”ارباباً من دون اللہ“ بنے ہوئے تھے اور تورات کی لفظی اور معنوی ہر قسم کی تحریف میں اس درجہ جری تھے کہ اس کو دنیا طلبی کا مستقل سرمایہ بنا لیا تھا اور عوام و خواص کی خوشنودی کے لیے ٹھہرائی ہوئی قیمت پر احکام دین کو بدل ڈالنا ان کا مشغلہ دینی تھا یہ ”احبار“ یا ”فقیہ“ تھے۔

یہ تھیں وہ جماعتیں اور یہ تھے ان کے عقائد و اعمال جن کے درمیان حضرت مسیح علیہ السلام مبعوث ہوئے اور جن کی اصلاح حال کے لیے ان کی بعثت ہوئی انہوں نے ہر ایک جماعت کے فاسد عقائد و اعمال کا جائزہ لیا رحم و شفقت کے ساتھ ان کے عیوب و نقائص



پرکتہ چینی کی ان کو اصلاح حال کے لیے ترغیب دی اور ان کے عقائد و افکار اور ان کے اعمال و کردار کی نجاستوں کو دور کر کے ان کا رشتہ خالق کائنات اور ذات واحد کے ساتھ دوبارہ قائم کرنے کی سعی کی۔ مگر ان بدبختوں نے اپنے اعمال سیاہ کی اصلاح سے یکسر انکار کر دیا اور نہ صرف یہ بلکہ ان کو ”مسح ضلالت“ کہہ کر ان کی دعوت حق و ارشاد کے دشمن اور ان کے خلاف سازشیں کر کے ان کی جان کے درپے ہو گئے۔

### اناجیل اربعہ:

حضرت مسیح علیہ السلام پر جو انجیل نازل ہوئی تھی کیا موجودہ چاروں انجیلیں وہی ہیں یا یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد کی تصانیف ہیں؟ اس کے متعلق تمام اہل علم کا جن میں نصاریٰ بھی شامل ہیں اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی انجیل نہیں ہے اور نہ اس کا ترجمہ ہے لیکن پھر ان موجودہ انجیلوں کے متعلق عیسائی کیا کہتے ہیں اور ناقدین کی رائے کیا ہے یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔

یہ بات بہر حال تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ چاروں انجیلوں کے متعلق نصاریٰ کے پاس کوئی ایسی سند موجود نہیں جس کی بناء پر وہ یہ کہہ سکیں کہ ان کی روایات کا سلسلہ یا ان کی ترتیب و تالیف کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام یا ان کے شاگردوں (حواریوں) تک پہنچتا ہے نہ اس کے لیے کوئی مذہبی سند ہے اور نہ تاریخی، بلکہ اس کے خلاف خود عیسائیت کی مذہبی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک عیسائیوں میں اکیس سے زیادہ انجیلیں الہامی یقین کی جاتی اور رائج و معمول بہا تھیں لیکن ۳۲۵ء میں نالیسیا کی کونسل نے ان میں سے صرف چار کو منتخب کر کے باقی کو متروک قرار دے دیا اور سخت حیرت کا مقام ہے کہ کونسل کا یہ انتخاب کسی تاریخی اور علمی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ ایک طرح کی فال نکالی گئی اور اس کو الہامی اشارہ تسلیم کر لیا گیا، چنانچہ ان اکیس سے زائد انجیلوں میں سے بعض یورپ کے قدیم کتب خانوں میں پائی گئی ہیں مثلاً انیسویں صدی میں ویٹیکان کے مشہور کتب خانہ سے متروک اناجیل کا ایک نسخہ برآمد ہوا تھا جس میں موجودہ چاروں انجیلوں سے بہت کچھ زائد موجود ہے موجودہ نسخوں میں سے سینٹ لوقا کی انجیل میں خصوصیت کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ تفصیل سے درج ہے لیکن سورہ مریم میں قرآن عزیز نے اس واقعہ کو جس طرح حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش اور ہیکل میں تربیت کے ذکر سے شروع کیا ہے نہ لوقا کی انجیل میں اس کا ذکر ہے اور نہ باقی تینوں انجیلوں میں۔ ویٹیکان کے اس نسخہ میں یہ واقعہ ٹھیک سورہ مریم میں مذکور واقعہ کی طرح درج ہے۔

اسی طرح سولہویں صدی میں روما کے مشہور پوپ سکٹس (Skits) کے قدیم کتب خانہ میں ایک اور متروک انجیل کا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام انجیل برنایا ہے، یہ نسخہ پوپ کے مقرب لاٹ پادری فرامینیو نے پڑھا اور پوپ کی اجازت کے بغیر کتب خانہ سے چرایا چونکہ اس میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کثرت سے واضح اور صاف بشارتیں موجود تھیں حتیٰ کہ ”احمد“ نام تک مذکور تھا نیز الوہیت مسیح علیہ السلام کے خلاف عقیدہ کی تعلیم پائی جاتی تھی اس لیے وہ لاٹ پادری مسلمان ہو گیا حال ہی میں اس کا عربی ترجمہ مصر میں علامہ سید رشید رضا مرحوم نے المنار پریس سے شائع کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے، ڈاکٹر سعادہ نے اس کے مقدمہ میں جو قابل قدر علمی تحقیق پیش کی ہے اس میں ہے کہ اس انجیل کا پتہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس تاریخی منشور (حکم نامہ) سے چلتا ہے جو



خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے عیسائیوں کے پوپ گلیسیوس کی جانب سے کلیساؤں کے نام بھیجا گیا تھا اور جس میں ان کتابوں کے نام درج تھے جن کا پڑھنا پڑھانا عیسائیوں پر حرام کیا گیا تھا ان ہی میں انجیل برنایا کا نام بھی شامل تھا۔

علاوہ ازیں محققین یورپ بھی آج اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ابتدائی تین صدیوں میں ایک سو سے زائد انجیلیں پائی جاتی تھیں جو بعد میں چار کو چھوڑ کر باقی متروک کر دی گئیں اور کلیسہ کے فیصلہ کے مطابق ان کا پڑھنا حرام کر دیا گیا اس لیے آہستہ آہستہ وہ سب مفقود ہوتی چلی گئیں اور کہتے ہیں کہ ان مفقود نسخوں میں ایک مشہور انجیل، انجیل ایگنٹس (انجیل اغنطسی) بھی تھی جو اب ناپید ہے۔

نیز یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے کہ سینٹ پال (پولوس رسول) کے جو خطوط ہیں اور جن پر موجودہ عیسائیت کی بنیادیں قائم ہیں ان کے مطالعہ سے جگہ جگہ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کرتا اور ڈراتا ہے کہ وہ ان انجیلوں کی جانب توجہ نہ دیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کے نام کی بجائے دوسرے ناموں سے منسوب ہیں کیونکہ مجھ کو روح القدس نے اسی کے لیے مامور کیا ہے کہ میں انجیل مسیح علیہ السلام کی حمایت کروں، اسی کو اسوہ بناؤں اور اس کی تعلیم کو تمام عیسائی دنیا میں پھیلاؤں، چنانچہ حسب ذیل جملے اس کی صراحت کرتے ہیں کہ اس کے نزدیک مسیح علیہ السلام کی انجیل عیسائیوں میں متروک ہو چکی تھی اور بعد کی بے سند انجیلوں کا عام رواج ہو گیا تھا اور ان ہی میں سے یہ چار ہیں جو نالیسیا کی کونسل نے بغیر کسی سند کے فال کے ذریعہ صحیح تسلیم کر لیں۔

اب ان چار کا حال بھی سنئے۔ ان میں سے سب سے قدیم متی کی انجیل تسلیم کی جاتی ہے، باایں ہمہ اس کے متعلق نصاریٰ میں سے علماء متقدمین تو بالاتفاق اور علماء موجودہ میں سے اکثر اس کے قائل ہیں کہ موجودہ انجیل متی اصل نہیں ہے بلکہ اس کا ترجمہ ہے اس لیے کہ اصل کتاب عبرانی میں تھی جو اب ناپید ہے اور ضائع ہو گئی لیکن یہ اصل کا ترجمہ ہے یا اس میں بھی تحریف ہوئی ہے اس کے متعلق کوئی تاریخی سند موجود نہیں حتیٰ کہ مترجم کا نام تک معلوم نہیں اور نہ یہ پتہ کہ کس زمانہ میں یہ ترجمہ ہوا اور مشہور عیسائی عالم جریمس زوبن الفتوحی اللبنانی نے اپنی کتاب میں تصریح کی ہے کہ متی نے اپنی انجیل بیت المقدس میں بیٹھ کر ۳۹ء میں عبرانی میں تصنیف کی تھی جیسا کہ مقدس ایرونیوس نے کہا ہے کہ اوسپیوس نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ متی کی انجیل کا یونانی ترجمہ اصل نہیں ہے اور جب بانیس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان جا کر عیسائیت کی تبلیغ کرے تو اس نے متی کی انجیل کو عبرانی میں مکتوب اسکندریہ کے کتب خانہ قیصر میں محفوظ دیکھا تھا مگر وہ نسخہ مفقود ہو گیا اور نہیں کہا جاسکتا کہ کس زمانہ میں کس شخص نے یونانی زبان میں موجودہ ترجمہ کو روشناس کرایا۔

دوسری انجیل مرقس کی ہے اس کے متعلق مشہور عیسائی عالم پطرس گوماگ اپنی کتاب مروج الاخبار فی تراجم الابراہیم مرقس کی سوانح حیات پر لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ نسل یہودی لاوی اور پطرس حواری عیسیٰ علیہ السلام کا شاگرد تھا۔ رومیوں نے جب عیسائیت اختیار کر لی تو ان کے مطالبہ پر یہ انجیل تصنیف کی، یہ الوہیت مسیح علیہ السلام کا منکر تھا اور اس نے اپنی انجیل میں اس حصہ کو بھی نہیں لیا جس میں حضرت مسیح علیہ السلام پطرس کی مدح کرتے ہیں یہ ۶۸ء میں اسکندریہ کے قید خانہ میں قتل ہوا بت پرستوں نے اس کو قتل کر دیا۔



اور عیسائی دنیا کو اس بارے میں اختلاف ہے کہ مرقس کی انجیل کب تصنیف ہوئی۔ چنانچہ الفارق کے مصنف مرشد الطالین ص ۱۷۰ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ علماء نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ یہ پطرس کی نگرانی میں ۷۰ء میں تصنیف ہوئی۔

تیسری انجیل سینٹ لوقا کی انجیل ہے جس قدر اختلاف علماء نصاریٰ میں متی کی انجیل سے متعلق ہے اس سے بھی زیادہ لوقا کی انجیل کی صحت و عدم صحت کے متعلق اختلاف ہے چنانچہ الفارق کے مصنف نے اس سلسلہ میں خود علماء نصاریٰ کے ہی اقوال نقل کیے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ الہامی کتاب نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ مسٹر گڈل اپنے رسالہ ”الہام“ میں دعویٰ کرتا ہے کہ لوقا کی انجیل الہامی نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ لوقا نے خود اپنی انجیل کی ابتداء میں یہ لکھا ہے کہ یہ (انجیل) اس نے تاوفیلس کے ساتھ خط و کتابت کی بناء پر لکھی ہے وہ اس کو مخاطب کر کے لکھتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی باتیں جن لوگوں نے آنکھوں سے دیکھی تھیں انہوں نے ہم تک جس طرح پہنچائی ہیں ان کو بہت سے لوگ ہم سے نقل کر رہے ہیں اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کو خود ہی صحیح طریقہ پر جمع کر دوں تا کہ تم کو صحیح حقیقت معلوم ہو جائے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کا زمانہ نہیں پایا، اور محققین نصاریٰ یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ لوقا کی انجیل مرقس کی انجیل کے بعد وجود میں آئی ہے اور پطرس اور پولوس کے مرنے کے بعد تصنیف کی گئی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ لوقا انطاکیہ میں طبابت کرتا تھا اس نے مسیح علیہ السلام کو نہیں دیکھا اور مسیحیت کو سینٹ پال (پولوس) سے سیکھا ہے اور پولوس کے متعلق یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ دراصل متعصب یہودی اور عیسائیت کا بدترین دشمن تھا اور نصاریٰ کے خلاف علی الاعلان اپنی جدوجہد جاری رکھتا تھا مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کی ہمہ قسم کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود مسیحیت کی ترقی ہوتی جا رہی ہے اور روکے نہیں رکتی تب اس نے یہودیانہ مکر و فریب سے کام لیا اور اعلان کیا کہ عجزہ ہوا میں بحالت صحت تھا کہ ایک دم اس طرح زمین پر گرا جیسا کہ کوئی کشتی میں بچھاڑ دیتا ہے اور اس حالت میں حضرت مسیح علیہ السلام نے مجھ کو چھوا اور پھر سخت زجر و توبیخ کی کہ آئندہ تو ہرگز میرے پیرووں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنا پس میں اسی وقت حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آیا اور پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے حکم سے میں مسیحی دنیا کی خدمت کے لیے مامور ہو گیا انہوں نے مجھ کو فرمایا کہ میں لوگوں کو مسیح علیہ السلام کی انجیل کی بشارت سنا دوں اور اس کے اتباع کی ترغیب دوں۔ چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ ”کلیسہ“ پر ایسا قبضہ کیا کہ دین عیسوی کی اصل صداقتوں کو مٹا کر بدعتوں اور برائیوں کا مجموعہ بنا دیا، الوہیت مسیح علیہ السلام تثلیث و ابنیت اور کفارہ کی بدعت ایجاد کر کے مسیحیت کو وثنیت میں تبدیل کر دیا اور شراب، مردار اور خنزیر سب کو حلال بنا دیا۔ یہی وہ مسیحیت ہے پولوس کے صدقہ میں جس سے آج دنیا روشناس ہے اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ پولوس کے شاگرد لوقا کی انجیل الہامی انجیل ہے اور جیروم کہتا ہے کہ بعض قدیم علماء نصاریٰ اس کے قائل ہیں کہ لوقا کی انجیل کے ابتدائی دو باب الہامی نہیں الحاقی ہیں کیونکہ یہ اس نسخہ میں موجود نہیں ہیں جو ماریوں فرقہ کے ہاتھوں میں ہے، اور مشہور نصرانی عالم اکہارن لکھتا ہے کہ لوقا کی انجیل کے باب ۲۲ آیات ۴۷-۴۳ الحاقی ہیں، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ معجزات سے متعلق جو بیان ہے اس میں کذب بیانی اور شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے جو غالباً کاتب کی جانب سے اضافہ ہیں لیکن اب صدق کا کذب سے امتیاز حد درجہ دشوار ہے اور کلی میش لکھتا ہے کہ متی اور مرقس کی انجیلیں بہت جگہ آپس میں مخالف اور متضاد



واقعات کی حامل ہیں لیکن جس معاملہ میں دونوں کا اتفاق ہو اس کو لوقا کی انجیل کے بیان پر ترجیح حاصل ہے۔ اور یہ واضح رہے کہ لوقا کی انجیل میں بیس سے زیادہ مواقع پر متی کی انجیل سے اضافہ ہے اور مرقس کی انجیل سے تو اس سے بھی کہیں زیادہ۔ پس ان تمام دلائل سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ لوقا کی انجیل ہرگز الہامی نہیں ہے اور نہ کسی حواری کی تصنیف ہے۔

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے اس کے متعلق نصاریٰ کا عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے محبوب شاگرد یوحنا زبدی کی ہے زبدی صیاد، یوحنا کے والد کا نام تھا، جلیل کے بیت صیدا میں ولادت ہوئی اور حواری۔ عیسیٰ علیہ السلام کا شرف حاصل ہوا اور نصاریٰ میں مشہور بارہ حواریوں میں سے سب سے زیادہ ان ہی کو تقدیس حاصل ہے۔ جرچیس زو میں اللبنانی لکھتا ہے کہ جس زمانہ میں شیر نیطوس اور بیسوں اور ان کی جماعت اپنے عقیدہ کی تشہیر کر رہی تھی کہ الوہیت مسیح علیہ السلام کا عقیدہ باطل ہے وہ بشر تھے اور حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم علیہا السلام سے قبل وہ عالم وجود میں نہیں تھے اس زمانہ میں ۹۶ء میں پادریوں، لاٹ پادریوں کی مجلس مشاورت ہوئی اور انہوں نے یوحنا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست پیش کی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی باتیں تحریر کریں اور جو باتیں دوسری انجیلوں میں پائی جاتی ہیں ان کے ماسواء جو کچھ معلوم ہو وہ لکھیں خصوصیت سے الوہیت مسیح کا مسئلہ ضرور لکھیں تاکہ شیر نیطوس وغیرہ کی جماعت کے خلاف ہمارے ہاتھ مضبوط ہوں تب یوحنا ان کی بات نہ ٹال سکے اور یہ انجیل لکھنے پر مجبور ہوئے۔ مگر اس کے باوجود مسیحی علماء زمانہ تصنیف کی تعیین میں مختلف نظر آتے ہیں بعض کہتے ہیں ۶۵ء میں تالیف ہوئی اور بعض ۹۶ء اور بعض ۹۸ء میں تصنیف ہونا بیان کرتے ہیں۔

مگر ان کے مقابلہ میں ان مسیحی علماء کی تعداد کم نہیں ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یوحنا کی انجیل، حواری یوحنا کی تصنیف ہرگز نہیں ہے چنانچہ کیتھولک ہیرالڈ جلد نمبر ۷ میں پروفیسر لن سے منقول ہے کہ انجیل یوحنا از ابتداء تا انتہاء مدرسہ اسکندریہ کے ایک طالب علم کی تصنیف ہے اور برٹش نیدر لکھتا ہے کہ انجیل یوحنا اور رسائل یوحنا ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد یوحنا کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی شخص نے دوسری صدی کے اوائل میں اس کو تصنیف کر کے اس لیے یوحنا کی جانب منسوب کر دیا تاکہ وہ لوگوں میں مقبول و مشہور بن جائے اور صاحب الفارق کہتے ہیں کہ مشہور مسیحی عالم کروئیس کا بیان ہے کہ یہ انجیل شروع میں بیس ابواب پر مشتمل تھی بعد میں افاس کے کنیسہ نے اس میں اکیسویں باب کا اضافہ کر دیا جبکہ یوحنا کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان حوالجات سے یہ بخوبی آشکارا ہوتا ہے کہ بلاشبہ یوحنا حواری کی انجیل نہیں ہے اور صرف اس مقصد سے تصنیف کر کے یوحنا کی جانب منسوب کی گئی کہ الوہیت مسیح علیہ السلام کے عقیدہ کو قوت پہنچائی جائے اور اصلاح عقیدہ کی جو آواز کبھی کبھی مسیحی دنیا میں اٹھتی تھی اس کو دبایا جائے۔

چہارگانہ اناجیل کے متعلق مسطورہ بالا مختصر تنقیدات کے علاوہ ان کے الہامی نہ ہونے کے دو واضح دلائل یہ بھی ہیں کہ ان چاروں انجیلوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے واقع درج ہیں حتیٰ کہ نصاریٰ کے زعم کے مطابق ان کی گرفتاری، صلیب، قتل، مرکر جی اٹھنے اور حواریوں پر ظاہر ہونے وغیرہ تک کے حالات بھی موجود ہیں۔ پس اگر یہ اناجیل انجیل مسیح علیہ السلام یا اس کا کوئی حصہ ہوتیں تو ان میں ان باتوں کا قطعاً تذکرہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ واقعات تو مسیح علیہ السلام کے بعد ان کے شاگرد جمع کرتے اور ان کو ایک تاریخی



حیثیت حاصل ہوتی نہ کہ وہ کتاب اللہ کہلانے کے مستحق ہوتے اور یہ کہ جس طرح ان انجیلوں کے مصنفین کے بارہ میں اختلاف ہے اسی طرح ان تصنیفات کے باہم روایات واقعات میں بھی تناقص اور سخت اختلاف پایا جاتا ہے یعنی بعض معجزات و عجیب واقعات ایسے ہیں جو ایک انجیل میں پائے جاتے ہیں اور دوسری انجیل میں ان کا اشارہ تک نہیں ہے یا بعض میں ایک واقعہ جس طرح مذکور ہے دوسری میں کچھ زیادتی یا کمی کے ساتھ ایسے طریقہ پر بیان ہوا ہے کہ پہلی انجیل کے بیان میں اور اس میں صریح تضاد اور خلاف نظر آتا ہے مثلاً صلیب مسیح علیہ السلام کا واقعہ انجیل میں تضاد بیان کے ساتھ منقول ہے۔

یہ بات بھی کم حیرت کے لائق نہیں ہے کہ یہ انجیل اربعہ جن جن زبانوں میں منقول ہوئی ہیں ان کی عبارات و کلمات کے بقاء و تحفظ کی کبھی پرواہ نہیں کی گئی بلکہ ایک ہی زبان کے مختلف ایڈیشنوں اور اشاعتوں میں بہ کثرت الفاظ اور جملوں کی تبدیلی، کمی اور بیشی موجود ہے خصوصاً جن مقامات پر علماء نصاریٰ اور علماء اسلام کے درمیان بشارات کے سلسلہ میں یہ بحث آگئی ہے کہ ان کا مصداق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا حضرت مسیح علیہ السلام یا کوئی اور نبی، نیز جن مقامات پر الوہیت مسیح علیہ السلام کی صراحت میں فرق پڑتا نظر آتا ہو ان کو کافی تختہ مشق بنایا جاتا رہا ہے..... اگر تحریفات لفظی و معنوی اور تضاد بیان کی تفصیلات و تشریحات کو بہ نظر وسیع مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اظہار الحق و حافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاری، باجہ جی زادہ کی الفارق بین المخلوق والخالق، اور مولانا آل نبی امر وہی کی اظہار حق لائق دید کتابیں ہیں۔

غرض موجودہ چاروں انجیلیں الہامی انجیلیں نہیں ہیں نہ ان کے الہامی ہونے کی روایتی سند ہے اور نہ تاریخی، نہ ان کے مصنفین کے متعلق قطعی اور یقینی علم حاصل ہے اور نہ زمانہ ہائے تصانیف ہی متعین ہیں بلکہ اس کے خلاف پولوس کے بیانات ان کتابوں کی تاریخی حیثیت مضامین و مطالب کا باہمی تضاد و تغیر اسی پر شاہد ہیں کہ یہ ہرگز انجیل مسیح علیہ السلام یا اس کا حصہ نہیں ہیں اور یہ کہ انجیل مسیح علیہ السلام نصاریٰ کے ہی ہاتھوں اول تحریف لفظی و معنوی کا شکار ہوئی اور اس کے بعد مفقود ہو گئی بلکہ ان چہارگانہ انجیلوں میں سے کوئی بھی اصل نہیں ہے بلکہ یونانی اور اس سے منقول دوسری زبانوں کے تراجم ہیں جو تبدیلی و تغیر اور نقص و ازدیاد کا برابر شکار ہوتے رہے ہیں اور صرف یہی نہیں کہ یہ انجیل اربعہ انجیل مسیح علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ کسی علمی تاریخی اور مذہبی سند سے ان کا شاگردان مسیح علیہ السلام کی تصنیف ہونا بھی ثابت نہیں ہے بلکہ بعد کے مصنفین کی تصانیف ہیں البتہ ان تراجم میں مواعظ و نصائح اور مقامات حکمت کے سلسلہ میں ایک حصہ ایسا ضرور ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ارشادات عالیہ سے ماخوذ ہے اس لیے نقل میں کہیں کہیں اصل کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔

## قرآن اور انجیل:

قرآن عزیز کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ جس طرح خدا ایک ہے اسی طرح اس کی صداقت بھی ایک ہی ہے اور وہ کبھی کسی خاص قوم، خاص جماعت اور خاص گروہ کی وراثت نہیں رہی بلکہ ہر قوم اور ہر ملک میں خدا کی رشد و ہدایت کا پیغام ایک ہی احساس و بنیاد پر قائم رہتے ہوئے اس کے سچے پیغمبروں یا ان کے نائبوں کے ذریعے ہمیشہ دنیا کے لیے راہ مستقیم کا داعی اور مناد رہا ہے اور اسی کا نام "صراط مستقیم" اور "اسلام" ہے اور قرآن اسی بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانے آیا ہے اور یہی وہ آخری پیغام ہے جس نے تمام مذاہب ماضیہ کی صداقتوں کو اپنے اندر سمو کر کائنات ارضی کی ہدایت کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس لیے اب اس کا انکار گویا خدا کی تمام صداقتوں کا



انکار ہے۔ اسی بنیادی تعلیم کے پیش نظر اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عظمت شان کو سراہا اور یہ اعتراف کیا کہ بلاشبہ انجیل الہامی کتاب اور خدا کی کتاب ہے لیکن ساتھ ہی جگہ جگہ یہ بھی بہ دلائل بتلایا کہ علماء اہل کتاب نے ان کی سچی تعلیم کو بدل ڈالا اور ہر قسم کی تحریف کر کے اس کی تعلیم کو شرک و کفر کی تعلیم بنا دیا۔ مگر بعض بعض مقامات پر اہل کتاب کو توراہ و انجیل کے خلاف عمل پر ملزم بناتی ہوئی موجودہ تورات و انجیل کے حوالے بھی دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت اصل نسخے بھی اگرچہ محرف شکل میں ہی کیوں نہ ہوں پائے جاتے تھے۔ بہر حال اس وقت بھی یہ دونوں کتابیں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفات سے اس درجہ مسخ ہو چکی تھیں کہ وہ تورات موسیٰ اور انجیل مسیح علیہ السلام کہلانے کی مستحق نہیں رہی تھیں۔ چنانچہ قرآن نے اصل کتابوں کی عظمت اور اہل کتاب کے ہاتھوں ان کی تحریف اور ان کا مسخ دونوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے:

﴿ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ أَنْزَلَ التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۗ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ أَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ ﴾ (آل عمران: ۴-۳)

”(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) اللہ نے تجھ پر کتاب کو اتارا حق کے ساتھ جو تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو اس کے سامنے ہیں اور اتارا اس نے تورات اور انجیل کو (قرآن سے) پہلے جو ہدایت ہیں لوگوں کے لیے اور اتارا فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والا)۔“

﴿ وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرَةَ وَ الْإِنْجِيلَ ۗ ﴾ (آل عمران: ۴۸)

”اور سکھاتا ہے وہ کتاب کو، حکمت کو، توراہ کو، انجیل کو۔“

﴿ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۗ ﴾ (آل عمران: ۶۵)

”اے اہل کتاب! تم کس لیے ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں جھگڑتے ہو اور حال یہ ہے کہ توراہ اور انجیل کا نزول نہیں ہوا، مگر ابراہیم (علیہ السلام) کے بعد، پس کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔“

﴿ وَ قَفَيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بَعِيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ ۗ وَ اتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَ نُورٌ ۗ وَ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ ۗ وَ هُدًى وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۗ وَ لِيَحْكُمَ أَهْلَ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۗ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۗ ﴾ (المائدہ: ۴۶-۴۷)

”اور پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) کو جو تصدیق کرنے والا ہے اس کتاب کی جو سامنے ہے تورات اور دی ہم نے اس کو انجیل جس میں ہدایت اور نور ہے اور جو اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرتی ہے اور سرتا سر ہدایت اور نصیحت



ہے پرہیزگاروں کے لیے اور چاہیے کہ اہل انجیل اس کے مطابق فیصلہ دیں جو ہم نے انجیل میں اتار دیا ہے اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے موافق فیصلہ نہیں دیتا پس یہی لوگ فاسق ہیں۔“

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ ۗ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۗ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿۶۶﴾﴾ (المائدہ: ۶۶)

”اور اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھتے (تحریف کر کے ان کو مسخ نہ کر ڈالتے) اور اس کو قائم رکھتے جو ان کی جانب ان کے پروردگار کی جانب سے نازل ہوا ہے تو البتہ وہ (فارغ البالی کے ساتھ) کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے نیچے سے بعض ان میں میانہ رو صلاح کار ہیں اور اکثر ان کے بد عمل ہیں۔“

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ﴾ (المائدہ: ۶۸)

”(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) کہہ دیجئے: اے اہل کتاب تمہارے لیے نکلنے کی کوئی جگہ نہیں ہے جب تک تورات اور انجیل اور اس شے کو جس کو تمہارے پروردگار نے تم پر نازل کیا قائم نہ کرو (تاکہ اس کا نتیجہ قرآن کی تصدیق نکلے)۔“

﴿وَإِذْ عَلَّمْنَاكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۗ﴾ (المائدہ: ۱۱۰)

”اور جب میں نے تجھ کو (اے عیسیٰ علیہ السلام) سکھائی کتاب حکمت تورات اور انجیل۔“

﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ ۗ﴾ (الاعراف: ۱۵۷)

” (نیکوکار) وہ شخص ہیں جو پیروی کرتے ہیں الرسول کی جو نبی اُمی ہے اور جس کا ذکر اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔“

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۗ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۗ وَعَدَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ ۗ﴾ (التوبہ: ۱۱۱)

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے خرید لیا ہے مومنوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات پر کہ ان کے لیے جنت ہے وہ اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں پس قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں ان کے لیے اللہ کا وعدہ سچا ہے جو تورات اور انجیل میں کیا گیا ہے۔“

غرض یہ مدح و منقبت ہے اس تورات اور انجیل کی جو تورات موسیٰ اور انجیل عیسیٰ کہلانے کی مستحق اور درحقیقت کتاب اللہ تھیں لیکن یہود و نصاریٰ نے ان الہامی کتابوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ اس کا حال بھی قرآن ہی کی زبان سے سنئے:



﴿اَفَتَطْمَعُونَ اَنْ يُؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللّٰهِ ثُمَّ يَحْرَفُوْنَهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرہ: ۷۵)

”کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ ان میں ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنا تھا پھر اس کو بدل ڈالتا تھا باوجود اس بات کے کہ وہ اس کے مطالب کو سمجھتا تھا اور دیدہ و دانستہ تحریف کرتے تھے۔“

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۗ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَّوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴾ (البقرہ: ۷۹)

”پس افسوس ان (مدعیان علم) پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں تاکہ اس کے معاوضہ میں ایک حقیر سی قیمت دنیوی فائدہ کی حاصل کریں پس افسوس اس پر جو کچھ وہ لکھتے ہیں اور افسوس اس پر جو کچھ وہ اس ذریعہ سے کماتے ہیں۔“

﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوٰضِعِهَا﴾ (النساء: ۴۶)

”وہ اہل کتاب، کتاب اللہ (تورات و انجیل) کے کلمات کو ان کے محل و مقام سے بدل ڈالتے ہیں یعنی تحریف لفظی اور معنوی دونوں کرتے ہیں۔“

ان کے علاوہ ثمن قلیل (معمولی پونجی) کے عوض آیات اللہ کی فروخت کرنے کے متعلق تو بقرہ، آل عمران، نساء، توبہ میں متعدد آیات موجود ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ، تورات و انجیل کی بیع دونوں طرح کیا کرتے تھے، تحریف لفظی کے ذریعہ بھی اور تحریف معنوی کے سلسلہ سے بھی۔ گویا سیم و زر کے لالچ سے عوام و خواص کی خواہشات کے مطابق کتاب اللہ کی آیات میں لفظی و معنوی تحریف ان کے فروخت کرنے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بڑھ کر شقاوت بدبختی کا دوسرا کوئی عمل نہیں اور جو ہر حالت میں موجب لعنت ہے۔

انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام :

مفسرین عام طور پر حواری کو ”حور“ سے ماخوذ کہتے ہیں جس کے معنی کپڑے کی سپیدی کے ہیں جب کپڑا دھل جانے کے بعد سپید ہو جاتا ہے تو اہل عرب کہا کرتے ہیں ”حار الثوب“ اس لیے دھوبی کو ”حواری“ کہتے ہیں اور ”حواریوں“ اس کی جمع آتی ہے۔ اس معنی کے پیش نظر حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں کو یا اس لیے حواری کہتے ہیں کہ ان میں سے اکثر دھوبی اور چھیرے کا پیشہ کرتے تھے اور یا اس لیے کہ جس طرح دھوبی کپڑا صاف کر دیتا ہے یہ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے لوگوں کے قلوب کو روشن کر دیا کرتے تھے۔ حواری کے معنی ناصر و مددگار اور ناصح کے بھی آتے ہیں اور عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں کو ”شاگرد“ کہتے ہیں یہ تعبیر بے اصل نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ اصل کے اعتبار سے ”حور“ عبرانی لفظ ہے جس کے معنی ”شاگرد“ کے ہیں اور اس کی جمع ”حوریم“ آتی ہے یہی حوریم ہے جو عربی میں جا کر حواری اور حواریین کہلایا۔



حوار میں عیسیٰ علیہ السلام کا گذشتہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے لیکن قرآن عزیز نے صرف ”حواریوں“ کہہ کر مجمل تذکرہ کیا ہے، کسی کا نام مذکور نہیں ہے، انجیل نے البتہ ان کے نام بھی بتلائے ہیں اور تعداد بھی۔ چنانچہ متی کی انجیل کے باب ۱ میں بارہ نام شمار کیے ہیں اور چار انجیلوں سے خارج برنابا کی متروک انجیل کے باب ۱۲ میں بھی یہی تعداد مسطور ہے البتہ چند ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے، نقشہ حسب ذیل ہے:

## انجیل برنابا

نمبر شمار	نام
۱	پطرس الصیاد (سمعان)
۲	اندر اوس
۳	برنابا
۴	یعقوب بن زیدی
۵	یوحنا بن زبدی
۶	فیلپس
۷	برٹولماؤس
۸	تداؤس
۹	یعقوب بن حلفی
۱۰	یہودا
۱۱	متی العشار
۱۲	یہودا انخطر یوطی *

## انجیل متی

نمبر شمار	نام
۱	پطرس (سمعان)
۲	اندر اوس پطرس کا بھائی
۳	یعقوب بن زیدی
۴	یوحنا (یعقوب کا بھائی)
۵	فیلپس
۶	برٹولماؤس
۷	توما
۸	متی العشار
۹	یعقوب بن حلفی
۱۰	لبادس (ملقب بہ تداؤس)
۱۱	سمعان القانوی
۱۲	یہودا انخریوطی

دونوں انجیلوں کے درمیان صرف دو ناموں میں اختلاف ہے، متی میں تو ما اور سمعان قانوی ہیں اور برنابا میں ان کی جگہ خود برنابا اور تداؤس ہیں ان میں کون صحیح کہتا ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن دلیل کی روشنی میں یہ کہنا بہت آسان ہے کہ کلیسہ کی کونسل نے بے دلیل اور بے سند صرف اس بنا پر برنابا اور اس کے رفیق تداؤس کے نام منظور کر دیئے کہ ان دونوں کی روایات الوہیت مسیح علیہ السلام اور کفارہ کے خلاف سچی عیسائیت پر مبنی تھیں اور یہ کلیسہ کے اس عقیدہ کے قطعاً خلاف تھیں جو سینٹ پال کی محرف عیسائیت کا مقبول عقیدہ تھا اور ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ برنابا کا نام موجودہ عیسائیت میں حواریوں سے خارج سمجھا جاتا ہے تاہم ان رسولوں کی فہرست میں آج بھی موجود ہے جنہوں نے ملکوں میں خدائی بادشاہت کا اعلان کیا اور مسیحی دین کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا۔



دارا نے اپنے زمانہ حکومت میں ایک اہم تاریخی کام یہ کیا ہے کہ پہاڑوں کی مضبوط چٹانوں پر کتنے نقش کرادیئے ہیں جو اس کے اور خورس کے عہد زریں کو روشنی میں لاتے ہیں ان مختلف کتبات میں سے ایک کتبہ ایران کے مشہور شہر اصرخر میں دریافت ہوا ہے یہ کتبہ قدیم تاریخ کا نادر ذخیرہ سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اس میں دارا نے اپنے تمام مفتوحہ ممالک اور صوبوں کے نام تک گنا دیئے ہیں اور ایسی تفصیلات دی ہیں جن سے اس کے مذہب و عقیدہ اور طریق حکومت تک پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ اسی کتبہ میں دارا کا یہ عقیدہ مذکور ہے:

”خدائے برتر اہور موزدہ ہے اسی نے زمین پیدا کی اسی نے آسمان بنایا اسی نے انسان کی سعادت بنائی اور وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تہا حکمران اور آئین ساز بنایا۔“

اہور موزدہ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے بادشاہت دی اور اسی کے فضل سے میں نے زمین میں امن و امان قائم کیا میں اہور موزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے میرے خاندان کو اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے، اے اہور موزدہ میری دعا قبول کر!

”اے انسان! اہور موزدہ کا تیرے لیے حکم ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر، صراطِ مستقیم کو نہ چھوڑ گناہ سے بچتا رہ۔“

دارا کے کتبات میں اصرخر کے کتبہ سے بھی زیادہ اہمیت اس کے کتبہ بے ستون کو حاصل ہے اس میں اس کے گوماتہ مجوسی کی بغاوت اور اپنے سریر آرائے سلطنت ہونے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

دارا نے اس کتبہ میں گوماتہ کو موگوش (مجوسی) اور اس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہونے کو اہور موزدہ کے فضل کی جانب منسوب کیا ہے اور ہیروڈٹس اور دوسرے یونانی مؤرخ یہ اور اضافہ کرتے ہیں کہ دارا کے خلاف یہ بغاوت میڈیا (ایران) کے قدیم مذہب کے پیروں (مجوسیوں) کی جانب سے ہوئی تھی۔ دارا کے زمانہ میں گوماتہ کے علاوہ پر اور تیش اور چترت خمہ اور مجوسیوں (موگوشوں) نے علم بغاوت بلند کیا اور دارا کے ہاتھ سے پہلا ہمدان میں اور دوسرا اردبیل میں قتل ہوا۔

پھر خورس اور دارا کے ”مومن“ ہونے اور ایران کے قدیم مذہبی ”مجوسی“ سے بیزار رہنے پر سب سے بڑی شہادت دارا کا وہ تبلیغی اعلان ہے جو اس نے دانیال علیہ السلام کے دشمنوں کے خلاف اس وقت شائع کیا تھا جب کہ دانیال علیہ السلام نبی کو ان کے دشمنوں نے شیر ببر کے سامنے ڈال دیا تھا اور دانیال علیہ السلام معجزانہ طور پر صحیح و سالم بچ گئے تھے۔

تب دارا بادشاہ نے ساری قوموں اور گروہوں اور اہل لغت کو جو روئے زمین پر بستے تھے نامہ لکھا:

”تمہاری سلامتی ترقی پائے میں یہ حکم کرتا ہوں کہ میری مملکت کے ہر ایک صوبے کے لوگ دانی ایل کے خدا کے آگے ترساں ولرزاں ہوں کیونکہ یہ وہی زندہ خدا ہے جو ہمیشہ قائم ہے اور اس کی سلطنت لازوال ہے اور آخر تک رہے گی وہی چھڑاتا اور بچاتا ہے اور آسمان اور زمین میں وہی نشانیاں دکھلاتا اور عجائب و غرائب کرتا ہے اسی نے دانی ایل کو شیر بیروں کے چنگل سے چھڑایا ہے پس یہ دانی ایل دارا کی سلطنت اور خورس فارسی کی سلطنت میں کامیاب رہا۔“

ترجمان القرآن ماخوذ حجاز الین فانوگریٹ مناریز آف دی اتھنیت ایسٹرن

دائرة المعارف بستانی (ایران)

دانیال کی کتاب باب ۶ آیات ۲۵-۲۸



یہ عقیدہ تثلیث ابھی سن طفولیت ہی میں تھا کہ علماء نصاریٰ میں اس کے رد و قبول پر حرکتہ الآراء بحثیں شروع ہو گئیں "نیقاد" کی کونسل میں مشرقی گرجاؤں میں اور خصوصی اور عمومی مجالس میں جب بحث نے طول کھینچا تو کلیسہ نے فیصلہ دیا کہ مسئلہ ثلاث (تثلیث) حق اور اس کے خلاف "الحاد" ہے ان ملحد جماعتوں اور فرقوں میں نمایاں فرقہ "ایونین" ہے جو کہتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام انسان محض تھے۔ دوسرا "سابلیین" ہے جس کا خیال ہے کہ خدا ذات واحد ہے اور اب ابن، روح القدس، یہ مختلف صورتیں ہیں جن کا اطلاق مختلف حیثیتوں سے ذات واحد ہی پر ہوتا ہے۔ تیسرا فرقہ "آریوسین" ہے اس کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اگرچہ "ابن اللہ" ہیں مگر "اب" کی طرح ازلی نہیں ہیں بلکہ کائنات بلند و پست سے قبل "اب" کی تخلیق سے مخلوق ہوا ہے اور اس لیے وہ "اب" سے نیچے اور اس کی قدرت کے سامنے مغلوب و خاضع ہے اور چوتھا فرقہ "مقدونین" ہے ان کا کہنا ہے کہ "اب" اور "ابن" دو ہی اقنوم ہیں "روح القدس" اقنوم نہیں ہے بلکہ مخلوق ہے۔

کلیسہ نے ان کو اور اسی قسم کے دوسرے فرقوں کو "ملحد" قرار دے کر نیقاد کی کونسل منعقدہ ۳۲۵ء اور قسطنطنیہ کی کونسل منعقدہ ۳۸۱ء کے مطابق ثلاث (تثلیث) کو مسیحی عقیدہ کی بنیاد تسلیم کیا اور فیصلہ دیا کہ "اب" اور "ابن" اور "روح القدس" تینوں جدا جدا مستقل اقنوم (اصل ہیں) اور عالم لاہوت میں تینوں کی وحدت ہی خدا ہے گویا اس طرح ریاضی اور علم ہندسہ کے اٹل اور ناقابل انکار بدیہی مسئلہ کے خلاف یا یوں کہئے کہ بدابہت عقل کے خلاف یہ تسلیم کر لیا کہ "ایک" تین ہے اور "تین" ایک اور یہ بھی کہا کہ "ابن" ازل ہی میں "اب" سے پیدا ہوا اور "روح القدس" کا صدور بھی ازل ہی میں "اب" سے ہوا ہے اور پھر ۵۸۹ء میں طلیطلہ کونسل نے یہ ترمیم منظور کر لی کہ "روح القدس" کا صدور "اب" سے ہی نہیں بلکہ "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا ہے۔ اس ترمیم کو "لاطینی کلیسہ" نے تو بغیر چون و چرا تسلیم کر لیا اور اس کو کلیسہ کا عقیدہ بنا لیا لیکن "یونانی کلیسہ" اول تو خاموش رہا مگر اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس ترمیم کو بدعت قرار دے کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس باہمی اختلاف نے اس قدر شدید صورت اختیار کر لی کہ "یونانی کلیسہ" اور "کیتھولک لاطینی کلیسہ" کے درمیان کبھی اتفاق و اتحاد پیدا نہ ہو سکا۔

ثالث یا تثلیث کا یہ عقیدہ دین مسیحی کے رگ و پے میں خون کی طرح ایسا سرایت کر گیا کہ مسیحی کے بڑے فرقوں رومن کیتھولک اور پرائسٹنٹ کے درمیان سخت بنیادی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس میں اتفاق ہی رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل حیرت ہے یہ بات کہ لو تھر کی جماعت اور اصلاح پسند کلیساؤں نے بھی ایک عرصہ دراز تک اس کیتھولک عقیدہ کو ہی بغیر کسی اصلاح و ترمیم کے عقیدہ تسلیم کر لیا البتہ تیرھویں صدی عیسوی میں فرقہ لاہوتی کی اکثریت نے اور جدید فرقوں سوسینیائی، جرمانی، موحدین اور عمومین وغیرہم نے اس عقیدہ کو نقل و عقل کے خلاف کہہ کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ ہے مسیحیت میں عقیدہ تثلیث کی وہ مختصر تاریخ جس سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے کہ دین مسیحی کی حقیقی صداقت کی تباہی کا راز اسی الحاد اور مشرکانہ بدعت کے اندر پوشیدہ ہے جو صنم پرستانہ تخیل کا رہین منت ہے۔

عقیدہ ثلاث کیا شے ہے اور "اب" "ابن" "روح القدس" کی تعبیرات کی حقیقت کیا ہے یہ مسئلہ بھی مسیحیت کے ان مباحث میں سے ہے جن کا فیصلہ کن جواب کبھی نہ مل سکا اور جس قدر اس کو صاف اور واضح کرنے کی کوشش کی گئی اس میں الجھاؤ اور



غیرے مالک اور متصرف ہے وہ یکتا و بے ہمتا ہے، قدیر و حلیم ہے، نور و قدوس ہے اور یہ اہور موزدہ کی پاک ہستی ہے یہی تمام کائنات کی خالق ہے تم جن کو خیر کے دیوتا سمجھتے ہو وہ دیوتا نہیں بلکہ اہور موزدہ کی مخلوق اور اس کے حکم سے امور خیر کے کار پرداز امش اسپند (فرشتے) ہیں اور تم نے جن کو شر کا دیوتا سمجھ لیا ہے وہ سراسر باطل کے سوا کچھ نہیں بلکہ یہاں شر کا مرکز اسی اہور موزدہ کی مخلوق ”اہرمن“ (شیطان) کی ہستی ہے یہی انسانوں کے دلوں میں شر کو بھڑکا کرتا رکھنے کی جانب لے جاتی ہے ”انسان“ ان دو متضاد اثرات میں گھرا ہوا ہے اور اہور موزدہ نے اس کو اپنے سچے نبیوں کے ذریعہ روشنی اور تاریکی دونوں کے اثرات سے بخوبی آگاہ کر دیا ہے پس آگ کی پرستش محض گمراہی ہے اور انسانی شقاوت و سعادت کا معاملہ صرف اسی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ اس عالم کے علاوہ ایک دوسرا عالم (آخرت) ہے اور وہاں دو جدا جدا مقامات ایک نیکو کاروں کے لیے اور دوسرا بدکاروں کے لیے ہے اس لیے ہم کو گناہوں سے پرہیز کرنا اور نیکی کو اختیار کرنا چاہیے اور اپنے اخلاق کو بہتر بنانا چاہیے۔

یہ تھی ابراہیم زردشت کی وہ تعلیم جس کے متعلق آج عرب اور یورپ کے محقق مورخین کا اتفاق ہے کہ اواخر چھٹی صدی قبل مسیح میں یہ آواز زردشت کی زبانی میڈیا اور فارس کے قدیم مذہب کے خلاف ایران میں سنی گئی۔  
یہی مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ ابراہیم زردشت دانیال اکبر یا یرمیاہ علیہ السلام کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے اور ایران کے قدیم مذہب کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے۔

ابراہیم زردشت کی تعلیم ”دین حق کی تعلیم“ تھی اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ان پر نازل شدہ الہامی کتاب ”اوستا“ کے مضامین کے ابتداء ایسے ہی جملوں سے ہوتی ہے جن کا مفہوم سچی الہامی کتابوں میں مشترک پایا جاتا ہے یعنی شیطانی وساوس سے پناہ اور خدائے رحمان و رحیم کی مدح و ثناء چنانچہ قرآن سے قبل کی الہامی کتابوں کی طرح اگرچہ ”اوستا“ بھی محرف ہو چکی ہے تاہم اس میں یہ جملے اب بھی محفوظ ہیں جن سے مضامین کی ابتداء ہوتی ہے اور دساتیر آسمانی میں ان کو اس طرح نقل کیا گیا ہے:

① ہوزامیم نہ مزدان ہر ہر ماس ہر شیور ہر دیور ”پناہیم بہ یزداں (اہور موزدہ) از نش رشت و خوئے بدگمارہ کنندہ براہ ناخوب برندہ، رنج دہندہ، آزار رسانندہ (یعنی شیطان)۔“

② نہ شید شمتای ہر شندہ ہر ششگر زمر پان فراہیدور ”بنام ایزد بخشنایندہ بخشائش گر مہربان، دادگر۔“

ماب اگر اسی کے ساتھ خورس (کے خسرو) اور داریوش (دارا) کے ان بیانات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جو توراہ میں بیت المقدس کی تعمیر سے متعلق ہیں اور ان کتبات کی عبارات کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے جو دارا کی جانب سے منقوش کیے گئے ہیں اور جن میں مجوسی عقائد کے خلاف خدائے واحد کی حمد و ثناء بیان کی گئی ہے تو پھر یہ دعویٰ حقیقت بن کر سامنے آ جاتا ہے کہ خورس اس کے بیٹے کیقباد دوم (کم بی سیز) اور دارا کا مذہب بلاشبہ ایران کے قدیم مذہب (مجوسی مذہب) کے خلاف دین حق کا مذہب تھا اور جب کہ تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ابراہیم زردشت اور خورس (کے ارش) کا زمانہ ایک رہا ہے اور خورس اور دارا کے عقائد زردشت کی تعلیم کے عین مطابق ہیں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خورس پہلا بادشاہ ہے جس نے ایران کے قدیم مذہب (مجوسی مذہب) کے خلاف

\* حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۸ و یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ مقالہ پروفیسر گرینڈی ج ۲ ص ۱۱۳

\* کم بی سیز (کیقباد) خورس کے باپ کا نام بھی ہے اور بیٹے کا بھی۔



کا درجہ مساوی ہے اور کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہے اور آریوسی کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسرا اقنوم ”بیٹا“ اقنوم اول کی طرح ازلی نہیں ہے البتہ عالم بالا و پست سے غیر معلوم مدت پہلے اقنوم اول سے پیدا ہوا ہے اس لیے اس کا درجہ ”باپ“ کے بعد اور اس سے کم ہے اور مقدونی فرقہ کہتا ہے کہ صرف وہی اقنوم ہیں ”باپ“ اور ”بیٹا“ اور ”روح القدس“ مخلوق ہے اور فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس کا پایہ تمام ملائکہ اللہ سے بلند ہے اور طیلطلہ کی کونسل کا فیصلہ یہ ہے کہ روح القدس ”باپ“ اور ”بیٹا“ دونوں سے پھوٹ کر نکلی ہے یا دونوں سے ہی اس کا صدور ہوا ہے مگر قسطنطنیہ کی کونسل روح القدس کو صرف باپ ہی سے صادر ہونا بتلاتی ہے اور قدیم و جدید فرقوں میں سے ایک بڑی جماعت اقنوم ثالث مریم علیہا السلام کی تسلیم کرتی اور روح القدس کے اقنوم ہونے کا انکار کرتی ہے۔

**بیٹا:** عربی میں ”ابن“ فرنج میں ”فی“..... اور انگریزی میں (Son) اور اردو میں ”بیٹا“ کہتے ہیں، یہ اس شکل انسانی پر بولا جاتا ہے جو عام قانون قدرت کے مطابق مرد و عورت کے جنسی تعلقات کا نتیجہ ہوتا ہے مگر عقیدہ ثلاثی کے مطابق وہ عالم لاہوت میں ”باپ“ سے جدا بھی نہیں ہے اور پیدا بھی ہے اور پھر بعض کے نزدیک اس کی پیدائش ازلی ہے اور بعض کے نزدیک غیر ازلی، آگے چل کر کہتے ہیں کہ جب ”باپ“ کی مشیت کا فیصلہ ہوا تو اقنوم ثانی ”بیٹا“ عالم ناسوت (کائنات ہست و بود) میں مریم کے بطن سے پیدا ہو کر ”مسیح“ کہلایا اور بعض کا تو یہ دعویٰ ہے کہ خود باپ ہی عالم ناسوت میں بیٹا بن کر مریم کے بطن سے تولد ہوا اور مسیح علیہ السلام کی شکل میں روشناس ہوا اور طرفہ تماشایہ کہ بعض کے نزدیک تو اقنوم ثانی ”ابن“ کو اقنوم اول ”اب“ پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

**روح القدس:** اسی طرح ”روح القدس“ کے متعلق بھی سخت اختلاف ہے: کوئی کہتا ہے کہ وہ اقنوم ہی نہیں ہے اس لیے عالم لاہوت میں اس کو الوہیت حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ مکدونی اور آریوسی کہتے ہیں کہ وہ ملائکہ اللہ میں سے ہے اور ان میں سب سے برتر و بلند ہے اور مارتونیوس کہتا ہے کہ ”روح القدس“ کی تعبیر مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال پر مجازاً اس کا اطلاق کیا جاتا ہے ورنہ الگ سے کوئی حقیقت نہیں ہے اس بناء پر اس قول کے قائلین کو ”مجازین“ کہا جاتا ہے اور علماء جدید میں کلارک کہتا ہے کہ الہامی کتابوں عہد نامہ قدیم و جدید میں کسی ایک جگہ بھی ”الوہیت“ کا درجہ نہیں دیا گیا، فرقہ مکدونی نے الوہیت روح القدس کا انکار کرتے ہوئے شد و مد سے یہ کہا ہے کہ اگر جوہر الوہیت میں روح القدس کو بھی دخل ہوتا تو یا وہ مولود ہوتی یا غیر مولود، اگر مولود ہے تو اس کے اور ”ابن“ کے درمیان کیا فرق رہا اور اگر غیر مولود ہے تو اس کے اور ”اب“ کے درمیان کیا امتیاز ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسری جماعتیں کہتی ہیں کہ ”روح القدس“ کو بھی الوہیت حاصل ہے بوسیورومانی کہتا ہے کہ ”روح القدس“ کا صدور ”اب“ اور ”ابن“ دونوں سے ہوا اور وہ ان کے جوہر نفس سے ہے اور دونوں کے ساتھ وحدت لاہوت میں ”الہ“ ہے اور اثناسیوس کہتا ہے کہ روح القدس کی الوہیت ناقابل انکار ہے اور کتب سماویہ میں روح پر ”الہ“ کا اور الہ پر ”روح“ کا اطلاق ثابت و مسلم ہے اور اس کی جانب ان ہی امور کی نسبت کی گئی ہے جن کا تعلق ذات خدا کے ماسوا اور کسی سے نہیں ہے مثلاً تقدیس ذات، معرفت جمیع حقائق وغیرہ اور یہ عقیدہ قدیم سے چلا آتا ہے جیسا کہ نظم و سولجیا سے ثابت ہے جس کی قدامت تالیف سب کے نزدیک مسلم ہے اس میں الوہیت ”روح القدس“ کا اعتراف موجود ہے اور مولٹ لفیلو پیٹرس نے انکار الوہیت روح پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ نصاریٰ کے نزدیک خدائے حقیقی کی توحید کا تثلیث میں مضمحل ہونا ایک مسلم حقیقت ہے پھر روح کو الوہیت سے خارج کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور مکدونیوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ماراثناسیوس کہتا ہے کہ کتب سماوی میں روح کو ابن نہیں کہا گیا بلکہ روح



الاب اور روح الابن کے اطلاقات پائے جاتے ہیں لہذا اس کو "ابن" یا "اب" کہنا صحیح نہیں اور نہ اس کو الوہیت سے نکال کر مخلوق کہنا درست ہو سکتا ہے اور ادراک بشری عاجز ہے کہ ان فلسفیانہ بحثوں سے "روح القدس" کی حقیقت تک پہنچ سکے البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقط تولید (پیدا ہونا) ہی تنہا ایسا واسطہ نہیں ہے جو "اب" کے ساتھ قائم ہو بلکہ انبثاق (صدور یا پھوٹ نکلنا) بھی ایک شکل ہو سکتی ہے مگر ہم اس دنیا میں تولید و انبثاق کے درمیان فرق ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہیں البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تولید و انبثاق دونوں کا "اب" کے ساتھ ازلی و ابدی اور تلازم کا تعلق ہے۔ پس ہمارے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ فلاسفہ قدیم (فلاسفہ یونان) کی طرح "روح القدس" اور "اب" کے درمیان فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعہ وہ اعتقادات قبول کر لیں جو انہوں نے خدا سے صدور ارواح کے متعلق پیدا کر لیے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ اختلافات بھی پیش نظر رہنے چاہئیں جو گذشتہ سطور میں بیان ہو چکے ہیں کہ بعض کلیسہ "روح القدس" کا فقط اقنوم اول (باپ) سے صادر ہونا مانتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے اس کا صدور ہوا ہے، یہ اختلاف بھی عیسائی فرقوں کے درمیان سخت کشاکش کا سبب رہا ہے کیونکہ ۳۸۱ء میں منعقدہ کونسل قسطنطنیہ نے "منشور ایمانی" میں یہ واضح کر دیا تھا کہ روح القدس کا صدور "باپ" ہی سے ہوا ہے اور عرصہ تک یہی عقیدہ مسیحی دنیا میں نافذ رہا لیکن ۴۴۷ء میں اول ہسپانیہ کے کلیسہ نے پھر فرانس کے کلیسہ نے اور اس کے بعد تمام لاطینی رومن کلیساؤں نے اس ترمیم کو جزء عقیدہ بنایا کہ "روح القدس" کا صدور اقنوم اول (باپ) اور اقنوم ثانی (بیٹا) دونوں سے ہوا ہے، عیسائی علماء کہتے ہیں کہ دراصل یہ بحث ۸۶۶ء میں سب سے پہلے شرق کے بطریق فوتیوس نے اس لیے پیدا کی کہ اس کی اور اس کی جماعت کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح شرق (یونان) کے کلیسہ کو غرب (روم) کے کلیسہ سے جدا کر دیا جائے اور مشرق و مغرب کے کلیساؤں کا اتحاد باقی نہ رہنے دیا جائے، اسی خیال کی تائید و تقویت کے لیے ۱۰۴۳ء میں بطریق میخائیل کرولا ریوس نے اس عقیدہ کو بہت جلد شائع کیا اور آخر کار صدیوں تک ان اختلافات نے کلیسہ ہائے مشرق و مغرب کے درمیان مخالفانہ کشاکش کو قائم رکھا اور دونوں کلیسہ ایک دوسرے پر یہ الزام قائم کرتے رہے کہ مخالف کلیسہ نے مسیحیت میں الحاد و بدعت کی آمیزش کر کے حقیقی مذہب کو مٹا ڈالا ہے اور رومن کیتھولک اور پرائسٹنٹ کی بالعموم اور کلیساؤں کے مختلف فرقوں کی بالخصوص کشاکش کا یہ سلسلہ اس وقت تو انتہائی شدت اختیار کر چکا تھا اور باہم ہولناک خونریزیوں اور بھیمانہ مظالم کا جہنم بن چکا تھا جبکہ اسلام اعتقادات کی سادگی، اعمال صالحہ کی پاکیزگی اور اپنی علمی و عملی روحانیت کی شگفتگی کی بدولت "امن عام" اور "رحمت" کا نیر درخشاں بنا ہوا تھا۔

### ازمنہ مظلمہ اور اصلاح کنیہ کی آواز:

یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائیوں کے مذہبی کلیسہ معمولی معمولی اختلافات کی بناء پر پوپ کی حکومت اور پیروان پوپ کی حکومتوں کے ذریعہ ایک دوسری جماعت کو گردن زدنی اور کشتنی قرار دیتی اور ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو وحشت ناک عذابوں میں مبتلا کر کے قتل کر دیا کرتی تھیں اسی بناء پر مؤرخین تاریخ کے اس دور کی ازمنہ مظلمہ (زمانہ ہائے تاریک) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قرآن نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق جس حقیقت اور صداقت کا اظہار کیا تھا پوپ اور کلیسا سے مرعوبیت نے اگرچہ ایک مدت مدید تک عیسائیوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا مگر پھر بھی یہ صدائے حق اثر کیے بغیر نہ رہ سکی اس کی تفصیل اگرچہ خاتم



الانبیاء محمد ﷺ کی حیات طیبہ میں مذکور ہوں گی لیکن یہاں صرف اس قدر اشارہ کرنا مقصود ہے کہ رومن کی تھولک، پرائسٹنٹ اور دوسرے فرقوں نے بغیر کسی جھجک کے سینٹ پال کی تحریف (تثلیث) مسیحیت کا بنیادی عقیدہ تسلیم کر لیا تھا اور اگرچہ بعض چھوٹی چھوٹی جماعتوں یا افراد نے کبھی کبھی اس کے خلاف آواز اٹھائی مگر وہ آواز دب کر رہ گئی اور نقارخانہ میں طوطی کی صدا سے زیادہ اس کی حیثیت نہ بن سکی مثلاً ۳۲۵ء اور ۳۸۱ء میں جب نیقادی کونسل اور قسطنطنیہ کونسل نے تثلیث کو دین مسیحی کی بنیاد قرار دیا اس وقت ابویین نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام صرف انسان ہیں اور الوہیت کا ان سے کوئی علاقہ نہیں اور سا بلہمیین کہتے تھے کہ اقا نیم ثلاثہ، تین مختلف جوہر نہیں ہیں بلکہ وحدت لاہوتی کی مختلف صورتیں اور تعبیریں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ صرف اپنی ذات واحد کے لیے اطلاق کرتا ہے تاہم اس وقت تک پوپ اور کلیسہ کے فیصلے خدائی فیصلے سمجھے جاتے تھے اور بپ اور پاپا "اربابا من دون اللہ" یقین کیے جاتے تھے اس لیے ان اصلاحی آوازوں کو "الحاد" کہہ کر دبا دیا گیا مگر جب صلیبی جنگوں نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے اتنے قریب کر دیا کہ انہوں نے اسلام کے اعتقادی اور عملی نظام کا بہت کچھ نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسلام سے متعلق بطارقہ (Batarika) بساقفہ (Bishaqifa) کی غلط بیانی اور بہتان ان پر ظاہر ہونے لگی تب ان میں بھی آزادی فکر نے کروٹ لی اور کورانہ تقلید کو شکست و ریخت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ لو تھر کی آواز پہلی صدائے حق تھی جس نے جرأت کے ساتھ "اربابا من دون اللہ" کے بتوں کو ماننے سے انکار کر دیا اور پوپ کے مقابلہ میں کتاب مقدس کی پیروی کی دعوت دی مگر آپ کو تعجب ہو گا یہ سن کر کہ پوپ کی جانب سے لو تھر کے خلاف جو الحاد اور بددینی کے الزامات لگائے گئے تھے ان میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ یہ در پردہ "مسلمان" ہو گیا ہے اور پاپا کے خلاف اس کی صدا قرآن کی صدائے بازگشت ہے۔

بہر حال یہی وہ صدائے اصلاح تھی جو بلاشبہ اسلام کی دعوت تفکر و تعقل سے متاثر ہو کر آہستہ آہستہ "اصلاح کنیہ" کے نام سے مسیحی دنیا میں گونج اٹھی اور آگ کی طرح ہر طرف اس کے شعلے نظر آنے لگے ان ہی اصلاحات میں سے ایک اہم اصلاحی تخیل یہ بھی تھا کہ عقیدہ ثلاثہ کتاب مقدس (عہد نامہ جدید) کے قطعاً خلاف ہے۔ چنانچہ تیرھویں صدی عیسوی میں قدیم لاہوتی فرقہ کے جمہور نے نسطوری فرقہ کے جماعتی فیصلہ نے اور جدید جماعتوں میں سے سویڈنیٹین.... جرمانیٹین.... موحدین.... اور عمومیین اور دوسری جماعتوں نے تعلیم کلیسا کے خلاف مذہبی بغاوت کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ تثلیث کا عقیدہ نقل و عقل دونوں کے خلاف اور ناقابل تسلیم ہے اور اگرچہ قومی و مذہبی عصبیت نے ان کو اسلامی عقیدہ کا پیرو ہونے سے باز رکھا تاہم انہوں نے عقیدہ تثلیث کی مختلف شکلوں کے ساتھ ایسی تعبیرات کرنی شروع کر دیں جس سے عقیدہ ثلاثہ باطل ہو کر توحید الہی کے پاک اور مقدس جراثیم پیدا ہونے لگے مثلاً سوڈنبرگ نے کہا: "اقانیم ثلاثہ" "باپ" "بیٹا" "روح القدس" کا تعلق حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات کے ماسوا ذات احدیت سے نہیں ہے یعنی مسیح علیہ السلام کی ذات اپنی طبع لاہوتی کے پیش نظر "باپ" ہے اور عالم ناسوت میں انسانی شکل کی تقید کی وجہ سے "بیٹا" اور "اقنوم ثانی" ہے اور اس حیثیت سے کہ روح القدس کا صدور اس سے ہوا ہے وہ اقنوم ثالث "روح" ہے غرض "ثالوث" کا تعلق صرف حضرت مسیح علیہ السلام سے ہے اور کانٹ (Cant) کہتا ہے کہ عقیدہ ثلاثہ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ "باپ" "بیٹا" "روح القدس" بلکہ یہ عالم لاہوت میں خدائے برتر کی تین بنیادی صفات کی جانب اشارہ ہے جو باقی تمام صفات کے لیے مصدر اور منبع کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ "قدرت" (اب) حکمت (ابن) اور "محبت" (روح) ہیں یا اللہ کے ان تین افعال کی جانب اشارہ ہے جو "خلق" "حفظ" اور "ضبط" کے



نام سے بھی تعبیر کیے جاتے ہیں اور ہیگن اور شیلنگ نے اس خیال کی کافی اشاعت کی کہ عقیدہ ثلاثہ حقائق کی طرح کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ ایک تخیلی نظریہ ہے ان کی مراد یہ ہے کہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے خدائے برتر کی ذات وحدہ لا شریک لہ ہے اور مسیح علیہ السلام مخلوق خدا، لیکن عام خیال و تصور میں جب ہم لاہوتی عالم کی جانب پرواز کرتے ہیں تو ہمارا خیال اس عالم میں خدا، مسیح علیہ السلام اور روح القدس کو "اب" "ابن" اور "روح" کی تعبیرات دیتا اور ان کے باہم تعلق کو اقا نیم ثلاثہ کی حیثیت میں دیکھتا ہے۔

"عقلیین" "لوٹھرین" اور "موحدین" اور "جرمانین" کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں جو سابلیمین کے عقیدہ کو اختیار کر کے ایک بڑی جماعت کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یورپ کی نشاۃ جدید میں بھی عام طور پر تمام کلیساؤں کا ثلاثہ (تثلیث) پر ہی عقیدہ ہے اور ان کے نزدیک اس کلمہ کی تعبیر وہی ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں متعدد مذہبی کونسلوں نے کی اور جو بلاشبہ شرک جلی اور توحید کے یکسر منافی ہے۔

### قرآن اور عقیدہ تثلیث:

نزول قرآن کے وقت جمہور مسیحی جن بڑے فرقوں میں تقسیم تھے ثلاثہ کے متعلق ان کا عقیدہ تین جدا جدا اصولوں پر مبنی تھا ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح علیہ السلام عین خدا ہے اور خدا ہی بشکل مسیح علیہ السلام دنیا میں اتر آیا ہے اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ مسیح ابن اللہ (خدا کا بیٹا) ہے۔ اور تیسرا کہتا تھا کہ وحدت کا راز تین میں پوشیدہ ہے۔ باپ، بیٹا، مریم اور اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے اور دوسرا گروہ حضرت مریم علیہا السلام کی جگہ "روح القدس" کو اقنوم ثالث کہتا تھا، غرض وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ثالث ثلاثہ (تین میں کا تیسرا) تسلیم کرتے تھے اس لیے قرآن کی صدائے حق نے تینوں جماعتوں کو جدا جدا بھی مخاطب کیا ہے اور یکجا بھی اور دلائل و براہین کی روشنی میں مسیحی دنیا پر یہ واضح کیا ہے کہ اس بارہ میں راہ حق ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مسیح علیہ السلام مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا شدہ انسان اور خدا کا سچا پیغمبر اور رسول ہے باقی جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ باطل محض ہے..... خواہ اس میں تفریط ہو جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ العیاذ باللہ وہ شعبہ باز اور مفتری تھے یا افراط ہو جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا ہیں اور خدا کے بیٹے ہیں یا تین میں کے تیسرے ہیں۔

قرآن عزیز نے صرف یہی نہیں کیا کہ نصاریٰ کے تردیدی پہلو کو ہی اس سلسلہ میں واضح کیا ہو بلکہ اس کے علاوہ حضرت مسیح علیہ السلام کی شان رفیع کی اصل حقیقت کیا ہے اور عند اللہ ان کو کیا قربت حاصل ہے، اس پر بھی نمایاں روشنی ڈالی ہے تاکہ اس طرح یہود کے عقیدہ کی بھی تردید ہو جائے اور افراط و تفریط سے جدا راہ حق آشکارا نظر آنے لگے۔

حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول ہیں:

﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ آتَنِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۖ وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا آيِنَ مَا كُنْتُ ۖ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۖ وَبَرًّا بِوَالِدَاتِي ۖ وَكَأَنَّي جَبَارًا شَقِيًّا ۖ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ ۖ وَيَوْمَ أَمُوتُ ۖ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ۖ﴾ (مریم: ۳۰-۳۳)



” (مسیح علیہ السلام نے کہا) بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھ کو نبی بنایا ہے اور مجھ کو مبارک ٹھہرایا جہاں بھی میں رہوں اور اس نے مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی جب تک بھی زندہ رہوں اور اس نے مجھ کو میری والدہ کے لیے نیکو کار بنایا اور مجھ کو سخت گیر اور بد بخت نہیں بنایا مجھ پر سلامتی ہو جب میں پیدا ہوا جب میں مرجاؤں اور جب حشر کے لیے زندہ اٹھایا جاؤں۔“

﴿إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ۗ وَ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُقُونَ ۖ وَ إِنَّهُ لَعَلَّمٌ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُون ۗ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝﴾ (الزخرف: ۵۹-۶۱)

”وہ (مسیح علیہ السلام) نہیں ہے مگر ایسا بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور میں نے اس کو مثال بنایا ہے بنی اسرائیل کے لیے اور اگر ہم چاہتے تو کر دیتے ہم تم میں سے فرشتے زمین میں چلنے پھرنے والے اور بلاشبہ وہ (مسیح علیہ السلام) نشان ہے قیامت کے لیے۔ پس اس بات پر تم شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔“

﴿وَ إِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَبْنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدٌ ۗ﴾ (الصف: ۶)

”اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے کہا اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے تورات اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے۔“

حضرت مسیح علیہ السلام نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۗ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ أُمَّهُ وَ مَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۗ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۗ وَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝﴾ (المائدہ: ۱۷)

”بلاشبہ ان لوگوں نے کفر اختیار کر لیا جنہوں نے یہ کہا ”بیشک اللہ وہی مسیح بن مریم“ ہے“ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ یہ ارادہ کر لے کہ مسیح بن مریم (علیہ السلام)، مریم اور کائنات زمینی پر جو کچھ بھی ہے سب کو ہلاک کر ڈالے تو کون شخص ہے جو اللہ سے (اس کے خلاف) کسی شے کے مالک ہونے کا دعویٰ کر سکے اور اللہ کی بادشاہت ہے آسمانوں کی اور زمین کی وہ جو چاہتا ہے اس کو پیدا کر سکتا ہے اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔“

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۗ وَ قَالَ الْمَسِيحُ يَبْنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَ رَبَّكُمْ ۗ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَا وَهُ النَّارُ ۗ وَ مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ



أَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾ (المائدہ: ۷۲)

”بلاشبہ ان لوگوں نے کفر اختیار کیا جنہوں نے کہا بلاشبہ اللہ وہی مسیح بن مریم (ﷺ) ہے۔ حالانکہ مسیح (ﷺ) نے یہ کہا: اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے بیشک جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے پس یقیناً اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد نہیں ہے۔“

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ ۗ بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ كُلُّ لَّهُ قٰنِیْنٌ ﴿۱۱۶﴾﴾ (البقرہ: ۱۱۶)

”اور انہوں نے کہا: اللہ نے ”بیٹا“ بنا لیا ہے وہ ذات تو ان باتوں سے پاک ہے بلکہ (اس کے خلاف) اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے ہر شے اللہ کے لیے تابع دار ہے۔“

﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۗ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فِیْكَوْنُ ﴿۵۹﴾﴾ (آل عمران: ۵۹)

”بلاشبہ عیسیٰ (ﷺ) کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے کہ اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اس کو کہا ہو جا تو وہ ہو گیا۔“

﴿يٰۤاٰهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ ۗ وَلَا تَقْوُلُوْا عَلٰی اللّٰهِ الْاِلٰهَ الْحَقِّ ۗ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِیْسٰی ابْنُ مَرْیَمَ

رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ ۗ اَلْقِيَتْهَا اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۗ فَاٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ ۗ وَلَا تَقْوُلُوْا ثَلٰثَةً ۗ

اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۗ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۗ سُبْحٰنَهُ اَنْ یُّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۗ لَّهُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی

الْاَرْضِ ۗ وَكَفٰی بِاللّٰهِ وَكِیْلًا ﴿۱۷۱﴾﴾ (النساء: ۱۷۱)

”اے اہل کتاب اپنے دینی معاملہ میں حد سے نہ گزرو اور اللہ کے بارے میں حق کے ماسوا کچھ نہ کہو بلاشبہ مسیح ابن مریم (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم پر ڈالا (یعنی بغیر باپ کے اس کے حکم سے مریم کے بطن میں وجود پذیر ہوئے) اور اس کی روح ہیں۔ پس اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تین (اقانیم) نہ کہو اس سے باز آ جاؤ تمہارے لیے بہتر ہوگا بلاشبہ اللہ خدائے واحد ہے پاک ہے اس سے کہ اس کا بیٹا ہو، اسی کے لیے ہے (بلا شرکت غیرے) جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں اور کافی ہے اللہ ”وکیل“ ہو کر۔“

﴿بَدِیْعِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ اِنِّیْ یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ ۗ لَمْ یَكُنْ لَهٗ صٰحِبَةً ۗ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ۗ وَهُوَ

بِجُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۱﴾﴾ (الانعام: ۱۰۱)

”وہ (خدا) موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اس کے لیے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے اور نہ اس کی بیوی ہے اور اس نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔“

﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ۗ اِلَّا رَسُوْلٌ ۗ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۗ وَاُمُّهُ صِدِّیْقَةٌ ۗ كٰنَا یَا كُلِّنَ

الطَّعَامَ ۗ﴾ (المائدہ: ۷۵)



”مسیح بن مریم (علیہ السلام) نہیں ہیں مگر خدا کے رسول بلاشبہ ان سے پہلے رسول گزر چکے ہیں اور ان کی والدہ صدیقہ ہیں، یہ دونوں کھانے کھاتے تھے، (یعنی دوسرے انسانوں کی طرح کھانے پینے وغیرہ امور میں وہ بھی محتاج تھے)۔“

﴿لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ ۗ وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا ۗ﴾ (النساء: ۱۷۲)

”ہرگز مسیح (علیہ السلام) اس سے ناگواری نہیں اختیار کرے گا کہ وہ اللہ کا بندہ کہلائے اور نہ مقرب فرشتے حتیٰ کہ روح القدس ”جبریل“ ناک بھومیں چڑھائیں گے اور جو عبادت سے ناگواری کا اظہار کرے اور غرور اختیار کرے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی جانب اکٹھا کرے گا یعنی جزا و سزا کے دن سب حقیقت حال کھل جائے گی۔“

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ۖ ابْنُ اللَّهِ ۗ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۗ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۗ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۗ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۗ أَنَّى يُؤْفَكُونَ ۗ﴾ (التوبہ: ۳۰)

”اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ کہتا ہے مسیح (علیہ السلام) خدا کا بیٹا ہے یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں ریس کرنے لگے کافروں کی بات کی اللہ ان کو ہلاک کرے کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔“

﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۚ اللَّهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۚ وَ لَمْ يُولَدْ ۚ ۚ وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۚ﴾ (الاعلاص: ۱-۴)

”اے (محمدؐ) کہہ دیجئے اللہ یکتا ہے، اللہ بے نیاز ہستی ہے، نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور کائنات میں کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔“

قرآن نے اس سلسلہ میں اپنی صداقت اور اصلاح عقائد و اعمال کا جو مدلل اور واضح اعلان کیا اس کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ موجودہ کتاب مقدس کے محرف اور مسخ کر دیے جانے کے باوجود جس شکل و صورت میں آج موجود ہے وہ کسی ایک مقام پر بھی ”ٹالوٹ“ کے اس عقیدہ کا پتہ نہیں دیتی جس کی تفصیلات و تشریحات ابھی سطور بالا میں علماء نصاریٰ، مذہبی کونسلوں اور کلیساؤں سے نقل ہو چکی ہیں اور بجز تعبیر کے جگہ جگہ حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے خدا کو ”باپ“ اور خود کو ”بیٹا“ ظاہر کیا گیا ہے اس کے لیے اور کوئی ثبوت واضح اور مصرح طور پر مہیا نہیں ہے۔ پس اگر ہم اس سے قطع نظر بھی کر لیں کہ یہ تعبیرات ”تحریفی“ اور صنم پرستی کے تخیل کی رہین منت ہیں اور اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیں کہ خدائے برتر کی جانب سے سچی الہامی انجیل میں بھی یہ تعبیرات موجود تھیں تب بھی ان سے نصاریٰ کا عقیدہ ”تثلیث“ کسی طرح صحیح ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ ”ابن“ کا لفظ اگرچہ حقیقی معنی کے لحاظ سے اس انسان پر بولا جاتا ہے جو کسی کی صلب یا کسی کے بطن سے مادہ منویہ کے ذریعہ پیدا ہوا ہو، تاہم محاورات زبان اور اہل زبان کے استعمالات و اطلاقات شاہد ہیں کہ یہ لفظ کبھی مجاز کے طور پر اور کبھی تشبیہ یا کنایہ کے طریق سے اور بھی مختلف معانی پر بولا جاتا ہے مثلاً ایک بڑی عمر کا شخص اپنے سے چھوٹے کو مجازاً ”ابن“ (بیٹا) کہہ دیا کرتا ہے یا بادشاہ اپنی رعایا کو اولاد کہہ کر خطاب کرتا ہے یا استاد اپنے شاگردوں کو ”بیٹا“ کہہ کر پکارتا ہے یا جو شخص کسی علم و ہنر کا ماہر یا اس کی خدمت میں سرشار ہوتا ہے تو اس کو کنایۃً اس علم و ہنر کا بیٹا کہہ کر یاد کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں ”ابن القانون“ ”ابن الفلسفہ“ ”ابن الفلاحۃ“ ”ابن الحدادہ“ یا دنیا طلبی کی حرص و آرزو میں اگر حد



سے گزر چکا ہے تو اس کو "ابن الدراہم" "ابن الدنانیر" کہہ دیا کرتے ہیں، اسی طرح مسافر کو "ابن السبیل" مشہور شخصیت کو "ابن جلا" بڑے ذمہ دار انسان کو "ابن لیلہا" آنے والے دن سے بے پرواہ شخص کو "ابن یومیہ" دنیا ساز ہستی کو "ابن الوقت" کہتے ہیں یا جس کے اندر کوئی وصف نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے تو اس وصف کی جانب لفظ ابن کو منسوب کر کے ذات موصوف کو یاد کرتے ہیں مثلاً صبح کو "ابن ذکاء" کہتے ہیں اور ان تمام مثالوں سے زیادہ یہ کہ انبیاء بنی اسرائیل اپنی امتوں کو ابناء اور اولاد کے ساتھ ہی خطاب کرتے اور نصائح و مواعظ میں یہ ظاہر فرماتے ہیں کہ امم واقوام انبیاء علیہم السلام کی روحانی اولاد ہوتی ہیں۔

اور یہی حال "اب" اور "باپ" کے اطلاقات و استعمالات کا ہے، ایک جھوٹا اپنے بڑے کو، ایک ضرورت مند اپنے مربی، کو ایک شاگرد اپنے استاد کو، ایک امتی اپنے نبی رسول کو "اب" اور "باپ" کہنا فخر سمجھتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تمام اطلاقات مجاز، کنایہ اور تشبیہ کے طور پر کیے جاتے ہیں اسی طرح بے نظیر مقرر اور خطیب کو "ابوالکلام" بہترین انشاء پرداز کو "ابوالقلم" ماہر نقاد کو "ابوالنظر" ڈراؤنی اور ہیبت ناک شے کو "ابوالہول" سخی کو "ابوالنجاہ" فن کاشتکاری کے ماہر کو "ابوالفلاح" صنعت و حرفت کے حاذق کو "ابوالصنع" شب و روز بولتے رہتے ہیں۔

تو ان اطلاقات کے پیش نظر باسانی یہ کہا جاسکتا ہے کہ کتاب مقدس میں ذات احدیت پر اب (باپ) کا اطلاق رب حقیقی کی حیثیت میں اور حضرت مسیح علیہ السلام پر ابن (بیٹا) کا اطلاق محبوب و مقبول الہی کی حیثیت میں ہوا ہے یعنی جس طرح باپ اور بیٹے کے درمیان محبت و شفقت کا رشتہ مضبوط و مستحکم ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ محبت و شفقت کا وہ رشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اور اس کے مقدس پیغمبر مسیح علیہ السلام کے درمیان قائم ہے، ایک صحیح حدیث میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس استعارہ اور تشبیہ کو استعمال فرماتے ہوئے کہا ہے:

الخلق عیال اللہ "تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔"

پس روزمرہ کے محاورات و اطلاقات کو نظر انداز کر کے کتاب مقدس کے لفظ "اب" اور "ابن" کے ایسے معانی و مطالب مراد لینا جو صریح شرک کے مترادف ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ قباحت و شاعت کے ساتھ خدا کی ہستی کو تین اقانیم سے مرکب ظاہر کرتے اور خدا کے حصے نجرے بناتے ہوں، کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا اور صریح ظلم اور اقدام شرک ہے (تعالی اللہ علوا کبیرا) بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ان ہی اناجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد مذکور ہے۔

"میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم آسمان کو کھلا ہوا اور خدا کے فرشتوں کو اوپر جاتے ہوئے اور ابن آدم (مسیح علیہ السلام) پر اترتے دیکھو گے۔"

اور باب ۱۳ میں بصراحت خود کو "رسول" کہا ہے:

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ نوکر اپنے مالک سے بڑا نہیں ہوتا اور نہ "رسول" اپنے بھیجنے والے سے۔"

اور باب ۴ میں ہے:

"کیونکہ یسوع نے خود گواہی دی کہ "نبی" اپنے وطن میں عزت نہیں پاتا۔"

اور باب ۳ میں ہے:



”اور آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوائے اس کے جو آسمان سے اتر یعنی ابن آدم جو آسمان میں ہے۔“

اور باب ۶ میں ہے:

”پس جو معجزہ اس نے دکھایا وہ لوگ اسے دیکھ کر کہنے لگے جو نبی دنیا میں آنے والا تھا وہ فی الحقیقت یہی ہے۔“

اور انجیل متی میں ہے: \*

”لیکن اس لیے کہ تم جان لو کہ ابن آدم (مسیح علیہ السلام) کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے۔“

علاوہ ازیں اگر عہد نامہ جدید میں حضرت مسیح علیہ السلام کے لیے ”ابن“ کا اطلاق موجود ہے تو نیکو کار انسانوں پر بھی ”ابناء اللہ“ اور

بدکاروں کے لیے ”ابناء ابلیس“ کا اطلاق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انجیل متی میں ہے: \*

”مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔“

اور انجیل یوحنا میں ہے: \*

”یسوع نے ان سے کہا: اگر تم ابراہیم کے فرزند ہوتے تو ابراہیم کے سے کام کرتے..... انہوں نے اس سے کہا ہم حرام

سے پیدا نہیں ہوئے ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا۔“

لہذا عقیدہ تثلیث میں نصاریٰ کے لیے موجودہ کتاب مقدس سے بھی کوئی حجت و دلیل نہیں ملتی اور اس لیے بغیر کسی شک و

ریب کے یہ کہنا حق ہے کہ یہ عقیدہ تثلیث صنم پرستانہ عقائد کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔

### لائق توجہ بات:

یہ بات کبھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ ادیان ملل سابقہ کے مسخ و تحریف میں تحریف کرنے والوں کو اس سے بہت زیادہ مدد

ملی کہ بنیادی عقائد میں صراحت اور وضاحت کی جگہ وقت کے معبروں، مفسروں اور ترجمانوں نے کنایات، استعارات اور تشبیہات

سے بہت زیادہ کام لیا، ان تعبیرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان مذاہب حق کا صنم پرستوں اور فلسفیوں سے واسطہ پڑا اور انہوں نے کسی نہ

کسی طرح اس دین حق کو قبول کر لیا تو اپنے فلسفیانہ اور مشرکانہ افکار و خیالات کے لیے ان ہی استعارات اور تشبیہات کو پشت پناہ بنایا

اور آہستہ آہستہ ملت حقیقی کی شکل و صورت بدل کر اس کو معجون مرکب بنا ڈالا، اسی حقیقت کے پیش نظر قرآن عزیز نے وجود باری،

توحید، رسالت، الہامی کتب، ملائکہ اللہ، غرض بنیادی عقائد میں ذومعنی الفاظ، پر بیچ تشبیہات اور توحید میں خلل انداز استعارات و

کنایات کی بجائے واضح صریح اور غیر مبہم اطلاقات کو اختیار کیا ہے تاکہ کسی ملحد، زندیق اور مشرک فلسفی کو توحید خالص میں شرک اور

اوہام و ظنون کی نکتہ آفرینیوں کا موقع ہاتھ نہ آنے پائے اور اگر کوئی شخص اس کے باوجود بھی بے جا جسارت کرے تو خود قرآن عزیز کی

نصوص صریحہ ہی اس کے الحاد کو پاش پاش کر دیں۔

### کفارہ:

موجودہ مسیحیت کا دوسرا عقیدہ جس نے دین مسیحیت کی حقیقت کو برباد کر ڈالا ”کفارہ“ کا عقیدہ ہے اس کی بنیاد اس تخیل پر



قائم ہے کہ تمام کائنات ”جس میں نیکوکار اور انبیاء و رسل سب ہی شامل ہیں“ ابتداء آفرینش سے ہی گنہگار ہے، آخر رحمت الہی کو جوش آیا اور اس کی مشیت نے ارادہ کیا کہ بیٹے کو کائنات ارضی میں بھیجے اور وہ مصلوب ہو کر اول و آخر تمام کائنات کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور اس طرح دنیا کو نجات اور مکتی حاصل ہو سکے لیکن اس عقیدے کے قوام بنانے کے لیے چند ضروری اجزاء کی ضرورت تھی جن کے بغیر یہ عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی تھی اس لیے ”عہد رسول“ میں سب سے پہلے مسیحیت نے یہودیت کے اس عقیدے کو تسلیم کر لیا کہ ان کو صلیب پر بھی چڑھایا گیا اور مار بھی ڈالا گیا اور اس کو شرف قبولیت دینے کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ ”الوہیت“ کے باوجود مسیح علیہ السلام کا صلیب پانا اور قتل ہونا اپنے لیے نہیں بلکہ کائنات کی نجات کے لیے تھا چنانچہ جب اس پر یہ حادثہ گزر لیا تو اس نے پھر الوہیت کی چادر اوڑھ لی اور عالم لاہوت میں باپ اور بیٹے کے درمیان دوبارہ لاہوتی رشتہ قائم ہو گیا۔

پس جب مذہب میں خدائے برتر کے ساتھ صحت عقیدہ اور نیک عملی مفقود ہو کر نجات کا دار و مدار عمل کردار کی بجائے ”کفارہ“ پر قائم ہو جائے اس کا حشر معلوم؟

قرآن نے اسی لیے جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ نجات کے لیے عقیدہ کی صحت یعنی صحیح خدا پرستی اور نیک عملی کے ماسوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے اور جو شخص بھی اس ”راہ مستقیم“ کو ترک کر کے خوش عقیدگی اور اوہام و ظنون کو اسوہ بنائے گا اور نیک عملی اور صحیح خدا پرستی پر گامزن نہ ہوگا بلاشبہ گمراہ ہے اور راہ مستقیم سے یکسر محروم۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِيَّانَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (البقرہ: ۶۲)

”جو لوگ اپنے کو مومن کہتے ہیں اور جو یہودی ہیں اور جو نصاریٰ ہیں اور جو صابی ہیں ان میں سے جو بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آیا اور اس نے نیک عمل کیے تو یہی وہ شخص ہیں جن کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے، نہ ان پر خوف طاری ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

یعنی قرآن کی دعوت اصلاح ادیان و ملل کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہودی، نصرانی صابی گروہوں کی طرح ایک نیا گروہ مومنوں کے نام سے اس طرح اضافہ کر دے کہ گویا وہ بھی ایک قومی، نسلی یا ملکی گروہ بندی ہے کہ خواہ اس کی خدا پرستانہ زندگی اور عملی زندگی کتنی ہی غلط اور برباد ہو یا سرے سے مفقود ہو مگر اس گروہ بندی کا فرد ہونے کی وجہ سے ضرور کامیاب اور خدا کی جنت و رضا کا مستحق ہے۔ قرآن کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ وہ یہ اعلان کرنے آیا ہے کہ اس کی دعوت حق سے پہلے کوئی شخص کسی بھی گروہ اور مذہبی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اگر اس نے (قرآن کی تعلیم حق) کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی کو اختیار کر لیا ہے تو بلاشبہ وہ نجات یافتہ اور کامیاب ہے ورنہ تو وہ اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوا پلا اور بڑھا اور اسی سوسائٹی میں زندگی گزار کر مر گیا مگر قرآن کی دعوت حق کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی دونوں سے محروم رہا یا مخالف تو اس کے لیے نہ کامیابی ہے اور نہ فوز و فلاح۔ باقی رہا مسیحیت کے کفارہ کا خصوصی مسئلہ تو قرآن نے اس کے ابطال اور تردید کے لیے یہ راہ اختیار کی کہ جن بنیادوں پر اس کو قائم کیا گیا تھا ان کی ہی جڑ کاٹ دی، چنانچہ گذشتہ سطور میں صلیب اور قتل مسیح علیہ السلام کے انکار، دفع الی السماء کے اثبات کے بحث میں اس پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔



## حضرت محمد ﷺ

○ محمد ﷺ اور قرآن ○ بشارات النبی ﷺ ○ صبح سعادت ○ تاریخ ولادت کی تحقیق ○ نسب مبارک قیمی ○  
 ○ بت پرستی سے نفرت ○ خلوت پسندی اور عبادت الہی کا ذوق ○ حقیقت وحی ○ صاحب وحی کی معرفت کی  
 وجدانی دلیل ○ بعثت ○ حدیث بخاری ○ بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق ○ نبی اور مصلح ○ کیفیت وحی اور  
 بعض مستشرقین کی گسراہی ○ نزول وحی کا پہلا دور ○ نزول وحی کا دوسرا دور ○ دعوت و ارشاد کی پہلی منزل  
 ○ دعوت و ارشاد کی دوسری منزل ○ دعوت و ارشاد کی تیسری منزل ○ (بعثت عامہ) دعوت اسلام کا مجمل حنا کہ  
 قرآن اور تجدید دعوت ○ توحید و رسالت ○ یوم آخرت ○ اسراہی (معراج) ○ ہجرت ○ غزوات  
 ○ غزوہ بدر ○ غزوہ أحد ○ غزوہ خندق یا احزاب ○ واقعہ حدیبیہ ○ معاہدہ صلح ○ فتح مکہ (الفتح الاعظم)  
 ○ حاطب بن بلتعہ کا واقعہ ○ بت شکنی ○ خطبہ غزوہ حنین ○ غزوہ تبوک اور تسبول توبہ کا عجیب واقعہ  
 ○ غزوات اور نتائج و بصائر ○ تہنی ○ خرافی داستان ○ بصائر ○ بنو نضیر ○ بصیرت ○ واقعہ اکف  
 ○ موعظت بناء فاسق ○ موعظت ○ مسجد ضرار ○ وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ ○ عبرت و موعظت

### محمد ﷺ اور قرآن :

قرآن کلام الہی ہے اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ اس کے مہبط ہیں وہ ان پر نازل ہوا ہے، قرآن علم و یقین کی روشنی ہے اور  
 ذات اقدس ﷺ اس کا عملی نمونہ اسوہ اور نقشہ ہیں ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ قرآن رشد و ہدایت ہے اور محمد  
 ﷺ راشد و ہادی، قرآنی حق و صداقت کے لیے دعوت و پیغام ہے اور نبی اکرم ﷺ اس کے داعی اور پیغامبر، اس لیے قرآن کا ہر  
 ایک جملہ اور اس کی ہر ایک آیت کسی نہ کسی حیثیت میں ذات قدسی صفات سے تعلق رکھتی ہے تو اب کس طرح یہ کہا جائے کہ قرآن میں  
 اتنی جگہ اس مقدس ہستی کا ذکر ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ آپ نبی اکرم ﷺ کے کچھ حالات زندگی ہم کو سنائیں،  
 صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نگاہ تعجب سے دریافت کیا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے جو مجھ سے خلق نبی کے متعلق سوال کرتے ہو۔ (فان خلقه  
 كان القرآن) آپ ﷺ کی تمام اخلاقی زندگی قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، قرآن جو کچھ کہتا ہے محمد ﷺ نے اسی کو کر دکھایا۔



پس قرآن کے کسی حصہ کو سامنے لانا گویا حیات طیبہ کا پیش نظر لے آنا ہے۔

البتہ قرآن عزیز نے جن آیات میں آپ ﷺ کے اسمائے گرامی یا اوصاف عالی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ﴾ اور ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ﴾ کہہ کر مخاطب کیا، اس کی تفصیل مسطورہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس نقشہ میں نبی، اور رسول، کے علاوہ جن اسماء اور اوصاف کی تفصیل مسطور ہے وہ یہ ہیں:

(۱) محمد	(۲) احمد	(۳) عبداللہ	(۴) شاہد	(۵) بشیر	(۶) نذیر
(۷) مبشر	(۸) مذکر	(۹) عزیز	(۱۰) رؤف	(۱۱) رحیم	(۱۲) امین
(۱۳) منزل	(۱۴) مدثر	(۱۵) منذر	(۱۶) ہادی	(۱۷) یسین	(۱۸) رحمتہ
(۱۹) نعمت	(۲۰) طہ	(۲۱) نور	(۲۲) حق	(۲۳) سراج منیر	(۲۴) شہید
(۲۵) داعی الی اللہ	(۲۶) خاتم النبیین	(۲۷) نبی	(۲۸) رسول	(۲۹) عبدہ	

## نقشہ

آیات	نام یا صفت	نام سورۃ	آیات	نام یا صفت	نام سورۃ
۶	(۲) احمد	صف	۱۴۴	(۱) محمد	آل عمران
۹		حدید	۴۰		احزاب
۱۹	(۳) عبداللہ	جن	۱		محمد
۱		کہف	۲۹		الفتح
۹		الفتح	۴۶	(۴) شاہد	احزاب
۴۶	(۵) مبشر	احزاب	۱۵		منزل
۹		الفتح	۱۸۸	(۶) بشیر	اعراف
۵۶		فرقان	۲		ہود
۱۹		نساء	۲۸		سبا
۱۱۹	(۷) نذیر	بقرہ	۲۴		فاطر
۵۰		عنکبوت	۲۱	(۸) مذکر	الغاشیہ
۱۹		نساء	۴۶	(۹) سراج منیر	فاطر
۱۸۸		اعراف	۴۶	(۱۰) داعی الی اللہ	فاطر
۲		ہود	۱۰۸	(۱۱) حق	یونس



۸۹	حجر		۱۲۸	توبہ	(۱۲) عزیز
۳۶،۳۲،۲۷،۲۳،۲۳	فاطر		۱۲۸	توبہ	(۱۳) رؤف
۹	الفتح		۱۲۸	توبہ	(۱۴) رحیم
۵۱-۵۰	الذاریات		۱۹	دخان	(۱۵) امین
۲۶،۱۷،۹،۸	ملک		۱۵	ماندہ	(۱۶) نور
۵۶	فرقان		۲۳۱	بقرہ	(۱۷) نعمة
۱۱۹	البقرہ		۸۱	نمل	
۳۶،۲۸	سبا		۵۳	روم	(۱۸) ہادی
۷	ص		۱۱۷	انبیاء	(۱۹) رحمة
۵	احقاف		۱	طہ	(۲۰) ظہ
۱	یسین	(۲۱) یس	۱	مزل	(۲۲) مزمل
۱	مدثر	(۲۳) مدثر	۹۲	نمل	(۲۴) منذر
۴۰	احزاب	(۲۵) خاتم الیسین	۱۶۱	آل عمران	(۲۶) نبی
۲۵۰،۱۴۶	بقرہ	(۲۷) رسول	۱۵۶،۱۵۷	اعراف	
۱۳۲،۱۰۱،۸۲،۸۱،۲۳	آل عمران		۸۱	ماندہ	
۱۸۳،۱۷۹،۱۷۲،۱۵۳			۷۰،۶۷،۶۵،۶۴	انفال	
۷۹،۶۹،۶۴،۶۱،۵۲،۱۴	نساء		۱۱۳،۷۳،۶۱	براة	
۱۷۰،۱۶۲،۱۱۵،۱۰۰،۸۰			۲	حجرات	
۶۷،۵۶،۵۵،۴۱،۳۲،۱۵	ماندہ		۳۶،۳۸،۳۲،۲۸،۱	احزاب	
۱۴۰،۹۹،۹۲،۸۲			۵۲،۵۰	فاطر	
۱۵۸،۱۵۷	اعراف		۹،۸،۳،۱	تحریم	
۲۴،۱۲،۱	انفال		۱	طلاق	
۲۹،۲۶،۲۴،۱۶،۷،۲،۱	توبہ		۱۲	ممتحنہ	
۸۰،۶۵،۶۳،۵۹،۵۴،۳۳					
۹۴،۹۱،۸۸،۸۶،۸۴،۸۱					



۱۲۸، ۱۰۷، ۱۰۵، ۹۹، ۹۷					
۱۸	عکبوت	(۲۷) رسول	۱۱۳	نحل	(۲۷) رسول
۱۵، ۱۴، ۸، ۳، ۱	حجرات		۹۳	اسراء	
۲۷، ۲۶، ۱۷، ۱۳، ۱۲، ۹	الفتح		۷۸	حج	
۹۶، ۲۸			۷۸	مومن	
۳۰، ۳۶، ۳۳، ۳۱، ۲۹، ۲۱، ۶	احزاب		۲۹	زخرف	
۷۱، ۵۷، ۵۲	فاطر		۲	جمعہ	
۱۹، ۱۴	دخان		۶۶، ۱۱، ۹	صف	
۲۹، ۸، ۷	حدید		۸، ۷، ۶، ۴	حشر	
۲۲، ۲۰، ۱۳، ۱۲، ۹، ۸، ۵	مجادلہ		۱	ممتحنہ	
۳۳، ۳۲	محمد		۲۸، ۲۲	جن	
۸، ۷، ۱	منفقون		۴۲	الحاقہ	
۱۲، ۸	تغابن		۵۲، ۵۱، ۴۸، ۴۷	نور	
			۶۳، ۶۲، ۵۶، ۵۴		
			۱۴۳	بقرہ	(۲۸) شہید
			۴۱	نساء	
			۸۹	نحل	
			۷۸	حج	
			۴۱، ۳۰، ۲۷، ۷	فرقان	
			۱۱	طلاق	

قرآن عزیز اور صحیح احادیث میں نبی اکرم ﷺ کے جن اسماء و صفات کا ذکر ہے علماء اسلام نے اس پر مستقل تصانیف کی ہیں اور ابن دحیہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس پر قلم اٹھایا۔ ان کے علاوہ ابن کثیر، بیہقی، ابن عساکر (رحمۃ اللہ علیہ) جیسے محدثین نے ان تمام احادیث و آثار کو یکجا جمع کر دیا ہے جن میں آپ ﷺ کے اسمائے صفات اور القاب مذکور ہیں، مشہور محدث ابو بکر بن عربی نے شرح ترمذی میں ان کی شمار چونسٹھ کرائی ہے بعض نے ننانوے بعض نے تین سو اور بعض اہل علم نے ان کو ایک ہزار تک پہنچایا ہے۔ مگر یہ کثرت تعداد اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس شمار میں ان تمام انتسابات کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو کسی مناسبت حال سے آپ ﷺ



کی جانب منسوب ہیں اگرچہ بحیثیت اسماء صفات یا القاب کے ان کا اطلاق ذات اقدس پر صحیح نہیں ہو سکتا مثلاً آپ ﷺ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنے درمیان صفت نبوت کے تعلق کو ظاہر اور ختم نبوت کو واضح کرنے کے لیے خود کو قصر نبوت کی آخری لبینہ (اینٹ) فرمایا ہے تو جن بزرگوں کو آپ ﷺ کے اسماء و صفات کی کثرت سے شغف تھا انہوں نے صفات النبی میں ”اللبینہ“ کو بھی شمار کر لیا۔

بخاری کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میرے پانچ نام ہیں: محمد ہوں، احمد ہوں، ماجی ہوں یعنی کفر و شرک کو مٹانے والا ہوں، حاشر ہوں۔ اس لیے کہ قیامت کے دن تمام کائنات سے پہلے میں حضرت حق کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا۔ اور عاقب ہوں (بقول زہری آخری پیغمبر ہوں) حافظ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پانچ کا یہ عدد حصر کے لیے نہیں ہے بلکہ اس جگہ ان اسماء و صفات کا ذکر ہے جو کتب سابقہ اور امم و اقوام ماضیہ میں آپ ﷺ سے متعلق مشہور و معروف اور بشارات و پیشین گوئیوں میں مسطور تھے۔ ابن حجر رضی اللہ عنہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ باتفاق علماء اسلام قرآن میں آپ ﷺ کے جو اسماء و صفات مذکور ہیں وہ یہ ہیں:

الشاهد، البشیر، النذیر، المبین، الداعی الی اللہ، السراج المنیر، المذکر، الرحمة، النعمة، الہادی، الشہید، الامین، المزمّل، المدثر۔ لیکن ہماری فہرست کے مقابلہ میں یہ فہرست ناقص ہے جن اسماء و صفات کا ذکر نقشہ میں ہے وہ بھی جمہور کے نزدیک مسلم، حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ احادیث میں مذکور اسماء و صفات میں سے حسب ذیل صفات بہت مشہور و معروف ہیں: المتوکل، المبتخر، المصطفیٰ، الشفیع المشفع، الصادق المصدوق۔

بہر حال محمد اور احمد ﷺ دو اسماء اعلام (نام ہیں) اور باقی اسماء صفات و القاب ہیں اور قرآن میں آپ ﷺ کے نام پاک کے انتساب سے ایک سورت کا نام سورہ محمد ہے جس کے شروع میں ہی آپ ﷺ کا اسم گرامی مذکور ہے:

﴿وَأَمْنُوا بِمَا نَزَّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ (محمد: ۲)

اور صرف ایک جگہ سورہ صف میں احمد منقول ہے یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی اس بشارت کے تذکرہ میں یہ نام آیا ہے جو آپ ﷺ کی آمد سے متعلق انہوں نے بنی اسرائیل کو سنائی تھی:

﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾

یہ حقیقت بھی قابل فراموش نہیں ہے کہ آپ ﷺ کے اسماء و صفات محض رسمی نہیں ہیں کہ والدین نے جو چاہا نام رکھ دیا اور احباب و اصحاب نے جس صفت و لقب سے جی چاہا پکار لیا بلکہ ان اسماء صفات کا آپ ﷺ کی زندگی اور آپ ﷺ کے اخلاق و اعمال کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے جیسا کہ ابھی ماجی، حاشر اور عاقب کے متعلق خود زبان وحی ترجمان سے سن چکے ہو یا مثلاً محمد اس ہستی کو کہتے ہیں جس کے تذکرے ہمیشہ خوبی اور نیک گوئی کے ساتھ ہوتے ہوں، یہ انبیاء سابقین علیہم السلام کی بشارات اور مستقبل میں تذکرہ کی حیات کی جانب اشارہ ہے اور احمد اس ذات پر اطلاق ہوتا ہے جو سب سے زیادہ حمد الہی کے لیے نغمہ سنج ہو یہ ذات اقدس کی عبدیت کاملہ اور انسان کامل ہونے کو ظاہر کرتا ہے بلاشبہ آپ ﷺ خدا پرست انسانوں کے لیے مبشر و بشیر اور فتنہ جو مفسدوں، کافروں اور مشرکوں کے لیے منذر و نذیر ہیں، روز قیامت، صادق و کاذب دونوں پر شاہد و شہید ہیں، چشم حق بین اور گوش حق نیوش کے



لیے مذکر (ناصح) ہیں، راہ حق سے بھٹکے ہوؤں کے لیے ہادی اور خدا سے بھاگے ہوؤں کے لیے داعی ہیں ان کا وجود رحمت ہے کائنات عالم کے لیے اور ان کی ہستی نظام کائنات کے لیے نعمت ہے، جہل و شرک کے لیے نور ہیں اور پیغام الہی کے لیے نبی و رسول، مصائب و آلام میں عزیز ہیں اور نوع انسانی کے ہر ایک گوشہ حیات کے لیے رؤف و رحیم، ان کی صدا، صدائے حق ہے اور ان کی ذات الصادق الامین، قرآن خدا کا آخری پیغام ہے اس لیے وہ خاتم النبیین ہیں، ان کی بعثت عالمگیر ہے اس لیے طہ و یسین ہیں اور آسمان نبوت کے سراج منیر ہیں اور کائنات و رسالت کے بشیر و نذیر، عالم ادیان و ملل کی سلطانی کے باوجود گدائے کملی پوش ہیں اس لیے منزل ہیں اور مدثر، پھر بیا ایں ہمہ حسن و کمال ﴿إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ﴾ اور ﴿لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ﴾ کے مصداق ہیں اللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَيْهِ۔ خدا پر توکل اس کا شعار ہے اس لیے متوکل اس کا وصف عالی و قار ہے اور وہ خدائے برحق کا برگزیدہ و مختار ہے بارگاہ الہی میں ابرار و مقررین سے بھی زیادہ مصطفیٰ، مجتبیٰ نیکو کار و صالحین کے لیے الشفیع المشفع اور ہر ایک شعبہ ہائے حیات میں الصادق المصدوق ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

ہم جانتے ہیں کہ اظہار مقصد کے لیے یہ اشارات کافی نہیں ہیں بلکہ اپنے معنوی مناسبات کے لحاظ سے ہر ایک وصف و نام قرآن سے شہادت کا طالب ہے اور قرآن کی شہادت بلاشبہ ہر ایک گوشہ کی تفصیل کے لیے شاہد عدل لیکن افسوس کہ کتاب کا موجودہ ترتیبی نقشہ اس کا متحمل نہیں ہے اس لیے صرف آیات کے حوالجات اور ارشادات پر ہی اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

### بشارات النبی ﷺ:

﴿وَ إِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَ لَتَنْصُرُنَّهُ ۗ قَالَ ءَأَقْرَرْتُمْ وَ أَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذٰلِكُمْ اٰصْرِي ۗ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ۗ قَالَ فَاشْهَدُوْۤا ۗ اَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۗ﴾ (آل عمران: ۸۱)

”اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد کیا کہ میں تم کو جو کچھ کتاب اور حکمت عطاء کروں اور پھر تمہارے پاس وہ پیغمبر آئے جو ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہیں تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا (پھر) اللہ نے فرمایا کیا تم اس عہد کا اقرار کرتے ہو اور اس کو میرا اہم عہد سمجھ کر قبول کرتے ہو تو انہوں نے کہا بیشک ہم اقرار کرتے ہیں اللہ نے فرمایا اب تم اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ بنتا ہوں۔“

حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس آیت ”ميثاق“ میں اس عہد و ميثاق کا تذکرہ ہے جو ازل میں تمام انبیاء و رسل علیہم السلام سے خاتم الانبیاء ﷺ کے متعلق لیا گیا، خطاب اگرچہ براہ راست انبیاء علیہم السلام سے ہے مگر مقصود و مراد میں ان کی امتیں بھی شامل ہیں کیونکہ عمومی طور پر ان ہی کے ذریعہ و فاء عہد کا مظاہرہ ہونے والا تھا۔

اس عہد ميثاق کو اس درجہ اہمیت کیوں حاصل ہے؟ یہ بات کچھ تمہید کی محتاج ہے مادیات و روحانیت پر فاعل مختار ایک ہی ہستی ہے اور وہ خدا ہے مگر مادیات میں خدائے برتر کے جاری قانون فطرت کا ہم شب و روز مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور وہ ہم کو محسوس نظر آتا ہے اس کے برعکس عالم روحانیت حواس خمسہ سے بلند احساسات تعقل و تفکر کا محتاج ہے یہاں وجدان و شعور جب عقل و فکر کو رہنما بناتے اور دونوں راہنما ریب و شک اور اوہام و ظنون سے محفوظ ”سلیم“ بن کر رہنمائی کا حق ادا کرتے ہیں تو انسان کے سامنے روز



روشن کی طرح یہ حقیقت چمک اٹھتی ہے کہ خدائے واحد کی احدیت و یکتائی عالم مادیات اور روحانیت میں ایک ہی قسم کے قانون فطرت کو نافذ رکھتی ہے۔

اب ذرا دیدہ عبرت کو دیکھئے اور کائنات ہست و بود پر نظر ڈالیے تو یہ حقیقت ہر جگہ ابھری ہوئی ملے گی کہ ذات واحد کے ماسواء یہاں کائنات کی ہر ایک شے کے لیے دو ہی سرحدیں مقرر ہیں آغاز و انجام اور درمیان کی تمام کڑیاں نشو و ارتقاء کے لیے وقف ہیں ہر ایک چیز شروع ہوتی اور درمیانی دور میں ترقی پذیر رہتی اور پھر حد کمال کو پہنچ کر اپنی ضرورت کو پورا کر دیتی ہے اس کو انجام اور شروع کو آغاز کہتے ہیں۔

روحانیت میں بھی یہی سلسلہ جاری ہے نسل انسانی کا جب آدم علیہ السلام سے آغاز ہوا تو مادی وجود کے ساتھ خدا کی معرفت یعنی خدا پرستی کی امانت کو بھی ساتھ لایا وہ اگر ایک جانب نسل انسانی کے مادی باپ تھے تو دوسری جانب خدا کی بخشی ہوئی ہدایت و صداقت کے لیے ”نبی“ اور ”اپیلچی“ بھی تھے اور جب کہ خدا کی ہستی ایک اور اس کی بنیادی صداقت و ہدایت کا پیغام بھی ایک ہے تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی رشد و ہدایت اور خدا پرستی کی بنیادی تعلیم کا سلسلہ بھی ایک ہی لڑی میں پرویا جائے اور آغاز سے انجام تک اس سلسلہ کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوں کہ ان میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب گویا پورے سلسلہ روحانیت کی تکذیب کے مرادف ہو۔ چنانچہ اس حقیقت کو قرآن نے اس طرح ظاہر کیا ہے:

﴿لَا نَفَرِقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ﴾ (البقرہ: ۲۸۵)

”ہم ایمان و تصدیق میں خدا کے کسی ایک پیغمبر کے درمیان بھی تفریق جائز نہیں رکھتے۔“

اور اسی کو زبان وحی ترجمان نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

((نحن بنوعلات دیننا واحد))۔

”ہم تمام انبیاء و رسل کی تعلیمات اصل و بنیاد میں اسی طرح ایک ہیں جیسا کہ علانی بھائی کہ ان سب کا باپ ایک ہی ہے۔“

پھر اس سلسلہ روحانیت کی اگرچہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں۔ مگر آغاز اور نشو و نما اور دور کمال و انجام کے پیش نظر اسی طرح باہم فرق مراتب رکھتی ہیں جس کا مظاہرہ ہم کو عالم مادیات کے مختلف سلسلوں میں نظر آتا ہے اور جس کو ہم فطری (Natural) کہتے ہیں اور ان درجات و مراتب میں بھی درجہ کمال کو جس سے کہ انجام کی سرحد ملتی ہے سب سے زیادہ رفعت و بلندی حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہی اس سلسلہ کا محور و مرکز (Center) اور قطب رچی (چکی کی کیلی) ہوتا اور وابستہ و پیوستہ کی منزل مقصود سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ کائنات کی ہر شے کی طرح خود عالم انسانی نے بھی اس ربع مسکوں پر عہد طفولیت گزارا ہے، اس وقت دنیائے انسانی ایک چھوٹے سے کنبے کی طرح آباد تھی اور نسل انسانی کا باپ ہی روحانی طبیب بھی تھا لیکن جب سلسلہ بود و ماند آہستہ آہستہ خاندانوں، برادریوں قبیلوں سے آگے بڑھ کر قوموں اور جغرافیائی نسلوں میں تقسیم ہونے لگا اور وحدت نے کثرت کی ہی شکل نہیں اختیار کر لی بلکہ کثرت میں بھی تنوع پیدا ہونے لگا تو ان مادی نشو و نما اور ترقیوں کے ساتھ ساتھ روحانی رشد و ہدایت نے بھی نقطہ



وحدت پر قائم رہتے ہوئے تنوع اور کثرت کی شکل اختیار کر لی یعنی ہر ایک قوم و ملک میں جدا جدا ہادی و رہنما اور پیغمبر مبعوث ہونے لگے بلکہ بعض حالات میں ایک قوم میں بیک وقت متعدد نبیوں نے دعوت حق میں ایک دوسرے کی اعانت کا فرض انجام دیا۔ اگرچہ ان کی دعوتوں کی بنیاد سراسر ایک ہی ”اصل و بنیاد“ پر قائم تھی۔

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ۗ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَ مُنذِرِينَ ۗ وَ أَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۗ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَغِيًّا بَيْنَهُمْ ۗ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ وَ اللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳۳﴾﴾ (البقرہ: ۲۱۳)

”ابتداء میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے ایک ہی قوم و جماعت تھے (پھر ایسا ہوا کہ باہم دگر مختلف ہو گئے اور الگ الگ ٹولیاں بن گئیں) پس اللہ نے (یکے بعد دیگرے) نبیوں کو مبعوث کیا وہ (ایمان و عمل کی برکتوں کی) بشارت دیتے اور (انکار و بد عملی کے نتائج سے) ڈراتے تھے۔ نیز ان کے ساتھ کتاب الہی نازل کی گئی تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو (اور تمام لوگوں کو راہ حق پر متحد کر دے) جو لوگ باہم دگر مختلف ہوئے تو اس لیے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے، نہیں وحی الہی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے بالآخر اللہ نے ایمان والوں کو (دین کی) وہ حقیقت دکھادی جس میں لوگ مختلف ہو رہے تھے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے دین کی سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے۔“

﴿وَ مَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۗ وَ لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۹﴾﴾ (یونس: ۱۹)

”اور (ابتداء میں) انسانوں کی ایک ہی امت تھی پھر الگ الگ ہو گئے اور اگر تمہارے پروردگار کی جانب سے پہلے سے ایک بات نہ ٹھہرا دی گئی ہوتی تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔“

لیکن خدائے واحد کی جانب سے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ اگرچہ وقتی تقاضا کے پیش نظر ہزاروں برس تک قوموں اور ملکوں میں تنوع اختیار کیے رہا۔ تاہم وہ اپنے مقصد وحدت کو فراموش نہ کر سکا اور بنیادی وحدت کے ساتھ اس عارضی کثرت کو بھی ایک ہی نقطہ وحدت پر لانے کے لیے اس وقت تک برابر حرکت کرتا رہا جب تک کہ اپنے مرکز وحدت اور مقصد کمال کو نہ پاسکا۔

یعنی خدا کی صداقت کا پیغام اگرچہ جدا جدا قوموں اور ملکوں میں نبیوں اور پیغمبروں کی زبانی پہنچایا جاتا رہا اور گوان تمام پیغامات میں فروعی اور وقتی تنوع سے قطع نظر اساسی اور بنیادی وحدت قائم رہی مگر خدا کی وحدانیت اور اس کے پیغام کی اساسی وحدت کا تقاضہ یہی تھا کہ یہ مختلف دعوتیں اور پیغامات سمٹ کر ایک ایسے نقطہ اور مرکز پر آ جائیں کہ وہ تمام کائنات کے لیے بیک وقت اور رہتی دنیا تک ایک ہی پیغام بن کر اپنی نمود دکھلائے اور ایک ایسا پیغمبر مبعوث ہو جس کی بعثت، بعثت عام ہو اور جس کی دعوت، عالمگیر



دعوت ہوتا کہ پھر اس تنوع اور کثرت کی ضرورت باقی نہ رہے۔

عالم روحانیت کی اپنی ”مثل اعلیٰ“ یا اپنے محور و مرکز کی جانب یہ حرکت جب کہ عالم مادیات کے نشو و ارتقاء کے متناسب حالات سے وابستہ تھی اور خالق کائنات کا قانون فطرت جب کہ دونوں سمتوں میں ایک ہی اصل پر کار فرما ہے تو یہ بھی از بس ضروری ہوا کہ روحانیت کے کمال و ارتقاء کا یہ دور مادی عالم کے ایسے دور کے ساتھ رونما ہو کہ کائنات انسانی کے ارتقاء دماغی و عقل کی استعدادات اپنے رشد و کمال کے ایسے نقطہ پر پہنچ جائیں کہ حجاب مستقبل میں مستور تمام ترقیاں اسی ارتقاء کا نتیجہ کہلائیں اور گو اس سلسلہ میں ایک مدت کیوں نہ ہو جائے مگر کائنات ارضی کا یہ پورا مادی کارخانہ اسباب مادی کی بناء پر ایک کنبہ اور ایک خاندان بن کر رہ جائے اور ملکوں اور قوموں کی بہتات و کثرت کے باوجود کسی ایک گوشہ کے حرکت و سکون کے اثر سے تمام کائنات متاثر ہونے پر مجبور ہو جائے تاکہ اس وقت عالم روحانیت کا آخری نقطہ ارتقاء کائنات انسانی کے عقل و دماغ کو اپنی دعوت کی یکتائی و وحدت سے متاثر کر سکے اور دنیا دانستہ یا نادانستہ اسی کے بتلائے ہوئے سوسائٹی کے نظام کو آہستہ آہستہ اپنا کر عملاً خدا کا ایک کنبہ بن جائے اور مساوات عالم اور اخوت ہمہ گیر کا مظاہرہ کر دکھائے اور نتیجہ یہ نکلے کہ دین حق صرف تعلیم قرآن ہی میں منحصر ہو کر رہ جائے۔

تاریخ اقوام و ملل شاہد ہے کہ قرآن کی دعوت و اصلاح کی صدائے حق نے جب چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کو پکارا ہے اس وقت دنیا کے تمام مذاہب و ادیان خود اصحاب مذاہب کے تاریخی اقوال کے مطابق اپنی حقیقی روشنی کو یکسر فراموش کر چکے تھے اور دنیا کے ہر گوشے اور ہر سمت میں مذہب و دھرم اور نظام سوسائٹی تنگی و تاریکی اختیار کر چکا تھا اس وقت قرآن کی آواز پہلی آواز تھی جس نے دنیا کے مذاہب اور ان کی سوسائٹی کے ابتر نظام میں نیا انقلاب پیدا کر دیا اور اقوام و امم نے بہ عجلت یا بہ دیر، اعتراف و اقرار کے ساتھ یا حاسدانہ انکار کے ساتھ مذہب اور سوسائٹی دونوں میں اسی کی اصطلاحات کو اپنایا اور قبول اصلاحات کے بغیر آنے والی دنیا میں اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

توحید کامل اور خالص خدا پرستی، نسل و خاندان یا کفارہ کی جگہ خدا پرستی اور نیک عملی پر مدار نجات، نسلی غرور و تفاخر کا انہدام، کاسٹ سٹیم کا خاتمہ، حقوق انسانیت میں تمام افراد انسانی کی مساوات، اخوت عام کی داغ بیل، رواجی غلامی کے خلاف اصلاح و انقلاب کی تشکیل، عورتوں کے لیے حقوق انسانیت میں مساوات کا اعلان اور حقوق صنفی میں امتیازی احکامات، انقلاب و اصلاح، وراثت، ازدواجی زندگی میں ظالمانہ رواج کا خاتمہ اور جدید مفید اصلاحات (خلع و طلاق وغیرہ) زکوٰۃ کے وجوب، سود و قمار کی حرمت اور دوسری اصلاحات کے ذریعہ اقتصادی نظام میں بنیادی انقلاب، انفرادی اور اجتماعی ملکیت کی تسلیم اور دونوں کے مابین تجدیدی اعتدال کا اعلان سیاسی اور ملکی نظام میں بادشاہت شخصی اور پارٹی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ شوروی نظام کی تشکیل ایسے اہم امور ہیں کہ آج کی دنیا میں ہر ایک انصاف پسند عاقل کے نزدیک ان کی صداقت و افادیت تسلیم ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو بلاشبہ یورپ و ایشیا میں افریقہ و امریکہ میں سوسائٹی کے نظام اور مذہب و دھرم کی اصلاح کے نام سے جو صدائیں بھی اس تعلیم اور اعلان حق کے بعد اٹھیں اگر بغیر کسی تعصب کے تاریخی انقلابات پر غور کیجئے گا تو ان میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی صدا کی بازگشت پائیں گے جو چھٹی صدی عیسوی میں فاران کی چوٹی سے بلند ہوئی اور جس نے ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ کو تاریخ عالم میں سچ کر دکھایا۔

اس سلسلہ کے حوالجات آئندہ تعلیم الاسلام اور مسئلہ خاتم النبیین کے بحث میں ذکر ہوں گے۔



تاریخی حقائق کی اس روشنی میں اب پھر ہم کو گذشتہ مضمون کی جانب واپس جانا چاہیے کہ جبکہ مادی استعدادات نشوونما پا رہے تھے اور چند صدیوں بعد جو قوموں کے انقلابات و اصلاحات کے لیے چند برسوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، مادی اسباب کی بدولت یہ سارا کارخانہ عالم ایک کنبہ بن جانے والا تھا۔ اس وقت از بس ضروری ہوا کہ ”وحدت مذہب“ کی روحانی صدا بلند ہو اور اس کی صدائے حق کسی خاص قوم اور ملک کی بجائے کائنات کے ہر گوشہ کے لیے یکساں حیثیت رکھے۔

پس منشاءً تقدیر الہی یہ ہوا کہ ایسے پیغام اور پیغامبر کی نصرت و حمایت کے لیے ازل ہی میں انبیاء و رسل سے عہد و میثاق لیا جائے اور ان کو مطلع کیا جائے کہ جب وہ پیغام کامل اور ”آخری صدائے حق“ بلند ہو جس کا تعلق رہتی دنیا تک تمام کائنات ارضی کے ساتھ یکساں طور پر وابستہ ہے تو وہ اور ان کی امتیں اس کو قبول کریں اور اس کی مدد فرض سمجھیں کیونکہ کائنات روحانی کا یہی مرکز وحدت اور نقطہ مثل اعلیٰ ہے۔ چنانچہ یہی وہ عہد میثاق ہے جس کو تمام امتوں نے اپنے دور میں اپنے پیغمبروں اور نبیوں کی معرفت ”بشارات“ کی شکل میں سنا اور آج بھی دنیا کے تمام مذاہب و ادیان میں خواہ وہ امتداد زمانہ کی بناء پر شرک کی آلودگیوں سے قطعاً منحرف ہو چکے ہوں یا ان میں تحریف و صداقت کا امتزاج قریبی دور سے وابستہ ہو۔ اوتار یا نبی مرسل کی معرفت کے ساتھ ایک ”منتظر ہستی“ کا مشترک عقیدہ پایا جاتا ہے۔ ”یہود مسیح“ کے علاوہ بھی ”ایلیا“ یا وہ نبی کہہ کر اس کی آمد کے منتظر ہیں، نصاریٰ بھی ہر قسم کی تحریف کے باوجود مسیح کے بعد فارقلیط (پیرا کلیوطاس) بمعنی (احمد) یا ”روح حق“ یا ”ناصر“ وغیرہ صفات کے تعارف سے اسی کے انتظار میں ہیں۔ مجوس آج تک ایک ”نجات دہندہ“ کا انتظار کر رہے ہیں اور ویدک دھرم (سناتن دھرم) ہندوؤں میں بھی ایک ”اوتار“ کا انتظار ہو رہا ہے اور آج عقلیت کے نام پر اس ”ہستی منتظر“ کے عقیدہ کو کتنا ہی مضحکہ خیز سمجھا جائے اور خود مذہبی افراد اپنے اپنے مذہب کے اس عقیدہ کو کیسا ہی غیر معقول کیوں نہ ٹھہرائیں لیکن ان کے پاس اس کا جواب کچھ نہیں ہے کہ مذاہب و ادیان کے موجودہ اختلافات کے باوجود چھوٹے سے ناسک گروہ کو چھوڑ کر ہزار ہا برس کائنات انسانی میں اس عقیدہ کا کسی نہ کسی شکل میں مشترک عقیدہ بنا رہنا اس کے ”حقیقت“ ہونے کی ناقابل انکار دلیل ہے۔ البتہ یہ بات جدا ہے کہ جس طرح یہود نے ازراہ حسد ”مسیح ہدایت کے انتظار کے باوجود“ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قبول نہ کیا اسی طرح مذاہب عالم کی اقلیت کو چھوڑ کر جو کہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئی ان کی اکثریت نے محمد ﷺ کو قومی و ملکی عصیت اور گروہ بندی کی بندشوں کی وجہ سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یا ان کی دعوت حق کو عرب کے لیے محدود قرار دے کر خود کو اس سے علیحدہ کر لیا۔

بہر حال ہندوستان کا قدیم مذہب چونکہ حقیقت مذہب کو فراموش کر چکا اور اس کی موجودہ شکل نے کسی طرح قدیم شکل و صورت کو بدل کر نیا رخ اختیار کر لیا اور اس کی تاریخ خود اس کے اپنے پاس بھی نہیں ہے اور اب اس کی تمام بنیاد صرف آبائی رسوم پر یا چند مخصوص فلسفیانہ عقائد پر قائم ہے اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ”منتظر ہستی“ کے متعلق جو روایات رکھتے ہیں ان کی اصل حقیقت کیا تھی اور یہی حال بدھت کا بھی ہے اس لیے ہم ابوریحان بیرونی اور بعض دیگر مفسروں اور مؤرخوں کے ان بیانات سے قطع نظر کرتے ہیں جو انہوں نے ہندوؤں کے عقیدہ ”کلنگی اوتار“ کے ”شنبل“ میں نزول کو محمد ﷺ پر منطبق کرنے کی سعی کی ہے۔

اور یہاں صرف یہود و نصاریٰ پر نازل کتب سماویہ تورات، زبور اور انجیل سے ہی ان بشارات کو پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جن میں تحریف کے باوجود اب بھی اصل کتاب کی چمک باقی ہے اور علمائے یہود و نصاریٰ کے پاس انطباق کے انکار کی موجودہ دلیل



موجود نہیں ہے، چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ (نور اللہ مرقدہ) کی میزان الحق اور حافظ ابن قیم کی ہدایہ الحیاری اور باجہ جی زادہ کی الفارق وغیرہ کتب سے اور ان مناظرات مطبوعہ سے ظاہر ہوتا ہے جو علماء نصاریٰ اور علماء اسلام کے درمیان ان بشارات سے متعلق پیش آئے ہیں اور جن کے متعلق بعض علماء نصاریٰ کو اقرار و اعتراف کے ماسوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔

### تورات اور بشارات:

تورات کتاب استثناء میں ہے:

خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھریو، اس سب کی مانند جو تو نے خداوند اپنے خدا سے جو ب میں مجمع کے دن مانگا اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی پھر سنوں اور ایسی شدت کی آگ پھر دیکھوں تاکہ میں مرنہ جاؤں اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے (بنی اسرائیل نے) جو کچھ کہا سوا چھا کیا۔ ”میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔“ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو کہ جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا لیکن وہ بھی اگر ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔\*

نشان زدہ جملوں کو غور سے پڑھئے اور پھر ہر ایک جملہ کی حقیقت کو تاریخی روشنی میں دیکھئے تو تاریخ کا بے لاگ فیصلہ ایک اور صرف ایک ہی ہوگا اور وہ یہ کہ اس بشارت کا مصداق ذات اقدس محمد ﷺ کے ماسوا دوسری کوئی ہستی نہیں ہے۔

بشارت کا پہلا جملہ یہ ہے: ”میں ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔“ تاریخ کہتی ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں بنی اسمعیل کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں جو اس کا مصداق بن سکے اور بنی اسمعیل میں محمد ﷺ کے ماسوا کوئی نبی ہی نہیں ہوا جو موسیٰ علیہ السلام کی مانند کہلایا جاسکے اور دوسرا جملہ ہے: ”میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس سے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔“ اس جملہ کو ایک بار پھر غور سے پڑھئے اور اس کے بعد قرآن کی ان آیات کا مطالعہ کیجئے جن میں بعینہ یہی صفات نبی اکرم ﷺ کے لیے مذکور ہیں:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۗ﴾ (النجم: ۳-۴)

”وہ (محمد ﷺ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں خدا کی وحی سے کہتے ہیں جو ان پر وحی کی جاتی ہے۔“

﴿فَأَنبَأَ يَسْرَنُهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لَّدَا ۗ﴾ (مریم: ۹۷)

”پس بے شبہ ہم نے اس (قرآن) کو تیری زبان پر آسان کر دیا تاکہ تو اس کے ذریعہ متقیوں کو بشارت دے اور کج راہوں کو (عذاب الہی سے) ڈرائے۔“



﴿ وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٩٦﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٧﴾ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿١٩٨﴾  
بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ ﴿١٩٥﴾ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٩٦﴾ ﴾ (الشعراء: ۱۹۲-۱۹۵)

”اور یقیناً یہ جہانوں کے پروردگار کا اتارا ہوا ہے اس کو روح الامین (جبرئیل) نے تیرے قلب پر اتارا تا کہ تو گمراہوں کو (اعمال بد کے نتائج سے) ڈرانے والوں میں سے ہو یہ ہے صاف عربی زبان میں اور اس کا ذکر پہلی کتابوں میں موجود ہے۔“

بشارات کے جملوں اور قرآن کی ان آیات کے اسلوب بیان کا مطالعہ کرنے کے بعد کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ دونوں کسی ایک ہی ہستی کی صفات کا ذکر ہے اب تیسرے جملہ کو پڑھئے: ”جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔“ اور ساتھ ہی ان آیات قرآنی کا مطالعہ کیجئے:

﴿ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصُوا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ ﴿٤٢﴾ وَلَا يَكْتُمُونَ لِلَّهِ حَدِيثًا ﴿٤٣﴾ ﴾ (النساء: ۴۱-۴۲)

”اور پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اس دن (قیامت کے دن) جب کہ ہم ہر ایک امت میں سے ان پر ایک گواہ طلب کریں گے، اور ہم تم کو ان سب پر گواہ بنائیں گے سو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور الرسول (محمد ﷺ) کی نافرمانی کی وہ اس دن یہ پسند کریں گے کاش کہ (وہ دھنس جائیں اور) زمین ان کے اوپر برابر ہو جائے اور اُس دن یہ اللہ سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہ رکھ سکیں گے۔“

غور کیجئے کہ دونوں عبارتوں میں کس درجہ مطابقت ہے اور سب کے بعد اس فقرے کو بامعان نظر دیکھئے لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔“ اور پھر قرآن کی اس آیت کو بھی پڑھئے اور فرمائیے کہ کیا یہ دونوں مضامین ایک ہی حقیقت کے دو نقش نہیں ہیں؟

﴿ وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ ﴿٤٤﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿٤٥﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿٤٦﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٤٧﴾ وَإِنَّهُ لَتَذْكُرَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٤٨﴾ ﴾ (الحاقة: ۴۴-۴۸)

”اور یہ پیغمبر بعض باتوں کو اپنی جانب سے گھڑ کر ہماری جانب منسوب کر دے تو بے شبہ ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیں اور پھر اس کی گردن کی رگ کاٹ ڈالیں (قتل کر دیں) اور اس وقت تم میں سے کوئی بھی اس کو ہماری گرفت سے باز نہیں رکھ سکتا۔“  
تورات کی پیش گوئی اور آیات قرآنی کے مسطورہ بالا تطابق کے بعد تھری (چیلنج) کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بشارات میں ذکر کردہ مجموعہ صفات کا مصداق ذات اقدس ﷺ کے ماسوا کوئی دوسری ہستی تاریخی دنیا میں نہیں پائی جاتی یہ مجموعہ صفات نہ حضرت مسیح علیہ السلام پر صادق آتے ہیں نہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام پر اور نہ حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام پر اور نہ دوسرے انبیاء بنی اسرائیل پر صادق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب علماء یہود سے اس کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے تو وہ ایک ”منتظر ہستی“ کے مزید انتظار کے ماسوا



دوسرا کوئی جواب نہیں رکھتے اور خاتم الانبیاء ﷺ کو اس کا مصداق نہ سمجھنے میں بے دلیل انکار اور خموشی کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ نہیں ہے اسی طرح نصاریٰ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کو اس بشارت کا مصداق ثابت کرنے میں مجموعہ صفات کے پیش نظر عاجز و در ماندہ نظر آتے اور صاف اور واضح باتوں کو دور از کار تاویلات کا جامہ پہنا کر اعترافِ حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔

اور تورات استثناء ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک نغمہ باب ۳۱ میں مذکور ہے جو انہوں نے موت سے چند لمحات قبل بحکم الہی بنی اسرائیل کو سنایا۔ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ میدان تیبہ میں اپنی قوم کو جمع کرو اور خدا کا یہ پیغام سناؤ کہ جب بنی اسرائیل خدا کے وعدے کے مطابق شہروں میں جا بسیں گے تو حکومت، تمول اور رفاہیت میں بدمست ہو کر خدا کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جائیں گے حتیٰ کہ بت پرستی سے بھی باز نہیں رہیں گے۔ پس جب ان کی حالت اس درجہ ابتر ہو جائے گی تو میں ان سے خفا ہو جاؤں گا اور ان سے اپنا منہ چھپالوں گا اور اس کے بعد میری غیرت حق حرکت میں آئے گی اور میں بھی ان (بنی اسرائیل) کو ایک ایسی قوم کے ذریعہ خفا کروں گا اور ان سے اپنی نعمت (نبوت) چھین کر اس قوم کو بخش دوں گا جو ان پڑھ \* اور تمدن سے دور، بے عقل، خانہ بدوش ہوگی جس کو تم اور دنیا کی قومیں "متمدن جماعت" نہ سمجھیں گی۔ اس کے بعد باب ۳۳ میں اس نغمہ کی تکمیل ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے:

تم اس بشارت یا پیغمبرانہ پیشین گوئی کے لیے تاریخ ماضی پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ بنی اسرائیل کی متمدانہ سرگرمیاں، باغیانہ اور سرکشانہ شراکینزیاں جب حد سے زیادہ متجاوز ہو گئیں اور انہوں نے مسیح علیہ السلام ہدایت جیسی جلیل القدر ہستی کو بھی رد کر دیا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسے مقدس پیغمبر کو قتل کر ڈالا تو ان کی جگہ خدا نے کس قوم کو پسند کیا کس کو شرف رسالت سے نوازا اور کس نے ساری کائنات میں حیرت زا انقلاب برپا کر کے سچی خدا پرستی اور نیک عملی کا غلغلہ بلند کر دیا اور بنی اسرائیل نے کس کے عظمت و جلال کو دیکھ کر حاسدانہ اس کے روکنے کی سعی کی۔ کیا یہ عرب قوم نہیں تھی اور کیا یہ محمد ﷺ کی مقدس ہستی اور ان کی قوم نہ تھی جس پیغمبر نے دنیوی وسائل و اسباب کی نظر میں اُمی "ان پڑھ" ہونے کے باوجود متمدن قوموں کے ظالمانہ و جاہلانہ تمدن کو فنا کے گھاٹ اتار کر اس عظیم الشان عادلانہ تمدن کی بنیاد ڈالی کہ ہر قسم کے اسباب و وسائل کے فقدان اور موانع کے باوجود جس کی عظمت و سرعت رفتار نے ماہرین فلسفہ تاریخ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام کی دعوت و اصلاح اور انقلاب، دنیائے تاریخ کی مستثنیات میں سے ہے۔ یہی وہ اُمی اور گلہ بان قوم تھی جو ایک "اُمی" کی خدا پرستانہ تعلیمات سے تربیت پا کر چند ہی برسوں میں دنیا کی قوموں کی تربیت و اصلاح کے لیے "بہترین معلم" ثابت ہوئی اور اونٹوں اور بکریوں کے چرانے والے دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کے چرواہے بن گئے اور بنی اسرائیل کی ہمہ قسم کی حاسدانہ اور معاندانہ جدوجہد اس کی راہ ترقی میں پرکاش کی برابر بھی سنگ راہ نہ بن سکی تو کیا تاریخ کے ان ابھرے ہوئے نقوش کے بعد بھی اس انکار کے لیے کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ تورات کی اس پیشین گوئی کا مصداق محمد ﷺ اور بنی اسمعیل علیہ السلام کے

\* کتاب مقدس کے قدیم نسخوں میں "ان پڑھ" کا لفظ تمام زبانوں میں موجود ہے مگر بعد کے ایڈیشنوں میں اس کی جگہ کہیں "بے عقل" اور کہیں اسی کے مترادف الفاظ پائے جاتے ہیں حاصل اگرچہ پھر بھی وہی رہتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن میں محمد ﷺ کی صفت اُمی اور آپ کی قوم کی "امیین" مذکور ہے جس کا لفظی ترجمہ "ان پڑھ قوم" ہوتا ہے اس لئے محض اس لئے کہ پیشین گوئی کا یہ صاف تطابق باقی نہ رہے قدیم لفظ کو بدل کر اس قسم کے الفاظ رکھے گئے۔ مختلف ایڈیشنوں کی اس قسم کی لفظی تحریفات کے لیے میزان الحق کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔



ماسوا کوئی اور ہستی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہی وہ اوصاف اور واضح حقیقت ہے جس کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۗ فَاَلَّذِينَ أَمَنُوا بِهِ وَعَدَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ۗ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝﴾

(الاعراف: ۱۵۷-۱۵۸)

”پس میں ان کے لیے رحمت لکھ دوں گا (جو الرسول (محمد ﷺ) کی پیروی کریں گے کہ وہ نبی اُمی ہوگا (یعنی دنیا کے سلسلہ تعلیم و تعلم کے لحاظ سے ان پڑھ ہوگا اور) اس کے ظہور کی خبر وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا اور برائی سے روکے گا اور پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا اور گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا اور اس بوجھ سے نجات دے گا جس کے تلے وہ دبے ہوں گے اور ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے تو جو لوگ ان پر ایمان لائے اس کے مخالفوں کے لیے روک ہوئے (راہ حق میں) اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے ہوئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) سو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں (اے پیغمبر!) تم لوگوں سے کہو: اے افراد نسل انسانی! میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کی آسمانوں کی اور زمینوں کی بادشاہت اسی کے لیے ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی ایک ذات، وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول اور نبی اُمی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں) پر ایمان رکھتا ہے اس کی پیروی کرو تا کہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے۔“

اور تورات استثناء میں ہے:-

”اور یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) مرد خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔“

موسیٰ علیہ السلام نے یہ بشارت بھی بنی اسرائیل کو اپنی موت سے قبل ایسی حالت میں سنائی تھی کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی وداعی حالت کو

﴿اُمی لفظ اُم کی جانب منسوب ہے جس کے معنی ماں کے ہیں، اہل عرب یہ لفظ اس شخص کے لئے بولتے ہیں جس نے پڑھا لکھا نہ ہو گویا وہ ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے، اہل عرب چونکہ عام طور سے ان پڑھ تھے اس لئے اسمین کہلائے اور پیغمبر اسلام نے بھی چونکہ وحی الہی کے ذریعہ تعلیم و تربیت کے ماسوا دنیا کے اسباب تعلیم و تعلم کے لحاظ سے کسی کے سامنے زانو اے ادب تہہ نہیں کیا اس لئے ان کی صفت بھی اُمی رہی، آپ ﷺ نے خود بھی یہ

ارشاد فرمایا: ((نحن امه امیہ لانکتب ولا حسب))



دیکھ کر دل تنگ اور دل گیر ہو رہے تھے اور یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب خداوند خدا موسیٰ علیہ السلام جیسا کوئی پیغمبر مبعوث نہ کرے گا۔ سینا جو طور کے نام سے مشہور اور وادی سینا میں واقع ہے اور زبان حال سے شہادت دے رہا ہے کہ آگ کی جستجو کے بہانے موسیٰ علیہ السلام کو یہیں خدا سے ہم کلام کا شرف حاصل ہوا تھا اور ﴿كَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا﴾ کا مظاہرہ میرے ہی سینہ پر ہوتا رہا ہے اور شعیر (ساعیر یا سیراۃ) اس پہاڑی سلسلہ کا نام ہے جو عرب میں سب سے زیادہ طویل اور شام سے یمن تک شمالاً و جنوباً پھیلا ہوا ہے اور القدس (یروشلم) کے سامنے ہو کر گزرتا ہے، یہیں وہ جگہ ہے جو بیت اللحم کے نام سے آج بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت مبارک کی گواہ اور بعثت مسیح علیہ السلام کا مناد ہے اور فاران عبرانی (جرو) میں عرب کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو حجاز کے نام سے مشہور ہے یہی مقام اس وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی سرزمین) کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے جس کو مکہ کہتے ہیں اور جو بہت مشہور و معروف ہے اور مقام ولادت و بعثت ہے خاتم الانبیاء محمد ﷺ کا۔

اس تفصیل کے بعد پیشین گوئی کا مطلب واضح ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا خدائے برتر کی صداقت و ہدایت کا پیغام نور ہدایت بن کر سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شکل میں نمودار ہوا اور سیراۃ (شعیر) پر حضرت مسیح علیہ السلام کی صورت میں طلعت افروز ہوا اور فاران پر محمد ﷺ کا رخ انور بن کر جلوہ گر ہوا۔

فراعنہ کی طویل و مدید غلامی سے اس خانوادہ نبوت (بنی اسرائیل) کے قلوب میں یاس و حرمان نے ایسی جگہ کر لی تھی کہ اب ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس بنجر زمین پر خدا کی رحمت کی بارش ہوگی اور جا بہائے تاریک سے ”نور ہدایت“ اپنی نمود دکھلائے گا۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صدائے حق گویا نور ہدایت کی وہ نمود تھی جس نے صدیوں بعد پھر ان کے گھرانے پر رونمائی کی اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد اگرچہ بہت انبیاء علیہم السلام احيائے حق کے لیے مبعوث ہوئے مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے وجود گرامی نے جس شان و عظمت کے ساتھ اس درمیان کی پیدا شدہ اندھیاریوں کا پردہ چاک کر کے ہدایت و رشد کی روشنی چمکائی گویا وہ طلوع تھا اس نور ہدایت کا جو موسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ میں اپنی نمود دکھا چکا تھا اور جس کے ذریعہ آسمان ہدایت کے اُفق میں صبح سعادت نے شب ظلمت سے جھانکنا شروع کر دیا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ یہی نور ہدایت بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر جب بنی اسمعیل تک پہنچا تو خاتم الانبیاء محمد ﷺ میں اس طرح جلوہ گر ہوا کہ فاران کی چوٹیوں سے جب اس کی کرنیں کائنات کے چہار جانب پھیلیں تو تمام عالم انسانی کو روشن و منور بنا دیا اور ظلمت شرک و کفر کو مٹا کر نور توحید سے ہر گوشہ عالم کو تاباں و درخشاں کر دیا۔ چنانچہ تورات میں مذکور اس حقیقت کو قرآن عزیز نے اس سے زیادہ بہتر اور معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ ادا کیا ہے:

﴿وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونِ ۝ وَطُورِ سَيْنِينَ ۝ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝﴾ (التین: ۱-۶)

”شاہد ہے (وہ مقام جو مرکز ہے) انجیر و زیتون کے باغوں (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام ولادت ”بیت اللحم“) اور شاہد ہے طور سینا اور شاہد ہیں یہ بلد امین ”مکہ“ یقیناً ہم نے انسان کو بہترین مخلوق بنایا پھر اس کو انتہائی پستی میں پھینک دیا ماسواء



ان انسانوں کے جو ایمان لائے اور کام کیے نیک پس ان کے لیے اجر ہے بے منت (یعنی خدا کا فضل اور رضا اور جنت)۔

الواو للشهادة، واو کا استعمال شہادت کے لیے بھی ہوتا ہے عربیت کا مشہور قاعدہ ہے اور اس قسم کی شہادت اکثر ایسے مواقع کے لیے مخصوص ہے کہ متکلم جس حقیقت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے مختلف وجوہ کی بنا پر مخاطب کو اس کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے تب بعض بدیہی اور محسوس مثالیں دے کر مخاطب کے لیے اس حقیقت کا سمجھنا آسان بنا دیتا ہے۔ سورہ والتین کی آیات میں بھی صورت حال ایسی ہی ہے اس لیے کہ بتلانا یہ مقصود ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو بہترین مخلوق بنایا ہے اس کے باوجود اگر سچا خدا پرست اور نیک کردار نہیں ہے تو انجام کار وہ انتہائی پستی میں پھینک دیا جائے گا اور اس کی حقیقت چوپاؤں سے بھی بدتر ہو جائے گی ﴿أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلَّغْنَا مِنْهُمْ أَضْلًا﴾ مگر یہ کہ سچا خدا پرست اور نیک اعمال ثابت ہو تو پھر انسانیت کے بلند سے بلند درجہ کا مستحق اور بے حساب و بے منت خدا کی نعمتوں کا مستوجب ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات کافی تفکر و تدبر کی محتاج ہے۔ ایک ہستی تمام مخلوقات سے اپنی تخلیق و تکوین میں ”احسن“ بھی ہو اور پھر قعر مذلت کی گہرائیوں میں بھی پھینک دی جائے اس لیے بطور شہادت نہایت لطیف پیرایہ میں تین مشہور اور نمایاں دور ہدایت کا ذکر کر کے اس جانب توجہ دلانی کہ اگر تاریخ کا مقصد یہ ہے کہ ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر دیکھی جاسکے تو ان ہر سہ ادوار تاریخ کا مطالعہ کرو اور دیکھو کہ خدائے برتر نے کائنات کی رشد و ہدایت کا شرف ”انسان“ ہی کو بخشا اور پھر غور کرو کہ وہ بھی انسان ہی تھے جنہوں نے خدا کے پیغمبروں کی پیروی میں سچی خدا پرستی اور نیک عملی اختیار اور نتیجہ یہ نکلا کہ روز قیامت کے فیصلہ سے قبل بھی اسی دنیا میں انہوں نے عزت، شرافت، حکومت سب کچھ پایا اور آخرت کا اجر تو بے منت و بے حساب الگ رہا اور وہ بھی انسان ہی تھے جو سرکشی، بغاوت اور پیغمبرانہ تعلیم کے خلاف فساد انگیزی کی بدولت آخرت سے پہلے ہی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کے قعر ہائے مذلت سے دوچار ہوئے اور جہنم کے اسفل سافلین سے جو واسطہ آئندہ پڑنے والا ہے وہ جدا ہے۔ پس اگر ان حقائق کو پیش نظر رکھو گے اور تاریخ ماضی کے ان اوراق کو دیدہ عبرت سے دیکھو گے تو پھر تمہاری یہ حیرت، اعتراف حقیقت سے بدل جائے گی اور آئینہ عقل و فکر میں یہ سب کچھ روشن ہو جائے گا۔ تورات کی بشارت کے یہ الفاظ بھی خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں:

”وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں آتش شریعت ان کے لیے تھی۔“

قابل توجہ اس لیے ہے کہ جب ہم تاریخ کے اس واقعہ کا مطالعہ کرتے ہیں کہ رمضان ۸ ہجری مطابق جنوری ۶۳۰ء میں فتح مکہ کی غرض سے جب محمد ﷺ روانہ ہوئے ہیں تو دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم جلو میں تھے اور آتش شریعت یعنی ”جہاد بالسیف کا حکم الہی....“ ان کے ہاتھ میں تھی تو قدرت الہی کے اس اعجاز کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جس ذات برتر نے موسیٰ علیہ السلام کی لسان حق سے ان جملوں کو ادا کرایا۔ اسی نے محمد ﷺ کے حق میں اس کو کر دکھایا ﴿وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ تو کیا کسی حق پرست حق آگاہ کو ذرا سا بھی تامل ہو سکتا ہے کہ بلاشبہ موسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق خاتم الانبیاء محمد ﷺ ہی کی ذات گرامی ہے۔

تورات کی یہ اور اسی قسم کی دوسری بشارات ہیں جن کے پیش نظر بعثت محمد ﷺ سے صدیوں پہلے یہود کو نبی آخر الزماں کا انتظار تھا اور وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ اب وہ وقت دور نہیں ہے کہ نور ہدایت ”آفتاب عالمتاب“ بن کر جلوہ گر ہونے والا ہے، اسی لیے جب کبھی ان کے اور مشرکین کے درمیان جنگ پیش آ جاتی تو کہا کرتے تھے کہ وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ نبی آخر الزماں مبعوث ہوں



گے اور ہم ان پر ایمان لا کر ان کی قیادت میں تم سے حق و باطل کی جنگ کریں گے اور کامیاب ہوں گے۔ چنانچہ جب قومی اور نسلی تعصب اور بغض و حسد کی بناء پر انہوں نے آفتاب ہدایت کی روشنی سے منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کر لیں تو قرآن عزیز نے ان کو (یاد ایام) کے ساتھ ملزم و مجرم بناتے ہوئے یہ کہا:

﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۗ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ۗ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿۸۹﴾﴾ (البقرہ: ۸۹)

”چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کی ہدایت کے لیے ایک کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو پہلے سے ان کے پاس موجود ہے تو باوجودیکہ وہ (تورات کی پیشینگوئیوں کی بناء پر اس ظہور کے منتظر تھے، اور) کافروں کے مقابلہ میں اس کا نام لے کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آ گئی تو صاف انکار کر گئے اور مخالفت پر کمر باندھ لی پس ان لوگوں کے لیے جو دیدہ و دانستہ کفر کی راہ اختیار کریں اللہ کی لعنت ہے۔“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے ایک دفعہ قبیلہ غطفان اور یہود کے درمیان جنگ ہوئی تو خیبر کے یہود ان کے مقابلہ میں فتح و نصرت کے لیے یہ دعا مانگتے تھے۔\*

اللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِي وَعَدْتَنَا اَنْ تَخْرُجَهُ فِىْ اٰخِرِ الزَّمَانِ اِنْ نَصَرْتَنَا عَلَيْهِمْ.  
”خدا یا! ہم تجھ سے اس نبی اُمی کا واسطہ دے کر دعا مانگتے ہیں جس کے متعلق تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آخر الزماں ہوں گے۔“

اور علی ازدی سے منقول ہے کہ ”یثرب“ (مدینہ) کے یہود ہمارے مقابلہ کے وقت اکثر یہ دعا کرتے تھے:

اللّٰهُمَّ اِبْعَثْ هٰذَا النَّبِيَّ يَحْكُمُ بَيْنَنَا وَبَيْنَ النَّاسِ.

”خدا یا! اس نبی موعود کو مبعوث فرما جو ہمارے اور لوگوں (مشرکوں) کے درمیان حق کا فیصلہ کر دے۔“\*

اور عقبہ ثانیہ میں جب مدینہ کے ستر اشخاص آپ ﷺ سے دعوت اسلام کی حقیقت معلوم کرنے آئے اور آپ ﷺ نے ان پر حقیقت حال ظاہر فرمائی تو انہوں نے اسی وقت ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، بلاشبہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی بعثت سے متعلق ہم اکثر یہودی علماء سے سنا کرتے ہیں\* اور کیا اس تاریخی پہلو سے ان اقوال کی صداقت پر روشنی نہیں پڑتی کہ جب رومیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل کی آخری اور فیصلہ کن تباہی عمل میں آئی تو آخر شام، فلسطین، شرق اُردن یمن جیسے شاداب و زرخیز علاقوں کو چھوڑ کر وہ کون سی اہم وجہ تھی جس نے یہود کے نمایاں اور مشہور قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر (وغیرہ) کو یثرب اور نواح یثرب میں آباد ہونے کی ترغیب دی یقیناً صرف ایک ہی وجہ تھی اور وہ یہ کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد اپنے انبیاء کی بشارات میں یہ بھی سنا تھا کہ اس ”منتظر ہستی“ کا ظہور یثرب اور نواح یثرب میں ہوگا۔ مگر وائے بدبختی کہ قبول حق کا سب سے بڑا مانع ان کو یہ پیش آیا کہ



قومی، جماعتی اور نسلی حسد نے ان کو اس کی اطاعت سے باز رکھا۔ حتیٰ کہ جب انصار رضی اللہ عنہم میں سے بعض حضرات علماء یہود کے سامنے یہ کہہ گزرتے کہ ہم نے تو اس نبی امی پر ایمان لانے کی بات سب سے پہلے تمہاری ہی زبانی سنی تھی اور اس کے ظہور سے قبل تم ہی اس کے چرچے کیا کرتے اور ان کتابوں سے متعلق بشارات سنایا کرتے تھے پھر اب کیا ہوا کہ جب اس کا ظہور ہوا تو تم انکار کر بیٹھے تو وہ علانیہ جھوٹ بول دیتے اور کہتے کہ ہم کو یاد نہیں کہ کب ہم نے تم سے ایسی باتیں کہی تھیں۔\*

تورات کی طرح عہد نامہ جدید (اناجیل) میں بھی تحریف لفظی معنوی کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے متعلق یہ بشارات ملتی ہیں۔ متی کی انجیل میں ہے:

لیکن بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول ○ کیونکہ آسمان کی بادشاہت اس گھر کے مالک کی مانند ہے جو سویرے نکلاتا کہ اپنے انگری باغ میں مزدور لگائے اور اس نے مزدوروں سے ایک دینار روز ٹھہرا کر انہیں اپنے باغ میں بھیج دیا ○ پھر پہر دن چڑھے کے قریب نکل کر اس نے اوروں کو بازار میں بیکار کھڑے دیکھا ○ اور ان سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ جو واجب ہے تمہیں دوں گا پس وہ چلے گئے پھر اس نے دو پہر اور سہ پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا اور کوئی ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر اوروں کو کھڑا پایا اور ان سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بیکار کھڑے رہے ○ انہوں نے اس سے کہا اس لیے کہ کسی نے ہم کو مزدوری پر نہیں لگایا۔ اس نے ان سے کہا۔ تم بھی باغ میں چلے جاؤ۔ جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بلاؤ اور پچھلوں سے لے کر پہلوں تک انہیں مزدوری دے دو ○ جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہے لگائے گئے تھے تو انہیں ایک ایک دینار ملا جب پہلے مزدور آئے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ ہمیں زیادہ ملے گا اور ان کو بھی ایک ہی دینار ملا تو گھر کے مالک سے یہ شکایت کرنے لگے کہ ان پچھلوں نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور تو نے انہیں ہمارے برابر کر دیا جنہوں نے (ہم نے) دن بھر کا بوجھ اٹھایا اور سخت دھوپ سہی ○ اس نے جواب دے کر ان میں سے ایک سے کہا: ”میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا، کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھہرا تھا جو تیرا ہے اٹھالے اور چلا جا، میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تجھے دیتا ہوں اس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں ○ کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں سو کروں؟ یا تو اس لیے کہ میں نیک ہوں بری نظر سے دیکھتا ہے ○ اس طرح آخر، اول ہو جائیں گے اور اول آخر ○

اس بشارت میں حضرت مسیح علیہ السلام نے مثالی رنگ میں اقوام و امم عالم کی عملی زندگی اور خدا کی جانب سے ان پر اجر و ثواب کا مرقع پیش فرمایا ہے پہلے مزدور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل کی دنیا کے لوگ ہیں اور دوسری جماعت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت بنی اسرائیل مراد ہیں۔ تیسرا گروہ نصاریٰ ہیں اور چوتھی جماعت خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی امت ہے، کائنات ارضی کی عمر کے لحاظ سے پہلی، دوسری اور تیسری جماعت کے مقابلہ میں محمد ﷺ کی امت کا زمانہ حیات یوں سمجھئے گویا دن کا آخری حصہ ہے اور اجر و ثواب میں اس آخری امت کو پہلی امتوں کے مقابلہ میں برابر کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے یہاں ان کو دوسری تمام امتوں پر برتری حاصل ہے اس لیے کہ اگرچہ ان کا وجود حیات امتوں کے آخر میں ہوا ہے لیکن چونکہ یہ خدا کے آخری پیغام ”قرآن“ کی حامل اور ”سرخیل انبیاء و



رسول کی امت ہیں اور تمام امتوں سے ان کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کا وعدہ و میثاق لیا گیا ہے۔ لہذا حیات دنیا کے لحاظ سے گو ان کا زمانہ آخر ہے مگر مرتبہ اور عظمت کے اعتبار سے وہ سب سے اول ہیں۔ یہی ہے مراد بشارت کے پہلے اور آخری جملہ کی یعنی ”بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول اور اس طرح آخر اول ہو جائیں گے اور اول آخر۔“

نبی آخر الزماں ﷺ نے بھی ٹھیک اسی طرح ایک مثال بیان فرمائی ہے جو بخاری میں منقول ہے: ”دوسری امتوں کے مقابلہ میں دنیا کے اندر تمہاری مثال ایسی ہے جیسا کہ دن کے طویل عرصہ میں عصر (شام) سے غروب آفتاب کے وقت کی، اہل تورات (یہود) کو تورات عطا کی گئی اور انہوں نے اس پر عمل کیا حتیٰ کہ وہ دوپہر ڈھلے عاجز رہ گئے (یعنی خدا کی تعلیم حق کو فراموش کر بیٹھے) تب ان کو مالک نے ایک قیراط مزدوری دے دی اور پھر اہل انجیل (نصاری) کو کام پر لگایا اور انہوں نے دوپہر ڈھلے سے عصر (شام) تک کام کیا اور پھر وہ بھی عاجز رہ گئے تب ان کو بھی مالک نے ایک ایک قیراط مزدوری دے دی، آخر میں ہم کو قرآن ملا اور ہم نے دنیا کی زندگی کے دن غروب ہونے تک کام کیا۔ تب مالک نے ہم کو دو دو قیراط عطا کیے اس پر پہلوں نے شکایت کی کہ ہم نے زیادہ محنت کی مگر تو نے ان کو اور ہم کو برابر کر دیا۔ مالک نے کہا میں نے تمہاری مزدوری میں سے تو کم نہیں کیا۔ تب مالک نے فرمایا: تو پھر میری یہ مرضی ہے کہ میں اپنے پاس سے جس کو چاہوں (مزدوری کی کیفیت و نوعیت کے فرق اور کام کی صلاحیت و استعداد کے پیش نظر) زیادہ دوں۔ فہو فضل او تہ من اشاء

اور ام ماضیہ واقوام سابقہ کے مقابلہ میں امت محمدیہ کی یہی فضیلت ہے جس کو قرآن نے بصراحت اس معجزانہ اسلوب میں

بیان کیا ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

”تم (تمام ام و اقوام میں) بہترین امت ہو جو کائنات انسانی (کی خدمت) کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے باز رکھتے ہو۔“

بہر حال آخری جماعت کا اول ہو جانا اگر اس کا مصداق امت محمد ﷺ نہیں تو اور کون ہے جس کا ذکر تورات کی ان بشارات میں ہو رہا ہے اور جس کی تصدیق ”نبی امی“ اور قرآن دونوں کر رہے ہیں، عقلاً بھی یہ فرق مراتب واضح ہے اس لیے کہ جبکہ محمد ﷺ تمام انبیاء و رسل کے بعد مبعوث ہوئے اور آپ ﷺ کے قبول کرنے والوں میں آپ ﷺ کی قوم سے بھی زیادہ دنیا کی دوسری اقوام و امم کے افراد شامل ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی فرد یا جماعت پہلے سے کسی مذہبی جماعت میں شامل ہے تو اس کے لیے جدید دعوت حق کو قبول کرنے میں قومی، جماعتی اور نسلی عصبیت و غرور سب سے بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آ جاتا ہے۔ پس جو شخص اس رکاوٹ کو پاؤں تلے روند کر دعوت حق پر ”لبیک“ کہتا ہے وہ بلاشبہ اس کا مستحق ہے کہ اپنے اپنے زمانہ میں پہلی صدائقوں پر ایمان لانے والوں کے مقابلہ میں اس کو دو چند بلکہ چند در چند اجر و ثواب عطا ہو۔

اور انجیل یوحنا میں ایک بشارت اس طرح مسطور ہے:

”اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے ”کاہن“ اور ”لیوی“ یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے تو



اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں انہوں نے اس سے پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے اس نے جواب دیا نہیں پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو کون ہے تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟\*

اس پیشین گوئی کا تاریخی زمانہ وہ ہے جب حضرت یحییٰ (یوحنا علیہ السلام) اپنی صدائے حق سے بنی اسرائیل کو مسحور کر رہے تھے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اس وقت یہود کے مقدسین کی ایک جماعت ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے یہ سوالات کیے۔

سوالات میں تین پیغمبروں کے متعلق ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ ان میں سے کون ہیں مگر انہوں نے انکار کیا وہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں ہیں تو یہ سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ یہود تین یا دو پیغمبروں کے ظہور کے منتظر تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے، حضرت ایلیاہ کے اور ایک ایسے پیغمبر کے جس کا ذکر ان کے درمیان اس درجہ مشہور تھا کہ انہوں نے سوالات کے وقت دو ناموں کی طرح نام لینا ضروری نہیں سمجھا اور صرف ”وہ نبی“ کہنا ہی کافی خیال کیا۔

یہ بشارت اس درجہ واضح اور صاف ہے کہ نصاریٰ بجز بے دلیل انکار کے تاریخ کے اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ اگر محمد ﷺ ”وہ نبی“ کا مصداق نہیں ہیں تو پھر کون ہے۔ کیا معاملہ کی صورت یہ نہیں ہے کہ جس طرح یہود ظہور مسیح علیہ السلام کے منتظر تھے مگر ان کی آمد پر ازراہ حسد ان کو رد کر دیا، اسی طرح یہود و نصاریٰ دونوں ”وہ نبی“ کی شہرت عام کے پیش نظر اس کے ظہور کے سخت منتظر ہونے کے باوجود اس کی بعثت و ظہور کے نسلی و قومی عصبیت کی بدولت منکر ہو گئے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (البقرہ: ۱۴۶)

”وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ تم کو اس طرح ”پیغمبر حق“ پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بلاشبہ ان میں سے ایک فریق حق کو چھپاتا ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ حق کو چھپا رہے ہیں۔“

یوحنا کی انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی وصیت بھی محمد ﷺ کی بشارت کے لیے شاہد عدل ہے، فرماتے ہیں:

”تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے؟ بلکہ اس لیے کہ میں نے یہ باتیں تم سے کہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے

\* باب ۱۶ آیات ۱۹-۲۲

\* یوحنا عبرانی میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا نام ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری کا نام بھی ہے جن کی جانب یوحنا منسوب ہے۔

\* کہا جاتا ہے کہ کتب قدیمہ میں ایلیاہ بھی محمد ﷺ کی صفت منقول تھی اور اس لیے خواص علماء یہود ایلیاہ اور فارقلیط کو ایک ہی تسلیم کرتے تھے مگر بعد کی تحریفات کی بدولت ایک اور ”منتظر ہستی“ کا اضافہ ہو گیا اور وہ الیاس علیہ السلام ہیں۔ یہود نے اب یہ گھڑ لیا کہ حضرت الیاس علیہ السلام کا دوبارہ ظہور ہوگا اور اس کے لیے اناجیل میں بھی دو کی جگہ تین کے ظہور کا ذکر نظر آتا ہے۔



پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راست بازی سے اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا۔

یہ بشارت حضرت مسیح علیہ السلام کی وصیت ہے اور تمثیلی استعاروں اور تشبیہوں کی بجائے واضح الفاظ میں ایک ”موعود پیغمبر“ کی خبر دیتی ہے اور موعود ہستی کی جن صفات کا اس میں ذکر ہے وہ حرف بحرف خاتم الانبیاء محمد ﷺ پر صادق آتی ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام حواریوں اور شاگردوں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ ان کی جدائی سے کس درجہ متاثر ہیں دل غم سے بھرے ہوئے ہیں آنکھیں پر نم ہیں، حسرت و یاس چہرے سے ٹپک رہی ہے کیوں؟ کیا اس لیے کہ ایک انسان ان سے جدا ہو رہا ہے نہیں، نہیں بلکہ خدا کا ایک ہادی، نبی و رسول، پیغمبر صداقت کی وداعی گھڑیاں قریب ہیں اور اب نہیں کہا جاسکتا کہ دنیا ایسی مقدس ہستیوں سے بہرہ ور ہوگی یا نہیں کیونکہ منکروں اور باطل پرستوں نے خدا کی اس نعمت کی کوئی قدر نہ کی اور اس کو رد کر دیا۔ اس غم آگیز منظر میں حضرت مسیح علیہ السلام ان کو تسلی و تشفی دیتے اور یقین دلاتے ہیں کہ ”میرا جانا تمہارے لیے ”فائدہ مند“ ہے“ اور پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”اگر میں نہ جاؤں تو وہ ”مددگار“ تمہارے پاس نہ آئے گا“ یعنی میرا کائنات ارضی پر یہ قیام اس ”مددگار“ کی آمد کے لیے تاخیر کا باعث ہو رہا ہے جس کا آنا تمہارے لیے اس درجہ مفید ہے کہ بایں محبت و خلوص میرا جانا ہی تمہارے لیے فائدہ مند ہے“ پھر اس کی معرفت کے لیے مزید باتیں بیان فرمائیں کہ وہ دنیا کو گناہوں (برائیوں) سے باز رکھے گا راست بازی کا حکم کرے گا اور افراط و تفریط کی ان روشوں کے خلاف جو انسانی دنیا کے ہر معاملہ میں رگ و ریشہ کی طرح پھیلی ہوں گی ”عدل“ سے گریز پر مجرم اور قصور وار ٹھہرائے گا۔

قدرتی طور پر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ہستی کون ہے جو ان مجموعہ صفات کا مصداق بن سکے۔ علماء نصاریٰ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ”روح القدس“ ہے اور وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے قبر میں جی اٹھنے اور آسمان پر باپ کے پاس چلے جانے کے بعد شاگردوں پر نمودار ہوئی لیکن جب اس باطل تاویل پر ان سے یہ کہا گیا کہ ماضی یا مستقبل میں کون سا زمانہ آچکا ہے یا آئے گا جس پر بشارت کا یہ جملہ صادق آسکے جو دراصل پوری وصیت کی روح ہے ”وہ آ کر دنیا کو گناہ سے اور راست بازی سے اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا“ اور کس طرح یہ عبارت صرف اس نور پر صادق آسکتی ہے جو شاگردوں پر (روح القدس) ایک کبوتر کی شکل میں نازل ہو کر دکھلائی گئی۔

یہ وصیت تو اس تاویل کے برعکس صاف یہ ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ایک ایسے عظیم المرتبہ، جلیل القدر پیغمبر کے ظہور کی بشارت سن رہے ہیں جس کی آمد کائنات انسانی کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کی موجودگی سے بھی زیادہ سود مند ثابت ہوگی اور جو ایک مرتبہ پھر کائنات کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلائے گی اور اس کی تعلیم حق کا معیار سرتاسر ”عدل“ پر مبنی ہوگا کہ یہی تمام اخلاق کریمانہ اور شعبہ حیات کے لیے اساس اور بنیاد کار ہے اور اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے جب ہم تاریخی مذاہب سے دریافت کرتے ہیں کہ اس کا مصداق کون ہے تو اس کے ماسواء اور کوئی جواب نہیں ملتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد وصیت میں مذکور اوصاف کی مصداق ہستی محمد ﷺ کے ماسواء کوئی ظہور میں نہیں آئی۔ یہی مقدس ہستی ہے جس نے ایسے زمانہ میں جبکہ دنیا کی قوموں اور ان کی سوسائٹیوں میں



”عدل“ ایک بے معنی شے رہ گئی تھی اور جب کہ سچی نیک عملی اور خدا پرستی، قومی اور اجتماعی زندگی سے خارج ہو چکی تھی دنیا انسان کو یہ پیغام سنایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَائِي ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبُغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (النحل: ۹۰)

”بیشک اللہ حکم دیتا ہے ”عدل“ کا ”احسان“ کا قرابت داروں کے ساتھ سلوک کا اور یقیناً منع کرتا ہے فحش کاموں اور باتوں سے۔ اور بغاوت و سرکشی سے وہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔“ اور یہی وہ مقدس ہستی ہے جس کے ظہور کی بدولت اس کی امت کا مقصد حیات یہ ظاہر کیا گیا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

”(اے امت محمد ﷺ) تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی خدمت) کے لیے عالم وجود میں لائی گئی ہے تم لوگوں کو بھلائی اور نیکیوں کا حکم کرتے اور ان کو برائیوں سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہو۔“

مضمون وصیت کے اس نمایاں پہلو کے ماسواء ایک اور روشن اور واضح بات اس وصیت یا بشارت میں وہ جملہ ہے جس میں موعود ہستی کو ایک خاص وصف کے ساتھ یاد کیا گیا ہے یہ وصف اگرچہ جدید ایڈیشنوں میں ”مددگار“۔ ”ویل“۔ ”معزی“ اور ”شفیع“ ہے، لیکن قدیم یونان، فرنج، لیٹن اور انگریزی تراجم میں ”پیرا کلیوتاس“ اور عبرانی (جبرو) اور عربی تراجم میں ”فارقلیط“ پایا جاتا ہے جو عربی لفظ احمد کے ہم معنی اور مرادف ہے۔

یہ بات تو علماء نصاریٰ اور ہر ایک تاریخ دان کے نزدیک متفق علیہ اور مسلم ہے کہ موجودہ اناجیل میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل انجیل نہیں ہے بلکہ جن ناموں سے یہ منسوب ہیں ان کے بھی اصل نسخے نہیں بلکہ تراجم ہیں اور یہ کہ مسیح علیہ السلام کی انجیل کا اور یجنل (اصل) نسخہ قدیم جبرو (عبرانی) زبان میں تھا اس لیے یہ دعویٰ بسہولت کیا جاسکتا ہے کہ اور یجنل نسخہ میں یہ لفظ بلاشبہ احمد ہی ہوگا۔ جیسا کہ سورہ صف میں قرآن عزیز نے حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے:

﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ (الصف: ۶)

اور دلیل یہ ہے کہ موجودہ انجیل کے تراجم میں فارقلیط اسی لفظ احمد کا ہم معنی اور مرادف لفظ اختیار کیا گیا مگر جب علماء نصاریٰ نے یہ دیکھا کہ صداقت خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے لیے کتاب مقدس سے بصراحت تام بہت بڑی دلیل ہاتھ آئی اور علماء اسلام کی جانب سے ہم پر قوی حجت قائم ہوئی جاتی ہے تو بعد کے ایڈیشنوں میں لفظ فارقلیط یا پیرا کلیوتاس نکال دیا گیا اور اب اس کی جگہ کبھی ناصر (مددگار) کبھی ویل، کبھی شفیع اور کبھی معزی (تسلی دینے والا) لکھا جانے لگا تاکہ واضح نام کی بجائے ایک ایسی صفت آجائے جس کا اطلاق بغیر کسی تعیین کے ہر ایک ذات حق پر ہو سکے۔ اناجیل کے قدیم و جدید نسخوں اور پھر قدیم و جدید کے مختلف ایڈیشنوں میں لفظ فارقلیط اور اسی قسم کی دوسری گونا گوں تحریفات کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لیے میزان الحق اور الفارق کا مطالعہ از بس مفید ہے یہاں



حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ اناجیل کے عربی تراجم میں مسطورہ بالا الفاظ کی بجائے فارقلیط تھا صرف یہ ایک ثبوت کافی ہے۔ ایک صدی قبل کے عربی نسخہ میں جو لندن سے ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا تھا یہ لفظ یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶ میں موجود تھا "والہلب من اب فیعطیکم فارقلیطا اخر۔"

تاہم علماء نصاریٰ کی اس واضح تحریف کے بعد بھی ان کا مقصد حل نہیں ہو سکتا اور ایک مرتبہ ان سے پھر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اس بشارت میں لفظ فارقلیط (احمد) کی جگہ مسطورہ بالا الفاظ میں سے ہی کوئی لفظ سہی مگر جبکہ اس بشارت کا مصداق روح القدس کا کبوتر کی شکل میں شاگردوں پر نمودار ہو جانا کسی طرح نہیں بنتا تو پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد تاریخ ادیان میں وہ کون سی سستی ہے جس کو اس کا مصداق سمجھا جائے۔ کیا علماء نصاریٰ اس بے دلیل انکار کے ساتھ کہ اس کا مصداق ذات اقدس محمد ﷺ نہیں ہیں جرات کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں ہستی اس مجموعہ صفات کا مصداق تھی یا آج ہے یا آئندہ آئے گی۔ نہیں وہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان کے پاس اس انکار کے لیے صرف یہی ایک مثبت دلیل ہے کہ روح القدس اس کا مصداق ہے کاش کہ وہ قدرت بھی رکھتے کہ روح القدس کو انسانی شکل میں کائنات کی ہدایت کے لیے لاسکتے کہ وہ پیغمبرانہ صداقت کے ساتھ لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتی برائیوں سے روکتی اور عدل ترک کر کے افراط و تفریط کی راہ بد اختیار کرنے پر لوگوں کو قصور وار ٹھہراتی تب شاید ان کا یہ قول الفاظ بشارت کی مطابقت کر سکتا ورنہ تو یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس بشارت کو ذات اقدس ﷺ کے حق میں تسلیم نہ کرنا صرف نسلی، قومی اور جماعتی گروہ بندی سے پیدا شدہ عصبیت و حسد کا نتیجہ ہے۔

اس سے قطع نظر ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی انجیل میں احمد (فارقلیط) کی بجائے مسطورہ بالا الفاظ ہی میں سے کوئی لفظ تھا تب بھی اس کا مصداق خاتم الانبیاء ﷺ کے ماسوا کوئی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ قرآن عزیز نے مختلف مقامات پر نبی اکرم ﷺ کے جو اوصاف حمیدہ بیان کیے ہیں وہ ان ہی مسطورہ بالا الفاظ کے ہم معنی ہیں مثلاً سورہ توبہ میں آپ ﷺ کو عزیز، رؤف، رحیم کہا گیا ہے:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۱۲۹﴾﴾ (التوبہ: ۱۲۸-۱۲۹)

"(ایمان والو!) تمہارے پاس (اللہ کا) ایک رسول آ گیا ہے جو تم ہی میں سے ہے تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے وہ ایمان والوں کے لیے شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے (اے پیغمبر!) اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو میرے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اس کی ذات، میں نے اس پر بھروسہ کیا وہ تمام عالم ہستی کی جہانداری کے عرش عظیم کا خداوند ہے۔"

اور سورہ انبیاء میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿۱۰۷﴾﴾ (الانبیاء: ۱۰۷)



”اور ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا مگر جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر۔“

اور اگر صحیح احادیث کی تصریحات کو بھی ان آیات کی تفسیر کے طور پر شامل کر لیا جائے تب تو اناجیل کے تراجم میں مذکورہ اوصاف بعینہ آپ کو مل جائیں گے مثلاً الشافع المشفع الشفیع، الناصر (مددگار) وغیرہ۔

پھر اسی باب کی آیت ۱۳ کو اس مضمون کے ساتھ اگر ملائیے تو معاملہ اور زیادہ واضح اور صاف ہو جائے گا حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں:

”لیکن جب وہ سچائی کی روح آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔“

غور فرمائیے کیا یہ مضمون ”روح القدس“ پر صادق آ سکتا ہے جس نے چند شاگردوں پر ظاہر ہو کر اپنی نمود دکھلائی یا ایسی ہستی پر جو لوازم بشریت سے متصف ہونے کے باوجود کائنات انسانی میں رہ کر سچائی کی راہ دکھلائے اور امور غیب سے متعلق خدا نے جو کچھ بتلایا ہے (علامات قیامت، جنت و جہنم، حشر و نشر وغیرہ کی تفصیلات) اس کو مخلوق خدا تک پہنچانے اور پھر معلوم کرو تاریخ ماضی سے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد محمد ﷺ کے علاوہ کون آیا جس نے خدا سے بھلے ہوئے انسانوں کا رشتہ دوبارہ خدا سے ملایا اور ادیان و ملل کی گم شدہ صداقتوں کو قرآن کے ذریعہ روشن و نمایاں کیا، کیا موافق و مخالف دونوں شہادتیں اس پر متفق نہیں ہیں کہ اس کی قوم دوست و دشمن سب ہی اس کو ”الصادق الامین“ کہہ کر پکارتے تھے اور کیا انجیل کا یہ فقرہ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا اور قرآن کی یہ آیت ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۗ﴾ وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، جو کچھ کہتا ہے اس وحی سے کہتا ہے جو خدا کی جانب سے اتاری جاتی ہے، ایک ہی مقدس ہستی کی تقدیس حیات اور صداقت قول و عمل کے دو عکس نہیں ہیں پس سچائی کی روح میں لفظ ”روح“ سے فائدہ اٹھا کر اور بقیہ تمام مضمون بشارت سے آنکھ بند کر کے اس کو ”روح القدس“ کہہ دینا علمی دیانت ہے؟ ہرگز نہیں۔

غرض وصیت یا بشارت حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب سے واضح اور صاف اعلان ہے۔ ظہور قدسی صفات ﷺ کا اور اس کا انکار بداہت کا انکار اور تعصب بیجا کی دلیل ﴿بشارات النبی ﷺ﴾ کا یہ باب بہت وسیع ہے اور چھٹی صدی ہجرت میں ایک مسیحی عالم سعید بن حسن اسکندرانی نے جب کتاب مقدس میں ان بشارات کو دیکھ کر اسلام قبول کیا تو محیط النظر ایک مستقل کتاب اسی موضوع پر تصنیف کی اور ہمیشہ سے علماء اسلام بھی اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ لکھتے رہے ہیں حتیٰ کہ بعض علماء نے ہندوؤں کی قدیم کتابوں اور مجوس کے قدیم نوشتوں میں بھی ”منتظر ہستی“ سے متعلق جو کچھ مذکور ہے اس کو بشارات النبی ﷺ میں شامل کیا ہے مگر ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہوئے قرآن عزیز کی ان آیات پر اس مضمون کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جو نزول قرآن کے وقت سے یہود و نصاریٰ کے سامنے برابر اعلان کرتی رہی ہیں کہ قدیم سماوی کتابوں میں اس مقدس پیغمبر کا تذکرہ برابر رہا ہے اور چونکہ خدا کی تقدیر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کا آخری اور کامل و مکمل قانون اسی ذات اقدس ﷺ کے ہاتھوں کائنات ہست و بود تک پہنچے گا۔ اس لیے از بس ضروری

﴿ اس پیشینگوئی میں فارقلیط سے مفصل محققانہ بحث کے لیے میزان الحق از مولانا رحمت اللہ (نور اللہ مرقدہ) الفارق، ہدایۃ الحیاری اور رسالہ تہذیب الاخلاق مضمون فارقلیط قابل مراجعت ہیں۔



تھا کہ اس کا ذکر پہلے نوشتوں میں ہوتا کہ جب اس کے ظہور کا وقت آ پہنچے تو تمام صادق ادیان و ملل سے متعلق امتیں میثاق الہی کے مطابق اس پر ایمان لائیں اور اس کی پیش کردہ صداقت اور قانون ہدایت ”قرآن“ کو اپنے لیے راہ عمل بنائیں۔ چنانچہ سورہ الفتح میں ارشاد ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۗ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ ۗ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ۗ﴾ (الفتح: ۲۹)

”محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ (صحابہ رضی اللہ عنہم) ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم خو ہیں۔ (اے مخاطب!) تو ان کو دیکھے گا (خدا کے سامنے) جھکنے والے سجدہ کرنے والے اور اس طریقہ سے خدا کے فضل اور اس کی رضا کے خواہش مند ہیں ان کی نشانی یہ ہے کہ ان کے چہروں (پیشانیوں) پر سجدے کے نشانات ہیں، تورات اور انجیل میں ان کا ذکر اسی طرح ہے۔“

یہ ذکر انجیل برنایا میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور آپ ﷺ کی صفات بہت نمایاں الفاظ میں مذکور ہیں لیکن وہ نصاریٰ کے نزدیک متروک ہے مگر جیسا کہ سابق میں کہا جا چکا ہے اس کا ترک کسی دلیل پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ اور بعض دوسری اناجیل کا ترک محض ایک فال کی بناء پر ہوا جو اسی غرض سے نکالی گئی تھی۔ اور سورہ شعراء میں ہے:

﴿وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۗ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۗ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۗ مَلِيحًا لِّقَوْمٍ كَافِرِينَ ۗ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ۗ﴾ (الشعراء: ۱۹۲-۱۹۶)

”اور یقیناً یہ (قرآن) جہانوں کے پروردگار کا اتارا ہوا ہے، اس کو روح الامین (جبرئیل علیہ السلام) نے (خدا کی جانب سے) تیرے قلب پر نازل کیا تاکہ تو (خدا کے نافرمانوں کو) ڈرانے والوں میں سے ہو یہ صاف عربی زبان میں ہے اور اس کا ذکر پہلوں (گذشتہ پیغمبروں) کی کتابوں میں ہے۔“  
اور ایک مرتبہ خود نبی اکرم ﷺ نے انہی بشارات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:  
(دعوة ابی ابراہیم و بشای عیسیٰ))۔

”(یعنی) میں اپنے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا ہوں اور عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کی بشارت ہوں (یعنی) دعاء خلیل اور نوید مسیحا۔“  
قرآن عزیز نے دعا ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اس طرح کیا ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ ۗ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۗ﴾ (البقرہ: ۱۲۹)

”اے ہمارے پروردگار! ان (اہل عرب) ہی میں سے ایک رسول بھیج، جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب اور



حکمت سکھائے اور ان کو (ہر قسم کی برائیوں سے) پاک کرے بے شبہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔“  
اور بشارت مسیح علیہ السلام کا ذکر سورہ صف میں اس طرح منقول ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَبْنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيِّ  
مِنَ التَّوْرَةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلِ يَّآتِيْٓ مِنْۢ بَعْدِي اَسْمٰٓءُ اَحْمَدُ ۗ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْٓا  
هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٦﴾﴾ (الصف: ۶)

”اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب عیسیٰ ابن مریم (ﷺ) نے کہا: ”اے بنی اسرائیل! میں تمہاری جانب اللہ کا رسول  
(اپنی) ہوں تصدیق کرنے والا ہوں توراہ کی جو میرے سامنے موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو  
میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد (فارقلیط) ہوگا پس جب ان کے پاس وہ (خدا کا پیغمبر) دلائل لے کر آیا تو یہ کہنے  
لگے یہ تو کھلا جادو ہے۔“

### صبح سعادت:

تاریخ ادیان و ملل شاہد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور پر تقریباً چھ صدیاں گزر چکی ہیں اور معمورہ عالم خدا کے پیغمبروں  
کی معرفت حاصل کی ہوئی صداقت حق کو فراموش کر چکا ہے تمام کائنات انسانی خدا پرستی کی بجائے مظاہر پرستی میں مبتلا ہے اور ہر ملک  
میں نوع انسانی سے لے کر نوع جمادات تک کی پرستش سرمایہ نازش بنی ہوئی ہے۔ کوئی انسان کو ادتار (خدا) کہہ رہا ہے تو کوئی خدا کا  
بیٹا۔ ایک اگر مادہ پرست ہے تو دوسرا خود اپنی آتما (روح) کو ہی خدا سمجھ رہا ہے۔ سورج کی پوجا ہے، چاند اور تاروں کی پرستش ہے،  
حیوانوں، درختوں اور پتھروں کی عبادت ہے، آگ، پانی، ہوا، مٹی کے سامنے ناصیہ فرسائی ہے غرض کائنات کی ہر شے پرستش اور  
پوجا کے لائق ہے اور نہیں ہے تو صرف ذات واحد قابل پرستش نہیں ہے نہ اس کی احدیت کا تصور خالص ہے اور نہ صمدیت کا۔ اس کو  
اگر مانا بھی جاتا ہے تو دوسروں کی پرستش اور عبادت کے ذریعہ وہ اگر خالق موجودات ہے تو دوسروں کے واسطے اور احتیاج کے ساتھ  
مادہ، روح اور ترکیب سب ہی باتوں کا محتاج ہے وہ اگر مالک موجودات ہے بھی تو انسان، حیوان، درخت، پتھر کے بل بوتہ پر، غرض  
ساری دنیا میں اصل کارفرمائی مظاہر کی تھی اور ”ذات حق“ صرف نام کے لیے، حقیقت سے چشم پوشی تھی مگر مجاز کے ساتھ ذوق عشق،  
ذات حق سے بعد تھا مگر، مظاہر سے قربت سرمایہ، سعادت، خالق سے بیگانگی تھی مگر مخلوقات کی عبادت گزار شیعار عام تھا اور ہر طرف

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾

”ہم ان کو نہیں پوجتے مگر اس لیے تاکہ وہ خدا کی جانب ہماری قربت کا ذریعہ بن جائیں۔“ کا مظاہرہ نظر آتا تھا۔

یہی وہ تاریک دور تھا جس میں ”سنت اللہ“ یعنی خدا کے قانون ہدایت و ضلالت نے ماضی کی تاریخ کو پھر دہرایا اور غیرت  
حق نے فطرت کے قانون رد عمل (Reaction) کو حرکت دی یعنی آفتاب ہدایت برج سعادت سے نمودار ہوا اور چہار جانب چھائی  
ہوئی شرک و جہالت اور رسم و رواج کی تاریکیوں کو فنا کر کے عالم ہست و بود کو علم و یقین کی روشنی سے منور کر دیا۔



۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کی صبح، وہ صبح سعادت تھی جب مدینت و حضارت سے محروم، بن کھیتی کی سرزمین مکہ کے ایک معزز قبیلہ قریش (بنی ہاشم) میں عبداللہ بن عبدالمطلب کے یہاں آمنہ بنت وہب کے مشکوے معلیٰ سے آفتاب رسالت محمد ﷺ نے ظہور کیا۔

خدایا! صبح کیسی سعادت افروز تھی جس نے کائنات ارضی کو رشد و ہدایت کے طلوع کا مژدہ جانفزا سنایا اور وہ ساعت کیسی مبارک و محمود تھی جو معمورہ عالم کے لیے پیغام بشارت بنی، عالم کا ذرہ ذرہ زبان حال سے نغمے گا رہا تھا کہ وقت آ پہنچا کہ اب دنیا ہست و بود کی شقاوت دور اور سعادت مجسم سے عالم معمور ہو، ظلمت شرک و کفر کا پردہ چاک ہو اور آفتاب ہدایت روشن ہوتا بناک ہو۔ مظاہر پرستی باطل ٹھہرے اور خدائے واحد کی توحید مقصد حیات قرار پائے۔

دنیا تو کیا ملک، قبیلہ اور خاندان کو بھی یہ علم نہ تھا کہ مذاہب عالم جس آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کے منتظر ہیں وہ اس غیر متمدن سرزمین اور عبدالمطلب کے گھرانے سے جلوہ گر ہوگا کہ اس کی ولادت باسعادت کو خاص اہمیت دیتے اور تاریخ ولادت کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتے مگر جس خالق کائنات کے نوشتہ تقدیر نے اس کو مقدس ہستی بنانے کا فیصلہ کیا۔ اسی کے ید قدرت نے ولادت باسعادت کے لیے ایک معجزانہ تاریخی نشان بھی ظاہر کر دیا اور وہ اصحاب الفیل کا واقعہ تھا۔

معتبر اور مستند روایات شاہد ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی ولادت اس واقعہ سے چند ماہ بعد ہوئی۔

یہ واقعہ جن خصوصیات کا حامل ہے ان کے پیش نظر یہ عرب کے لیے عموماً اور اہل حجاز کے لیے خصوصاً نہایت عجیب اور حیرت زا تھا۔ اور اس لیے وہ کبھی اس کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس کا نام ہی عام الفیل (یعنی ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا۔ مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ دراصل یہ واقعہ ایک (نشان) ہے اس جلیل القدر ہستی کے ظہور کا جو ایک روز تمام معمورہ انسانی کو مرکز توحید اور قبلہ ابراہیمی پر جمع کر دے گی اور اس کو غیر اللہ (بتوں) کی آلودگیوں سے پاک کر کے توحید الہی کے نغموں کے لیے مخصوص کرائے گی۔ کیونکہ یہی وہ پہلا مقام ہے جو صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا گیا۔ یہ مندر نہیں تھا کہ مورتی کی پوجا کی جائے، یہ گرجا اور کلیسا بھی نہ تھا کہ یسوع مسیح علیہ السلام اور کنواری مریم علیہا السلام کے مجسموں کے سامنے سر جھکا یا جائے نہ یہ آتش کدہ تھا آگ کو نور کا مظہور قرار دے کر اس کی پرستش کی جائے اور نہ یہ صلوات یہود تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا کر اس کی تقدیس کے نغمے گائے جائیں بلکہ یہ تو خدا اور صرف ایک خدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا:

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبْرَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ﴿۶۷﴾﴾ (آل عمران: ۹۶)

غرض بعثت کے بعد جب قدرت کے اعجاز نما ہاتھوں نے عام الفیل میں آپ ﷺ کی ولادت کا راز سربستہ آشکارا کر دیا تب دنیا نے یہ سمجھا کہ ابرہہ الاشرام اور اس کے لشکر سے کعبۃ اللہ کی یہ حفاظت اس لیے تھی کہ وہ وقت قریب آ پہنچا جب دوبارہ یہ مقدس مقام خدائے واحد کی عبادت اور توحید خالص کی مرکزیت کا شرف حاصل کرنے والا ہے پس جو طاقت بھی اس مقصد عظیم سے متصادم ہوگی خود ہی پاش پاش ہو کر رہ جائے گی۔

واقعہ کی تفصیلات قصص القرآن ج ۳ میں گزر چکیں۔



ابرہہ عیسائی تھا اور اہل عرب (قریش) مشرک، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ابرہہ اور اس کے لشکر کی بربادی قریش کی نصرت و حمایت کے لیے تھی، نہیں! بلکہ اس لیے سب کچھ ہوا کہ مشیت الہی کے خلاف ابرہہ کی خواہش تھی کہ یمن (صنعا) میں جو خوبصورت گرجا (القلیس) باپ، بیٹا، روح القدس (تثلیث) کے فروغ دینے کو بنایا گیا تھا مرکز توحید ”کعبۃ اللہ“ کی جگہ وہ مرجع خلافت بنے اور اس مقصد کی خاطر اس نے انہدام کعبہ کے لیے لشکر کشی کی ادھر قریش یعنی سارا عرب اس کی مقاومت سے عاجز و در ماندہ تھا، ابرہہ وقت کے تمام جنگی اسلحہ اور سروسامان کا مالک اور قریش ان سب سے یکسر محروم، تب غیرت حق حرکت میں آئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ دنیوی طاقت کے گھمنڈ پر مشیت الہی سے ٹکرانے والا خود ہی فنا کے گھاٹ اتر گیا اور محور توحید ”کعبۃ“ خدائی حفاظت کے سایہ میں اس طرح قائم رہا۔

﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخْشَى﴾ (النازعات: ۲۶)

”بلاشبہ اس بات میں بڑی ہی عبرت ہے اس شخص کے لیے جو خوف خدا رکھتا ہے۔“  
قرآن عزیز نے سورۃ الفیل میں اسی حقیقت کو معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ نقل کیا ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ۗ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضَلُّيلٍ ۗ وَ أَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۗ تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۗ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۗ﴾

(الفیل: ۱-۵)

”(اے پیغمبر!) کیا تجھے نہیں معلوم کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا ان کے فریب کو ناکام نہیں بنا دیا؟ اور ان پر فوج در فوج پرند بھیج دیے، وہ پرند ان پر کنکریاں پھینکتے تھے پھر (خدا نے) ان ہاتھیوں والوں کو کھائے ہوئے بھس کے مانند کر دیا۔“

بہر حال عام الفیل، نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کا سال ہے اور یہ واقعہ آپ ﷺ کے ظہور قدسی کا سب سے بڑا قریبی نشان ہے اور یہ حقیقت اس شخص پر بخوبی عیاں ہے ﴿لَمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيدٌ﴾ جس کے پاس قبول حق کے لیے دل ہے یا وہ حاضر دماغی کے ساتھ امر حق کی جانب کان لائے ہوئے ہے۔“

تاریخ ولادت کی تحقیق:

تمام ارباب تاریخ و سیرکاتین باتوں پر کلی اتفاق ہے ایک یہ کہ ولادت کا سال ”عام الفیل“ تھا چنانچہ سیرت و مغازی کے مشہور امام محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ اور جلیل القدر محدث و مؤرخ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ جمہور کی یہی رائے نقل کرتے ہیں:

و كان مولده عليه الصلوة والسلام عام الفيل وهذا هو المشهور عن الجمهور و قال ابراهيم بن منذر الخرامي وهو الذي لا يشك فيه احد علمائنا انه عليه الصلوة والسلام ولد عام الفيل. \*



”جمہور کے نزدیک یہی قول مشہور ہے کہ نبی ﷺ کی ولادت عام الفیل میں ہوئی اور ابراہیم بن منذر کہتے ہیں کہ اس بات میں کسی عالم کو بھی شک و شبہ نہیں کہ نبی ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے۔“

والمجتمع عليه انه عليه السلام ولد عام الفيل. \*

”اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ محمد ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے۔“

اور دوسری اور تیسری بات یہ کہ آپ ﷺ کی ولادت ربیع الاول کے مہینے میں دوشنبہ (پیر) کے دن صبح صادق کے وقت ہوئی:

وهذا ما لا خلاف فيه انه ولد ليلة الثلاثاء يوم الاثنين ثم الجمهور على ان ذلك كان في شهر ربيع الاول. \*

”اور اس پر کلی اتفاق ہے کہ آپ ﷺ دوشنبہ (پیر) کے دن پیدا ہوئے، پھر جمہور کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔“

قال ابو قتادة رضي الله عنه ان اعرابيا قال يا رسول الله ما تقول في صوم يوم الاثنين فقال ذلك يوم ولدت فيه و انزل علي فيه. \*

”ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: گاؤں کے ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ پیر کے دن کے متعلق کیا فرماتے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ وہ دن ہے، جس میں میری ولادت ہوئی اور جس میں مجھ پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی۔“

لیکن اہل سیر و تاریخ اس بات میں مختلف رائے ہیں کہ ربیع الاول کی کون سی تاریخ تھی عوام میں تو مشہور قول ہے کہ ۱۲ ربیع الاول تھی اور بعض کمزور روایات اس کی پشت پر ہیں اور اکثر علماء ۸ ربیع الاول کہتے ہیں لیکن صحیح اور مستند قول یہ ہے کہ ۹ ربیع الاول تاریخ ولادت ہے اور مشاہیر علماء تاریخ و حدیث اور جلیل المرتبہ ائمہ دین اسی تاریخ کو ”صحیح“ اور ”اثبت“ کہتے ہیں، چنانچہ حمیدی، عقیل، یونس بن یزید، ابن عبد اللہ، ابن حزم، محمد بن موسیٰ، خوارزمی، ابوالخطاب ابن دحیہ، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، شیخ بدر الدین عینی جیسے مقتدر علماء کی یہی رائے ہے۔

محمود پاشا فلکی نے (جو قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجم گزرا ہے) ہیئت کے مطابق جو زائچہ اس غرض سے مرتب کیا تھا کہ محمد ﷺ کے زمانہ سے اپنے زمانہ تک کے کسوف و خسوف (سورج گرہن و چاند گرہن) کا صحیح حساب معلوم کرے، پوری تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سن ولادت باسعادت میں کسی حساب سے بھی دوشنبہ (پیر) کا دن ۱۲ ربیع الاول کو نہیں آتا۔ بلکہ ۹ ربیع الاول ہی کو آتا ہے اس لیے بلحاظ قوت و صحت روایات اور باعتبار حساب ہیئت و نجوم ولادت مبارک کی مستند تاریخ ۹ ربیع الاول ہے۔ \*

اصحاب فیل کے واقعہ سے کس قدر عرصہ بعد ولادت ہوئی؟ متعدد اقوال میں سے مشہور قول یہ ہے کہ پچاس دن بعد ظہور قدسی ہوا ہے:

وقيل بخسین يوماً وهو اشهر. \*

\* تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۱ \* ایضاً ج ۲ ص ۳۶۱ \* مسلم

\* ۸ اور ۹ کا اختلاف حقیقی نہیں ہے بلکہ مہینے کے ۲۹ اور ۳۰ کے حساب پر مبنی ہے اور جبکہ حساب سے ثابت ہو گیا کہ صحیح تاریخ ۱۲ اپریل تھی تو ۸ کے متعلق تمام اقوال دراصل ۹ کی تائید میں پیش ہو سکتے ہیں۔

\* فتح الباری ج ۶ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۰



”ایک قول یہ ہے کہ اصحاب فیل کے واقعہ سے پچاس دن بعد ولادت باسعادت ہوئی اور یہی قول زیادہ مشہور ہے۔“

### نسب مبارک:

نبی اکرم ﷺ عربی النسل ہیں اور عرب کے معزز قبیلہ قریش کی سب سے زیادہ مقتدر شاخ بنی ہاشم سے ہیں، قرآن عزیز نے اہل عرب کو خطاب کرتے ہوئے متعدد مقامات پر آپ ﷺ کے عربی نژاد ہونے کا ذکر کیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعه: ۲)

”خدا) وہ ذات ہے جس نے امیین (ان پڑھ لوگوں) میں سے ہی ایک رسول بھیج دیا جو ان پر اس کی آیات پڑھتا اور ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو الکتاب (قرآن) اور حکمت سکھاتا ہے۔“

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ﴾ (التوبہ: ۱۲۸)

”بلاشبہ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول (محمد ﷺ) آیا۔“

﴿إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ﴾ (آل عمران: ۱۶۴)

”جب کہ بھیج دیا اللہ نے ان میں ایک رسول جو بلحاظ نسب ان ہی میں سے ہے۔“

﴿وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ (الشوری: ۷)

”اسی طرح ہم نے آپ ﷺ پر قرآن کو بزبان عربی اتارا ہے تاکہ (اے محمد ﷺ) تم مکہ والوں اور ان کے گرد و پیش کے بنیے والوں کو (برائیوں سے) ڈراؤ۔“

﴿أَعْجَبِي ۗ وَهَذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ﴾ (النحل: ۱۰۳)

”کیا (اس قرآن کو سکھا دیتا ہے کوئی عجمی) اور حالت یہ ہے کہ یہ واضح عربی زبان میں ہے۔“

ماہرین انساب عرب کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اس لیے کہ قریش بغیر کسی اختلاف رائے کے عدنانی، ہیں اور عدنان کے اسماعیلی ہونے میں دورائے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

عرب کے علم الانساب کے مشہور عالم محدث ابن عبد البر تحریر فرماتے ہیں:

وَأَجْمَعُوا أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ وَلَدِ عَدْنَانَ وَانْ عَدْنَانَ مِنْ وَلَدِ اسْمَاعِيلَ وَانْ رِبِيعَةَ وَامْرَأَةَ مِنْ وَلَدِ اسْمَاعِيلَ.

”اور علماء انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ عدنان کی نسل سے ہیں اور عدنان اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہے



اور ربیعہ اور مضر بھی اسمعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔“

علماء انساب نے نسب نامہ کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

اور والدہ کی جانب سے آپ ﷺ کا نسب نامہ کلاب پر جا کر پدری سلسلہ نسب کے ساتھ مل جاتا ہے یعنی آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب، کلاب کو حکیم بھی کہتے ہیں۔

البتہ عدنان اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے درمیان سلسلہ کے ناموں سے متعلق ماہرین انساب کی آرا مختلف \* ہیں اس لیے نبی اکرم ﷺ نے اس کے متعلق ارشاد فرما کر ”کذب النسابون“ (نسب بیان کرنے والوں نے غلط بیانی کی ہے) کسی رائے کی توثیق نہیں فرمائی اور اپنے سلسلہ نسب کے متعلق صرف اس قدر ارشاد فرمایا ہے:

ان الله اصطفى كنانة من ولد اسمعيل واصطفى قريشا من كنانة واصطفى من قريش بني هاشم واصطفاني من بني هاشم. \*

”اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے کنانہ کو ممتاز بنایا اور کنانہ میں سے قریش کو عزت و عظمت بخشی اور قریش میں سے بنی ہاشم کو امتیاز عطا فرمایا اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو منتخب فرمایا۔“

گویا اس طرح سلسلہ نسب کے صرف ان حصوں کی تصدیق فرمائی جو ماہرین انساب کے درمیان بلا خلاف مسلم تھے۔

اسلام نے نسبی تفاخر اور اس پر مبنی سماجی رسم و رواج کو بہت بڑا گناہ اور جرم قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا کے یہاں فضیلت کا معیار ”ایمان اور عمل صالح“ ہے اور وہاں حسب و نسب کی کوئی پریشانی نہیں ہے، نیز نسبی تفاخر اسلام کے بنیادی قانون ”اخوت اسلامی“ کے قطعاً منافی ہے اس لیے اسلام کے اجتماعی دستور میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، تاہم واقعاتی طور پر تاریخ یہ پتہ دیتی ہے کہ ہمیشہ انبیاء و رسل علیہم السلام اپنی قوم اور اپنے ملک کے معزز خاندان میں سے ہوتے رہے ہیں، حکمت خداوندی کا یہ فیصلہ غالباً اس لیے ہوا کہ قوموں اور ملکوں کے رسم و رواج اور نسبی تفاخر کے خلاف ان کی دعوت حق اور ان کا پیغام صداقت کہیں ذاتی مفاد کے لیے نہ سمجھ لیا جائے اور اس طرح اس کا اخلاقی پہلو کمزور نہ ہو جائے مثلاً کسی سماجی زندگی میں ذات پات کی تقسیم اور کاسٹ سسٹم اس طرح موجود ہے کہ اس کی وجہ سے بعض انسان بعض کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگے ہیں تو اگر اس قوم یا ملک میں کوئی پیغمبر اس خاندان سے تعلق رکھتا ہو جس کو قومی اور ملکی رواج نے بیچ اور پست اقوام کا لقب دے رکھا ہے ایسی حالت میں اس ظلم صریح باطل کوشی کے خلاف اس پیغمبر کی صدائے حق اتنی سرعت کے ساتھ کامیاب نہ ہوتی جس قدر اس حالت میں ہو سکتی ہے جس کو وہ خود اس قوم ملک کے اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور صرف ایک اسی خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اس کے پیغام حق کی تمام اصلاحات میں یہ فرق ضرور نظر آئے گا۔

بہر حال یہ حکمت ہر مقام اور ہر موقع پر مفید ہو یا نہ ہو عرب کے حالات و واقعات کے لیے از بس مناسب اور مفید ثابت ہوئی چنانچہ صدائے اسلام نے جب اپنی انقلابی اور اصلاحی گرج سے روحانیت کی خفتہ کائنات میں تہلکہ ڈال دیا تو ایک جانب نبی اکرم ﷺ



نے اہل عرب کو یہ سنایا کہ جہاں تک خاندانی امتیاز کا تعلق ہے تو میں قریشی بھی ہوں اور ہاشمی بھی، اور یہ امتیاز تمہارے نقطہ نظر سے بہت بلند ہے مگر میری نگاہ میں اس کی حیثیت صرف یہ ہے: ”ولا فخر، یہ کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں ہے۔“ اور دوسری جانب نسی تقاخر کی بنیادوں کے انہدام اور مساوات انسانی کی دعوت عام کے لیے اس خدائی فرمان کا اعلان کر کے کائنات انسانی کی تمام تاریک ذہنیت کے خلاف انقلاب عظیم برپا کر دیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۗ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۗ﴾ (الحجرات: ۱۳)

”لوگو! میں نے تم سب کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے (یعنی تخلیق انسانی کی ابتدا آدم اور اس کی بیوی حوا (ﷺ) سے ہوئی ہے) اور تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں صرف اس لیے بانٹ دیا ہے کہ آپس میں (صلہ رحمی کے لیے) پہچان اور معرفت کا طریقہ قائم کر لو (اور اصل یہ ہے کہ) بلاشبہ اللہ کے نزدیک وہی عزت والا ہے جو تم میں سے پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے والا ہے۔“

اور حجۃ الوداع کے موقع پر جب آپ ہزار ہا صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں وداعی پیغام سنارہے اور اسلام کے بنیادی اصول کے استحکام کے لیے اہم وصایا پیش فرما رہے تھے اس حکم خداوندی کی تائید میں یہ انقلاب آفریں پیغام بھی ارشاد فرمایا:

ان الله يقول ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۗ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۗ﴾ فليس لعربي على عجمي فضلٌ ولا لعجمي على عربي فضلٌ ولا لاسود على ابيض فضلٌ ولا لابيض على اسود فضلٌ الا بالتقوى يا معشر القريش لا تجيئوا بالدينيا تحلونها على رقابكم ويحى الناس بالآخرة فاني لا اغني عنكم من الله شيئاً.... الخ ﴿﴾

”اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ”اے افراد نسل انسانی! بلاشبہ ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تمہارے درمیان خاندان اور قبائل بنا دیے ہیں تاکہ (صلہ رحمی کے لیے) تعارف پیدا کرو بلاشبہ تم میں اللہ کے نزدیک وہی برگزیدہ ہے جو زیادہ متقی (نیک کردار ہے) پس (خوب یاد رکھو کہ) نہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی برتری حاصل ہے نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے اور نہ گورے کو کالے پر کوئی بزرگی۔ بلکہ ان سب کے لیے فضیلت کا معیار صرف تقویٰ (نیک عملی) ہے۔ اے گروہ قریش! ایسا نہ ہو کہ تم (خاندانی فخر کے زعم باطل کی وجہ سے قیامت میں) دنیا کو کاندھے پر لا کر لاؤ اور دوسرے لوگ (نیک عملی کی بدولت) آخرت کا سامان لے کر آئیں، واضح رہے کہ (تمہارے محض قریشی ہونے کی وجہ سے) میں تم کو خدا کے فیصلے سے قطعاً بے پرواہ نہیں بنا سکتا (خدا کے یہاں تو صرف عمل ہی کام آئے گا)۔“

اور ایک مرتبہ نسی فخر کے خلاف تبلیغ حق کرتے ہوئے اس کو ”جاہلی تعصب“ فرمایا اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کے لیے سخت



تاکید فرمائی۔ ارشاد فرمایا:

(( ان الله تعالى قد اذهب عنكم عبية الجاهليته و فخرها بالاباء و انما هو مؤمن تقى او فاجر شقى الناس  
كلهم بنو ادم و ادم خلق من تراب ))۔

”اللہ تعالیٰ نے (دعوت اسلام کے ذریعہ) تمہارے درمیان سے جاہلیت کے تعصب اور نسی فخر کو مٹا دیا ہے اور اب انسان یا نیکو کار مؤمن ہے اور یا بدکار پاپی، سب انسان آدم ﷺ کی اولاد ہیں اور آدم ﷺ کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے، (پھر فخر کرنے کا کیا موقع ہے؟“

اسی مقدس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے دور اولین میں نہ ذات پات کا کوئی سوال باقی رہ گیا تھا اور نہ خاندانی تفاخر کی کوئی حیثیت سمجھی جاتی تھی اور اس صدائے حق نے غلاموں تک کو سروری بخش دی تھی، چنانچہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی سالاری لشکر اور امامت جہاد، بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ”سید هذه الامة“ اس امت کا سردار“ قریش اور ہاشمی صحابہ کے درمیان ایک عجمی انسان ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جلالت و عظمت، صہیب رومی رضی اللہ عنہ اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رفعت و بلندی مرتبت اور اسی قسم کے ہزاروں واقعات تھے جو چشم فلک نے آنکھوں سے دیکھے اور تاریخ نے آغوش صفحات میں محفوظ رکھے ہیں مگر وائے بدبختی کہ بیرونی اثرات اور عرب سے باہر عجمی ماحول نے ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کو پھر اسی لعنت سے دو چار کر دیا۔ جس کا مرثیہ اقبال مرحوم کو اس طرح کرنا پڑا۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں

کیا زمانہ میں پینے کی یہی باتیں ہیں

سرور دو عالم ﷺ نے یہ فرما کر ((انما هو مؤمن تقى او فاجر شقى)) اس مسئلہ کو اس درجہ صاف کر دیا تھا کہ مسلمان کی زندگی میں کبھی اس کے برعکس زندگی کا کوئی اثر پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا، ذات پات تو صرف اس لیے تھیں کہ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں باہمی تعارف، صلہ رحمی اور حسن سلوک کا معاملہ ایک دوسرے کے ساتھ آسانی ہو سکے، ورنہ کیسی ذات، کہاں کا خاندان؟ کون برادری؟ یہاں تو صرف دو ہی فطری اور نیچرل تقسیمیں ہیں یا ”نیکو کار“ یا ”بدکار“ کسی قوم، کسی خاندان اور کسی ملک کا انسان ہو اگر ”سچی خدا پرستی“ اور نیکو کاری رکھتا ہے تو وہ سب ایک برادری اور ایک قوم ہیں اور اگر مشرک و کافر اور بدکار پاپی تو یہ سب ایک گروہ اور ایک ٹولی ہیں۔

قیسی:

خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے والد ماجد کا نام عبداللہ اور والدہ ماجدہ کا نام آمنہ تھا۔ ابھی آفتاب ہدایت نے کائنات ہست و بود میں طلوع نہیں کیا تھا اور حضرت آمنہ کی مشکوئے معلیٰ اس ودیعت کی امین ہی تھی کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور ارباب سیرت کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ایک قافلہ تجارت کے ساتھ شام تشریف لے گئے تھے، واپسی میں جب قافلہ مدینہ (یثرب) پہنچا تو وہ بیمار ہو گئے اور



اس لیے اپنے ننھیال بنی نجار میں قیام پذیر رہے قافلہ جب مکہ پہنچا تو عبدالمطلب نے بیٹے کے متعلق دریافت کیا قافلہ نے ان کی بیماری اور مدینہ میں قیام کا واقعہ کہہ سنایا۔ تب عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو دریافت حال کے لیے مدینہ بھیجا، حارث جب مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ نے ایک ماہ چند روز بیمار رہ کر داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ واپس آ کر جب حارث نے باپ کو حادثہ کی اطلاع دی تو عبدالمطلب اور تمام خاندان کو اس صدمہ جانکاہ نے بے حال کر دیا۔ کیونکہ عبداللہ اپنے باپ اور بھائیوں کے بہت چہیتے تھے۔

غرض جب ولادت باسعادت ہوئی تو اس سے قبل ہی آپ ﷺ کو یتیمی کا شرف حاصل ہو چکا تھا، چنانچہ قرآن نے آپ ﷺ کی یتیمی و دنیوی وسائل سے محرومی کے باوجود آغوش رحمت کردگار میں نشوونما پانے کی ہادی عالم بننے کا معجزانہ اختصار کے ساتھ سورہ الضحیٰ میں تذکرہ کیا ہے:

﴿الْمُ يَجِدُكَ يَتِيمًا فَآوَى ۝ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَى ۝ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَى ۝﴾ (الضحیٰ: ۶-۸)

”اے پیغمبر! کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا پھر اپنی آغوش (رحمت) میں جگہ دی اور کیا تجھ کو ناواقف نہیں پایا، پھر تجھ کو (کائنات کی ہدایت کے لیے) ہدایت ماب بنایا اور کیا تجھ کو (ہر قسم کے وسائل سے محروم و محتاج نہیں پایا) پھر تجھ کو (ہر قسم کی سروری دے کر) غنی بنا دیا۔“

بقول حضرت ابوقادہ رضی اللہ عنہ ان آیات میں عجیب و غریب اعجاز اور اسلوب بیان کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے تمام ارتقائی مدارج کا تذکرہ ہے تم سمجھتے ہو، کہ ﴿فَآوَى﴾ کے معنی یہ ہیں کہ پروردگار عالم نے آپ ﷺ کو رہنے سہنے کی صورت پیدا کر دی یا آپ ﷺ کو بے یار و مددگار نہیں رہنے دیا، یہ بھی صحیح ہے مگر اس کلام ربانی کی اصل روح یہ ہے کہ اس نے ذات اقدس ﷺ کو ہر قسم کے مادی اسباب و وسائل سے بے پروا رکھ کر اپنی آغوش رحمت میں لے لیا اور آپ ﷺ کے نشو و ارتقاء کو خالص اپنی تربیت میں کامل و مکمل کیا۔ اور ﴿وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَى﴾ کی تفسیر کو خود قرآن ہی نے دوسری جگہ روشن کر دیا ہے مثلاً سورہ شوریٰ میں ہے:

﴿وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۗ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۗ﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

”اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے ”امر“ کی روح کا القاء کیا (حالانکہ اس سے پہلے) نہ تو کتاب (قرآن سے واقف تھا اور نہ ایمان) (کی حقیقت) سے، لیکن ہم نے اس کو ”نور“ (روشنی) بنا دیا ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں (اس کی صلاحیت و استعداد کے پیش نظر) اس کے ذریعہ ہدایت دیتے ہیں۔“

اور آیت ﴿عَائِلًا فَأَغْنَى﴾ میں دنیوی احتیاج و غناء کا ذکر روح کلام نہیں ہے بلکہ اس جانب اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے



آپ ﷺ کو قربت و کمال کا وہ مرتبہ عظمیٰ عطا فرمایا ہے کہ مادی اور روحانی ہر قسم کی احتیاج سے بالاتر بنا کر صفات حمیدہ اور اخلاق کریمانہ کی مثل اعلیٰ ”غنا“ سے بہرہ ور بنا دیا، یہی وہ غنی ہے جس کا خود ذات اقدس ﷺ نے اس طرح ذکر فرمایا ہے:

((ليس الغنى عن كثرة العرض ولكن لغنى عن النفس)).

”غنا مال داری کی بہتات کا نام نہیں ہے حقیقی غنی ”نفس کا ماسوی اللہ سے مستغنی ہو جانا“ ہے۔“

عمر مبارک ابھی چھ سال ہی کی تھی کہ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ کا بھی انتقال ہو گیا بی بی آمنہ آپ ﷺ کو آپ کے ننھیال (مدینہ) میں لے کر گئی تھیں، واپسی میں مقام ابوا میں بیمار ہو گئیں اور چند روز علیل رہ کر وہیں انتقال فرمایا اور سن مبارک ابھی آٹھ منزلیں ہی طے کر پایا تھا کہ دادا عبدالمطلب نے بھی دنیا سے منہ موڑ لیا اور اس طرح عہد طفلی ہی میں وسائل تربیت اور دنیوی اسباب کفالت سے محرومی نے گویا مشیت الہی کی جانب سے یہ اعلان کر دیا کہ جس ذات قدسی صفات کو خدائے واحد نے خالص اپنی تربیت کے لیے منتخب کر لیا ہے کیسے ممکن ہے کہ اس کو دنیوی اسباب و وسائل تربیت کا محتاج بنائے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک یتیم و یرسیر اور مادی وسائل سے محروم ہستی کو اپنے لیے چن کر کس طرح اپنی ربوبیت کاملہ کا مظہر بنایا۔ سورہ انشراح میں اس حقیقت کو اچھوتے انداز میں بیان فرمایا:

﴿ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۙ الَّذِي اُنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ وَرَفَعْنَا لَكَ

ذِكْرَكَ ۙ ﴾ (الانشراح: ۱-۴)

”کیا ہم نے (قبول حق و صداقت کے لیے) تیرا سینہ نہیں کھول دیا اور (معرفت الہی کی حقیقی طلب اور قوم اور کائنات انسانی کی بے راہ روی پر ان کی ہدایت کی تڑپ کا) وہ بوجھ ہم نے تجھ سے دور کر دیا جس نے تیری کمر توڑ رکھی تھی اور ہم نے تیرے ذکر کو کائنات ہست و بود میں بلند کر دیا۔“

”شرح صدر“ یہ کہ اب وسائل تعلیم و تعلم کے ذریعہ حاصل ہونے والے تمام علوم و معارف اس عطاء الہی اور وہی معرفت و علم کے سامنے ہیج ہو کر رہ گئے ہیں جس کی سمائی کے لئے ہم نے تیرے سینہ کو کھول دیا ہے، اب علوم و معارف کے بحرنا پیدا کنار بھی ہوں تو تیرے سینہ کا دامن وسیع ان کے لیے کافی و دافی ہے اور اسی ”شرح صدر“ نے معرفت الہی کے تمام پوشیدہ گنجینے تجھ پر وا کر دیے اور وہ سارا بوجھ تیرے سینہ پر سے ہٹ گیا جس نے تیری کمر کو اس لیے شکستہ کر رکھا تھا کہ قلبی جستجو اور دلی تڑپ کے باوجود تو اس سے قبل نہیں جانتا تھا کہ معرفت الہی کی راہ مستقیم کون سی ہے اور گم کردہ راہوں کی راہنمائی کی سبیل کیا ہے؟ مگر اب یہ سب کچھ روشن ہو جانے کے بعد ہم نے عالم بالا و پست میں تیرے ذکر کو وہ بلندی اور رفعت عطا فرمائی کہ تیرا مقام

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

قرار پایا، چنانچہ نام احمد و محمد ﷺ ہے اور مقام، مقام محمود، سورہ الحمد و طیفہ حیات ہے اور لواء حمد قیامت میں طغرائے امتیاز

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری



یہی نہیں بلکہ ”قرآن کی تجدید دعوت“ کے ذریعہ تیری صدائے حق نے اعتقاد و عمل اور ایمان و کردار کی راہ سے تمام دنیا کے نظام ہائے اجتماعی و سماجی میں جو عظیم الشان انقلاب پھا کر دیا اور سوسائٹی کے ہر شعبہ کی پرانی اور فرسودہ بساط کو الٹ کر جو نئی بساط بچھا دی اس نے تیرے ذکر کو وہ رفعت و برتری عطا کی کہ کوئی قوم، کوئی مذہب اور کوئی جماعت کسی نہ کسی شکل میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

### بت پرستی سے نفرت، خلوت پسندی اور عبادت الہی کا ذوق :

عہد طفولیت سے ازدواجی زندگی کے ابتدائی مراحل تک کے حالات و واقعات تفصیل کے ساتھ کتب سیرت و حدیث میں منقول ہیں۔ اس لیے وہیں لائق مراجعت ہیں۔ مختصر یہ کہ دادا عبدالمطلب کے انتقال کے بعد آپ ﷺ کے چچا ابوطالب آپ ﷺ کے ساتھ بہت انس رکھتے تھے اور زندگی بھر آپ ﷺ کی رفاقت کا حق ادا کرتے رہے۔ انبیاء و رسل کی سنت کے مطابق آپ ﷺ نے اپنی روزی کا بار کسی پر نہیں ڈالا اور دنیوی مشاغل میں آپ ﷺ نے بکریاں بھی چرائیں اور تجارت بھی کی، شام کے مشہور تجارتی شہر بصریٰ میں بھی اس غرض سے تشریف لے گئے اور پچیس سال کی عمر میں یہی سفر حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے عقد کا باعث ہوا، آپ ﷺ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت مضاربت پر بصریٰ کی منڈی میں لے گئے، خدیجہ رضی اللہ عنہا کا غلام میسرہ بھی رفیق سفر تھا، اس درمیان میں آپ ﷺ کی صداقت و امانت، ایک یہودی راہب کی بشارت اور بیش بہا منافع تجارت کا جو تجربہ اور مشاہدہ کیا تھا میسرہ نے وہ سب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہہ سنایا چنانچہ یہی تاثر ازدواجی رشتہ کا باعث بن گیا۔

اب زندگی میں ایک اور انقلاب ہوا کہ آپ ﷺ کو خلوت گزینی کی طرف رغبت ہوئی اور غار حرا میں روز و شب بسر ہونے لگے، بت پرستی سے شروع ہی سے نفرت تھی اس لیے کبھی نہ کسی صنم کے آگے سر جھکایا اور نہ کسی ایسی مجلس میں شرکت فرمائی جو صنم پرستی کے میلے کہلاتے تھے، اب خلوت میں فطرت سلیم جس طرح راہنمائی کرتی خدائے واحد کی عبادت کرتے مگر ایک خلش سینہ میں ایسی تھی جو اس حالت میں بھی بے چین ہی رکھتی، اکثر یہ سوچ کر تڑپ جاتے تھے کہ میری قوم خصوصاً اور دنیا انسانوں عموماً کس طرح خدائے واحد کو چھوڑ کر صنم پرستی اور مظاہر پرستی میں مبتلا ہے اور یہ کہ اخلاق کی دنیا کس طرح الٹ گئی ہے آخر وہ کونسا نسخہ کیمیاء ہے جو اس حالت میں انقلاب پیدا کر دے اور سچی خدا پرستی اور نیک عملی پھر ایک مرتبہ اپنی نمود دکھلائے۔

یہی جذبات و تاثرات تھے جو قلب مضطرب میں موجزن تھے اور خلوت کدہ حرا میں انہی کیفیات کے ساتھ ذات اقدس ﷺ مصروف یاد الہی رہتی اور جب کئی کئی دن اس طرح گزر جاتے تو کبھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حاضر ہو کر آذوقہ حیات دے جاتیں اور کبھی خود بنفس نفیس جا کر چند روز کا سامان خورد و نوش لے آتے اور حرا، میں پھر مشغول عبادت ہو جاتے، چنانچہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی آج حرا زبان سے اس کیف آگے منظر کا شاہد ہے جس کا لطف اس نے برسوں اٹھایا ہے، مشہور محدث و مؤرخ حافظ عباد الدین ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ ان مختصر الفاظ میں حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے:

وانما كان رسول الله ﷺ يحب الخلا والانفراد على قومه لئلا يراهم عليه من الضلال المبين من عبادة الاوثان والسجود للاصنام وقويت محبة للخلوة عند مقاربة احياء الله اليه صلوات الله وسلامه عليه. ❀



”اور رسول اللہ ﷺ (دور شباب میں) خلوت پسند ہو گئے تھے اور قوم سے الگ تنہائی میں وقت گزارتے تھے کیونکہ وہ قوم کی اس کھلی گمراہی کو دیکھ کر ”کہ وہ بت پرستی میں مبتلا اور بتوں کے سامنے سجدہ گزار ہے“ کڑھتے تھے اور جوں جوں آپ ﷺ پر وحی الہی کے نزول کا زمانہ قریب ہوتا جاتا تھا (مشیت الہی سے) اسی قدر آپ ﷺ کی خلوت پسندی میں اضافہ ہوتا جاتا، صلوات اللہ وسلامہ علیہ ”اس ذات اقدس ﷺ پر خدا کی رحمتیں اور سلامتی نازل ہو۔“

بہر حال یہی وہ خلوت کدہ عبادت تھا جہاں ذات اقدس ﷺ پر سب سے پہلے ”وحی الہی“ کا نزول ہوا اور بالترتیب سورہ اقرآء اور سورہ مدثر کی چند آیات سنانے کے لیے بشیر و نذیر بنا دیا۔

### حقیقت وحی:

یہ ”وحی“ و ”تنزیل“ کیا ہے جس کو ”نبوت و رسالت“ کے خصائص میں سے کہا جاتا ہے اور یہ ”منصب نبوت و رسالت“ کیا شے ہے جس کا ”وحی و تنزیل“ کے ساتھ اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہے کہ منطقی اصطلاح میں ”لازم و ملزوم“ کہا جاسکتا ہے اور اس اصطلاحی گفتگو سے قطع نظر سادہ الفاظ میں اس سوال کو کیوں نہ اس طرح پیش کر دیا جائے کہ کائنات انسانی کے ہر معاملہ میں جبکہ حسن و قبح کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے فطرت نے ہم کو ”جوہر عقل“ عطا کر دیا ہے اور انسان کے اندر کی یہ سرچ لائٹ (Search Light) ہر ایک مادی شعبہ حیات میں رہنمائی کرتی ہے تو پھر ”رسول و نبی“ کے ذریعہ پیغام الہی کی حاجت کیا ہے؟ اور عالم روحانیات کے مسائل اور معرفت الہی کے حصول میں تنہا ”عقل“ ہی کیوں کافی نہیں سمجھی جاتی؟ یہی وہ سوال ہے جس کے حل ہو جانے پر ”وحی“ اور ”نبوت“ دونوں کی حقیقت بھی خود بخود واضح ہو جاسکتی ہے۔

اس سوال کو حل کرنے کے لیے پہلے ایک تمہید قابل توجہ ہے اور دراصل وہی اس مسئلہ کی کلید ہے۔

تم جب کائنات کے وجود و خلق کو عمیق فکر و نظر سے مشاہدہ کرتے ہو تو یہ حقیقت ہر جگہ ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ خالق کائنات نے اپنی ربوبیت کاملہ کے فیض و عطا سے ہر شے کو جس طرح وجود بخشا اور خلق کیا اس کو ”ہدایت“ (راہنمائی) سے بھی سرفراز کیا ہے اور اگر یہ نہ ہوتی تو کائنات کا وجود و خلق مہمل اور بیکار ہو جاتا، کیونکہ یہی ”ہدایت“ ہر ایک جاندار پر زندگی اور معیشت کی راہ کھولتی، ان کی حیات کو مفید بناتی اور ضروریات حیات کی طلب و حصول میں راہنمائی کرتی ہے اور یہی ناموس فطرت کا وہ فیض عام ہے جس کے بغیر کوئی مخلوق بھی سامان حیات اور وسائل تربیت سے استفادہ نہیں کر سکتی ورنہ وجود و حیات کی یہ گرمجوشیاں ہی ظہور پذیر ہو سکتیں۔

”مچھلی کے جائے کن تیرائے“ اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے، وہ جب اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں تو خود بخود پانی میں تیرنے لگتے اور اپنی غذا کی جستجو میں مصروف ہو جاتے ہیں، پرندوں کے بچے انڈے سے باہر آتے ہی ہوا میں اڑنے کی کیوں کوشش کرتے نظر آتے ہیں، حیوان اور انسان کا بچہ جب اس کارگاہ ہستی میں قدم رکھتا ہے تو بھوک و پیاس دور کرنے کے لیے ماں باپ سے تعلیم حاصل نہیں کرتا بلکہ خود بخود ماں کے سینہ پر منہ رکھ کر غذا کے خزانہ سے دودھ کیوں چوسنے لگتا ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ تم کہتے ہو کہ یہ فطرت کا قانون ہے جو ان سب کو ”فیض ہدایت“ سے فیض یاب کر کے مخلوق کی نشوونما کا سامان مہیا کرتا ہے، یہ ”ہدایت“ ہے جو ہر حرکت حیات میں اپنا کام کر رہی ہے اور یہ ”فیض ہدایت“ ہے جو خالق کائنات کی جانب سے مخلوقات کی نشوونما کے لیے ”فیض عام“ ہوا ہے۔



لیکن ابھی وسعت نظر کو آگے بڑھنے دیجئے اور قدرت حق کے مشاہدہ کے لیے تیز گام ہو جیے تو کارگہ قدرت اور نوا میں فطرت کی کرم فرمائیاں اور زیادہ جلوہ آرا نظر آئیں گی۔ اور تم دیکھو گے کہ یہ ”ہدایت“ بھی دوسری موجودات کی طرح ارتقائی درجات رکھتی ہے اور ہر ایک درجہ اپنی افادیت کی نمود جدار کھتا ہے۔ چنانچہ اس راہ میں سب سے پہلے ”وجدان کی ہدایت“ سامنے آتی ہے اور یہ طبیعت حیوانی کے ”فطری اور باطنی الہام“ کا نام ہے، یہی وہ ابتدائی درجہ ہے جو بچہ کو قید ہستی میں آنے کے فوراً بعد ہی کسی خارجی تعلیم و تربیت کے بغیر اس کی غذا کا پتہ دیتا اور اسباب حیات کے لیے معلم بنتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو انسان کی ارتقائی منزل پر پہنچ کر اور ”ضمیر کی آواز“ ”اندر کی صدا“ بن کر حقائق کی معرفت کے لیے خارجی دلائل و براہین سے زیادہ قوی حجت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ”ہدایت حواس“ کا درجہ ہے یہ پہلے درجہ سے بلند ہے اور اس کی عطاء و بخشش سے ہر ایک ذی روح دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے، چھونے کی قوتیں حاصل کرتا ہے اور ان کے ذریعہ کائنات عالم میں اپنی افادیت اور استفادہ دونوں کو ترقی دیتا ہے۔

قدرت حق کی جانب سے یہ دونوں درجے انسان اور حیوان دونوں کو عطاء ہوئے ہیں اور دونوں کی یکساں طور پر راہنمائی کرتے ہیں، مگر ان دونوں سے بلند ایک درجہ اور ہے جو ”ہدایت عقل“ کہلاتا ہے اور صرف ”انسان“ ہی کے لیے مخصوص ہے اور یہ بھی پہلے دو درجوں کی طرح بدیہی اور فطرت کے قوانین و نوا میں نمایاں جگہ رکھتا ہے۔ یہی وہ ”ہدایت“ ہے جو انسان کو بقیہ تمام حیوانات سے امتیاز بخشتی، اس کے سامنے فکر و نظر اور ترقیوں کی راہیں کھولتی ہے اور اسی کی بدولت وہ ”اشرف المخلوقات“ کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

عطیہ الہی ”ہدایت“ کے یہ تینوں درجے اپنے اپنے حلقہ اثر میں حضرت انسان کی راہنمائی کا حق ادا کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ”وجدان“ اس میں سعی پیہم کا جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے ”حواس“ اس کے لیے معلومات فراہم کرتے ہیں اور ”عقل“ اس کو جزئیات و کلیات کا علم بخشتی اور ان سے متعلق احکام و نتائج ترتیب دیتی ہے۔

غرض یہی وہ ”ہدایت“ ہے، قرآن عزیز نے جس کا ذکر انسانی تخلیق و تربیت کے سلسلہ میں کیا ہے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے باہمی مکالمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدائے برحق کی ربوبیت کاملہ کا جس طرح اظہار فرمایا ہے اس کا ذکر یوں کیا ہے۔ سورہ طہ میں ہے:-

﴿رَبَّنَا الَّذِي اَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ ۝﴾ (طہ: ۵۰)

”ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر راہ عمل کھول دی۔“  
اور سورہ اعلیٰ میں ہے:

﴿الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۙ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۙ﴾ (الاعلیٰ: ۲-۳)

”وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی پھر اس کو درست کیا پھر ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اس پر راہ عمل کھول دی۔“

اور سورہ بلد میں ہے:



﴿الْم نَجْعَلُ لَهُ عَيْنَيْنِ ۙ وَ لِسَانًا وَ شَفَتَيْنِ ۙ وَ هَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۙ﴾ (البلد: ۸-۱۰) ﴿

”کیا ہم نے اس کو (دیکھنے کے لیے) دو آنکھیں نہیں دیں اور کیا (بولنے کے لیے) زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے، اور ہم نے اس کو اچھی اور بری دونوں راہیں دکھا دیں۔“

اور سورہ دہر میں ہے:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۙ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَبِيْعًا بَصِيْرًا ۙ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ ۙ إِمَّا شَاكِرًا ۙ وَإِمَّا كَفُوْرًا ۙ﴾ (الدھر: ۲-۳)

”ہم نے انسان کو (مرد و عورت کے) ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا جس کو (ہم) مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں پھر اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنا دیا، ہم نے اس پر راہ عمل کھول دی، اب یہ اس کا کام ہے کہ شکر گزار بنے یا ناشکر گزار۔“

مگر یہ بات بھی بہت صاف ہے کہ ہدایت کے ان ہر سہ مراتب ”وجدان“ ”حواس“ ”عقل“ کی راہ عمل اپنے اپنے دائرہ عمل ہی تک محدود ہے یعنی ”وجدان“ ایک جاندار کے اندر زندگی کے لیے جوش عمل اور سعی مسلسل ولولہ تو پیدا کر سکتی ہے مگر حیوان یا انسان سے باہر محسوسات خارجیہ کا ادراک اور علم اس کے دائرہ عمل سے خارج ہے، اسی طرح ”ہدایت حواس“ محسوسات کا ادراک ضرور پیدا کر دیتی ہے لیکن یہ اس کے احاطہ عمل سے باہر ہے کہ وہ محسوسات کے نتائج و احکام اور جزئیات سے کلیات کا اور کلیات سے جزئیات کا استنباط کر سکے کیونکہ یہ کار فرمائی ”ہدایت عقل“ سے متعلق ہے جو عام حیوانات کے لیے نہیں بلکہ صرف انسان کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ تو ”ہدایت عقل“ اگرچہ پہلی دونوں ہدایات کے مقابلہ میں بلند مرتبہ رکھتی اور کائنات کی بلند ترین ہستی (حضرت انسان) کی راہنمائی کرتی ہے تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ”عقل“ کا دائرہ وسیع تر ہونے کے باوجود پھر محدود ہے کیونکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ عقل جو کچھ اور جس قدر بھی نتائج و احکام کا استنباط و استخراج کرتی ہے اس کا دائرہ محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حواس خمسہ (قوت باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ، ذائقہ) نے اپنی اپنی خدمات انجام دے کر جو کچھ ہمارے لیے فراہم کیا ہے ”عقل“ اسی پر اپنا تصرف کرتی اور کر سکتی ہے لیکن یہ بات کہ محسوسات کی سرحد سے پرے کیا کچھ ہے اور اس پر دے کے پیچھے کیا ہے؟ اس مقام پر پہنچ کر ”عقل“ بھی عاجز و درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ ”درجہ ہدایت“ بھی اس سلسلہ میں ہم کو کسی قسم کی روشنی پہنچانے سے معذور نظر آتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر وجدان کی تکمیل کے لیے حواس اور حواس کی تکمیل کے لیے عقل کی ہدایت سے موجود نہ ہوتی تو انسان ہرگز ان مدارج ارتقاء اور مراتب رفیع پر نہ پہنچ پاتا جن تک آج پہنچا ہوا ہے اور آئندہ جن تک پہنچنے کے لیے میدان عمل میں گامزن ہے، اگر انسان

﴿اس آیت میں وجود کائنات کے چار مراتب بیان کر کے قرآن نے ایک عظیم الشان ”حقائق علمیہ“ کا ایک باب کھول دیا ہے یہ چار مراتب بالترتیب ”خلق، تسویہ، تقدیر، ہدایت“ ہیں اور یہی چار مراتب خلاصہ حقائق ہیں خلق یہ کہ وجود بخشا، تسویہ یہ کہ اس کی استعداد کے مطابق اس کی درست کاری کی، تقدیر یہ کہ ہر شے سے متعلق اس کے بدء خلق سے اس کے نتیجہ حیات تک کے لیے پہلے سے ایک مقررہ اندازہ طے کر دیا اور ہدایت یہ کہ اس پر ہر قسم کی راہ عمل کھول دی۔ تفصیلات کتب تفسیر میں مطالعہ فرمائیں۔



میں وجدان کی قوت نہ ہوتی تو کس طرح حواس کی دنیا تک اپنی حیات کو پہنچا سکتا اور اگر محسوسات کے ادراک کے لیے حواس کی قوتیں نہ ہوتیں تو انسان کس طرح اپنی ذات سے خارج اشیاء کا ادراک کر سکتا اور ترقی کے لیے کوئی قدم اٹھا سکتا اور جبکہ حواس کے وسائل ادراک محدود ہیں، اور نہ صرف محدود بلکہ بسا اوقات گمراہی اور غلطی میں مبتلا کر دیتے ہیں مثلاً ہم کو طویل فاصلہ کی بڑی سے بڑی چیز چھوٹی نظر آتی ہے یا خلط صفراء کے بڑھ جانے سے شیریں سے شیریں چیز ذائقہ میں تلخ معلوم ہوتی ہے یا فاصلہ ہونے کی وجہ سے ہم رنگوں کے امتیاز میں اکثر غلطی کر جاتے ہیں تو ان تمام حالتوں میں، عقل کی ہدایت، کام آتی اور صحیح راہنمائی کرتی ہے اور اصل حقیقت کو پیش نظر لاتی ہے، وہ کہتی ہے کہ اگر طویل فاصلہ کی بناء پر تم کو ”جہاز“ ایک چھوٹی سی چیز نظر آتا ہے تو یہ نگاہ اور قوت باصرہ کا قصور ہے ورنہ جہاز ایک لمبی چوڑی اور بڑی شے کا نام ہے، اسی طرح شیریں اور تلخ کا فیصلہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ حقائق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی شیریں ہر حالت میں شیریں ہے، اس لیے ذائقہ کی یہ تلخی مرض کی وجہ سے ہے غرض حواس کی غلطیوں سے محفوظ رکھ کر اصل حقیقت کو واضح کرنا ”عقل کی ہدایت“ کا فریضہ ہے اس لیے ہم ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے قطع نظر..... کہ عقل محسوسات کی حدود سے آگے کچھ نہیں جانتی..... انسان کی عملی زندگی کے تمام حالات میں عقل کی ہدایت بھی کافی اور مؤثر ثابت نہیں ہوتی اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نفس انسانی، جذبات، رجحانات اور قسم قسم کی خواہشات سے متاثر و مغلوب ہے بلکہ اکثر یہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ جب ”عقل“ اور ”جذبات“ کے درمیان کشمکش ہوتی ہے تو فتح ”جذبات“ ہی کی ہوتی ہے اور ”عقل“ در ماندہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

تو ان حالات میں ”عقل“ ہی تقاضا کرتی ہے کہ یہاں ”عقل“ سے بھی بلند اور کوئی درجہ ہونا چاہیے جو عقل سے زیادہ مؤثر رہنما اور ہر قسم کی کوتاہیوں سے پاک اور بے لوث ثابت ہو۔

اس تمہید کا حاصل یہ نکلا کہ انسان محسوسات کے دائرہ میں محدود رہ کر بھی اور ماوراء محسوسات کے ادراک کے لیے بھی ”ہدایت عقل“ سے بلند (ایک چوتھے) درجہ ہدایت کا محتاج ہے تو اب لائق غور و فکر ہے یہ بات کہ جس ”رب العالمین“ نے اپنی ربوبیت کاملہ سے انسان کے ارتقائی کمالات کی حاجات و ضروریات کے پیش نظر ہدایت وجدان سے بلند ہدایت حواس اور ہدایت حواس سے رفیع ہدایت عقل عطا فرمائی تو جبکہ عقل کی ہدایت بھی خاص حدود سے آگے نہیں جاسکتی اور حصول کمالات اور اعمال کے صحیح ضبط و نظم کے لیے ہی کافی نہیں ہے۔ نیز ماوراء محسوسات کے عدم علم کے باوجود اس کے انکار پر کوئی مثبت علمی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وجدانی جذبات و احساسات اور شعور نفس اس کے ”حقیقت“ ہونے کا پتہ دیتے ہیں تو کیا اس خدائے برحق کی ربوبیت اور فیض رحمت کے لیے یہ منافی نہ تھا کہ وہ انسان کو ”ہدایت عقل“ سے بلند کوئی ”مرتبہ ہدایت“ عطا نہ کرے؟ ضرور منافی تھا اور اس لیے ایسا نہیں ہوا بلکہ اس نے اس کو ایک اور بلند تر مرتبہ ”ہدایت وحی“ بخشا، یہ مرتبہ ہدایت اپنی راہنمائی میں ہر قسم کی کوتاہیوں اور خطا و قصور سے مامون و محفوظ ہے کیونکہ یہ خدا کی جانب سے ہر شے کی حقیقت کا علم و یقین عطا کرتا ہے اور ہدایت وحی کے افاضہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی مقدس ہستی کو جو ہر قسم کے گناہوں اور عیوب سے ”معصوم“ ہوتی ہے اس مقصد کے لیے چن لیتا ہے کہ وہ اس کی جانب سے کائنات انسانی تک ”ہدایت وحی“ کو پہنچا دے، اس لیے یہ مقدس ہستی ایک جانب لوازم بشریت کے ساتھ مقید رہ کر دوسرے انسانوں کی طرح ”انسان“ اور ”بشر“ کہلاتی ہے اور دوسری جانب عیوب و مائثم سے ”معصوم“ رہ کر خدا کے ساتھ وہ تعلق رکھتی



ہے جو دوسرے مقدس سے مقدس انسانوں کو بھی حاصل نہیں ہوتا اور اس طرح خدا اور اس کے بندوں کے درمیان افاضہ "ہدایت وحی" کے لیے اپنی اور واسطہ بنتی ہے، ایسی حقیقت کا نام مذہب کی اصطلاح میں "نبوت و رسالت" ہے۔  
قرآن حکیم نے ہدایت کے اس مرتبہ عالی کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ حسب ذیل چند شواہد ملاحظہ ہوں:

﴿وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَصَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ﴾ (ختم السجدہ: ۱۷)

"لیکن قوم ثمود تو اسے بھی ہم نے راہ حق و ہدایت دکھائی تھی لیکن اس نے اندھے پن کو پسند کیا اور "ہدایت" کی راہ نہ چلی۔"

﴿قُلْ إِنَّ هُدَىٰ اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۗ وَأَمْرًا لِّنُسُلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الانعام: ۷۱)

"(اے پیغمبر!) کہہ دیجئے، یقیناً اللہ کی ہدایت ہی "حقیقی ہدایت" ہے اور ہم سب کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ تمام کائنات عالم کے پروردگار کے آگے سرعبودیت جھکا دیں۔"

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (الروم: ۶۹)

"اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں سعی و جانفشانی کی تو ضرور ہے کہ ہم بھی ان پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلاشبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو نیک کردار ہیں۔"

﴿إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۗ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ﴾ (اللیل: ۱۲-۱۳)

"بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم رہنمائی کریں (ہدایت وحی عطاء کریں) اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لیے ہیں۔"

ارتقائی نقطہ نظر سے "ہدایت وحی" اور مسئلہ نبوت و رسالت کی وضاحت کے لیے اشہب فکر کو یوں بھی مہمیز کیا جاسکتا ہے کہ جب کہ یہ عقلی اور عملی نظریہ مسلمات میں سے ہے کہ "بقاء نفع" یا "بقاء صالح" کے فطری قانون کے مطابق کائنات کی گونا گوں موجودات میں ہر ایک شے اپنے موجود رہنے کے لیے کوئی "حکمت و مصلحت" ضرور رکھتی ہے اور حکیم مطلق کا قانون فطرت کسی شے کو اسی وقت تک باقی رکھتا ہے جب تک اس کا وجود "نافع" اور "مفید" ہونے کی صلاحیت رکھتا اور جس غرض و غایت کے لیے اس کو پیدا کیا گیا ہے اس کو پورا کرتا ہے اور اسی قانون "بقاء نفع و صالح" سے یہ بات بھی بہت واضح اور نمایاں طور پر ثابت ہوتی ہے کہ "نفع اور افادیت" کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ ہر شے اپنے سے بلند مخلوق اور سلسلہ مخلوقات میں سے ہر نوع اپنے سے بلند نوع کی بقاء کے لیے مفید و معاون ثابت ہو، پس جبکہ حضرت انسان کو عقل بھی موجودات عالم کی سب سے بلند مخلوق اور مدارج ارتقاء کی بلند ترین کڑی تسلیم کرتی ہے اور اسی قانون کی رو سے موجودات عالم کی ہر شے اس کی خدمت، اس کے نفع اور اس کی افادیت میں مصروف عمل نظر آتی ہے تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اشرف المخلوقات (انسان) کا وجدان، اس کے جذبات عالیہ اور اس کے افکار و خیالات کی پرواز جبکہ عالم مادیات سے کہیں زیادہ بلند اور رفیع ہیں اور اس کی عقل یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ماوراء مادہ سے ناواقف ہے پھر بھی اس پردہ کے پیچھے کچھ ہونے کا احساس رکھتی اور اس کی معرفت کے لیے چمک محسوس کرتی ہے۔ فطرت الہی کا فیضان اور بقاء نفع کا ناموس اس کو عالم مادیات و محسوسات ہی کے اندر محصور رکھتا، اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ فطرت "بخیل" ٹھہرتی بلکہ نہ فطرت کا بہت بڑا ظلم ہوتا اور نہ ظاہر سے کہ



تہا عقل اس کو اس منزل تک پہنچانے کے لیے قاصر و ناکام ہے لہذا از بس ضروری تھا کہ ”فطرت الہی“ اس کی رہنمائی کے لیے مزید کوئی سامان مہیا کرتی اور انسان کی ذہنی و فکری ترقیوں کو درجہ تکمیل تک پہنچاتی۔ پس ماوراء مادہ علوم و معارف اور کائنات انسانی کی فلاح و نجات کے مقصد عظیم کے لیے عقل کی رہنمائی کا یہی وہ فیضان الہی ہے جس کو قرآن کی اصطلاح اور مذہبی بول چال میں ”وحی نبوت“ کہا جاتا ہے اور آیات ذیل اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہیں:

﴿ وَأَوْحَىٰ إِلَيْنَا هَذَا الْقُرْآنَ لِأَنذَرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ ۗ ﴿۱۹﴾ (الانعام: ۱۹)

”اس نے (خدا نے) مجھ پر اس قرآن کی وحی کی تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں (اہل عرب کو) اور انہیں جن تک اس کی تعلیم پہنچ جائے (ربع مسکون کو) ”انکار اور بد عملی کے نتیجے سے ڈراؤں۔“

﴿ إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّنَ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ۗ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا ۗ ﴿۲۱﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۗ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ۗ ﴿۲۲﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۗ ﴿۲۳﴾ (النساء: ۱۶۳-۱۶۵)

”(اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری جانب اسی طرح ”وحی“ بھیجی جس طرح نوح علیہ السلام پر اور ان نبیوں پر جو نوح علیہ السلام کے بعد ہوئے بھیجی تھی، اور جس طرح ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب، عیسیٰ ایوب، یونس، ہارون، سلیمان (علیہم السلام) پر بھیجی اور داؤد کو زبور عطاء فرمائی، نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے سنا چکے ہیں اور جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا، اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے، یہ تمام رسول (خدا پرستی اور نیک عملی پر) خوش خبری دینے والے اور (انکار حق پر) ڈرانے والے تھے (اور اس لیے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر کر سکیں کہ ہمیں راہ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور خدا (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔“

﴿ وَ لَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِأَبِينَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۗ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا اللَّهَ ۗ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۗ ﴿۲۴﴾ (الزخرف: ۶۳-۶۴)

”اور جب عیسیٰ علیہ السلام خدا کی (نشانیوں) لے کر آیا، کہا ”میں تمہارے پاس حکمت و دانائی لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا



ہوں کہ بعض ان باتوں کو جن کے متعلق تمہارے درمیان اختلاف ہے صاف صاف بیان کر دوں، پس اللہ کے متقی بندے بن جاؤ اور میری پیروی کرو (اس بات میں کہ) بیشک اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔“

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ﴿۱۷۴﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۗ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمًا ﴿۱۷۵﴾﴾ (النساء: ۱۷۴-۱۷۵)

”(اے افراد نسل انسانی!) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان (دلیل و حجت) آ گئی اور ہم نے تمہاری طرف واضح اور آشکارا روشنی بھیج دی پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انہوں نے اس کا سہارا مضبوط پکڑ لیا تو وہ انہیں عنقریب اپنی رحمت کے سایہ میں داخل کر دے گا اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انہیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھائے گا۔ ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔“

قرآن نے ان آیات میں ”ہدایت وحی“ کو ”حکمت“ ”برہان“ (حجت و دلیل اور نور مبین) (آشکارا روشنی) کہا ہے تاکہ یہ بخوبی واضح ہو جائے کہ جس طرح محسوسات و مادیات کے لیے ”عقل“ کو ”روشنی“ اور ”دلیل راہ“ کہا جاتا ہے اسی طرح عقل کے دائرہ حدود سے آگے کے لیے ”ہدایت وحی“ یہی حیثیت رکھتی اور یہی خدمات انجام دیتی ہے۔

”ہدایت وحی“ کی ضرورت پر اب تک جو کچھ کہا گیا اگر اس کے علاوہ مزید اضافہ مطلوب ہو تو مبداء فیاض کے اس لطیف و حسین فیضان کے متعلق اس روشن پہلو سے بھی نظر کی جاسکتی ہے کہ جب ہم حواس کی قوتوں کا فکر عمیق سے مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت صاف نمایاں نظر آتی ہے کہ ناموس فطرت نے یہاں ایک قوت کے عملی نظام کو اس طرح سانچہ میں ڈھالا ہے کہ انسان کے اندر ودیعت کی ہوئی قوت حواس اس وقت تک اپنا صحیح عمل نہیں کر پاتی جب تک خارج سے اس کی مدد نہ کی جائے۔ مثلاً قوت باصرہ دیکھنے کی قوت کا نام ہے اور تم اس سے اپنی زندگی میں برابر کام لیتے رہتے ہو اور اس بحث سے قطع نظر کہ جو شے باہر موجود ہے وہ آنکھ کے باریک پردوں پر اپنا عکس ڈال رہی ہے یا آنکھ کے پردوں میں جو روشنی ہے وہ اندر سے بشکل شعاع نکل کر موجود خارجی کو متاثر کر رہی ہے، اور اس کو ہم ”دیکھنا“ کہتے ہیں۔ ”تم“ نے کبھی اس پر ضرور غور کیا ہوگا کہ جب تم کسی قسم کی بھی روشنی میں ہوتے ہو تو اپنی قوت باصرہ کی استعداد کے مطابق جس شے کو دیکھنا چاہتے ہو دیکھتے ہو لیکن جوں ہی تاریکی کا شکار ہو جاتے ہو اور شب دیبچور کے ساتھ ابرسیاہ کے پردے روشنی پر چھا جاتے ہیں اس وقت حلقہ چشم میں قوت باصرہ کی موجودگی کے باوجود تم یہ کہا کرتے ہو کہ ”ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا“ تو آخر بیٹا ہوتے ہوئے ایسا کیوں کہتے ہو؟ تمہارا جواب اس وقت یہ ہوتا ہے کہ قانون قدرت نے یہی مقرر کر دیا ہے کہ باطنی قوائے عمل اس وقت تک اپنا صحیح کام نہیں کرتے جب تک خارج سے اس سلسلہ کی مدد نہ پہنچے۔ اس لیے قوت باصرہ کی باطنی قوت بھی محتاج ہے کہ دیئے (چراغ) کی روشنی سے لے کر ماہتاب و آفتاب تک جس حیثیت کی بھی روشنی ہو اپنا عملی مظاہرہ کر سکے گی اور یہی حال دوسرے حواس کا بھی ہے۔



پس اگر یہ صحیح ہے اور بلاشبہ صحیح ہے کہ خدائے واحد کا قانونِ قدرت اور ناموسِ فطرت اپنی وحدت کی جلوہ نمائی کا مظاہرہ کائناتِ مادی اور عالمِ روحانی میں یکساں طور پر کرتا رہتا ہے تو بے تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ”عقل“ حضرت انسان کے اندر کی وہ روشنی ہے جس کو قدرت نے انسانیت کے ارتقائی منازل پر گامزن ہو کر انسانیت کی ”مثلِ اعلیٰ“ اور ”مقصدِ عظیم“ کو پانے کے لیے ودیعت کیا ہے، مگر مسطورہً بالا قانون یہاں بھی اسی طرح کارفرما ہے جیسا کہ قوائے حواس میں کارفرما نظر آتا ہے یعنی اگر ”عقل“ عالمِ محسوسات و مادیات کے دائرے میں اپنا عملی مظاہرہ کرنا چاہتی ہے تو وہ محسوساتِ خارجی کی مدد کی ضرورت محتاج رہتی ہے، مثلاً اس کا یہ فریضہ ہے کہ جزئیات کے ذریعہ ”کلی“ کا استخراج کرے، لیکن وہ ایسا جب ہی کر سکے گی کہ خارج میں اس سلسلہ کی جزئیات کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے حقائقِ اصلیہ کو اس کے سامنے پیش کرے۔ پس اگر عقل کی روشنی اور ان حقائق کے درمیان وہم، خیال اور ظن کے تاریک پردے حائل ہو جائیں تو عقل کی روشنی ہرگز اپنا صحیح کام نہیں کر سکتی۔ اسی طرح جب وہ ماوراءِ محسوسات (روحانیت) کی جانب اپنی روشنی کو متوجہ کرتی ہے تو یہی ادہان، ظنون، خیالات اور جذباتِ فاسدہ کے تاریک پردے، اس کے اور عالمِ روحانیت کے درمیان عموماً حائل ہو جاتے ہیں، اور وہ اکثر و بیشتر ان سے مغلوب ہو کر گم کردہ راہ ہو جاتی اور معرفتِ حق اور معرفتِ باطل کے درمیان فرق و امتیاز سے عاجز نظر آتی ہے۔ ایسی حالت میں خالق کائنات کی رحمتِ کاملہ اور ربوبیتِ تامہ اس کو خاسر و ناکام نہیں چھوڑتی اور خارج سے اس کی پوری مدد کرتی ہے اور یہی وہ خارج کی روشنی ہے جو نبی اور پیغمبر کے ذریعہ کائناتِ انسانی تک پہنچی، اور دین و مذہب کی زبان میں ”وحیِ روشنی“ کہی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے جگہ جگہ وحی کو ”نور“ (روشنی) سے تعبیر کیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ﴿۱۷۴﴾ (النساء: ۱۷۴)

”(اے افرادِ نسلِ انسانی!) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے برہان (دلیل و حجت) آگئی اور ہم نے تمہاری جانب واضح اور آشکارا ”روشنی“ (وحیِ الہی بشکلِ قرآن) بھیج دی۔“

﴿قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ ﴿۱۵﴾ (المائدہ: ۱۵)

”اللہ کی جانب سے تمہارے پاس (حق کی) ”روشنی“ آچکی اور ایسی کتاب آگئی جو (اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن کتاب ہے۔“

﴿يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿۳۲﴾ (التوبہ: ۳۲)

(التوبہ: ۳۲)

”یہ لوگ (مشرکین، یہود، نصاریٰ) چاہتے ہیں ”اللہ کی روشنی“ کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں حالانکہ اللہ یہ ”روشنی“ پوری کیے بغیر رہنے والا نہیں اگرچہ کافروں کو پسند نہ آئے۔“

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ﴿۵﴾ (ابراہیم: ۵)



”اور (دیکھو واقعہ یہ ہے کہ) ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالے اور ”روشنی“ میں لائے۔“

﴿وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۗ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۗ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۵۲﴾﴾

(الشوری: ۵۲)

”اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے ”امر“ میں سے ”روح امر“ کی وحی بھیجی حالانکہ اس سے قبل تو نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب؟ اور نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے ایمان؟ لیکن ہم نے اس کو (قرآن کو) نور (روشنی) بنایا، ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ان کو اس کے ذریعہ راہ دکھاتے ہیں، اور اے پیغمبر! بلاشبہ تو (لوگوں) کو سیدھی راہ کی جانب راہنمائی کرتا ہے۔“

پھر اس مسئلہ کی اہمیت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی فکر و نظر کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ہم اس عالم ہست و بود میں روز و شب کے مشاہدات و تجربات سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ یہاں ہر شے کی کیفیت و کمیت یا اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ایک ”ترازو“ یا ”پیمانہ“ ضرور ہے اور یہ کہ ہر ایک ”پیمانہ“ اور ہر ایک ”ترازو“ اپنے اندر ایک خاص صلاحیت رکھتا اور اپنی صلاحیت کے مطابق ہی اشیاء کے ناپ تول میں کام دے سکتا ہے مثلاً موتی اور جواہرات کے تولنے کے لیے ایک خاص ترازو (کانٹا) ہے، اب اگر ہم یہ چاہیں کہ اس میں شکر، روئی، غلہ جیسی چیزوں کو تولیں تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے یہ نہیں، بلکہ دوسری قسم کا ترازو کام دے گا، یا مثلاً کپڑا، زمین وغیرہ جیسی اشیاء کی پیمائش کے لیے ہم ایک خاص قسم کا پیمانہ (گزن) استعمال کرتے ہیں۔ پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس سے حرارت و برودت کی بھی پیمائش کر لیں تو اس کے لیے یہ نہیں بلکہ دوسرا پیمانہ تھرمامیٹر\* کام میں لانا ہوگا، اور اسی طرح ہوا کے دباؤ اور سطح کی اونچائی معلوم کرنے کے لیے بیرومیٹر\* اور زلزلوں اور بھونچالوں کی حالت دریافت کرنے کے لیے سیسومیٹر\* اور آواز کی مقدار و قوت کی پیمائش کے لیے فونومیٹر\* جدا جدا قسم کے پیمانے استعمال کرنے ہوں گے کیونکہ ان کی اپنی صلاحیت و استعداد کار کا یہی فطری تقاضا ہے کہ اگر اس کے خلاف ان کا استعمال کیا جائے گا تو یا تو قطعاً بیکار ثابت ہوں گے اور یا صحیح حقیقت نہ بتلا سکیں گے حالانکہ ان سب کا ایک ہی کام ہے یعنی ”ماپ تول“ اور ایک ہی نام ہے ”ترازو اور پیمانہ“ مگر ہر شے کی حقیقت اور اس کی کیفیت و کمیت کے پیش نظر چونکہ ان سب کی صلاحیت کار کی حدود متعین ہیں لہذا ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی حدود سے متجاوز ہو کر کارآمد ثابت نہیں۔

قانون قدرت کی کارفرمائی کو رہنما بنا کر اگر ہم اسی نقطہ نظر سے آگے قدم بڑھائیں اور خالص مادیات سے گزر کر معنویات کی حدود پر جا پہنچیں تو یہاں بھی وہی کرشمہ قدرت نظر آتا ہے یعنی انسان کی انفرادی و اجتماعی حیات کے لیے رحمت کردگار نے جو پیمانے مقرر کیے ہیں، اور جن کو وجدان، حواس اور عقل کہا جاتا ہے ان میں بھی جدا جدا صلاحیتوں کے اعتبار سے حدود منقسم ہیں، مثلاً پیمانہ ”وجدان“ انسان کی صرف اسی کیفیت و حالت سے متعلق ہے جو قدرت کے ہاتھوں نے اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اس میں ودیعت



کردی ہے اور حواس کا پیمانہ ان ہی اشیاء سے تعلق رکھتا ہے جو دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے میں آ سکتی ہیں اور پیمانہ ”عقل“ ان دونوں سے آگے عالم مشاہدات و محسوسات کے حقائق اور ان کی کیفیات کے جانچنے ان کے درمیان امتیاز پیدا کرنے، ان سے نتائج اخذ کرنے اور ان پر احکام صادر کرنے کی خدمت انجام دیتا ہے۔

پس اگر ہم چاہیں کہ ”وجدان“ سے ”حواس“ اور ”حواس“ سے ”عقل“ کا کام لیں تو خود عقل ہی کے نزدیک ایسا کرنا غلط ہوگا، کیونکہ یہ قانون فطرت کی مقررہ حدود کی خلاف ورزی کے مرادف ہے جس کے اقدام پر ناکامی کے ماسوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن عقل انسانی اس کے آگے نہ جاننے کے باوجود پھر جاننے کی جستجو رکھتی اور اپنی ترقی کو اس کے اندر محدود نہیں سمجھتی، نیز تمام خارجی دلائل سے بڑھ کر انسان کے اندر کی قوی تر حجت و برہان ”وجدان“ ان ہر دو عالم سے بھی بلند تر عالم کے وجود کا جو پتہ دیتی ہے اس کے پیش نظر ہم وسعت نظر کا قدم اور آگے بڑھاتے اور مسطورہ بالا عالم معنویات سے لطیف تر معنوی عالم کا کھوج لگانا چاہتے اور اس کائنات سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں، جہاں حسن، صداقت اور محبت ﴿ذات حق کی صفات ربوبیت، عدالت اور رحمت﴾ اپنی جلوہ آرائیوں سے اس کائنات کو بھی منور کر رہی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں پہنچ کر پیمانہ عقل بھی کوتاہ ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی رفعت پرواز وہاں تک رسائی نہیں کر پاتی، خصوصاً ایسی حالت میں کہ انسانوں کے درمیان ”عقل“ کا اس درجہ تفاوت موجود ہے کہ ایک شخص کی عقل اس کو نہ صرف ممکن الوقوع سمجھتی ہے بلکہ اس کو وجود پذیر کر دکھاتی ہے بلکہ تفاوت عقلی کی بوالعجبیوں کا تو یہ حال ہے کہ ایک ہی شخص کی عقل ایک وقت جس بات پر ناممکن کا فتویٰ صادر کر دیتی ہے دوسرے وقت میں اسی بات کو ممکن سمجھتے لگتی ہے تو جب پیمانہ عقل کا عالم محسوسات میں یہ حال ہے تو عالم غیب تک اس کی رسائی معلوم؟ اور پھر جس پیمانہ کے توازن کو غیر متوازن بنانے کے لیے وہم و خیال اور جذبات کا سیل رواں موجیں مارتا رہتا ہو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ خارج سے مدد و یاری کے بغیر ”عقل“ معرفت الہی اور علوم غیب تک رسائی حاصل کر سکتی ہے؟

پس انسان کی بیچارگی و درماندگی کے اس مقام پر بھی رحمت کردگار اپنے فیضان سے اس کو محروم نہیں رکھتی اور معنوی اور روحانی حقائق کی معرفت کے لیے ایک مقدس ہستی (پیغمبر) کے ذریعہ اس کو عقل سے بھی رفیع و لطیف پیمانہ ”ہدایت وحی“ عطا کر دیتی ہے۔ تاکہ انسان ”سعادت و شقاوت“ میں امتیاز کرنے کے بعد حیات سرمدی اور ”نجات ابدی“ کو پاسکے۔

قرآن عزیز نے ”وحی الہی“ کو یہی حیثیت دیتے ہوئے سورہ شوریٰ میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ﴾ (الشوریٰ: ۱۷)

”اللہ وہ ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب (قرآن) کو نازل کیا اور اتارا ”میزان“ (ترازو) کو یعنی دین حق کو جو حق و باطل کے لیے ترازو اور پیمانہ ہے۔“

آج کل علمائے جدید میں یہ بحث جاری ہے کہ سائنس نے اپنی حدود کو اس طرح محدود رکھا کہ اس کے دائرہ میں حسن، صداقت اور محبت کی کوئی قدر و قیمت نظر نہیں آتی اور اس لیے وہ خدا کی ہستی کی معرفت ضروری نہیں سمجھتی مگر یہ سائنس کا کمال نہیں ہے بلکہ نقص ہے جو آج نہیں تو کل ضرور پورا ہو کر رہے گا۔



چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب (نور اللہ مرقدہ) موضح القرآن میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”تراز و فرمایا دین حق کو جس میں بات پوری ہے نہ کم نہ زیادہ۔“

### صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل:

”ہدایت وحی“ یا ”نبوت و رسالت“ کی حقیقت و اہمیت پر گذشتہ سطور میں کوتاہ قلبی کے باوجود جو کچھ سپردِ قریب کیا گیا اس کی تکمیل کے لیے اس سوال کو بھی حل کرنا از بس ضروری ہے کہ جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ ”حامل وحی“ ہے اور ”خدا کا پیغمبر اور ایلی“ تو اس کے دعوائے صدق و کذب کی معرفت کا کون سا طریقہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ”علم الکلام“ کے ماہرین (متکلمین) نے اس معرفت کے لیے بہت سے دلائل و براہین پیش کیے ہیں اور اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اس پر معرکہ الآراء بحثیں کی ہیں تاہم وہ اپنے طرز استدلال میں اصطلاحی فلسفیانہ اسلوب رکھتی ہیں جس کو ہم ”مذہبیات“ و ”روحانیات“ میں خاص اہمیت دینے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ اس راہ میں وہی اسلوب بیان مفید، دل نشین اور جاذبِ قلوب ہو سکتا ہے جس کی بنیاد و نہاد وجدانی طرز استدلال پر رکھی گئی ہو اور عقلیت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اصطلاحی فلسفہ و منطق کی قیود میں اس کو پابہ زنجیر نہ کر دیا گیا ہو اور یہ اس لیے کہ معرفت الہی اور معرفت علوم غیبیہ کے لیے دلیل ”وجدان“ سے زیادہ دوسری کوئی دلیل و برہان مؤثر نہیں ہے، اسی حکمت بالغہ کے پیش نظر قرآن عزیز کے تمام عقلی استدلالات..... جن پر غور کرنے کے لیے ”قرآن“ عقل و فکر اور تدبر کو مخاطب بناتا ہے..... کی بنیاد بھی ”وجدان“ پر قائم کی گئی ہے البتہ یہ قرآن حکیم کا اعجازِ بلاغت ہے کہ ان وجدانی دلائل کو اگر کوئی فلسفی دقیق فلسفیانہ طریق استدلال کے سانچے میں ڈھال کر زیر بحث لانا چاہے تو یہ وجدان پر مبنی استدلالات اسی اہمیت و قوت کے ساتھ اپنی صداقت اور ثمرہ و نتیجہ کو اس رنگ میں بھی تسلیم کرا لیتے ہیں۔

غرض ”وجدان“ اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ تم مدعی نبوت کی زندگی کو ”صداقت کی کسوٹی“ پر خوب کسو اور اگر آج وہ ہستی تمہارے سامنے نہیں ہے تو تعصب اور نسلی و جماعتی حسد سے پاک اور بے لوث ہو کر بے لاگ تاریخی حقائق سے دریافت کرو، پس اگر تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ اس کی قبل از دعوائے نبوت زندگی کا ہر شعبہ حیات صداقت و حقانیت کا مظہر ہے اور ہر ایک شعبہ زندگی بے داغ صداقت کا پیکر اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اس کا وجود ہر قسم کی بد اخلاقیوں، گناہوں اور آلودگیوں سے پاک اور ”معصوم“ ہے اور اخلاقی بلندیوں کا مخزن اور ان ہی کیفیات و حالات کے ساتھ اس نے جانے بوجھے لوگوں میں زندگی کا بڑا حصہ گزارا ہے تو پھر اس کے دعوائے صداقت میں شک و شبہ کرنا عقل سلیم کے خلاف ہو گا کیونکہ عقل باسانی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جس ہستی نے اپنی مدت حیات کے طویل عرصہ میں نازک سے نازک موقعوں پر بھی کبھی ایک لمحہ کے لیے انسانی دنیا پر جھوٹ نہ بولا ہو، آخر دماغی و قلبی انقلابات کی وہ کونسی تاریخ ہے جس کی بنا پر ایسی باہوش و حواس ہستی کے متعلق یہ کہا جاسکے کہ وہ خالق کائنات ”خدائے برحق“ پر کذب بیانی اور افترا پردازی کے لیے یک بیک آمادہ ہو جائے، چنانچہ قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو سورہ یونس میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرِكُمْ بِهِ ۚ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمْرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ



## المُجْرِمُونَ ﴿۱۷﴾ (یونس: ۱۶-۱۷)

”اور تم کہو“ اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اور تمہیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو باندھے اللہ پر بہتان یا جھٹلائے اس کی آیتوں کو، بیشک بھلا نہیں ہوتا گنہگاروں کا۔“

”صاحب وحی“ کی صداقت کی یہ ایسی بہترین کسوٹی اور دلیل ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے ۶ھ میں پادشاہان دنیا کے نام اسلام کی دعوت و پیغام کے سلسلہ میں والانامے بھیجے تو وقت کی سب سے بڑی طاقت (رومن امپائر) کے بادشاہ ہرکلیوس (ہرقل) کے پاس حضرت وحیہ کلبی رضی اللہ عنہما نامہ مبارک لے کر پہنچے تب اس نے بھی جب آپ ﷺ کی صداقت کو پرکھنا چاہا تو سب سے پہلے اسی وجدانی دلیل کو ”معیار صداقت“ ٹھہرایا اور صورت حال یہ پیش آئی کہ اس نے سرکاری حکام سے دریافت کیا، یہاں کوئی حجازی قافلہ موجود ہے جس سے اس ہستی کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں؟ اتفاق سے ابوسفیان (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی سرکردگی میں ایک تجارتی قافلہ مقیم تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کو شاہی دربار میں طلب کیا گیا اور ہرکلیوس نے رئیس التجارة (ابوسفیان) سے نبی اکرم ﷺ کے متعلق چند سوالات کیے جن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ”وہ تمہارے اندر ہی پلا بڑھا۔ رہا سہا ہے تو کیا تم نے اس کی زندگی کے اس طویل دور میں کبھی جھوٹ کا شائبہ پایا ہے؟“ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ”کبھی نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی قوم میں ”الصادق الامین“ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے“ یہ سن کر ہرکلیوس نے یہ کہا:

و سألتك هل كنتم تتهمونه بالكذب قبل ان يقول ما قال فذكرت ان لا تقدر اعرف انه لم يكن ليدرك  
الكذب على الناس ويكذب على الله. (بخاری ج ۱)

”میں نے تجھ سے یہ بھی دریافت کیا: کیا کبھی اس کے اس دعویٰ سے قبل تم نے اس کو جھوٹا پایا ہے؟“ تو نے کہا: ”کبھی نہیں“  
تب میں نے یقین کر لیا کہ جو ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ نہیں بول سکتی۔“

”جو ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ نہیں بول سکتی۔“ دیکھئے یہ جملہ اس سلسلہ میں وجدان انسانی کا کس درجہ صحیح ترجمان ہے کہ ہرکلیوس نے بھی تمام عقلی و نقلی دلائل سے الگ ہو کر وجدان کے تقاضے سے پہلی دلیل جو پیش کی وہ وہی تھی جس کو وجدان کے خالق (خدائے برتر) نے اپنے پیغمبر سے (صداقت دعویٰ کے لیے) پیش کرائی۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ان آیات کی تفسیر اسی حقیقت کی روشنی میں اس طرح کی ہے:

”پھر آیت (۱۶) میں صداقت نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے..... فرمایا، ساری باتیں چھوڑ دو، صرف اس بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جس کے خصائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو، تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں، یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمر انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان



باندھنے کے لیے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پاسکتے؟ تمام علماء اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل کے ابھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے جو سانچہ اس عرصہ میں بن گیا پھر بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا پس اگر ایک شخص چالیس برس کی عمر تک ”صادق و امین“ رہا ہے، تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ ﴿فَاَطْرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ ”آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے خدا“ پر افترا کرنے لگے؟

چنانچہ اس کے بعد فرمایا: دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے جو شخص اللہ پر افتراء کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے اور شریر و مفتری انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اب صورت حال نے یہاں دونوں فریق پیدا کر دیے۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا، اگر تم سچائی کے مکتذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہے، فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا یہ فیصلہ صادر ہو گیا، جو مکتذب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا، جو صادق تھا اس کا کلمہ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔ \*

بہر حال ”صاحب وحی“ کے دعوائے صداقت کی یہ وجدانی دلیل عقل سلیم اور فکر مستقیم کی نگاہ میں ”علم الیقین“ پیدا کرنے کے لیے کافی و وافی ہے، تاہم بقیہ شرائط یعنی صداقت تعلیم نزول وحی کا ادعاء اور مخالفین کے مقابلہ میں تحدی (چیلنج) اور تحدی کا ایفاء ”مدعی نبوت و رسالت“ کے لیے یہ تمام امور بھی از بس ضروری ہیں اور اپنی جگہ تفصیل طلب اور قابل لحاظ ہیں اس لیے کہ ان شرائط کے پیش نظر ہی نبی اور مصلح کے درمیان امتیاز، نبی اور ساحر و شعبدہ باز کے مابین فرق بین اور نبی اور متنبی میں تضاد قائم کیا جاسکتا ہے۔ \*

### بعثت :

غرض خاتم الانبیاء ﷺ کی حیات طیبہ کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کا یہ حال تھا کہ ایک جانب خلوتہائے راز میں معرفت الہی کے لیے استغراق، صراط مستقیم کی جستجو، نوع انسانی کے اصلاح حال کی تڑپ اور طلب تھی اور دوسری جانب افراد قوم و لک کے ساتھ راست گفتاری، صداقت شعاری، حسن معاملت اور اصابت فکر جیسے اخلاق کریمانہ و صفات حمیدہ سے متصف معاشرتی زندگی کا مظاہرہ تھا اور ان امتیازات کی وجہ سے ہر فرد کی نگاہ میں آپ ﷺ کی وہ قدر و منزلت تھی کہ باتفاق رائے ”الصادق الامین“ کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے اور کل جو دشمنی ان کو محمد رسول اللہ ﷺ سے دعوائے نبوت کی بناء پر ہوئی وہ آج محمد ﷺ بن عبد اللہ کے ساتھ قطعاً نہیں تھی اور سب ہی ان کی تقدیس و تطہیر کے قائل تھے۔

یہی حالات و واقعات تھے جبکہ عمر مبارک چالیس منزلیں طے کر چکی تھی، رمضان کا مہینہ تھا اور آپ ﷺ غار حرا میں مشغول عبادت تھے کہ اچانک آپ ﷺ کے سامنے جبرئیل علیہ السلام فرشتہ نمودار ہوا اور اس نے بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ



کو ثقلین کی رشد و ہدایت کے لیے چن لیا اور رسالت و پیغمبری کے منصب کبریٰ پر فائز کیا۔

یہ واقعہ چونکہ نوع انسانی کی تاریخ میں حیرت زا انقلاب کا باعث ثابت ہوا اور اس نے ذات اقدس ﷺ کو معراجِ رفعت کی اس حد پر پہنچا دیا جہاں عالم ادیان و ملل کے تمام اصلاحات و انقلابات اس ہستی کا فیضِ رحمت نظر آتے ہیں اس لیے تاریخ و حدیث کے روشن صفحات نے اس واقعہ کی تمام تفصیلات کو بسندِ صحیح اپنے سینہ میں محفوظ رکھا ہے، چنانچہ فن حدیث و تاریخ اسلام کے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی مشہور و مقبول کتاب الجامع الصحیح میں صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے اس واقعہ کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

نبی اکرم ﷺ پر شروع میں سچے خوابوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کوئی خواب آپ ﷺ نہیں دیکھتے تھے مگر وہ اپنی تعبیر میں اس درجہ روشن اور صحیح ثابت ہوتا تھا جیسا کہ طلوع صبح کے لیے سفیدہ صبح کا ظہور ہوتا ہے پھر آپ ﷺ کو خلوتِ محبوب ہو گئی اور حراء میں مشغول عبادت رہنے لگے۔ گاہے گاہے آپ ﷺ اہل و عیال کے پاس بھی تشریف لے آتے تھے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے لیے کچھ توشہ تیار کرتیں اور آپ ﷺ اس کو لے کر پھر غار میں واپس تشریف لے جاتے، اسی طرح حراء میں مشغول استغراق و عبادت تھے کہ اچانک ایک روز آپ ﷺ پر خدا کا فرشتہ نمودار ہوا اور کہنے لگا: "اقراء پڑھے۔" نبی اُمی نے کہا: "ما انا بقاری، میں پڑھنا نہیں جانتا" پیغمبر ﷺ ارشاد فرماتے تھے "کہ جب میں نے فرشتہ سے یہ کہا تو اس نے مجھ کو گرفت میں لے لیا جس کی شدت سے مجھ کو تکلیف محسوس ہونے لگی اور پھر چھوڑ کر مجھ سے دوبارہ کہا "پڑھے" اور میں نے وہی جواب پھر دیا "میں پڑھنا نہیں جانتا" تب اس نے پھر وہی عمل کیا، اور گرفت چھوڑ کر تیسری مرتبہ پھر پہلا جملہ دہرایا اور میں نے بھی وہی سابق جواب دیا غرض تین مرتبہ یہی گفتگو اور یہی عمل ہوتے رہنے کے بعد چوتھی مرتبہ فرشتہ نے (سورہ اقرآء کی) یہ چند آیتیں تلاوت کیں:

﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَ رَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝﴾ (العلق: ۱-۵)

"اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو خونِ بستہ سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا پروردگار بہت کرم کرنے والا ہے جس نے قلم (تحریر) کے ذریعہ (انسان کو) علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جس سے وہ ناواقف تھا۔"

غرض نبی اکرم ﷺ نے ان آیات کو دہرایا اور یہ آپ ﷺ کے ذہن نشین ہو گئیں، اس کے بعد جب حراء سے فارغ ہوئے تو یہ حالت کہ قلب (شدتِ وحی سے) کانپ رہا تھا، آپ ﷺ نے مکان میں داخل ہوتے ہی فرمایا: "مجھ کو کپڑا اڑھاؤ" (حضرت) خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فوراً کپڑا اڑھا دیا، جب آپ ﷺ کو سکون ہوا تو خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تمام واقعہ کہہ سنایا اور پھر فرمایا: خشیت

حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں بہت ہی لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں، موضح القرآن میں لکھتے ہیں: اول جبرئیل علیہ السلام وحی لائے تو یہ پانچ آیتیں، حضرت (محمد ﷺ) نے کبھی لکھا پڑھا نہ تھا اس لیے (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ قلم سے بھی علم وہی دیتا ہے یوں بھی (یعنی بغیر وسائل بھی وہی طور پر) وہی دے گا۔



علی نفسی۔ ”مجھے جان کا خوف ہے۔“ (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے یہ سن کر عرض کیا: ”قسم بخدا! خدا آپ ﷺ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمانوں کی مہمانداری، بیچاروں کی چارہ گری فرماتے اور مفلس کے لیے ذریعہ معاش مہیا کرتے ہیں اور حق رسی کی کڑی سے کڑی مصیبت میں مددگار بنتے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ زمانہ جاہلیت کے ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سچی عیسائیت کو قبول کر لیا تھا، عبرانی زبان سے واقف اور انجیل کی کتابت کیا کرتے تھے اور بہت ضعیف العمر اور نابینا تھے (حضرت) خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ورقہ سے کہا: برادر من آپ اپنے بھتیجے کا واقعہ تو سنئے۔“ ورقہ نے دریافت حال کیا، تب نبی اکرم ﷺ نے گزرا ہوا واقعہ سنایا، ورقہ نے سنا تو کہا: ہذا الناموس الذی کان یمنزل علی موسیٰ۔ یہ وہ فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی الہی لے کر آیا کرتا تھا۔ کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں جب تیری قوم تجھ کو تیرے وطن (مکہ) سے نکالے گی۔“ آپ ﷺ نے دریافت کیا: ”کیا میری قوم مجھ کو وطن سے بے وطن کرے گی“ ورقہ نے کہا: ”بیشک ایسا ہوگا اور جس پیغام کے لیے خدا نے آپ ﷺ کو پیغمبر بنایا ہے اس خدمت پر جو بھی مامور ہو اس کے ساتھ یہی صورت پیش آئی ہے، پس اگر وہ وقت میری زندگی میں آیا تو میں پوری قوت کے ساتھ تیری حمایت کروں گا“ مگر ورقہ کو یہ وقت نہیں آیا اس سے قبل ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

### حدیث بخاری اور بعض مستشرقین کی کوتاہ اندیشی:

صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں نزول وحی کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ پر فوری تاثر ہوا اس کو خود زبان مبارک سے اس طرح ظاہر کیا گیا ہے ((انی خشیت علی نفسی)) اور پھر اس کے متصل ہی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے تسکین دہ الفاظ منقول ہیں تو یہ واقعہ کا ایسا پہلو ہے جس کی فطری صداقت اور غیر مصنوعی سادگی خود بخود دل میں اتر جاتی ہے اور واقعہ کا نقشہ اس طرح سامنے آ جاتا ہے کہ ایک صادق و امین ہستی اپنی پاک اور بے لوث زندگی کے ساتھ ایک غار میں محو استغراق ہے، اس کے قلب میں خدائے برتر کے لیے عشق سے سرشار جذبہ عبودیت موجزن ہے، وہ شرک اور گناہوں کی آلودگیوں سے نفور و بیزار گوشہ تنہائی کو پسند کر کے پہاڑ کے ایک غار میں سرگرم عبادت ہے، یہ سلسلہ اگرچہ عرصہ سے جاری ہے مگر اچانک ایک روز خدا کا فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) جو ہمیشہ سے خدا کے پیغمبروں کے پاس وحی لے کر آتا رہا ہے، اس پر ظاہر ہوتا ہے اور وحی الہی کی پیغام رسانی کرتے ہوئے اس کو نبوت و رسالت کی بشارت دیتا ہے۔ یہ ہستی چونکہ اس سے قبل اس منصب جلیل کی حقیقت سے نا آشنا تھی اس لیے اس حیرت زا خبر اور وحی الہی کی عظیم ترین روحانی قوت کے زبردست اثر نے جو فوری انقلاب ذات اقدس ﷺ میں پیدا کیا اس کی وجہ سے تشویش اور گھبراہٹ کا رونما ہونا ایک فطری بات تھی ”خشیت علی نفسی“ کی مراد یہ نہیں تھی کہ جان کا خوف آپ ﷺ کو پریشان کیے ہوئے تھا، ایک عربی نژاد، قریشی الاصل اور شخصی شجاعت کے مالک سے اس قسم کی توقع کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اس بار عظیم کو برداشت بھی کر سکے گا یا نہیں، چنانچہ اس اعلیٰ تاثر کو اس مقدس انسان کی رفیقہ حیات خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے محسوس کرتے ہوئے اس کے اخلاق کریمانہ اور اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا اور کہا کہ ایسی ہستی ناکام زندگی کے لیے نہیں ہوتی اور خدا کبھی آپ ﷺ کو رسوا نہیں کرے گا، اور

یعنی مجھے یہ خوف ہے کہ شاید میں وحی کے بار کو برداشت نہ کر سکوں۔

بخاری باب کیف بدء الوحی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔



پھر اس مقدس پیغمبر کو ورقہ کے پاس لے گئیں تاکہ ایک ایسے شخص سے جو عرصہ سے خدا کی وحی اور خدا کی کتاب کا ذکر کرتا رہتا ہے اس اجمال کی تفصیل معلوم کریں۔

اس صاف اور سادہ بات کو دیکھیے اور پھر بعض مستشرقین یورپ کی اس مضحکہ خیز نکتہ چینی پر نظر ڈالیے جو تعصب اور کوتاہ نظری کی عینک لگا کر کی گئی ہے۔

اگر پیغمبر اسلام پر حراء میں وحی الہی کا نزول اور فرشتہ کا ظہور ہوا ہوتا تو پھر آپ ﷺ وحی الہی سے فیضیاب ہو کر اور منصب رسالت کی بشارت سن کر یہ کیوں فرماتے ”انی خشیت علی نفسی“ اور خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تسکین دینے کی ضرورت پیش نہ آتی کیا آپ ﷺ کو خدا پر بھروسہ نہیں تھا۔

ہمیں تفاوت راہ از کجاست تا کجا، حقیقت حال کیا تھی اور اس کو رنگ و روغن دے کر کیا بنا دیا؟ یہاں نہ خدا پر عدم اعتماد کی کوئی جھلک ہے اور نہ فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول پر ریب و شک کا معاملہ ہے بلکہ اس حقیقت کے اعتراف ہی کی وجہ سے جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس کا ایک فطری تاثر ہے جو آپ ﷺ کی صداقت کا مزید ثبوت فراہم کرتا ہے، کیونکہ اگر اس کے برعکس کہیں آپ اس واقعہ کو اس طمطراق کے ساتھ پیش فرماتے کہ گویا ذات اقدس ﷺ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ جانی بوجھی بات ہے تب البتہ اس کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ اس شخص نے (دعوائے نبوت کے لیے) پہلے سے ایک منصوبہ قائم کر رکھا تھا، اور حراء کی خلوتیں بھی اسی مقصد کے لیے تھیں۔ چنانچہ اب موقع دیکھ کر اس نے یہ اعلان کر دیا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے۔

بہر حال اس مسئلہ پر ہم نے مختصر طور پر جو کچھ لکھا ہے علماء اسلام نے مختلف اسالیب بیان کے ساتھ اسی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے مثلاً: مشہور محدث و مفسر حافظ عماد الدین بن کثیر (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

ثم قال: ((لقد خشیت علی نفسی)) وذلك لانه شاهد امر الم یعهدہ قبل ذلك ولا کان فی خلدہ. \*  
 ”آپ ﷺ نے فرمایا: ((لقد خشیت علی نفسی)) یہ اس لیے فرمایا کہ آپ ﷺ نے ایک ایسی حقیقت کا آج مشاہدہ کیا کہ اس سے قبل اس سے واقف نہیں تھے اور نہ کبھی آپ ﷺ کے دل میں یہ خیال گزرا تھا کہ ایسا کچھ پیش آئے گا۔“  
 اور حکیم الامہ شاہ ولی اللہ دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی لطیف توجیہ کا حاصل یہ ہے:

”پھر آپ ﷺ پر غار حراء میں حق (وحی) کا نزول ہوا جب فرشتہ اور آپ ﷺ کے درمیان سلسلہ کلام ختم ہو گیا تو آپ ﷺ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی جس کو ہم اپنی زبان میں ”تشویش واضطراب“ سے تعبیر کرتے ہیں اور حقیقت میں یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی جس کا پیش آنا فطری تھا اس لیے کہ جب نزول وحی کی وجہ سے آپ کے بشری قوی پر ملکوتی صفات نے اثر کیا تو دو متضاد قوتوں کے درمیان تصادم اور پھر ملکوتی قوت کے غلبہ کی وجہ سے آپ ﷺ کے اندر تشویش پیدا ہو جانا یقینی تھا، یہی وجہ ہے کہ ابتداء نزول وحی کے بعد کچھ مدت تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا کیونکہ انسان بشریت اور ملکیت دو جہات کے درمیان محصور ہے، پس جس ہستی کی بشریت پر ملکوتی صفات غالب آ کر اس کو ظلمتوں سے نور کی جانب لے جاتی ہیں تو جس قوت کے ساتھ یہ غلبہ اپنا اثر کرتا ہے انسان اپنے اندر اسی شدت کے ساتھ بشریت و ملکیت کے



کے درمیان تصادم اور تزاوم محسوس کرتا ہے اور شدت تصادم کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ملکوتی قوت و استعداد کو اس درجہ کامل و مکمل کر دے جو منصب نبوت و رسالت کے لیے ضروری ہے حتیٰ کہ اس کی قوت بشری (قوت بیہمی و حیوانی) قوت ملکوتی کے ہاتھ میں پوری طرح تابع و اور منقاد ہو جاتی ہے، اور اب وہ ہستی جس کو فیضان نبوت سے سرفراز کیا گیا ہے مطمئن اور تصادم کی کشمکش سے بالاتر ہو کر اس منصب جلیل (نبوت و رسالت) کی خدمت کے قابل ہو جاتی ہے۔ ❀

### بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق:

”نبوت“ اور ”بشریت“ کے درمیان اس درجہ نازک رشتہ ہے کہ قرآن حکیم کی ”تعلیم“ سے قبل پیروان مذاہب و ادیان نے اس راہ میں بھی اعتدال کو ترک کر کے افراط و تفریط کو اسوہ بنا لیا تھا اور اس بارہ میں ان کو سخت ٹھوکر لگی تھی، چنانچہ بعض پیروان مذہب نے یہ دیکھ کر کہ نبی اور رسول باوجود اس امر کے کہ وہ انسان اور بشر کی شکل و صورت رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی افراد انسانی سے جدا ایسی خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے جو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے بھی دوسروں کو حاصل نہیں ہوتیں، اس لیے دراصل وہ بشر نہیں بلکہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے جس نے انسانوں کی نجات کے لیے جامہ بشریت اختیار کر لیا ہے۔ ❀ اس کے برعکس دوسری جماعت نے یہ کہا کہ نبوت و رسالت کوئی منصب نہیں ہے کہ خدا کی جانب سے ”عطیہ مناصب“ کی طرح دیا جاتا ہو بلکہ اخلاق کریمانہ اور صفات حمیدہ کا وہ اعلیٰ درجہ ہے جو ہر ایک انسان اپنی روحانی جدوجہد سے حاصل کر لے سکتا ہے اور کہتے ہیں کہ اگرچہ عطا و بخشش ہر شے کے لیے اسی کی جانب (خدا کی جانب) سے ہے لیکن کسی شے کا بطور ”منصب“ عطا ہونے کی حدود میں محدود رہنا اور روحانی جدوجہد سے ہر شخص کے حاصل کر لینے کے لیے اس کا دروازہ کھلا رہنا ان دونوں باتوں کے درمیان جو فرق ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ ”نبوت“ بھی اور درجات روحانیت کی ہی طرح ہے اور عطاء منصب کی شکل میں خاص امتیاز نہیں رکھتی۔

قرآن حکیم نے اس افراط و تفریط کو ختم کرنے کے لیے ”نبوت و رسالت کی حقیقت کو“ بہت عمدہ طریقوں سے آشکارا کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کی راہنمائی کے لیے جو مختلف درجات ہدایت کا سلسلہ قائم کیا ہے اس کا اعلیٰ درجہ ”ہدایت وحی“ کا ہے اور یہ انسان کی روحانیت اور مقصد حیات کی کامرانی کا کفیل و ضامن ہے اور جبکہ ہدایت کا یہ سلسلہ ”انسانی راہنمائی کے لیے“ ہے تو عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ درجہ ”انسان“ ہی کو بخشا جائے لیکن کیا ہر شخص کو جدا جدا بخش دیا جائے۔ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ یہاں درجات عقل مختلف ہیں اور درجات استعداد میں بھی تنوع موجود ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ کسی خاص ہستی کو اس کے لیے چن لیا جائے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انتخاب کی نوعیت کیا ہونی چاہیے یہ کہ جو عمدہ صلاحیتوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مجاہدات اور ریاضات کے ذریعہ نفس پر قابو پائے یا یہ کہ خدائے تعالیٰ جس کو یہ درجہ عطا فرمائے اس کی صلاحیتوں اور اس کی استعدادات کی تخلیق ہی اس طرح کر دے کہ صدق و امانت اس کا مایہ خمیر بنا ہوا ہو اور خارجی مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہ ہو۔ یہ جدا امر ہے کہ خدائے برتر کے سامنے اظہار عبودیت اور تقرب الی اللہ کے لامتناہی فیض سے فیض یاب ہونے کے لیے



اس سلسلہ کو بھی کلیۃً ترک نہ کرے۔ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عقل و بصیرت اس فیصلہ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ یہاں دوسری شکل عمل میں آنی چاہیے اس لیے کہ جس طرح خدائے برتر کے مقررہ قانون قدرت نے ”ہدایت وحی“ سے پہلے کے مختلف درجات ہدایت کو انسان کے مجاہدہ و ریاضت پر موقوف نہیں رکھا اور اس بخشش و فیض کو حسب حال ”عطیہ الہی“ کی حیثیت میں رکھا ہے یعنی ”وجدان“ ”حواس“ اور ”عقل“ ان سب درجات ہدایات کا جب یہی حال ہے کہ وہ جدوجہد سے نہیں بلکہ ”عطیہ الہی“ سے ملتے ہیں تو ”ہدایت وحی“ بھی جس کو بخشا جائے وہ بطور ”منصب و عطیہ“ کے ہی عطاء ہو، البتہ یہ از بس ضروری ہے کہ جس کو بھی بخشا جائے اس کی روحانی صلاحیتیں اور استعدادات ہر طرح اس منصب کی اہل ہوں اور ایسی ہستی کو عطاء نہ ہو کہ اس کی صلاحیت و استعداد عطاء کرنے والے کی بے سلیقگی پر چشمک زن ہو۔

غرض نبی اور ”رسول“ اس ہستی کو کہتے ہیں جو لوازم بشریت کے ساتھ اپنے تقدس و طہارت اور اخلاق حسنہ و اوصاف حمیدہ کے اس بلند مقام پر فائز ہو اور اس کے صفات صدق و امانت اس درجہ مسلم ہوں کہ اس کو ”بشر معصوم“ کہہ سکیں، وہ نہ خدا ہوتا ہے اور نہ ابن خدا بلکہ خدا کی جانب سے ”ہدایت وحی کا حامل“ مخلوق خدا کے لیے ”خدا کا اپنی“ اور ان کی ہر قسم کی ”رشد و ہدایت کا کفیل“ ہو، چونکہ وہ بشر ہے اس لیے افراد نسل انسانی سے تعلق رکھتا ہے، اور چونکہ ہر قسم کی آلودگیوں اور گناہوں سے پاک اور ”معصوم“ ہے اس لیے اس کو اللہ سبحانہ، کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل ہے۔ پس نبوت و رسالت کا بشریت کے ساتھ یہی وہ تعلق ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے بری اور حقیقت حال کے لیے آئینہ دار ہے اور اسی حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے خود زبان وحی ترجمان سے ظاہر فرمایا ہے: ((انما انا قاسم والله يعطي)) خدادینے والا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں۔ یعنی ایک جانب خدا سے ”وحی ہدایت“ حاصل کرتا ہوں اور دوسری جانب خدا کے بندوں تک اس کو پہنچا دیتا ہوں یہی میرا فریضہ رسالت و نبوت ہے اور اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے مختلف اسالیب بیان کے ساتھ اس سلسلہ کے غلط کار لوگوں کی ہدایت کے لیے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا﴾ (بنی اسرائیل: ۹۳)

”کہہ دیجئے، پاکی ہے میرے پروردگار کے لیے، میں نہیں ہوں مگر انسان، اور خدا کا اپنی (رسول)۔“

﴿قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبِ لَا سْتَكْتَرْتُ

مِنَ الْخَيْرِ ۗ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ۗ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ (الاعراف: ۱۸۸)

”وہی ہو کر رہتا ہے جو خدا چاہتا ہے اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا اور (زندگی میں)

کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا، میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لیے (گناہوں کی پاداش عمل سے) خبردار کرنے والا

اور (نیک عمل پر) بشارت دینے والا ہوں۔“

﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۗ وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا ۗ أَيْنَ مَا كُنْتُ ۗ﴾ (مریم: ۳۰-۳۱)

”(عیسیٰ علیہ السلام نے) کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھ کو (ہدایت انسانی کے لیے) کتاب دی اور مجھ کو ”نبی“ بنایا اور اس



نے مجھ کو بابرکت کیا، خواہ میں کسی جگہ ہوں۔“

﴿فَاتِيَهُ فَقَوْلًا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۚ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّنْ رَبِّكَ ۚ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ ﴿٤٧﴾﴾ (طہ: ۴۷)

”(موسیٰ و ہارون) اس (فرعون) کے پاس جاؤ اور کہو ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کر دے اور ان پر سختی نہ کر۔ ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے سامنے آگئے ان پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔“

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ ۚ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٦٥﴾﴾ (النساء: ۱۶۵)

”یہ تمام رسول (خدا پرستی و نیک عملی کے نتائج کی) خوشخبری دینے والے اور (انکار حق کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے (اور اس لیے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں اور (خدا اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔“

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٤٥﴾ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ﴿٤٦﴾﴾ (الاحزاب: ۴۵-۴۶)

”اے نبی! بلاشبہ ہم نے تجھ کو بھیجا ہے (حق پر) گواہی دینے والا اور (نیکی کے انجام پر) بشارت دینے والا اور (بدی کے انجام سے) ڈرانے والا اور بلانے والا اللہ کی راہ کی طرف اس کے حکم سے اور بھیجا روشن چراغ بنا کرے۔“

﴿عِلْمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ﴿٦٦﴾ إِلَّا مَن ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ﴿٦٧﴾ لِيَعْلَمَ أَن قَدِ ابْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ ﴿٦٨﴾﴾ (الجن: ۲۶-۲۸)

”وہ (خدا) غیب کی تمام باتوں کا جاننے والا ہے پس وہ اپنے غیب (کے معاملات) پر کسی کو خبردار نہیں کرتا مگر جس کو پیغمبر بنا کر چن لے، پس بلاشبہ وہ (خدا) اس رسول کے آگے اور پیچھے نگہبان چلاتا ہے (یعنی اس کو اس بات سے محفوظ رکھتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی خبر میں شیطان یا اس کا نفس کوئی ملاوٹ کر سکے اور اس کو شبہ پڑ جائے کہ یہ خدا کی وحی ہے یا کچھ اور) تاکہ خدا یہ ظاہر کر دے کہ انہوں نے (رسولوں نے) بلاشبہ اپنے پروردگار کے پیغام (ٹھیک ٹھیک) پہنچا دیئے۔“

ان آیات کی تفسیر میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب (نور اللہ مرقدہ) یہ تحریر فرماتے ہیں:

”یعنی رسول کو خبر دیتا ہے غیب کی، پھر جو کیدار (فرشتے) رکھتا ہے اس کے ساتھ کہ اس میں شیطان دخل نہ کرنے پاوے اور اپنا (رسول کا) نفس غلط نہ سمجھے یہی معنی ہیں اس بات کے کہ پیغمبروں کو عصمت ہے اور ان کو نہیں اور ان کا معلوم ”بے شک“



ہے اوروں کے معلوم میں شبہ ہے۔“

”نبی“ اور ”رسول“ سے متعلق مسطورہ بالا افراط و تفریط کے ساتھ ساتھ مشرکین عرب ایک نئی گمراہی میں مبتلا تھے وہ کہتے تھے کہ اول تو ”پیغمبر“ کا وجود ہی ہمارے لیے اچھے کی بات ہے، اور اگر یہ اچھا ہونا ہی تھا تو اس کے لیے ہماری طرح کا ایک انسان ہی کیوں چنا گیا کیوں ایک ”فرشتہ“ نہ بھیجا گیا اور اگر انسان ہی بھیجا تھا تو یا تو مکہ اور طائف کی کسی متمول سرمایہ دار ہستی کو پیغمبر بنایا جاتا ورنہ اس کو ہی غیب سے خزانے اور بے نظیر باغات عطاء کیے جاتے تب ہم سمجھتے کہ بیشک یہ خدا کا فرستادہ ہے:

﴿وَقَالُوا مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ۗ لَوْلَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونُ مَعَهُ نَذِيرًا ۙ أَوْ يُلْقَى إِلَيْهِ كَنزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا ۗ﴾ (الفرقان: ۷-۸)

”اور وہ (مشرکین) کہتے ہیں یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ایسا کیوں نہ ہو کہ اس کے ساتھ آسمان سے فرشتہ اترتا اور وہ خدا کے پیغام سے خبردار کرتا یا ایسا کیوں نہ ہو کہ (ہماری آنکھوں دیکھتے) اس پر آسمان سے خزانہ اتر آتا یا قدرتی باغ ہوتا کہ وہ (ہر وقت مرضی کے مطابق) اس سے (پھل) کھاتا۔“

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ ۗ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۗ أَتَصْبِرُونَ ۗ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا ۙ﴾ (الفرقان: ۲۰)

”اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی ایسے ہی پیغمبر بھیجے تھے جو کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے (یعنی پیغمبری کے لیے بشریت منافی نہیں ہے بلکہ انسانوں کے لیے انسان ہی کو پیغمبر ہونا چاہیے) اور ہم نے (انسانوں میں سے انسان ہی کو پیغمبر بنا کر) ایک دوسرے کی آزمائش کا سامان کر دیا کہ آیا تم صبر و استقامت کا ثبوت دیتے ہو یا نہیں اور تیرا پروردگار بلاشبہ (انسانوں کے کردار کا) دیکھنے والا ہے۔“

﴿وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكَ لَقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ۙ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكَ لَجَعَلْنَاهُ رَجُلًا ۙ وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبَسُونَ ۙ﴾ (الانعام: ۸-۹)

”اور وہ کہتے ہیں اس پر (محمد ﷺ) پر کیوں فرشتہ نہیں اتارا گیا اور اگر ہم فرشتہ اتارتے تو البتہ (نتائج اعمال کا) فیصلہ کر دیا جاتا اور پھر وہ مہلت نہ دیے جاتے اور اگر ہم اس کو فرشتہ کر دیتے تو بھی (انسانوں کی ہدایت کے لیے) اس کو بصورت انسان ہی ظاہر کرتے اور (اس طرح) ہم پھر ان لوگوں کو اس شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب مبتلا ہیں۔“

اس جگہ ان کی گمراہی کو دو دلائل سے واضح کیا ہے ایک یہ کہ ایمان و اعتقاد کی زندگی سر تا سر ”غیب“ سے متعلق ہے پس اگر انسان کو اسی عالم میں عالم غیب کے معاملات کا مشاہدہ کر دیا جائے اور پھر بھی وہ انکار پر جمار ہے تو خدا کا قانون ”امہال“ (مہلت کا قانون) نافذ نہیں ہوگا بلکہ نتائج اعمال کا فودا ہی ظہور ہو کر رہے گا اور ان کے لیے بھی مضر ہے اور خدا کی حکمت رحمت و ربوبیت کے بھی خلاف ہے دوسری دلیل یہ کہ انسانی دنیا میں اگر فرشتہ کے ذریعہ ”ہدایت وحی“ کو بھیجا جائے تو انسان کس طرح اس سے مانوس ہو سکتے



ہیں، پھر اگر اسے بھی انسان ہی کی شکل میں بھیجیں تو شبہ کرنے والوں کا شبہ اسی طرح قائم رہے گا۔ اس لیے عقل و نقل دونوں فیصلہ یہی ہے کہ ہدایت کے لیے ”انسان“ ہی کو مبعوث ہونا چاہیے۔

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا ﴿۹۴﴾  
قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَشْهَدُونَ لَنَزَلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكَاتٍ رَسُولًا ﴿۹۵﴾﴾

(بنی اسرائیل: ۹۴-۹۵)

”اور لوگوں کے پاس جب ہدایت آ پہنچی تو ان کو ایمان لانے سے کسی بات نے نہیں روکا مگر اس نے کہ وہ کہتے ہیں ”کیا خدا کسی بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجے گا“ اے پیغمبر! کہہ دیجئے اگر زمین پر انسانوں کی جگہ فرشتوں کی آبادی ہوتی اور وہ اس پر چلتے پھرتے تو ہم ضرور ان کے لیے آسمان سے فرشتہ کو ہی رسول بنا کر بھیجتے۔“

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۷۸﴾ وَ مَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا إِلَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ ﴿۷۹﴾﴾ (الانبیاء: ۷۸-۷۹)

”اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے بھی جن پر وحی نازل کی ہے وہ انسانوں کے سوا اور کچھ نہیں تھے پس (اے معترضین!) اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کر لو اور نہ ہم نے ان کو بے جان (دھڑ) بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ (خدا کی طرح) ہمیشہ رہنے والے تھے۔“

بہر حال ان آیات میں قرآن عزیز نے علمی اور تاریخی دونوں قسم کے دلائل سے یہ صاف کر دیا کہ کائنات انسانی کی ہدایت کے لیے ”انسان“ کا نبی اور ہادی ہونا فطری بات ہے اور اس لیے اقوام ماضیہ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ پھر اس مسئلہ کی جانب بھی توجہ کی ہے کہ نبوت و رسالت کا تعلق سرداری، سرمایہ داری اور جتھ بندی سے کچھ نہیں ہے اور اس کے لیے جن فطری اعلیٰ ملکات و استعدادات کی ضرورت ہے ان کے پیش نظر اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہے کہ کون اس ”منصب“ کا اہل ہے:

﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرِيبَاتِ عَظِيمٍ ﴿۳۱﴾ أَهْمُ يَقْسِبُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ﴿۳۲﴾ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرِيًّا ﴿۳۳﴾ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۳۴﴾﴾ (الزخرف: ۳۱-۳۲)

”اور وہ کہتے ہیں یہ قرآن کیوں ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی سردار پر نازل نہیں ہوا، (تو) کیا تیرے پروردگار کی رحمت کو یہ تقسیم کرنے والے ہیں، نہیں، بلکہ ہم نے ہی ان کے درمیان ان کی دنیوی معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ہم نے ہی بعض انسانوں کو بعض پر بلندی درجات عطا کی ہے تاکہ بعض بعض کے مسخر رہیں (یعنی بعض مقتدی ہوں اور بعض مقتدی، بعض پیغمبر ہوں اور بعض امتی) اور تیرے پروردگار کی رحمت (نبوت) اس (دولت و ثروت) سے (کہیں زیادہ) بہتر ہے



جو وہ خزانہ کیے ہوئے ہیں۔“

﴿وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ حَتَّى نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۗ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ﴾ (الانعام: ۱۲۴)

”اور جب ان کے پاس خدا کی جانب سے کوئی آیت آتی ہے تو یہ (مشرکین) کہتے ہیں ”ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم کو بھی وہی چیز (وحی) نہ دی جائے جو خدا کے رسولوں کو دی گئی (لیکن ایسا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ) اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنے منصب رسالت کو کس کے سپرد کرے۔“

اور یہ بات تو بہت واضح اور صاف ہے کہ جس شخص کو کوئی منصب عطاء کیا جائے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر طرح اس کے لیے جو ہر قابل اور اہل ہونا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک جو ہر قابل کو وہ ”منصب“ ملے کیونکہ معطلی کی مصلحت ہی خوب فیصلہ کر سکتی ہے کہ کس کو ملے اور کس کو نہ ملے چہ جائیکہ جو ہر قابل بھی نہ ہو۔ اس لیے ضروری ہوا کہ جو نبی اور رسول ہو وہ ہر حیثیت سے ”انسان کامل“ اور گناہوں سے ”معصوم“ ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو شخص بھی اخلاق حمیدہ اور روحانی مجاہدات کے ذریعہ ”تقدیس“ کا درجہ حاصل کر سکا ہو وہ منصب نبوت پر بھی ضرور فائز ہو۔

بہر حال نبوت ”منصب“ ہے۔ ”ڈگری“ نہیں ہے، اور اس لیے جن کو دیا بھی جاتا ہے ان کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ تم پر فضل خداوندی ہے ورنہ اگر وہ تم سے اس کو سلب کر لینا چاہے تو تمہاری طاقت بلکہ کائنات کی طاقت سے باہر ہے کہ پھر یہ تم کو مل سکے۔

﴿وَلَيْنَ شِئْنَا لَنذُهِبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا ۗ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۗ إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا ۗ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۶-۸۷)

”اور (اے پیغمبر!) اگر ہم چاہیں تو جو تجھ پر ہم نے وحی کی ہے اس کو چھین لیں اور پھر تجھ کو کوئی بھی ایسا کارساز نہ ملے جو ہم پر زور ڈال سکے، لیکن (یہ جو سلسلہ وحی جاری ہے تو) اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تیرے پروردگار کی رحمت سے ہے اور یقین کر کہ تجھ پر تیرے پروردگار کا بڑا ہی فضل ہے۔“

### نبی اور مصلح:

مسطورہ بالا تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چونکہ ”نبی“ اور ”رسول“ کو براہ راست خدائے برتر سے شرف مکالمت حاصل ہوتا ہے یا خدا کا معصوم فرشتہ خدا کی وحی لا کر سنا تا ہے اس لیے اس کا ذریعہ علم ”علم یقین“ کا درجہ رکھتا ہے جس میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی اور اس کے علاوہ تمام ذرائع علم یقین کے اس درجہ سے نیچے ہیں بلکہ ان کی افادیت ”ظن“ سے آگے نہیں بڑھتی اس لیے اگر ایک مرد صالح اپنی قوم یا نوع انسانی کی اصلاح حال کے لیے کوئی قدم اٹھائے تو مقدس سے مقدس تر ہونے کے باوجود اس کے اپنے طریقہ اصلاح میں غلطی کا وقوع اور امکان دونوں موجود رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات وہ ایسی فاش غلطی کر گزرتا ہے کہ اس سے فائدہ پہنچنے کی بجائے قوم کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس لیے ایک ”نیکوکار مصلح“ یہ کبھی دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ اصلاح حال کے لیے جو



کچھ اپنی جانب سے کہتا ہے غلطی سے پاک ہے مگر ایک ”نبی“ اور ”رسول“ کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ یہ بھی اعلان کرے کہ میں خدا کی جانب سے اصلاح حال کے لیے خدا کا پیغام رساں ہوں اور یہ بھی دعویٰ کرے کہ وہ جو ”تعلیم اصلاح“ پیش کر رہا ہے، خدا کا فرمودہ ہے اور اس لیے ہر قسم کی غلطی اور لغزش سے پاک اور محفوظ ہے وہ یہ نہیں کہے گا کہ یہ میرے دل کی آواز ہے یا اندر سے جو آواز آتی ہے اس کا نتیجہ اور ثمرہ ہے بلکہ صاف صاف یہ کہے گا کہ اس میں میرا اپنا کچھ نہیں میں تو صرف اپنی اور پیغامبر ہوں یہ جو کچھ بھی ہے خدا کا فرمان اور اس کی ”وحی“ ہے۔

چنانچہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ ان دونوں باتوں کو واضح کیا ہے وہ کہتا ہے کہ ہر ایک پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اعلان کر دیں کہ خدا نے ان کو اپنی ”ہدایت وحی“ کے لیے جن لیا ہے اور وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ ان پر وحی کیا جاتا ہے اس کو حرف بہ حرف امت تک پہنچائیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۱ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلَتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحْ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِّنْ اِلٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۲﴾ (الاعراف: ۶۱-۶۲)

” (نوح علیہ السلام) نے کہا اے میری قوم! مجھ کو گمراہی سے کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ میں تو تمام کائنات کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں تم تک اپنے پروردگار کی جانب سے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی باتوں میں سے وہ باتیں جانتا ہوں جن سے تم بے خبر ہو۔“

اور حضرت ہود علیہ السلام اور قوم کے درمیان مکالمہ میں حضرت ہود علیہ السلام نے یہ اعلان فرمایا:

﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاہَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلَتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نٰصِحٌ اٰمِيْنٌ ۝۱۷﴾ (الاعراف: ۶۷-۶۸)

” (ہود علیہ السلام نے) کہا: اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں لیکن میں جہانوں کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں میں اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور (پیغام الہی اور خیر خواہی میں) صاحب امانت ہوں۔“

اور حضرت صالح علیہ السلام نے یہ فرمایا:

﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبَلَّغْتُكُمْ رِسٰلَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَاَلٰكِنْ لَا تُحِبُّوْنَ النَّصِيْحِيْنَ ۝۱۹﴾

(الاعراف: ۷۹)

” (صالح علیہ السلام نے) کہا: اے قوم! بلاشبہ میں نے تم کو اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہی کرنے والوں کو ناپسند کرتے ہو۔“

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے یہ ارشاد فرمایا:



﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ۖ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا ۗ يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۗ﴾ (مریم: ۴۱-۴۳)

”اور یاد کرو کتاب (قرآن) میں ابراہیم کا حال، بلاشبہ تھا وہ بہت ہی صادق اور نبی جب اس نے اپنے باپ سے کہا: ”اے باپ! ایسی چیز کی پوجا کیوں کرتا ہے جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ تجھ کو کسی (نقصان) سے بے پرواہ کرتی ہے (یعنی بت پرستی کیوں کرتا ہے؟) اے باپ! بلاشبہ مجھ کو علم (وحی) سے وہ حصہ ملا ہے جو تجھ کو حاصل نہیں ہے پس میری پیروی کر میں تجھ کو سیدھی راہ دکھلاؤں گا۔“

اور لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے مکالمہ کرتے ہوئے یہ فرمایا:

﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطُ أَلَا تَتَّقُونَ ۚ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَاطِيعُونَ ۗ﴾ (الشعراء: ۱۶۱-۱۶۴)

”جب کہا ان سے ان کے بھائی (لوط) نے کیا تم پر ہیزگاری اختیار نہیں کرتے بلاشبہ میں تمہارے لیے خدا کا بھیجا ہوا ہوں (اور اس پیغامبری میں) صاحب امانت ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔“

اور حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کے ایک طویل حیرت زا واقعہ کے ضمن میں یعقوب علیہ السلام کا وہ مقولہ بھی منقول ہے جس میں انہوں نے اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام کو وحی الہی کے ذریعہ یہ بشارت دی ہے کہ جس طرح خدا نے تیرے باپ دادا، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کو پیغمبری عطا فرمائی اسی طرح تجھ کو بھی اس منصب جلیل سے سرفراز کرے گا۔

﴿وَكَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَتْهَا عَلَىٰ أَبِيكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَاسْحَقَ ۗ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۗ﴾

(یوسف: ۶)

”اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو چن لے گا اور تجھ کو تعبیر رویا کا علم بخشے گا اور تجھ پر اپنی نعمت (نبوت) کی تکمیل کرے گا اور اولاد یعقوب پر (جو اس کے اہل ہوں گے) جیسا اس نے اس سے پہلے تیرے باپ دادا ابراہیم، اسحاق پر اس (نبوت) کو پورا کیا بیشک تیرا پروردگار جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔“

اور پھر یوسف علیہ السلام کی تبلیغ و دعوت کا اس طرح قرآن میں مذکور ہے:

﴿يُصَاحِبِي السَّجْنَءَ أَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۗ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَيِّئَاتُهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۗ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ ۗ أَمَرَ إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۗ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۗ﴾ (یوسف: ۳۹-۴۰)



”اے میرے قید کے رفیقو! کیا بہت سے آقا اور خداوند بہتر ہیں یا یکتا خدا کی ذات جو ہر شے پر غالب ہے تم اس کے سوا جس کو پوجتے ہو ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے گھڑ لیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کوئی دلیل نہیں اتاری اور حکم تو خدا کے سوا کسی کا نافذ نہیں، اس نے یہی حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، دین کی سیدھی راہ یہی ہے۔ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔“

اور حضرت شعیب علیہ السلام نے اصحاب ایکہ کے سامنے یہ اعلان کیا:

﴿كَذَّبَ أَصْحَابُ لُعَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۷۶﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ ﴿۱۷۷﴾ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱۷۸﴾ إِنْ لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۷۹﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أَمْرَهُ ﴿۱۸۰﴾﴾ (الشعراء: ۱۷۶-۱۷۹)

”اصحاب ایکہ نے پیغمبروں کو جھٹلایا، جب ان سے شعیب علیہ السلام نے کہا: کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، بلاشبہ میں تمہارے لیے (خدا کی جانب سے) صاحب امانت پیغامبر ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔“

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں بے دھڑک یہ اعلان فرمایا:

﴿وَقَالَ مُوسَىٰ يُفْرِعُونَ إِنْ لِي رَسُولٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۸۱﴾ حَقِيقٌ عَلَيَّ أَنْ لَا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ﴿۱۸۲﴾ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۱۸۳﴾﴾ (الاعراف: ۱۰۴-۱۰۵)

”اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے فرعون! بلاشبہ میں جہانوں کے پروردگار کا پیغمبر ہوں میرے لیے یہی لائق ہے کہ میں خدا کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہوں، میں تمہارے پروردگار کی طرف سے ”دلیل“ لے کر آیا ہوں، پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو (آزاد کر کے) بھیج دے (جن کو صدیوں سے غلام بنا رکھا تھا)۔“

اور حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعہ میں سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو دعوت اسلام کے لیے جو نامہ مبارک تحریر فرمایا تھا اس کا اسلوب بیان یہ ہے:

﴿إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿۳۰﴾ أَلَّا تَعْلَمُوا عَلَيَّ وَأُتُوْنِي مُسْلِمِينَ ﴿۳۱﴾﴾

(النمل: ۳۰-۳۱)

”یہ سلیمان علیہ السلام کی جانب سے ہے اور یہ شروع ہے اللہ کے نام سے جو رحمن ہے رحیم ہے بات یہ ہے کہ مجھ پر اپنی بلندی و برتری کا اظہار نہ کر (کیونکہ میں بادشاہ نہیں بلکہ پیغمبر ہوں) اور میرے پاس خدا کی فرمانبرداری بندگی بن کر حاضر ہو۔“

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل ایک علاقہ میں خدا کے چند نبی دعوت و تبلیغ اسلام کے لیے مامور کیے گئے تھے انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا:

﴿قَالُوا رَبَّنَا عَلِّمْنَا لِنَا إِذَا كُنَّا مِنَ الْغَايِبِينَ ﴿۱۷۰﴾ وَإِنَّا لَنَرِيكَ فِي الْعِلْمِ بِرَبِّنَا عِلْمًا ﴿۱۷۱﴾﴾ (النمل: ۱۷-۱۶)

”انہوں نے کہا ہمارا پروردگار (خوب) جانتا ہے کہ بلاشبہ ہم تمہاری جانب اس کے بھیجے ہوئے ہیں اور ہمارے اوپر اس



سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں کہ امر حق کا صاف اور کھلا پیغام پہنچادیں۔“

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بار بار بنی اسرائیل کے سامنے یہ اعلان فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور میری بتلائی ہوئی راہ کے سوا کوئی راہ مستقیم نہیں کیونکہ میں جو کچھ بھی پیش کر رہا ہوں خدا کا فرمودہ ہے:

﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ آتَنِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۖ﴾ (مریم: ۳۰)

”(عیسیٰ علیہ السلام نے) کہا بلاشبہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھ کو ”کتاب“ عطا کی ہے اور اس نے مجھ کو ”نبی“ بنایا ہے۔“

﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ﴾ (الصف: ۶)

”جب کہا عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نے اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب خدا کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں (رسول ہوں)۔“

اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی دعوت و تبلیغ میں تو جگہ جگہ یہ حقیقت بہت نمایاں نظر آتی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۗ﴾ ﴿۱۵﴾ ﴿وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا﴾ ﴿۱۶﴾ (الاحزاب: ۴۵-۴۶)

”اے نبی! بلاشبہ ہم نے تجھ کو (حق کے لیے) گواہ اور (نیک عملی کے لیے) بشارت دینے والا اور (بد عملی کے نتائج سے) ڈرانے والا اور خدا کے حکم سے اس کی جانب بلانے والا اور (ہدایت و صراط مستقیم کے لیے) روشن چراغ بنایا ہے۔“

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ۗ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ فَأَمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۗ النَّبِيُّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَتِهِ ۗ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ ﴿۱۵۸﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

”(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے ”اے لوگو! بیشک میں تم سب کی جانب اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اسی کے لیے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی کوئی خدا نہیں ہے مگر صرف وہی یکتا ذات، (وہی) زندگی بخشا ہے اور وہی موت دیتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول ”نبی اُمی“ پر جو خود اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان لاتا ہے اور اس کی پیروی کرو تا کہ تم راہ پاؤ۔“

﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ ﴿۱۹﴾ (آل عمران: ۱۹)

”بلاشبہ اللہ کے نزدیک (ہمیشہ سے) دین (حق) اسلام ہی ہے۔“

﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ ﴿۸۵﴾ (آل عمران: ۸۵)

”جو شخص اسلام کے سوا کوئی دین بنانا چاہے تو خدا کے یہاں وہ مقبول نہیں ہے۔“



غرض پیغمبر اور نبی کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوت اصلاح اور تعلیم حق پر خود بھی ایمان لائے اور کائنات کے سامنے بھی یہ اعلان کرے کہ یہ ”پیغام ہدایت“ اور یہ ”تعلیم حق“ میری جانب سے نہیں بلکہ خدا کی جانب سے ہے اور اسی نے مجھ کو اپنا اپنی بنا کر اس کی دعوت کے لیے بھیجا ہے یہ جو کچھ ہے سب خدا کا اپنا ہے میں تو صرف اس کی جانب پکارنے والا ہوں اور اس میں شک و شبہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اور یہ ہر قسم کی لغزش و خطا سے پاک ”علم یقین“ اور ”وحی الہی“ ہے جس کے متعلق خدا کا یہ فیصلہ ہے:

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (ختم السجده: ۴۲)

اور

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (النجم: ۳-۴)

لیکن ”مصلح غیر نبی“ کو یہ مجاز حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوت اصلاح کے بارہ میں یہ دعویٰ کرے، کیونکہ اس کی یہ دعوت اصلاح یا کسی پیغمبر اور نبی کی ”ہدایت وحی“ کی پیروی میں ہوگی، تب تو اس کی حیثیت ایک یاد دہانی کرنے والے کی ہے اور یا ہدایت وحی کے اتباع کے ساتھ اس کے اپنے اجتہاد اور ضمیر کی آواز کا بھی دخل ہوگا تو اس کے اس حصہ اصلاح کا لغزش، خطا بلکہ بعض اوقات غلط روی سے بھی محفوظ رہنا لازمی اور ضروری نہیں ہے۔

### کیفیت وحی:

وحی سے متعلق جو حقائق سپرد قلم ہو چکے ہیں ان میں ایک یہ اضافہ بھی قابل توجہ ہے: عربی میں وحی کے معنی ”مخفی اشارہ“ کے ہیں، گویا یہ فطرت الہی کی وہ سرگوشی ہے جو ہر ایک مخلوق پر اس کی راہ عمل کھولتی ہے، چنانچہ قرآن نے شہد کی مکھی کے نظام بیت کے متعلق فطری ہدایت کو لفظ ”وحی“ سے ہی تعبیر کیا ہے:

﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنْ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ﴾ (النحل: ۶۸)

(النحل: ۶۸)

”اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اسی غرض سے بلند کی جاتی ہیں اپنے لیے چھتے بنائے۔“

اور مذہب و دین کی اصطلاح میں اس الہام کو کہتے ہیں جو خدائے برتر کی جانب سے نبی اور پیغمبر پر اس طرح القاء یا فرشتہ کے ذریعہ نازل کیا جاتا ہے کہ اس مقدس ہستی کو اس کے منجانب اللہ ہونے کا روز روشن سے بھی زیادہ یقین حاصل ہو جاتا ہے اور کسی قسم کے بھی شک و شبہ اور تردد کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اسی لیے وہ تحدی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ ”خدا کی وحی“ اور اس کا بخشنا ہوا ”علم یقین“ ہے نزول وحی کی یہ صورت کس طرح پیش آتی ہے اور کون سے وہ طریقے ہیں جن کے ذریعہ نبی معصوم کو خدا کی وحی کا علم ہوتا ہے؟ قرآن عزیز اس کے متعلق یہ کہتا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ



بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥١﴾ (الشوری: ۵۱)

”اور کسی انسان کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے (اس دنیا میں بالمواجہہ) گفتگو کرے مگر یا وحی (کے القاء) کے ذریعہ یا پس پردہ یا بھیج دے فرشتہ کو پس وہ اس کی (خدا کی) اجازت سے اس پر وحی لا اُتارے جو اس کی (خدا کی) مرضی ہو بلاشبہ وہ (خدا) بلند و بالا حکمت والا ہے۔“

غرض ”وحی“ ایک خاص ذریعہ علم کا نام ہے جو خدا کی جانب سے اس کے نبیوں اور رسولوں کے لیے مخصوص ہے اور اس کا تعلق براہ راست عالم قدس اور عالم غیب سے ہے اسی بنا پر اگرچہ انبیاء و رسل کو اس کی معرفت اور اس کے منجانب اللہ ہونے کا یقین کامل آفتاب عالمتاب سے زیادہ بدیہی ہوتا ہے لیکن وہ اس کو حقیقی کیفیت کو دوسروں پر تشبیہ و تمثیل ہی کے ذریعہ واضح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جب بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت اقدس ﷺ سے نزول وحی کی کیفیت کے متعلق سوالات کیے تو آپ نے یہ جوابات ارشاد فرمائے:

((احیاناً یاتینی کصلصلة الجرس)) ”کبھی یوں معلوم ہوتا ہے گویا گھنٹہ کی مسلسل گونج ہے۔“

((دوی کدوی النحل)) ”(کبھی) جس طرح شہد کی مکھیوں کی بھنھناہٹ سے گونج پیدا ہوتی ہے اس طرح کی گونج محسوس کرتا ہوں۔“

((واحیاناً یتمثل لی الملک رجلاً فاعی ما یقول)) ”اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں ظاہر ہو کر مجھ کو خدا کی وحی سناتا ہے اور میں اس کو محفوظ کر لیتا ہوں۔“

ان جوابات میں کیفیت وحی کو اگرچہ قریب الفہم بنانے کی کافی کوشش کی گئی ہے پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حقیقی کیفیت کو خدا اور خدا کے پیغمبر کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں پاسکتا اور پیغمبر اس حقیقت کا اذعان اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر غیر متبدل یقین تو رکھتا ہے لیکن غیر نبی پر حقیقی کیفیت کو واضح کرنے سے معذور ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لیے کہ یہ صورت حال تو دنیا کی بن دیکھی اشیاء کے بارہ میں صبح سے شام تک ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً جس شخص نے سب کو نہیں دیکھا اور نہیں چکھا اس کے سامنے دیکھنے اور چکھ لینے والا اگرچہ سب کی حقیقت کا بہتر سے بہتر نقشہ بھی پیش کر دے اور اس کے رنگ، مزہ، خوشبو، لطافت وغیرہ کی تعبیر بحد کمال بھی پہنچا دے تب بھی وہ شخص سب کو آنکھ سے دیکھنے اور زبان سے چکھ لینے والے کے مقابلہ میں کسی طرح اس کی حقیقی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو سکتا وہ بلاشبہ سب کے متعلق صحیح علم تو حاصل کر سکتا ہے لیکن حقیقی ذوق کو ہرگز نہیں پاسکتا اسی طرح نبی کی تعلیم و تلقین سے ہم ”وحی“ کے متعلق ایک اجمالی علم ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کی حقیقی کیفیت کو نہیں پاسکتے۔

نبی اکرم ﷺ نے قرآن میں مسطور ہر سہ اقسام وحی میں سے پہلی قسم ((الاحیاء)) کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: ((وہو اشدہ علی فیفصم عنی وقد وعیت ما قال)) اور وحی کی یہ صورت مجھ پر بہت سخت گزرتی ہے پھر جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو وحی الہی نے جو کچھ کہا ہوتا ہے وہ سب مجھے محفوظ ہوتا ہے یعنی جب فرشتہ بشکل انسان تمثیل اختیار کر کے وحی الہی لاتا ہے یا ((من وراء حجاب)) براہ راست خدائے برتر سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے تو یہ دونوں صورتیں آپ ﷺ پر آسان ہوتی ہیں مگر ”القاء وحی“ کی پہلی شکل سخت گزرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے متعلق علماء حق یہ ارشاد فرماتے ہیں:

خالق کائنات نے انسان کو لوازم بشریت کی قیود و شروط کے ساتھ اس درجہ پابند بنا دیا ہے کہ انبیاء و رسل جیسی مقدس اور



معصوم ہستیوں کو بھی اپنی تطہیر و تقدیس کے باوجود ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے اس لیے جب ان پر خدا کی وحی کا نزول ہوتا اور ایسی حالت میں ان پر عالم قدس کے تمام اثرات چھا جاتے اور انوار و تجلیات کی آغوش میں وہ حضرت حق سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں تو اس حالت میں ان پر دو قسم کی کیفیتوں میں سے ایک کیفیت ضرور طاری ہوتی ہے ایک یہ کہ اس کے بشری خواص کو مغلوب کر کے اس کی روحانی کیفیات کو عالم قدس کی جانب اس درجہ بلند اور رفیع کیا جائے کہ وہ حضرت حق کی وحی کے اثرات قبول کرنے اور محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکے اور چونکہ جذب و انجذاب کی اس خاص حالت اور عالم آب و گل سے عالم قدس کی جانب اس مخصوص رفعت میں بشری خصوصیات اور روحانی مؤثرات کے درمیان سخت قسم کا تصادم پیدا ہو جاتا ہے اس لیے اس تصادم اور تزام سے نبی پر ابتداءً ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ جب یہ تصادم ختم ہو کر یہ عالم قدس کے تمام پاک اور لطیف اثرات اس ہستی پر چھا جاتے ہیں اور وہ ان میں محو اور مستغرق ہو کر لذت وحی کو پا جاتی ہے تو پھر یہ اذیت و تکلیف یک لخت جاتی رہتی ہے اور اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور یہ سب کچھ چند دقیقوں میں ہو گزرتا ہے۔

یہی وہ صورت وحی ہے جس کی کیفیات کو ذات اقدس ﷺ نے ((صلصلة الجرس)) اور ((دوی النحل)) کی تمثیلات میں سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے تمثیلات میں اس پہلو کے اختیار کرنے کی وجہ بھی مسطورہ بالا حقیقت ہے اس لیے کہ اس صورت خاص میں جب بشری حواس و ادراکات پر عالم قدس کے روحانی اثرات کا غلبہ ہوتا ہے تو اول حواس و ادراکات میں اضطراب و بے چینی پیدا ہو جاتی ہے اور حواس سمع کہ جس کا تعلق سماعت وحی سے ہے وہ شروع میں ایک خاص قسم کی گونج محسوس کرتا ہے جو اس عالم پست سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی اور اس کے بعد وہ ”وحی الہی“ کی اصل کیفیت سے لذت اندوز ہوتا اور اس کو ”علم یقین“ اور ”اذعان حق“ کے ساتھ پالیتا ہے کیونکہ عالم قدس کے قوی مؤثرات اس پر غالب آ کر ”وحی الہی“ کے حصول کا ہر طرح اہل بنا دیتے ہیں مگر دوسروں پر اس حقیقت کے تمام و کمال سمجھانے میں ان علامات و اثرات کے اظہار سے آگے نہیں جاتا جن کو ابھی ((صلصلة الجرس)) اور ((دوی النحل)) کی تعبیرات میں سن چکے ہو۔ وحی الہی کی اس نوع کے علاوہ دوسری ہر دو انواع ”یعنی وراء حجاب کلام الہی کی سماعت یا فرشتہ کے ذریعہ وحی کے نزول“ میں صورت حال برعکس ہوتی ہے اور اس وقت نبی کے بشری خواص کو عالم قدس کی جانب رفعت دینے اور عالم خاک و گل سے عالم نور کی جانب جذب و انجذاب سے متاثر کرنے کی تکلیف نہیں دی جاتی بلکہ عالم قدس کی تمام کیفیات خود، ہبوط و نزول کرتی اور نبی کی روحانیت کو متاثر بناتی ہیں اور یا فرشتہ بحکم حضرت حق اپنے ملکوتی جسد کو جامہ انسانیت کے ساتھ متمثل کر لیتا اور عالم قدس کے اثرات اور بشری خواص میں امتزاج پیدا کر کے نبی کے حضور حاضر ہوتا اور وحی الہی کی تلاوت کرتا ہے اور اس لیے ان دونوں صورتوں میں نبی اور رسول کو پہلی قسم کے تصادم سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

### کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی:

چونکہ یورپ کے دور علمی کی بنیاد خالص مادیات پر قائم ہے اور روحانی علوم اور ماوراء مادیات کے ناقابل انکار حقائق کے لیے وہ کوئی جگہ دینے کو آمادہ نہیں ہے، اس لیے بعض مستشرقین نے جب وحی الہی کی پہلی قسم کے متعلق نبی اکرم ﷺ کے وہ اقوال سنے جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اور وہ حالات پڑھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نزول وحی کی اس خاص صورت میں آپ ﷺ کرب اور



اضطراب محسوس فرماتے اور سردی کے ایام میں آپ ﷺ کی پیشانی پر پسینہ آ جاتا اور آپ ﷺ پر بے خودی کے سے آثار نظر آنے لگتے تو انہوں نے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی کہ یہ نزول وحی کی کیفیت نہیں ہوتی تھی بلکہ (العیاذ باللہ) آپ ﷺ کو ہسٹریا کا دورہ ہو جاتا تھا۔

مستشرقین پر زور الفاظ میں آپ ﷺ کی صداقت و امانت کو تسلیم کرتے ہیں، آپ کی تعلیمات حق کو سراہتے اور کائنات انسانی کے لیے آپ کی تعلیمات کو ”تعلیم کامل“ مانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کے دعویٰ ”الہام و وحی الہی“ کا انکار کرتے اور کیفیت وحی کو مرض سے تعبیر کرتے ہیں۔ ﴿سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝﴾

درحقیقت یہ حضرات یا تو ازراہ تعصب ناقابل انکار تعلیم حق کے تسلیم کے ساتھ ساتھ ایک ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جس سے تعلیم حق (اسلام) پر کاری ضرب لگ سکے اور تعصب کے الزام سے بھی بچ جائیں اور یا پھر اس علمی حقیقت سے بے بہرہ ہیں جس کو تفصیل کے ساتھ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ نزول وحی کی یہ کیفیت ”مرض“ نہیں تھا بلکہ اپنے اثرات اور محرکات کی بناء پر ایک فطری صورت حال تھی جس کا پیش آنا از بس ضروری تھا اور دراصل یہ کیفیت دماغ، حواس اور اعضائے انسانی کو مفلوج نہیں بناتی تھی جیسا کہ ہسٹریا وغیرہ میں ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس تمام مادی قوی میں روحانی کوائف کی ایسی برقی رودروا دیتی ہے جس سے چند لمحات کے بعد ان کے اندر ایسی زبردست اور مانوق المادہ قوت پیدا ہو جاتی تھی جس کے ذریعہ اس ہستی (نبی) میں عالم قدس سے پوری طرح وابستہ ہو کر خدا کی وحی اور اس کے کلام کو سننے اور قلب و دماغ میں بخوبی محفوظ رکھنے کی صلاحیت رونما ہو جائے۔ چنانچہ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا:

((فیفصم عنی وقد وعیت ما قال))۔

”شدت و کرب کی یہ کیفیت جلد ہی مجھ سے زائل ہو جاتی ہے اور میں وحی الہی کو تمام و کمال محفوظ کر لیتا ہوں۔“

کیا ہسٹریا کے دوروں کا کوئی مریض ایسا پیش کیا جاسکتا ہے جس پر ایک جانب مرض کا مسلسل حملہ ہو رہا ہو اور دوسری جانب وہ علمی و عملی صلاحیتوں، معاشی و معادی حکمتوں، اور دینی و دنیوی رفعتوں کے لیے ایسا کامل و مکمل دستور و آئین اور اعمال و افکار پیش کر رہا ہو، کائنات جس کا جواب نہ رکھتی ہو اور دوست و دشمن دونوں اس کی رفعت و بلندی کا اعتراف کرتے ہوں؟ کیا دماغی فتور جو کہ ہسٹریا کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اور دماغی رفعت و بلندی جس کے ثمرات حیرت زا اور عملی دنیا میں واقع سے واقع تر ہوں دونوں یکجا جمع ہو سکتے ہیں؟ اور اگر نہیں ہو سکتے اور بلاشبہ نہیں ہو سکتے تو حقیقت حال کو نظر انداز کرتے ہوئے ”وحی الہی سے متعلق“ مستشرقین کا یہ دعویٰ کس درجہ حقیر اور بے وقعت ہو جاتا ہے صاحب عقل و بصیرت اس کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں؟

### نزول وحی کا پہلا دور:

نبی اکرم ﷺ پر سب سے پہلے سورہ علق کی یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَأْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِي

عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمُ ۝۵﴾ (العلق: ۱-۵)



”پڑھو! اپنے پروردگار کے نام سے، جس نے پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو خون بستہ سے، پڑھو! اور تیرا پروردگار جو سب سے زیادہ برگزیدہ ہے وہ ہستی ہے جس نے سکھایا لکھنا، سکھایا انسان کو وہ سب کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔“

ان آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت انسان جو خدا کی سب سے بہتر اور سلسلہ کائنات کی سب سے ترقی یافتہ مخلوق ہے اور اسی وجہ سے وہ کائنات ہست و بود میں ”خلیفۃ اللہ“ کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہے اس کی خلقی کمزوریوں کا یہ حال ہے کہ اس کی نمود کی ابتداء آب نجس اور خون بستہ سے ہوئی ہے لیکن قدرت حق نے جب اس کو مقام رفیع بخشنے کا ارادہ کیا اور ”اسفل سافلین“ کے لائق مخلوق کو ”درجات علیا“ پر فائز کرنا چاہا تو اس کو وہ صفت اعلیٰ عطا فرمائی جو صفات الہی میں مبداء الصفات ہے یعنی اس کو ”صفت علم کا مظہر“ بنایا اس کو ”قلم کے ذریعہ“ لکھنا سکھایا اور علوم و عرفان کا مہبط و محور ٹھہرایا پھر اس جانب بھی اشارہ کیا کہ یہ سلسلہ اسباب و مسببات حصول علم کے تین ہی طریقے ہیں ”ذہنی، لسانی، رسمی“ اور علم ذہنی الفاظ اور رسوم و نقوش کا محتاج نہیں ہوتا اور علم لسانی علم ذہنی کا محتاج ہے مگر رسوم و نقوش کتابت سے بے نیاز اور علم رسمی، رسم الخط اور نقوش کا بھی محتاج ہے پس اگر ”علم رسمی“ کا کسی جگہ مذکور ہو تو لسانی اور ذہنی علوم کا ذکر خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے سے بلند ہر دو علوم کے لیے بہترین معبر ہے اور ظاہر ہے کہ علم رسمی ”قلم“ کا محتاج ہے لہذا قرآن عزیز نے ﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ کہہ کر لطیف پیرایہ بیان میں اس پوری حقیقت کو واضح کر دیا اس کی مزید تشریح ﴿عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ سے کر دی اور اس معجزانہ اسلوب کی غرض و غایت یہ ہے کہ ایک جانب ”علم“ اور ”نبوت“ کے درمیان کیا علاقہ ہے اس کا اظہار ہو جائے اور دوسری جانب انسان کو اپنے مقصد حیات کا صحیح علم ہو جائے۔

### نزول وحی کا دور اور :

غار حراء میں منصب نبوت سے سرفرازی کے وقت سورہ علق کی یہ چند آیات نازل ہو کر وحی الہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، حکمت الہی کا تقاضا یہ ہوا کہ حراء میں فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول سے فوری طور پر نبوت و رسالت کے جو خصائص و اثرات ذات اقدس ﷺ پر وارد ہوئے ہیں وہ اچھی طرح راسخ ہو جائیں اور صلاحیت و استعداد نبوت و رسالت کی تکمیل ہو جائے تاکہ آئندہ سلسلہ وحی کے قوی موثرات و محرکات پیغمبر ﷺ کے بشری خواص کے اجنبی نہ رہیں اس لیے کچھ عرصہ کے لیے نزول وحی کا سلسلہ بند رہا۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں ”فترت وحی“ کہتے ہیں۔

لیکن ذات اقدس ﷺ کو حراء میں پیش آمدہ کیفیت و صورت حال سے جو فطری تشویش پیدا ہوتی تھی جب اس نے سکون و طمانیت کی شکل اختیار کر لی تو نزول وحی کی روحانی کیفیات نے اس درجہ لطف اندوز کیا کہ آپ ﷺ اس ”فترت“ کو برداشت نہ کر سکے اور لطیف و عمیق جذبات نے اس حد تک اضطراب و بے چینی کی شکل اختیار کر لی کہ گاہ نا موس اکبر (جبریل امین علیہ السلام) ظاہر ہو کر آپ ﷺ کو صبر و تسکین کی دعوت دیتے اور یقین دلاتے تھے کہ اپنی تمام لطفوں اور حسن و کمال کے ساتھ نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے اور ”فترت“ کا یہ دور محض عارضی ہے اس لیے آپ اندوہ نہیں نہ ہوں تپ آپ تسکین پاتے اور وقت موعود کے منتظر رہتے کہ کچھ عرصہ بعد نزول وحی کا دوسرا دور شروع ہوا اور سب سے اول سورہ مدثر کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ ﴿

﴿ فترتہ کا زمانہ کس قدر رہا ہے اس سلسلہ میں چھ ماہ سے ڈھائی سال تک کے متعلق روایات پائی جاتی ہیں اور محدثین کا رجحان چھ ماہ کی طرف زیادہ ہے۔



﴿يَا أَيُّهَا الْمَدَّثِرُ ۝۱ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝۴ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝۵ وَلَا تَمُنُّ بِتَسْتِكْبَرِ ۝۶ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝۷﴾ (المدثر: ۱-۷)

”اے کملی پوش اٹھ (اور لوگوں کو گمراہی کے انجام سے) ڈرا اور اپنے پروردگار کی عظمت و جلال کو بیان کر اور لباس کو پاک کر اور بتوں سے جدا رہ اور زیادہ حاصل کرنے کی نیت سے حسن سلوک نہ کر اور اپنے پروردگار کے معاملہ میں (اذیت و مصیبت پر) صبر اختیار کر۔“

ان آیات نے گویا انسانی مقصد حیات کی تکمیل کردی کیونکہ سورہ علق میں کہا گیا تھا کہ انسانیت کبریٰ کے لیے ”صحیح علم“ شرط ہے، یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ علم صحیح کی رفعت و بلندی کے اعتراف کے باوجود انسانیت کی تکمیل اس وقت تک ناممکن ہے کہ علم صحیح کے ساتھ ”عمل صحیح“ بھی موجود ہو اس لیے کہ اگر علم صحیح ہے اور عمل صحیح مفقود تو اس کی افادیت معطل اور بیکار ہے اور اگر عمل ہے اور علم صحیح نادر تو وہ عمل موجب زیان و نقصان ہے، رشد و ہدایت اور صراط مستقیم کے لیے دونوں ہی کا وجود ضروری ہے اور تب ہی ”انسان“ ”انسانیت کبریٰ“ حاصل کر سکتا ہے۔

غرض جس طرح سورہ علق کی آیات نے ”علم نافع“ کی جانب اشارات کیے اسی طرح سورہ مدثر نے ”عمل نافع“ کی اساسی تفصیل ظاہر کی ہیں خدا کی ہستی اور اس کی ربوبیت کاملہ کا عملی اعتراف، باطنی طہارت و پاکیزگی کا کمال ظاہری طہارت و پاکی کا لزوم، بے غرض اور بے لوث اخلاق حمیدہ کی اساس ”احسان“ پر استقامت اور قبول حق اور نیک عملی کے نتائج پر ”صبر“ ان آیات کا حاصل ہیں اور یہی وہ بنیادی امور ہیں جن میں علم حق اور عمل صحیح کی تمام کائنات سمودی گئی ہے۔

نیز ذات اقدس ﷺ کے لیے سورہ علق اور سورہ مدثر کا یہ خطاب اور پیغام حق، اشارہ ہے اس جانب کہ یہ نظام عمل منصب رسالت کے لیے ”تکمیل نفس“ اور دعوت رشد و ہدایت کے لیے ”مرتبہ اولین“ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہی مستقبل قریب میں ”بعثت عامہ“ کا باعث ثابت ہوگا۔

### اعلان دعوت و ارشاد کی پہلی منزل:

کلام الہی کے اس حکم کے بعد جو کہ تبلیغ و دعوت حق کا پہلا پیغام تھا دعوت و ارشاد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اب ذات حق نے سورہ شعراء کی آیات نازل فرما کر نبی اکرم ﷺ کو یہ فیصلہ سنایا کہ سب سے پہلے اہل قرابت اور رشتہ داروں کو دعوت حق دیجئے کہ دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑے اور یوں بھی قریش اور بنی ہاشم کے قبول حق کا اثر تمام عرب قبائل پر پڑنا لازمی ہے اس لیے کہ وہ سب قبائل کے سرخیل اور سرگردہ ہیں اور ساکنان حرم ہونے کی وجہ سے تمام عرب پر ان کا دینی اور دنیوی اثر ہے۔ سورہ شعراء میں ہے:

﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ۝۱۳ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝۱۴ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنَّي بِرَبِّي ۝۱۵ مِمَّا تَعْمَلُونَ ۝۱۶ وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝۱۷ الَّذِي يَرِيكَ حِينِ



تَقَوْمٌ ۚ وَ تَقَلُّبِكَ فِي السَّجِدِينَ ۝ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۲۱۹﴾ (الشعراء: ۲۱۴-۲۲۰)

”اور (اے پیغمبر!) اپنے قریبی ناتے والوں کو (گمراہی سے) ڈرا اور جو مسلمان تیرے پیرو ہیں ان کے لیے اپنے بازوؤں کو پست رکھ (یعنی نرمی اور تواضع سے پیش آ) اگر وہ نافرمانی کریں تب تو ان سے کہہ دے میں تمہارے ان اعمال (بد) سے بری ہوں اور غالب رحم کرنے والی ذات پر بھروسہ کر جو تجھ کو اس وقت بھی دیکھتی ہے جب تو اس کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے اور اس وقت بھی جبکہ تو سجدہ کرنے والوں میں مل کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے بلاشبہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔“

گویا یہ ”تکمیل علم و عمل“ اور ”منصب رشد و ہدایت کے فیضان“ کے بعد دوسرا درجہ تھا، جس میں اعلانِ حق اور دعوتِ اسلام کی عملی صورت اختیار کرنے کے لیے تحریک کی گئی، چنانچہ صحیح روایات شاہد ہیں کہ آپ ﷺ نے صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اس زمانہ کے طریقِ اعلان کے مطابق ”یا صباحا“ ”یا صباحا“ کہہ کر خانوادہ قریش کو پکارا اور جب سب جمع ہو گئے تو ایک مثال دے کر سمجھایا کہ بلاشبہ میں خدا کا پیغمبر اور رسول اور صراطِ مستقیم کے لیے ہادی برحق ہوں ارشاد فرمایا:

”لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک لشکرِ جرار جمع ہے اور تم پر حملہ کے لیے آمادہ، تو کیا تم مجھ کو صادق سمجھو گے۔ ((اد مصدق؟)) لوگوں نے کہا ہم نے تجھ کو ”الصادق الامین“ پایا ہے تو جو کچھ کہے گا حق اور صداقت پر مبنی ہوگا تب آپ ﷺ نے فرمایا: تو لوگو! میں تم کو خدائے واحد کی جانب بلاتا ہوں اور اصنام پرستی کی نجاست سے بچانا چاہتا ہوں، تم اس دن سے ڈرو، جب خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال و کردار کا حساب دینا ہے۔“

یہ صدائے حق جب قریش کے کانوں میں پہنچی تو وہ حیران رہ گئے اور باپ دادا کے دین ”بت پرستی“ کے خلاف آواز سن کر برا فروختہ ہونے لگے گویا سب میں ایک آگ سی دوڑ گئی اور سب سے زیادہ آپ ﷺ کے حقیقی چچا ابو لہب کو طیش آیا اور غضبناک ہو کر کہنے لگا:

تَبَالَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ اَمَا دَعَوْتَنَا الْاِبْهَذَا.

”تو ہمیشہ بلاکت و رسوائی کا منہ دیکھے کیا تو نے اس غرض سے ہم کو بلایا تھا۔“

عجب منظر ہے کہ چند گھڑیاں پہلے جس محمد بن عبد اللہ کی صداقت و امانت اور خصائلِ حمیدہ سے ساری قوم متاثر رہ کر اس کی عظمت و عزت کرتی اور اس کے ساتھ والہانہ محبت کا اظہار کرتی تھی وہی آج اس اعلان پر ”کہ میں محمد رسول اللہ ہوں“ یکنخت بیگانہ و نفور اور خون کی پیاسی بن گئی۔

### دعوت و ارشاد کی دوسری منزل:

سیرت کی کتابوں میں پڑھ آئے ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے خاندان اور برادری کے لوگوں کو راہِ حق دکھانے اور ان کی ایمانی اور اخلاقی حالت درست کرنے کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا مگر قریش کے چند اصحاب کے سوائے کسی نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک نہ کہا

﴿ تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۳۸ ﴾

﴿ سورہ لہب کا نزول ابو لہب کی اسی گستاخانہ جرأت کے انجامِ بد کا اظہار کرتا ہے۔ ﴾



اور عداوت و بغض کو اپنا شعار بنائے رکھا تب دعوت و ارشاد نے ترقی کے تیسرے زینہ پر قدم رکھا اور ذات حق کی جانب سے حکم ہوا: اے داعی حق! خاندان اور برادری کے انکار و جھوٹ سے متاثر و غمگین نہ ہو اور اپنی مفوضہ خدمت پر استقامت کے ساتھ قائم رہو کیونکہ سعادت و شقاوت تمہارے قبضہ میں نہیں ہے تمہارا کام تو صرف ابلاغ (پہنچانا) ہے۔ البتہ اب خاندان کے دائرہ سے آگے بڑھ کر مکہ اور اطراف مکہ کے قبائل و اقوام کو بھی یہ پیغام حق سناؤ اور دعوت و ارشاد کا یہ تحفہ ان کے سامنے بھی رکھو تا کہ جو سعید روحمیں ”پیغام حق“ کے لیے مضطرب اور بے چین ہیں وہ اس پر لبیک کہہ کر تسکین پائیں اور روح تشنہ کو آب حیات سے سیراب کریں۔

﴿وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبْرَكٌ مُّصَدِّقٌ لِّلَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا﴾

(الانعام: ۹۲)

”اور (دیکھو) یہ کتاب (قرآن) ہے جسے ہم نے (توراة کی طرح) نازل کیا، برکت والی اور جو کتاب اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس لیے نازل کی تاکہ تم اُم القریٰ (یعنی شہر مکہ) کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے چاروں طرف ہیں (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ۔“

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنذِرَ اُمَّ الْقُرَىٰ﴾ (الشوری: ۷)

”اور اسی طرح ہم نے تم پر قرآن نازل کیا زبان عربی میں تاکہ (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ شہر مکہ کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے آس پاس ہیں۔“

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے تبلیغ حق کو مکہ کی تحدید سے آزاد کر کے اطراف مکہ کے لیے عام کر دیا اور طائف، حنین اور یثرب (مدینہ) تک اپنی صدائے حق کو پہنچایا بلکہ مہاجرین کے ذریعہ حبشہ کے عیسائی بادشاہ اصمہ تک کو کلمہ حق سنایا۔

### بعثت عامہ :

اس کے بعد دعوت و ارشاد کی وہ تیسری منزل پیش آئی جو ”بعثت محمدی“ کا نصب العین اور مقصد و حید، اور تمام انبیاء و رسل ﷺ کے مقابلہ میں ذات اقدس محمد ﷺ کی بعثت کے لیے طغرائے امتیاز تھی، یعنی خدائے برتر نے آپ کی بعثت کو ”بعثت عام“ قرار دیا اور حکم ہوا کہ آپ ﷺ نہ صرف قریش کے لیے، نہ صرف اُم القریٰ (مکہ) اور اطراف مکہ کے لیے نہ صرف عرب کے لیے نبی و رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں بلکہ آپ ﷺ کی بعثت تمام کائنات انسانی کے لیے ہوئی ہے اور آپ ﷺ عرب و عجم اور اسود و احمر سب کے لیے پیغامبر اور خدا کے اپنی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (سبا: ۲۸)

”اور ہم نے آپ کو کائنات انسانی کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے (اعمال نیک پر) خوش خبری سنانے اور (اعمال بد پر) لوگوں کو ڈرانے کے لیے اور اکثر (جاہل) لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔“

﴿تَبٰرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝۱﴾ (الفرقان: ۱)



”پاک اور برتر ہے وہ ذات جس نے حق و باطل کے درمیان تمیز دینے والی کتاب نازل فرمائی اپنے بندے محمد ﷺ پر تاکہ وہ تمام جہان والوں کو (انجام بد سے) ڈرائے۔“

### دعوت اسلام کا مجمل خاکہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تفسیر:

نبی اکرم ﷺ سرزمین عرب میں مبعوث ہوئے اس لیے فطری طریق کار کے پیش نظر سب سے اول قوم عرب ہی ان کی دعوت و ارشاد کا مخاطب قرار پائی تاکہ جو قوم کل چوپایوں کی گلہ بان تھی نور نبوت سے مستنیر ہو کر کائنات انسانی کی گلہ بان بن جائے اور خدائے برتر کے سب سے بزرگ ترین پیغمبر و رسول کے سایہ رحمت میں تربیت پا کر کائنات ہدایت کے لیے ”خیر امۃ“ کا لقب پائے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ عرب جیسی سرکش، جاہل، تمدن و حضارۃ سے یکسر محروم اور اخلاقی و ملی جذبات و احساسات سے قطعاً منحرف قوم پر ”اسلام کی دعوت“ نے فوری طور پر کیا اثر کیا تاکہ ہم بآسانی یہ اندازہ کر سکیں کہ جس مذہب کے بنیادی اصول و عقائد اور افکار و اعمال نے ایسی قوم کے تمام شعبہ ہائے حیات میں حیرت زار اور عظیم الشان انقلاب پیدا کر کے اس کو روحانی دنیا کا انسان بنا دیا اس مذہب کی صداقت کے لیے تنہا یہ ایک کارنامہ ہی روشن دلیل بن سکتا ہے۔

مشرکین مکہ کی پیہم مخالفت ایذا رسانی اور ہولناک طریقہ ہائے عذاب نے جب مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت کو افریقہ کے رملک حبشہ کی جانب ہجرت پر مجبور کر دیا اور وہ عیسائی حکمران اصحمہ کی حکومت میں پناہ گزین ہو گئے تو سرداران قریش اس کو بھی برداشت نہ کر سکے اور اصحمہ کے دربار میں مشاہیر کا ایک وفد بھیج کر یہ مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو اس لیے ان کے حوالہ کر دے کہ یہ بد دین ہو کر اور باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر قوم میں تفرقہ پیدا کرنے کا باعث بنے اور یہاں رہ کر بھی حکمران کے دین کے مخالف ہیں۔ اصحمہ نے وفد کا مطالبہ سن کر مسلمانوں کو جواب دہی کے لیے دربار میں طلب اور اسلام کے متعلق دریافت حال کیا، تب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام سے متعلق تقریر فرمائی اور اس کی مقدس تعلیم کا مختصر اور جامع نقشہ کھینچ کر اصحمہ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ یہی وہ تقریر ہے جو دراصل عرب کے دور جاہلیت اور قبول اسلام کے دور کی انقلابی کیفیت کا مجمل مگر بہترین خاکہ ہے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بادشاہ اور درباریوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

”بادشاہ! ہم پر ایک طویل تاریک زمانہ گزرا ہے اس وقت ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے تھے اور خود ساختہ پتھروں کی پوجا ہمارا شعار تھا مردار خوری، زنا کاری، لوٹ مار، قطع رحمی صبح و شام کا ہمارا مشغلہ، ہمسایوں کے حقوق سے بیگانہ، رحم و انصاف سے ہم نا آشنا اور حق و باطل کے امتیاز سے ہم ناواقف، غرض ہماری زندگی سرتا سر درندوں کی طرح تھی کہ قوی ضعیف کو کچلنے اور توانا، ناتواں کو ہضم کر لینے کو اپنے لیے فخر اور طغرائے امتیاز سمجھتا تھا۔

رحمت خدا کا کرشمہ دیکھیے کہ اس نے ہمارے اندر ایک بزرگ پیغمبر مبعوث کیا جس کے نسب سے ہم واقف جس کی صداقت، امانت و عصمت پر دوست و دشمن دونوں گواہ، جس کی قوم نے اس کو ”محمد الامین“ کا لقب دیا، وہ آیا، اور اس نے ہم کو خدا کی توحید کا سبق دیا خدائے واحد کی جانب بلایا اس نے بتلایا کہ خدا کا کوئی سہیم و شریک نہیں وہ شرک سے پاک ہے بت پرستی جہالت کا شیوہ ہے اس لیے قابل ترک ہے اور صرف خدائے واحد ہی کی عبادت حق عبدیت ہے اس نے ہم کو حق گوئی اور صداقت شعاری کی تلقین کی اور صلہ رحمی کا حکم فرمایا، ہمسایوں اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک سکھایا، قتل و



غارت کی رسم بد کو مٹایا، زنا کاری کو حرام اور فحش کہہ کر اس ننگ انسانیت عمل سے ہم کو نجات دلائی، نکاح میں محارم اور غیر محارم کا فرق بتایا، جھوٹ بولنے، ناحق مال یتیم کھانے کو حرام فرمایا، نماز اور خیرات و صدقات کی تعلیم دی اور ہر حیثیت سے ہم کو حیوانیت کے تعرذلت سے نکال کر انسانیت کبریٰ کے مرتبہ پر پہنچایا۔

بادشاہ! ہم نے اس مقدس تعلیم کو قبول کیا اور اس پر صدق دل سے ایمان لائے یہ ہے ہمارا وہ تصور جس کی بدولت یہ مشرکین کا وفد تجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو ہم کو ان کے حوالے کر دے۔“

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام کے صاف اور سادہ مگر روشن اصول کو جب اھمہ کے سامنے جرأت حق کے ساتھ پیش کیا تو حبشہ کے حکمران نے مسلمانوں کو اپنی پناہ سے نکال کر وفد کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا اور پھر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے خوش الحانی کے ساتھ سورہ مریم کی چند آیات تلاوت کیں تو نجاشی حبشہ بے حد متاثر ہوا اور آبدیدہ ہو کر اسلام کی صداقت پر ایمان لے آیا اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے دست حق پرست پر مشرف باسلام ہو گیا۔

یہ ہے دعوت اسلام کا مختصر خاکہ جس نے دنیا کے شب رنگ اور تاریک ترین خطہ انسانی کو ایک بہت ہی قلیل عرصہ میں مثل آفتاب تابناک اور روشن ترین بنا دیا۔ اس خاکہ میں اعتقادات، اخلاق اور اعمال حسنہ کا وہ تمام عطر موجود ہے جس کو قرآن عزیز نے مختلف سورتوں میں حسب حال اور مناسب مقام پر بکثرت بیان کیا ہے بلکہ پورا قرآن انہی روشن حقائق کا ہادی اور مرشد ہے۔

### قرآن اور تجدید دعوت:

نبی اکرم ﷺ کی بعثت جبکہ بعثت عام ہے تو از بس ضروری ہوا کہ کائنات انسانی کی رشد و ہدایت کے لیے خدا کا جو پیغام آپ ﷺ کے ذریعہ آئے وہ آخری پیغام اور کامل و مکمل پیغام ہو اور فطرت کے ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو کہ عقل سلیم اور فطرت مستقیم تمام کائنات انسانی کے لیے اس کو ابدی اور سرمدی پیغام یقین کرے اسی پیغام الہی کا نام ”القرآن“ یا ”الکتاب“ ہے۔ قرآن کی تعلیم اور اس کی دعوت و اصلاح کی حقیقت معلوم کرنے سے قبل چند لمحات کے لیے مذاہب عالم کی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

قرآن کے نزول سے قبل کائنات انسانی پر چار مذہبی تصور حاوی اور فکر و نظر ذہنی پر اثر انداز تھے: ہندومت۔ مجوسی۔ یہودی اور مسیحی۔

ہندومت تصور الہی کے متعلق خواص اور عوام کے لیے دو جدا جدا تخیلات رکھتا تھا خواص کے لیے وحدۃ الوجود اور عوام کے لیے اصنام پرستی، وحدۃ الوجود کا تصور اس درجہ فلسفیانہ تھا کہ خدا کا صحیح تصور کسی طرح اس راہ سے ممکن نہ تھا اس لیے کہ اگر ایک جانب وہ ہر وجود کو خدا یا خدا کا جزء مانتا ہے تو دوسری جانب خدا کے لیے کوئی محدود و متعین تخیل بتانے سے عاجز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندومت کے تمام اسکولوں (مذہب) میں اصنام پرستی ہی کو مذہبی امتیاز رہا اور وہ توحید خالص کو مقبول خواص و عوام نہ بنا سکا۔ چنانچہ ویدک دھرم، بدھ مت، جین مت وغیرہ بلکہ جدید اصلاحی اسکول (مذہب) آریہ سماج سب کے سب توحید خالص کے تصور سے خالی ہیں۔

سیرت ابن ہشام جلد اول و تاریخ ابن کثیر ج ۳

یہاں وہ وحدت الوجود مراد ہے جو یوگیانہ تصور کا نچوڑ ہے۔



مجوسی مذہب کا اعتقادی تصور تو صاف صاف ”ثنویت“ کی بنیادوں پر قائم ہے یعنی وہ خدا کے تصور و تخیل کو خیر و شر کی جدا جدا دو متقابل قوتوں میں تقسیم کر دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ نور اور خیر کا خدا ”یزداں“ اور ظلمت و شر کا ”اہرمن“ ہے اور اس طرح خدائے خیر اور خدائے شر دو خدا کائنات ہست و بود پر متصرف اور باہم متقابل ہیں۔

یہودی مذہب اگرچہ خدا کے تصور میں مدعی توحید رہا ہے لیکن موجودہ تورات کے اوراق شاہد ہیں کہ اس کی نگاہ میں خدا کی ہستی تجسم سے پاک نہیں ہے اسی لیے تورات کا تخیلی خدا کہیں حضرت یعقوب علیہ السلام سے کشتی لڑتا نظر آتا ہے اور یعقوب علیہ السلام اس کو پچھاڑ دیتا ہے، اور کہیں اس کی انتزیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے چیخا نظر آتا ہے، کبھی وہ بنی اسرائیل کو اپنی چیمٹی بیوی بنا لیتا ہے تو کبھی مصر سے خروج کے وقت بادل اور آگ کا ستون بن کر بنی اسرائیل کی راہنمائی کرتا نظر آتا ہے اور کبھی اس کی آنکھیں دکھنے آ جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور اس تصور کا آخری مظاہرہ حضرت عزیر (عزرا) علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کرنے پر مشتمل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح مسیحی تصور بھی تجسم و تشبہ کے چکر میں آ کر حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مان لیتا اور اس طرح مشرکانہ عقیدہ ”اوتار“ کا تخیل اپنا لیتا ہے اور اقا نیم ثلثہ (مثلیث) اور مریم پرستی میں حقیقی خدا پرستی کو گم کر بیٹھتا ہے خدا کی ہستی سے متعلق یہ وہ تصورات تھے جن میں دنیا کے بڑے بنیادی مذاہب نزول قرآن کے وقت بتلا نظر آتے ہیں۔

ان سب مذاہب میں توحید حقیقی سے غفلت نے رسالت یعنی دعوت حق کے داعی کی شخصیت کے متعلق بھی غلط تصورات پیدا کر دیے تھے چنانچہ ہندوستان کے مذہبی تصور میں تو رسالت و نبوت اپنے صحیح معنی میں نظر ہی نہیں آتی اور وہ نبی و رسول کے مفہوم سے ہی یکسر نا آشنا نظر آتا ہے اور مجوسی، یہودی اور مسیحی مذاہب کے معتقدات میں اگر یہ تصور پایا بھی جاتا ہے تو افراط و تفریط کی شکل میں کبھی ”ابن اللہ“ ہو کر اور کبھی ”بداخلاق و بد اعمال انسان“ کا پیکر بن کر جیسا کہ تورات میں حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی بیٹیوں کا ان کے ساتھ اختلاط کا واقعہ مذکور ہے (العیاذ باللہ من هذه الخرافات والافتراءات)

گویا ان کے نزدیک یا تو ”رسول“ اور داعی حق کی شخصیت کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی اور یا پھر خدا، خدا کا اوتار اور خدا کا بیٹا بن کر سامنے آتی ہے اور اس لیے جس طرح وہ حقیقی توحید سے بیگانہ نظر آتے ہیں اسی طرح رسالت و نبوت کے صحیح تصور سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔

اسی طرح عالم آخرت کے متعلق بھی ان مذاہب کے تصور کی دنیا افراط و تفریط سے خالی نہیں تھی بعض مذاہب میں تو کائنات انسانی مختلف چولوں کے چکر میں گرفتار نظر آتی اور آواگون (تناخ) کے ناقص فلسفیانہ نقطہ نگاہ کا رہن منت بنی ہوئی ہے اور ایک حد پر پہنچ کر ”برہم“ یعنی خدا میں جذب ہو جانا نجات کا آخری نقطہ متعین کیا جاتا ہے۔ نیز خیر و شر کی جزا و سزا کے بارہ میں ایک قادر مطلق خدا نہیں بلکہ ایک جبری قانون میں جکڑی ہوئی مجبور ہستی کا تصور پیش کرتا ہے اور بعض اگرچہ تناخ کے غلط عقیدہ سے جدا یوم معاد اور یوم حساب کے تصور سے آشنا بھی ہیں لیکن ان کے نزدیک بھی عالم آخرت کا معاملہ اعمال صالحہ و سیئہ یا افعال و کردار کے حق و باطل کی جزا و سزا سے وابستہ نہیں ہے بلکہ نسلی امتیازات اور جماعتی فرقہ بندی اور یا پھر کفارہ کے ساتھ مربوط ہے۔

ان چار بنیادی مذاہب عالم کے علاوہ مشرکین اور فلاسفہ کی بعض ایسی جماعتیں بھی تھیں جو نہ خدا کی ہستی کی قائل ہیں اور نہ عالم آخرت کی اور خدا کی ہستی پر اگر ایمان بھی رکھتی تھیں تو سینکڑوں ہزاروں بلکہ بے تعداد بتوں کی باطل پرستی کے ساتھ ملوث و مجروح۔



غرض یہ تھے مذاہب عالم کے وہ ذہنی تصورات اور فکری معتقدات جن پر کائنات انسانی کی روحانی اور سرمدی سعادت کا مدار سمجھا جاتا تھا اور جو بلاشبہ اپنے نتائج و ثمرات کے لحاظ سے کائنات انسانی کو مشعل ہدایت دکھا کر ”انسانیت کبریٰ“ کے درجہ تک پہنچانے اور انسانوں کا خدا کے ساتھ حقیقی معبود و عبد ہونے کا رشتہ قائم کر کے دین و دنیا کی خیر و فلاح تک پہنچانے میں قطعی تہی دامن تھے۔ ان ہی حالات میں ”اسلام“ کی دعوت و تبلیغ یا ”تعلیم حق“ نے رونمائی کی اور کائنات انسانی کے ہر شعبہ حیات میں گونا گوں انقلاب پیدا کر کے نیا عالم پیدا کر دیا اور آفتاب ہدایت کی روشنی سے منور بنا کر اس کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔

## توحید:

نبی اکرم ﷺ نے خدا کے کلام (قرآن) کے ذریعہ سب سے پہلے اسی عقیدہ توحید پر روشنی ڈالی اور توحید خالص کی حقیقت واضح کر کے تمام کائنات انسانی کو اس کی جانب دعوت دی۔

قرآن عزیز کی دعوت توحید کا حاصل یہ ہے کہ اللہ ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو اپنی ذات و صفات میں ہر قسم کے شرک سے پاک اور وراء الوراء ہے، نہ اس کا کوئی سہیم و شریک ہے اور نہ اس کا ہمتا و ہمسر، اس لیے ”ابنیت“ کا عقیدہ ہو یا ”اوتار“ کا، صنم پرستی ہو یا وثنیت و تثلیث، یہ سب باطل ہیں وہ یکتا و بے ہمتا ہے، باپ، بیٹا اور اس قسم کی نسبتوں سے پاک ہے، پرستش کے قابل وہ خود ہے نہ کہ اس کے مظاہر اور اس کی مخلوقات، وہ جس طرح تجسم و تشبہ سے بالاتر ہے اسی طرح اس کا نہ کوئی مقابل ہے اور نہ کوئی حریفانہ سہیم۔

﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۝﴾ (البقرہ: ۲۵۵)

”اللہ“ اس ہستی کا نام ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود اور خدا نہیں ہے، اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی نہ خدا ہے نہ معبود، وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اور زندگی کا بخشنے والا۔“

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ۝﴾ (النساء: ۳۶)

”پس تم اللہ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔“

﴿لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝﴾ (لقمان: ۱۳)

”اللہ کا کسی کو شریک نہ بنا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔“

﴿وَالْهَكْمُ لِلَّهِ وَاحِدٌ ۝﴾ (البقرہ: ۱۶۳)

”اور خدا تمہارا ایک ہی ہے۔“

یہ اور اسی مضمون کی بے شمار آیات ہیں جو قرآن عزیز میں توحید خالص کی داعی اور مناد ہیں لیکن سورہ اخلاص یا سورہ توحید میں جس معجزانہ اختصار کے ساتھ توحید سے متعلق موجودہ مذاہب کے ناقص اور غلط تصورات کو باطل کرتے ہوئے توحید خالص کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہ خود اپنی نظیر ہے:



﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۝ وَ لَمْ يُولَدْ ۝ وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝﴾

(الاخلاص: ۱-۴)

”(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے اللہ یکتا ذات ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ اس کا کوئی ہمسر اور سہیم و شریک ہے۔“

ایک مرتبہ توحید سے متعلق مذاہب عالم کی تعلیم پر اور نظر کیجئے اور پھر ان چند مختصر آیات کو غور و فکر کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے تو آپ اندازہ کر سکیں گے کہ پہلی دو آیات میں توحید خالص کا صحیح اور حق تصور پیش کر دیا گیا ہے، قرآن کہتا ہے کہ اللہ ایسی ہستی کا نام ہے جو یکتا و بے ہمتا ہے، ساری کائنات اس کی محتاج ہے اور وہ ہر قسم کی احتیاج سے پاک اور بے نیاز ہے وہ صمد ہے یعنی مجموعہ کمالات صرف صمدیت کا حصہ ہے اور بس۔

اس کے بعد وہ نصاریٰ اور یہود سے مخاطب ہو کر شمع ہدایت دکھاتا ہے کہ اللہ اس ہستی کو کہتے ہیں جو باپ اور بیٹے جیسی فانی نسبتوں سے بالاتر ہے وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا، تعالیٰ اللہ علوا کبیرا اور اسی طرح ہندو دھرم سے کہتا ہے کہ ایسی لازوال ہستی کی مقدس شان اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ کسی انسان یا حیوان کے جسم میں محدود ہو کر ”اوتار“ کہلائے یا اس معبود مطلق کے ساتھ چھوٹے معبودوں کا سلسلہ قائم کر کے کسی مخلوق کو اس کا سہیم و شریک ٹھہرایا جائے۔ سُبْحٰنَكَ هَذَا بَهْتَانٌ عَظِيْمٌ اور وہ مجوس اور ویدک دھرم کے ان پجاریوں کو مخاطب کرتا ہے جو اس کو یزداں کہہ کر اہرمن کو اس کا مقابل حریف تسلیم کرتے ہیں یا روح (جیو) اور مادہ (پر کرتی) کو خدا کے ساتھ ازلی وابدی (قدیم و غیر مخلوق) کہہ کر ان چیزوں کو خدا کا کفو اور ہمسر بتلاتے ہیں اور کہتا ہے ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾ خدا اس ہستی کا نام ہے جس کا نہ کوئی ہمسر اور حریف ہے اور نہ اس کی طرح انادی (قدیم) اور غیر مخلوق ہے۔

غرض قرآن عزیز نے خدا کی ذات واحد سے متعلق ان تمام نسبتوں کا قطعی انکار کر کے جو توحید خالص کے کسی طرح بھی معارض ہوتی تھیں اس کو یکتا اور بے ہمتا ظاہر کیا ہے اور اس طرح شرک فی الذات اور شرک فی الصفات کا قلع قمع کر دیا ہے اور شرک فی الالوهیة اور شرک فی الربوبیة کے خلاف توحید اور صرف توحید کو ہی اسلام کا بنیادی تصور قرار دیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جس طرح قرآن نے توحید کے تمام اطراف و جوانب کو نقص و خام کاری سے پاک کر کے حقیقی توحید کے تصور کی جانب راہنمائی کی اور ہر قسم کے تجسم سے وراء الوراہ بتلا کر توحید کامل کی جانب دعوت دی اسی طرح اس نے توحید کے اس فلسفیانہ عقیدہ کو بھی باطل ثابت کیا جو اس باب میں تفریط کی حد تک بڑھ کر صفات الہی کا بھی منکر ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ قادر ہے بغیر قدرت کے، خالق ہے بغیر خلق کے، بصیر ہے بغیر رویت کے، سمیع ہے بغیر سمع کے وغیرہ وغیرہ۔ اس عقیدہ کا حاصل یہ ہے کہ خدا ایسی ہستی کا نام ہے جس کے لیے ”تعطل“ لازم ہے جیسا کہ پہلی تعلیمات کا حاصل یہ تھا کہ کسی نہ کسی رنگ میں خدا کے لیے تجسم ضروری ہے۔

قرآن نے کہا کہ پہلی کیفیت اگر افراط پر مبنی تھی تو یہ تفریط پر قائم ہے اس لیے کہ ایک ذات کے لیے متعدد صفات کمال کا ہونا ذات کی وحدت پر اثر انداز نہیں ہے اس لیے بلاشبہ وہ سمیع و بصیر ہے، سنا ہے اور دیکھتا ہے، لاریب وہ قدرت کاملہ کے ساتھ قادر ہے اور صفت رحم و کرم کے ساتھ رحیم و کریم ہے البتہ اس کی صفت سمع و بصر، صفت رحم و کرم وغیرہ صفات کا انسانی صفات سمع و بصر



سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور جس طرح وہ اپنی ذات میں بے ہمتا اور یکتا ہے اسی طرح صفات میں بھی ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝﴾ (الشوری: ۱۱)

”اس (خدا) کی کوئی مثال نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ سنا ہے، دیکھتا ہے۔“

غور فرمائیے کہ کس معجزانہ تعبیر کے ساتھ ایک ہی آیت اور ایک ہی جملہ میں اس کی صفات کمالیہ کا اعتراف بھی مذکور ہے اور یہ بھی وضاحت موجود ہے کہ خدا کی ان صفات کو انسانی صفات کی طرح نہ سمجھو بلکہ اس کی ذات کی طرح اس کی صفات بھی ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ کے عنوان سے معنون اور انسانی صفات کی حقائق کے مقابلہ میں بے مثال و بے نظیر ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدائے برتر کی توحید جب ہی حقیقی توحید کہلا سکتی ہے کہ اس میں نہ تجسم کا عقیدہ شامل حال ہو اور نہ تعطل کا کہ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں بلکہ عقیدہ یہ ہو کہ اللہ اپنی ذات میں بھی بے ہمتا و یکتا ہے اور اپنی صفات میں بھی اور وہ ہر طرح کے شرک و کفو سے پاک اور برتر ہے۔

## رسالت:

توحید حقیقی کے ثبوت کے بعد قرآن نے ”رسالت“ کے بنیادی عقیدہ کی اصلاح بھی ضروری سمجھی اور اس نے بتلایا کہ کسی تعلیم کے حسن و قبح میں معلم کی شخصیت کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اچھی تعلیم کا معلم بد عمل انسان ہو یا بری تعلیم کا معلم نیکو کار، اور جبکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ خدا ہر ایک انسان کے ساتھ براہ راست ہم کلام نہیں ہوتا تو از بس ضروری تھا کہ کائنات انسانی کی ہدایت کے لیے ایک انسان ہی کو معلم بنایا جائے اور وہی خدا کی جانب سے رسالت اور پیغامبری کا فرض انجام دے۔

پس بشری اوصاف سے متصف یہ انسان نہ خدا ہوگا اور نہ خدا کا بیٹا یا خدا کا اوتار بلکہ بشر اور انسان ہی رہے گا نیز خدا کے پیغامبر ہونے کی وجہ سے پاکی اور تقدس کا جو رشتہ اس کو خدا کی درگاہ سے وابستہ کیے ہوئے ہے اس کے پیش نظر اس کی ہستی کا نہ انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کو دوسرے انسانوں کے مساوی کہا جاسکتا ہے اس لیے قرآن نے جگہ جگہ مسیح ابن مریم اور عزیر (علیہ السلام) کے متعلق اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہ خدا کے مقدس رسول ہیں۔ خدا یا خدا کے بیٹے نہیں ہیں۔ نیز یہ بھی بتلایا کہ اگر ایک انسان تمہاری طرح کھاتا بھی ہے اور پیتا بھی اور بازاروں میں چلتا پھرتا۔ خرید و فروخت کرتا اور گھر میں اہل و عیال کے ساتھ معاشرتی زندگی بسر کرتا ہے تو اس سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ وہ خدا کا فرستادہ ”رسول“ نہیں ہے اور کس طرح یہ جائز ہے کہ ایک صادق و امین ہستی کے اس دعویٰ کو تم محض قیاس کی بناء پر جھٹلا دو کہ وہ خدا کا رسول نہیں ہے۔

قرآن نے ان حقائق کو جن صاف اور واضح تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے گذشتہ صفحات میں آپ ان کا مطالعہ فرما چکے ہیں۔ پس جس کتاب میں نبوت و رسالت سے متعلق صحیح تصور موجود نہ ہو وہ کبھی اپنی مذہبی تعلیمات کی صداقت کی مکمل تصویر نہیں پیش کر سکتی، یہی وہ عقیدہ ہے جس کی حقیقت میں ”ایمان بالرسول“ ”ایمان بالکتب“ ”ایمان بالملائکہ“ سب بنیادی عقائد سمٹ کر جذب ہو جاتے ہیں۔



قرآن کہتا ہے کہ جبکہ ہدایت انسانی کے لیے خدائے تعالیٰ اپنی پیغامبری کے لیے ایک انسان اور بشر کو ہی چن لیتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان نے جب سے اس کائنات میں قدم رکھا ہے اسی وقت سے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ قائم ہے:

﴿وَأَنَّ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (فاطر: ۲۴)

”کوئی گروہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جس میں ہماری جانب سے نذیر (پیغامبر) نہ گزرا ہو۔“

﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (الرعد: ۷)

”اور ہر قوم کے لیے ہادی آئے ہیں۔“

﴿مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ (المؤمن: ۷۸)

”ان میں سے بعض کے واقعات کا ہم نے قرآن میں تذکرہ کر دیا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا۔“  
اور یہ یقین لانا بھی ضروری ہے کہ جبکہ خدا ایک ہے اور اس کی تعلیم ایک تو بلاشبہ تمام پیغمبران خدا کی بنیادی تعلیم بھی ایک ہی رہی ہے اور اس لیے اگر خدا کے کسی ایک برحق نبی و رسول کا بھی انکار کر دیا گیا تو گویا اس نے پوری دعوت قرآنی کا انکار کر دیا پس یہ ایمان ضروری ہوا:

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ﴾ (البقرہ: ۲۸۵)

”ہم خدا کے پیغمبروں میں پیغمبر ہونے کے لحاظ سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے (کہ ایک کو مان لیں اور دوسرے کا انکار کر دیں)۔“

لہذا جب تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا از بس ضروری ہو تو ان پر نازل شدہ تمام کتب سماویہ پر بھی ایمان لانا جزء ایمان ہو گا ورنہ تو ایک جانب سے ایمان لا کر دوسری جانب سے اس پیغمبر کی صداقت کا انکار لازم آئے گا اور جب رسالت اور رسالت کے ساتھ کتب سماویہ پر ایمان حقیقت ثابتہ بن جائے تو ملائکتہ اللہ پر اس لیے ایمان لانا ضروری ہو گا کہ خدا کے ان پیغمبروں نے یہ صاف صاف اعلان کیا ہے کہ خدا کی جانب سے ان پر یہ وحی خدا کا فرشتہ لے کر آتا ہے تو اب یا ہم اس پیغمبر کی صداقت کا انکار کر دیں اور یا پھر بن دیکھے فرشتہ پر اس لیے ایمان لے آئیں کہ بتلانے والی ہستی اپنے کردار و اعمال میں ہر طرح صادق و امین اور امراض دماغی و قلبی ”جنون و سحر“ سے ہر طرح پاک ہے اور ضروری نہیں ہے کہ جس شے کو آنکھوں نے نہ دیکھا ہو اور کانوں نے نہ سنا ہو وہ حقیقت میں بھی غیر موجود ہو کیونکہ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی شے کے عدم علم سے اس شے کا عدم لازم نہیں آتا یعنی یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو ہم نہیں جانتے وہ واقعہ میں بھی موجود نہ ہو۔

## یوم آخرت:

نبی اکرم ﷺ نے خدا کے آخری اور مکمل پیغام قرآن کے ذریعہ تیسری بنیادی اصلاح ”یوم آخرت“ سے متعلق فرمائی۔



مذہب عالم اس سلسلہ میں بھی راہ مستقیم سے روگرداں اور افراط و تفریط کے بحر ظلمات میں پھنسے ہوئے تھے یا تو آواگون (تناخ) کے چکر میں یوم آخرت کے اس تصور سے قطعاً بیگانہ ہو چکے تھے اور قیامت (پرلے) کا تعلق انسانی اعمال کی جزاء و سزا اور یوم الحساب سے غیر متعلق سمجھ چکے تھے اور یا پھر اس دن نجات کا مدار اور جزاء و سزا کا معیار اعمال و کردار کی جگہ نسل و خاندان اور سوسائٹی کی معاشرتی گروہ بندی پر سمجھ بیٹھے تھے اور "کفارہ" کو عقیدہ بنا کر حساب و محاسبہ اعمال سے مطمئن ہو چکے تھے۔ اور مشرکین اور بعض فلاسفہ نے تو یوم آخرت کے وجود ہی کا انکار کر دیا تھا اور ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ آج کا مردہ انسان کل کس طرح زندگی اختیار کر لے گا اور سینکڑوں اور ہزاروں برس کی بوسیدہ ہڈیاں یوم حساب میں کس طرح جسم بن کر اپنی روح کے لیے لباس بن سکیں گی۔

قرآن نے نازل ہو کر دنیا انسان کو بتایا کہ اس صاف اور واضح بات کے سمجھنے میں آخر تم پر کیوں وحشت طاری ہوتی ہے اور کیوں تمہاری عقل اس کو نہیں تسلیم کرتی کہ جس خالق کائنات اور بدیع السماوات والارض نے نمونہ اور نقشہ کے بغیر یہ عجیب و غریب عالم آفرینش کر دیا وہ بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ ماضی میں مخلوق اور حال میں مردہ بوسیدہ ہستی کو مستقبل میں دوبارہ وجود عطا فرما دے اور اس کے منتشر اجزاء کو جمع کر کے دوبارہ وہی ہیئت جسمانی عطا اور سابق روح کو اس میں واپس کر دے۔

اس موقع پر اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں سے متعلق اگرچہ بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے تاہم اس قدر سمجھ لینا ضروری ہے کہ تناخ (آواگون) کا عقیدہ اس اساس پر قائم ہے کہ ہر ایک انسان کی موجودہ زندگی سابق میں کئے ہوئے اعمال کا ثمرہ اور نتیجہ ہے ورنہ کائنات میں یہ تنوع ہرگز نہ ہوتا کہ کوئی انسان ہے تو کوئی حیوان اور کوئی نباتات و جمادات نیز انسانوں میں کوئی غلام ہے تو کوئی جاہل اور کوئی صحت یاب ہے تو کوئی مریض اور کوئی امیر کبیر ہے تو کوئی مفلس و محتاج وغیرہ وغیرہ۔

اس عقیدہ کا مقصد یہ ہوا کہ بغیر عمل و کردار کے اگر عالم میں یہ تغیرات موجود ہیں تو یہ خدا کی صفت عدل کے منافی ہے لیکن عقیدہ کی خام کاری اور بطلان کی مختلف وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اگر روح اپنے اعمال کی وجہ سے مختلف جون بدل کر ان تغیرات عالم کا باعث ہے جو مجموعہ کائنات کے حسن کا باعث ہیں اور جس کی بدولت یہ پورا کارخانہ مکمل نظام کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کے لئے فطری اور نیچرل طور پر گنہگار، بدکار اور بد اعمال ہونا از بس ضروری ہے تاکہ مجموعہ کائنات کا یہ حسن نہ صرف یہ کہ پیدا ہو بلکہ قائم رہے جس کا تغیرات اور تنوعات پر مبنی ہونا از بس ضروری ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ جون بدل کر آواگون کی زندگی اگر اعمال کی جزا و سزا سے متعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت انسان کے لئے نیکو کار بننے کی جگہ زیادہ سے زیادہ بدکار ہونا چاہیے تاکہ آئندہ نظام عمل میں یہ تنوع باقی رہے جس کا باقی رہنا عقل و فطرت کے مطابق ہے ورنہ تو حیوانات، نباتات، جمادات کے فقدان سے انسانی دنیا کا یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

تناخ کے ناقص فلسفیانہ عقیدہ پر یقین رکھنے والوں نے اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیا ہے کہ ایک چیز اپنی انفرادیت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی قبیح اور بری معلوم ہو لیکن مجموعہ کائنات کے پیش نظر اس کا وجود بھی اپنے اندر ضرور حسن رکھتا ہے مثلاً تل (خال) اپنے رنگ و روپ میں کیسا ہی سیاہ قام کیوں نہ ہو لیکن محبوب کے رخسار پر نہ خود حسین بن جاتا ہے بلکہ حسن محبوب کو دوبالا کر دیتا ہے اور حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ جیسے صوفی کو خال محبوب پر سمرقند و بخارا بخش دینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

اسی طرح عالم و کائنات میں انفرادی طور پر کسی کا مریض ہونا، اپانج و معذور ہونا، ناقص الخلق ہونا وغیرہ گوتیج اور قابل افسوس نظریات ہوں مگر مجموعہ کائنات کے حسن کے لئے فطری (نیچرل) ہیں اور اس تنوع پر ہی دنیا کے نظام کا بقاء ہے اور خالق کائنات کے کمالات آفرینش کا آئینہ دار۔

لگھائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے



یا تو صاف کہو کہ اس کائنات کو کسی بلند و بالا ہستی نے پیدا نہیں کیا جس کو خدا (اللہ) کہتے ہیں اور اگر یہ مانتے ہو تو یہ قطعاً عقل کے خلاف ہے کہ جو ابتدائی آفرینش کر سکے وہ اس آفرینش کو دہرا نہ سکے:

﴿وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ إِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ۝ أَوْ لَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَكَمْ يَكُ شَيْئًا ۝﴾ (مریم: ۶۶-۶۷)

”اور انسان کہتا ہے کہ بھلا جب میں مر گیا تو کیا میں (قبر سے) زندہ نکالا جاؤں گا۔ کیا انسان یہ یاد نہیں کرتا کہ ہم نے پہلے اسے پیدا کیا حالانکہ وہ کوئی چیز نہیں تھا۔“

﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۗ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۗ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۝﴾ (يسين: ۷۸-۷۹)

”اور ہماری نسبت باتیں بنانے لگا اور اپنی پیدائش کی حقیقت کو بھول گیا، کہتا ہے کہ ہڈیاں جب گل کر خاک ہو گئی ہوں تو کون ہے جو ان کو زندہ کر کے کھڑا کر دے (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے کہ جس نے ان ہڈیوں کو اول بار پیدا کیا تھا وہی ان کو زندہ کرے گا اور وہ سب کا پیدا کرنا، جانتا ہے۔“

یہ مشرکین مکہ تھے جو خدا اور خالقیت خدا کے تو قائل تھے مگر دوسری زندگی کے منکر و کافر اور جاحد تھے۔ پھر اس نے ان کو بھی مخاطب کیا جو کہتے تھے کہ آخرت کا تصور اس لیے فضول ہے کہ یہ کائنات کسی کی مخلوق ہی نہیں مادہ اور اس کی حرکت یونہی ازل سے ابد تک کائنات کا روپ و رنگ اختیار کیے ہوئے ہے اور حرکت و کشش دو قوتیں اس نظام عالم کے ہر قسم کے تنوعات کے کفیل ہیں۔ قرآن نے کہا، یہ گمراہ کن تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے وہ یہ کہ عقل اور سائنس کے خلاف یہ سمجھ لیا گیا کہ ذرات مادہ (اجزاء اثیریہ) میں شعور اور ارادہ نہ ہونے کے باوجود حرکت، قوت استعداد اور کشش کے ذریعہ خود بخود ایسی اشیاء وجود پذیر ہو سکتی ہیں جن کا مواد (میٹریل) ان ذرات میں موجود نہیں یعنی مادہ میں بالقوہ بھی نہ شعور ہے اور نہ ارادہ، نہ جذبات ہیں نہ احساسات، نہ ادراکات ہیں اور نہ عقل و تمیز، ورنہ تو جسم کو بالقوہ ان صفات کا حامل کہنا بجا ہوتا، لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ جسم کو نہ شعوری کہہ سکتے ہیں نہ جذباتی، نہ ذی ادراک کہا جاسکتا ہے اور نہ ذی عقل و صاحب تمیز پس دلیل ”وجدان“ جو فطری دلائل میں سب سے مضبوط اور نیچر دلیل ہے، وہ اس حقیقت کو تسلیم کراتی ہے کہ جبکہ تمام موجودات عالم میں ”انسان“ موجودات عالم کی ارتقائی ہستی اور اشرف الموجودات ہے اور اس میں جذبات، حیات، ادراکات، شعور اور عقل جیسے لطیف اوصاف موجود نظر آتے ہیں حالانکہ بلاشبہ مادہ کی قوت و استعداد میں یہ معدوم تھے، تو اس میں قطعاً شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان سے بلند ضرور ایک ایسی ہستی موجود ہے جو قدرت و ارادہ کی علی الاطلاق مالک اور تمام موجودات کی خالق ہے اور اس میں بھی کوئی ریب و شک نہیں کہ انسان ایسی ذی عقل و ذی شعور اور صاحب ارادہ ہستی کی تخلیق محض بے فائدہ نہیں ہے اور اس کی زندگی کے اعمال اور کردار بے وجہ اور مہمل نہیں ہیں اور جبکہ ہم اس دنیا میں انسانوں کے اعمال و کردار کی جزاء و سزا کا مظاہرہ نہیں دیکھتے تو وجدان ہی ہمارے لیے رہنمائی کرتا ہے کہ ایک ایسا دن ضرور مقرر ہے



جب کائنات انسانی اپنے اعمال و کردار کی جزاء و سزا کا نتیجہ و ثمرہ پائے گی اور اسی کو یوم القیامہ، یوم الآخرہ اور یوم الحساب کہتے ہیں، چونکہ یہ دن اپنی پائیداری اور قیام کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے اس لیے یوم القیامہ کہلاتا ہے اور چونکہ دنیائے موجودہ کے بعد ہے اس لیے یوم الآخرہ ہے اور چونکہ جزاء و سزا اور اعمال کے محاسبہ پر مشتمل ہوگا اس لیے یوم الحساب ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۗ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ ۗ لَعَلَّ الْغَیْبَ ۗ﴾ (سبا: ۳)

”اور منکرین کہتے ہیں کہ قیامت ہم کو تو کبھی نہیں آئے گی۔ اے محمد! ﷺ کہہ دیجئے، ہاں ہاں مجھ کو اپنے پروردگار کی قسم جو عالم الغیب ہے قیامت تو تم کو ضرور پیش آ کر رہے گی۔“

﴿أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۗ﴾ ... الی ... أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدْرِ عَلَىٰ أَنْ يُحْجَىٰ

﴿الموتی ۗ﴾ (القیامہ: ۳۶، ۴۰)

”کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مہمل اور بیکار چھوڑ دیا جائے گا کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے؟“

﴿وَالَّتَيْنِ وَالزَّيْتُونَ ۗ وَطُورِ سَيْنِينَ ۗ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۗ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۗ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۗ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۗ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالذِّكْرِ ۗ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ ۗ﴾ (التین: ۱-۸)

”گواہ ہے انجیزوزیتون (کے باغات سے سرسبز و شاداب وہ مقام بیت اللحم جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی) اور گواہ ہے طور سیناء (جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفرازی نصیب ہوئی) اور گواہ ہے یہ بلد امین (مکہ جہاں محمد ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی) کہ بلاشبہ ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر قوم سے بنایا پھر اس کو نشیبوں کے سب سے نیچے مقام پر دھکیل دیا مگر وہ انسان جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لیے بے منت و احسان اجر و ثواب ہے تو اب وہ کیا بات ہے جو تجھ کو دین (قیامت) کے جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے کیا اللہ حاکموں میں سے بہتر حاکم نہیں ہے۔“

اور سچ تو یہ ہے کہ قرآن عزیز کہتا ہے کہ آخرت کے انکار پر منطقی دلائل قائم کرنے اور فسفطہ اور غلط روش کو اختیار کر کے اقدھر اقدھر بھٹکنے کی آخر ضرورت کیا ہے جبکہ انسان کی سب سے قریب اور سب سے زیادہ مضبوط دلیل ”وجدان“ خود بخود اس جانب راہنمائی کرتی ہے کہ یہ نظام عالم جس طرح حیرت زا اور محیر العقول نظام فطرت سے منظم اور قوانین فطرت کے ہاتھوں میں مسخر ہے، ہو نہیں سکتا کہ یہ خود رو نظام ہو اور جبکہ اس کا کوئی خالق ضرور ہے تو اس نے خیر و شر کے ثمرات و نتائج کے لیے بھی ضرور کوئی وقت مقرر کیا ہے ورنہ یہ کامل و مکمل نظام ثمرہ اور نتیجہ کے پیش نظر ایک مہمل شے مانی پڑے گی۔ پس نتیجہ اور ثمرہ کا وہ دن ہی ”یوم آخرت“ کے نام سے موسوم ہے جو نہ نتائج کے چکر سے وابستہ ہے اور نہ ازلیت و ابدیت عالم کا حامل بلکہ جس طرح عالم کی ہر شے کا ایک آغاز ہے اور ایک انجام، اسی طرح خود اس پورے عالم کا بھی ایک آغاز اور انجام از بس ضروری ہے۔

پس مومن اور مسلم وہی ہے جو توحید خالص، رسالت کے صحیح تصور اور یوم آخرت پر یقین کامل، کے سررشتہ کے ساتھ پیوستہ



ہو اور یہی وہ تین بنیادی عقائد ہیں جو دین کے حقیقی تصور یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسول، ایمان بالکتاب، ایمان بالملائکہ، ایمان بالقدر اور ایمان بالآخرہ سب ہی پر حاوی ہیں اور یہی وہ دین کامل ہے جس کی تشریح قرآن عزیز نے سورہ بقرہ کے آخری رکوع میں اس طرح کی ہے:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ ۗ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ ۗ وَقَالُوا سَبِعْنَا وَاطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ (البقرہ: ۲۸۵)

”رسول محمد (ﷺ) ایمان رکھتے ہیں اس شے پر جو اس پر ان کے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے (یعنی قرآن) اور ہر ایک (ایماندار) ایمان رکھتا ہے خدا پر، فرشتوں پر، سماوی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، (وہ کہتے ہیں خدایا) ہم تیرے پیغمبروں کے درمیان کسی ایک کو بھی پیغمبر تسلیم کرنے کے سلسلہ میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں ہم نے تیرا حکم سنا اور اس کی پیروی کی، اے پروردگار ہم تجھ سے مغفرت کے خواہاں ہیں اور ہم کو آخر کار تیری ہی جانب لوٹنا ہے۔“

مابعد الطبیعیاتی عقائد و افکار سے متعلق قرآن حکیم کی یہی وہ اصلاحی اور انقلابی تعلیمات تھیں جن کو نبی اکرم ﷺ نے اول عرب کے سامنے روشناس کیا اور پھر تمام کائنات انسانی تک پہنچا کر مذاہب کی دنیا ہی بدل ڈالی اور اسلام کی اس دعوت توحید نے مذاہب عالم میں ہلچل پیدا کر دی اور کسی نہ کسی رنگ میں ان کو توحید حقیقی کے اس ارتقائی نقطہ کی جانب جھکنا پڑا اور اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان رشتہ معبودیت و عبودیت ہی کو صحیح نقطہ نظر پر استوار اور عقائد اور مابعد الطبیعیاتی افکار کے رخ روشن کو آشکارا کر دیا، بلکہ اس نے ”ایمان اور عمل صالح“ کو دین کی بنیاد بنا کر اخلاق، معاشرت، معاش، غرض مذاہب اور اجتماعی سیاست سب ہی کو اصلاح و انقلاب کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کی صحیح راہنمائی کا حق ادا کر دیا۔

یہ بحث چونکہ طویل الذیل ہے اور آیت ﴿وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ کی تفسیر کے ضمن میں شرح و بسط کی محتاج، اس لیے یہ مقام اس کی وسعت کو برداشت نہیں کر سکتا۔





## اسراء (معراج)

”اسراء“ کے معنی شب میں لے جانے کے ہیں، نبی اکرم ﷺ کا وہ بے نظیر شرف و مجد اور حیرت زا واقعہ ”جس میں خدائے برتر نے اپنے رسول کو مسجد حرام (مکہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور وہاں سے ملاء اعلیٰ تک بجمد عنصری اپنی نشانیاں دکھانے کے لیے سیر کرائی“ چونکہ شب کے ایک حصہ میں پیش آیا تھا اس لیے ”اسراء“ کہلاتا ہے۔

”معراج“ عروج سے مشتق ہے جس کے معنی چڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں اور اسی لیے معراج زینہ کو بھی کہتے ہیں، نبی اکرم ﷺ نے چونکہ اس شب میں ملاء اعلیٰ کے منازل ارتقاء طے فرماتے ہوئے سبع سماوات، سدرۃ المنتہیٰ، اور اس سے بھی بلند ہو کر آیات اللہ کا مشاہدہ فرمایا اور ان واقعات کے ذکر میں زبان وحی ترجمان نے ”عرج جی“ کا جملہ استعمال فرمایا اس لیے اس باجبروت اور پر عظمت واقعہ کو ”معراج“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بعض علماء نے اصطلاحی فرق و امتیاز کے لیے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس واقعہ کا وہ حصہ جس کا ذکر بصراحت سورہ بنی اسرائیل میں ہے قرآنی تعبیر کے اتباع میں ”اسراء“ ہے، اور وہ حصہ جس کا تذکرہ سورہ نجم اور صحیح احادیث میں ہے ذات اقدس ﷺ کی تعبیر ”ثم عرج جی“ کی مناسبت سے ”معراج“ کے عنوان سے معنون ہے۔

### واقعہ کی وحدت:

اس لیے دو مختلف تعبیروں اور واقعات کی تفصیلات میں جزوی اختلاف کے پیش نظر تطبیق روایات کی خاطر اس واقعہ کے تعدد کا قائل ہونا تاریخی اور تحقیقی نقطہ نظر سے ہرگز صحیح نہیں ہے اور مشہور محقق، جلیل القدر محدث، مفسر اور مؤرخ حافظ عماد الدین بن کثیر کا یہ ارشاد بلاشبہ درست اور حقیقت حال کے لیے کاشف ہے، فرماتے ہیں:

ان تمام روایتوں کو جمع کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ واقعہ معراج صرف ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہے اور راویوں کی عبارات کے بعض حصص کا ایک دوسرے سے کچھ مختلف اور تفصیلات میں کم و بیش ہونا وحدت واقعہ پر اثر انداز نہیں ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دوسرے انسان خطا کاری سے محفوظ نہیں ہیں۔

سوان روایات کے جزوی اختلافات کو دیکھ کر جن علماء نے تعدد واقعہ کا مسلک اختیار کیا اور ہر ایک مختلف روایت کو جدا جدا واقعہ بنا دیا اور اس طرح یہ دعویٰ کر دیا کہ معراج کا واقعہ متعدد بار پیش آیا ہے۔ انہوں نے بعید از قیاس بات کہہ ڈالی اور قطعاً غلط راہ روی اختیار کر لی اور حقیقت حال سے دور پڑ گئے..... یہ مسلک اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کہ نہ سلف صالحین سے تعدد واقعہ منقول ہے اور نہ تاریخی دلائل اس کے موید ہیں اور اگر ایسا ہوتا تو خود نبی اکرم ﷺ ضرور بصراحت اس سے مطلع فرماتے اور راویان روایت



بلاشبہ اس کو روایت کرتے۔

### تحقیق تاریخ و سنہ :

یہ عدیم النظیر واقعہ کب پیش آیا؟ اس کے تعین میں اگرچہ متعدد اقوال مذکور ہیں لیکن ان دو باتوں پر سب کا اتفاق نظر آتا ہے، ایک یہ کہ واقعہ معراج قبل از ہجرت پیش آیا، اور دوسری بات یہ کہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد وقوع میں آیا اور جبکہ واقعہ ہجرت باتفاق ۱۳ نبوت کو پیش آیا اور بخاری میں مذکور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہجرت سے تین سال قبل اور ایک دوسری روایت کے پیش نظر نماز پنجگانہ کی فرضیت سے قبل ہو چکا تھا۔ تو اب واقعہ معراج کو ہجرت سے قبل کے ان تین برسوں کے اندر ہی ہونا چاہیے۔

نیز کتب تاریخ و سیرت دونوں شاہد ہیں کہ معراج اور ہجرت کے درمیان کوئی اہم واقعہ موجود نہیں ہے اور بنظر تحقیق ان ہردو کے درمیان نہایت گہرا رشتہ اور ربط و علاقہ پایا جاتا ہے تو بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ واقعہ معراج ہجرت سے بہت قریب زمانہ میں پیش آیا اور درحقیقت یہ واقعہ ہجرت ہی کی پر جلال و پر عظمت ”تمہید“ تھی۔

غالباً ابن سعد نے طبقات میں اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی الصحیح الجامع میں اسی لیے واقعہ معراج اور ہجرت کو کسی تیسرے واقعہ کی مداخلت کے بغیر آگے پیچھے بیان کیا ہے اور جو حضرات بخاری کے ابواب و تراجم کی باہمی ترتیب کی دقیقہ سنجی سے واقف اور ان کے تفقہ کی بالغ نظری سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کا رجحان یہ ہے کہ ان ہردو واقعات کے درمیان زمانہ اور تعلق دونوں اعتبار سے انتہائی قربت ہے۔ تو اب یہ کہنا آسان ہے کہ جو اباب سیر و تاریخ یہ فرماتے ہیں کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال یا ڈیڑھ سال قبل پیش آیا ان کا ارشاد پایہ تحقیق رکھتا ہے۔

پھر مہینہ اور تاریخ کے تعین میں بھی متعدد اقوال موجود ہیں مگر راجح قول یہ ہے کہ مہینہ رجب کا تھا اور تاریخ ۲۷ تھی۔ چنانچہ ابن عبدالبر، امام نووی اور عبدالغنی مقدسی رحمہم اللہ جیسے مشہور اور جلیل القدر محدثین کا رجحان اسی جانب ہے کہ رجب تھا اور آخر الذکر فرماتے ہیں کہ ۲۷ تھی اور دعویٰ کرتے ہیں کہ امت مرحومہ میں ہمیشہ سے عملاً اسی پر اتفاق بھی رہا ہے۔

### قرآن عزیز اور واقعہ معراج :

قرآن عزیز میں اسراء یا معراج کا واقعہ دو سورتوں بنی اسرائیل اور النجم میں مذکور ہے، سورہ بنی اسرائیل میں مکہ (مسجد حرام) سے بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) تک سیر کا تذکرہ ہے، اور سورہ النجم میں ملاء اعلیٰ کی سیر و عروج کا بھی ذکر موجود ہے، اور اگرچہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کی صرف ابتدائی آیات ہی میں یہ واقعہ مذکور ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ پوری سورت اسی عظیم الشان واقعہ سے متعلق ہے اور سورہ کی تمام آیات اسی کا تکرار ہیں اور اسی دعوے کے لیے ایک صاف اور واضح دلیل خود اسی سورہ میں یہ موجود ہے کہ وسط سورہ میں آیت ﴿وَمَا جَعَلْنَا الزُّرِّيَّا لَآلِئِيَّ أَرِيْنَكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾ میں اسی واقعہ معراج کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس سے قبل حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہم السلام کے واقعات دعوت و تبلیغ اسی سلسلہ میں بطور شواہد و نظائر پیش کئے گئے ہیں کہ منکرین نے ہمیشہ اسی طرح خدا کی صداقتوں کو جھٹلایا ہے جس طرح آج واقعہ معراج کو جھٹلا رہے ہیں۔



## احادیث اور واقعہ معراج کا ثبوت:

مشہور محدث زرقانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ معراج کا واقعہ پینتالیس صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے اور پھر ان کے نام بھی شمار کرائے ہیں۔ ان صحابہ میں مہاجرین بھی ہیں اور انصار بھی اور یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ چونکہ انصار صحابہ مکہ میں موجود نہیں تھے اس لیے ان کی روایات صرف شنیدہ ہیں اس لیے کہ ایسے اہم واقعہ کو جس کا اسلام کی ترقی کے ساتھ بہت گہرا تعلق اور ہجرت کے واقعہ کے ساتھ خصوصی ربط ہے صحابہ رضی اللہ عنہم نے براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی دریافت حال کیا ہوگا اور اگر مہاجرین سے بھی سنا ہوگا تو پھر ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تصدیق ضرور کی ہوگی، چنانچہ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں:

قلنا رسول الله كيف أسرى بك. (ترمذی)

”ہم نے (صحابہ رضی اللہ عنہم نے) عرض کیا اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو معراج کس طرح ہوئی؟“

لفظ ”قلنا“ یہ ثابت کر رہا ہے کہ بلاشبہ معراج سے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم کے عام مجمع میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا جاتا تھا جن میں مہاجرین و انصار سب ہی شریک ہوتے تھے اور مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ جو انصاری صحابی ہیں ان کی روایت معراج میں ہے:

ان النبي ﷺ قال: حدثتهم. (بخاری کتاب المعراج)

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے (صحابہ رضی اللہ عنہم سے) واقعہ بیان فرمایا۔“

## واقعہ کی نوعیت:

چونکہ یہ واقعہ اپنی اہمیت کے ساتھ ساتھ طویل بھی تھا اس لیے بربناء بشریت واقعہ کے اصل تفصیلی حالات میں اتحاد و اتفاق اور بحد تو اتروایات منقول ہونے کے باوجود متعدد روایات کی فروعی تفصیلات میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ معمولی توجہ سے رفع کیا جا سکتا ہے اور بلاشبہ ان جزوی اختلافات سے اصل واقعہ کی حقیقت پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا خصوصاً جبکہ قرآن عزیز نے ان عجیب اور حیرت زا واقعات کو نص قطعی سے واضح کر دیا ہے جن کے متعلق ملحدین اپنے الحاد و زندقہ کے ذریعہ باطل تاویلات پیش کر کے اس واقعہ کی معجزانہ حیثیت کا انکار کرتے ہیں۔

## واقعہ معراج و اسراء اور قرآن عزیز:

سورہ بنی اسرائیل میں واقعہ اسراء بیت المقدس تک کی سیر سے وابستہ ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بَرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیْہٖ مِنْ اٰیٰتِنَا ۗ اِنَّہٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝۱﴾ (بنی اسرائیل: ۱)

”پاکی ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندے کو (یعنی پیغمبر اسلام کو) راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کہ اس کے اطراف کو ہم نے بڑی ہی برکت دی ہے سیر کرائی اور اس لیے سیر کرائی کہ اپنی نشانیاں اسے دکھائیں۔ بلاشبہ وہی ذات ہے جو سننے والی دیکھنے والی ہے۔“



﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّعْيَا الَّتِي أَرَبْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ﴾ (بنی اسرائیل: ۶۰)

”اور وہ دکھلاوا جو تجھ کو ہم نے دکھایا سو لوگوں کی آزمائش کے لیے (دکھلایا)۔“

اور سورۃ النجم میں ملاء اعلیٰ تک عروج کا ذکر بھی موجود ہے:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝۱ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۝۲ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝۳ إِنْ هُوَ إِلَّا

وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝۴ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝۵ ذُو مِرَّةٍ ۝۶ فَاسْتَوَىٰ ۝۷ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۝۸ ثُمَّ دَنَا

فَتَدَلَّىٰ ۝۹ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ۝۱۰ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۝۱۱ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا

رَأَىٰ ۝۱۲ أَفَتُرُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۝۱۳ وَ لَقَدْ رَأَاهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ۝۱۴ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ ۝۱۵ عِنْدَهَا

جَنَّةُ الْبَاوَىٰ ۝۱۶ إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَىٰ ۝۱۷ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۝۱۸ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ

رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ ۝۱۹﴾ (النجم: ۱-۱۸)

”شاہد ہے ستارہ جبکہ غروب ہو، تمہارا رفیق نہ گمراہ ہوا اور نہ بھٹکا اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے یہ نہیں ہے مگر حکم جو

اس کو بھیجا گیا ہے، اس کو بتلایا ہے سخت قوتوں والے زور آور (فرشتہ) نے (کہ یہ خدا کی وحی ہے) جو سیدھا بیٹھا اور تھا وہ

آسمان کے اونچے کنارہ پر، پھر وہ قریب ہوا، پس جھک آیا، پھر رہ گیا (دونوں کے درمیان) دو کمان بلکہ اس سے بھی

نزدیک کا فرق، پس خدا نے اپنے بندہ (محمد ﷺ) پر وحی نازل فرمائی جو بھی وحی بھیج، اس (بندہ) نے جو دیکھا (اس کے)

دل نے جھوٹ نہیں کہا (یعنی آنکھ کی دیکھی بات کو جھٹلایا نہیں بلکہ تصدیق کی) تو کیا تم اس سے اس پر جھگڑتے ہو جو اس

نے خود دیکھا ہے (یعنی واقعہ پر جھگڑتے ہو) اور اس (بندہ) نے خدا کو دیکھا ایک (خاص) نزول کے ساتھ جبکہ وہ بندہ

سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک موجود تھا جس کے پاس (آرام سے رہنے کی بہشت) جنت الماویٰ ہے اس وقت سدرہ (بیری کا

درخت) پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا اس رویت کے وقت نہ نگاہ بہکی اور نہ حد سے متجاوز ہوئی بلاشبہ، اس (بندہ) نے

(اس حالت میں) اپنے پروردگار کے بڑے بڑے نشان دیکھے۔“

### سورۃ بنی اسرائیل اور واقعہ معراج:

یہاں سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ النجم کی تفسیر کا موقع نہیں صرف اشارات ہی پر اکتفاء مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اگر ایک جانب

یہ آیات اپنے مکمل تفسیری حق کا مطالبہ کرتی ہیں تو دوسری جانب کتاب اپنے سیاق و سباق کے پیش نظر اختصار کی طالب ہے بہر حال حسب

ضرورت دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس قدر گزارش ہے کہ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیت میں واقعہ اسراء کے متعلق جو کچھ کہا گیا اس کی اگر تحلیل

کی جائے تو باسانی یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا فیصلہ یہی ہے کہ واقعہ اسراء بحالت بیداری بجمہد عنصری پیش

آیا ہے، اور اس مطلب سے ہٹ کر جب اس کو روحانی یا منامی رویا کہا جاتا ہے تو تاویلات بارہ کے بغیر دعویٰ پر دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔

بنی اسرائیل میں اس واقعہ کی ابتداء خدائے برتر کی قدوسیت اور سبحانیت کے بعد لفظ ”اسریٰ“ سے ہوئی ہے یہ لفظ ”س، ر،

ی۔ سری یسری“ سے ماخوذ ہے۔ لغت میں جس کے معنی ”رات میں چلنے“ کے آتے ہیں:



سماى، يسماى، سماى وسماية... الخ سارليلا (منجد) ”سرى، يسرى، سريه مىلى سرى كے معنى هىں وه رات مىلى چلا۔“

اسماى، اسراء، سارليلا (منجد) ”اسرى كے معنى هىں رات مىلى چلا۔“

يہى معنى اقرب الموارء، قاموس، لسان العرب اور تمام كتب لغت مىلى بصراحت مذكور هىں اور اسى لفظ اسرى كو جب متعدى بنانا چاہتے هىں يعنى ”راتوں رات لے جانا“ ظاہر كرنا چاہتے هىں تو ”ب تعدية“ بڑھاديتے هىں۔ اس موقعه كے علاوه قرآن عزيز مىلى جہاں جہاں ”اسراء“ اور اس كے مشتقات آئے هىں ان تمام مقامات مىلى بهى اسى معنى مىلى استعمال هوا ہے۔ چنانچہ سورہ هود مىلى لوط ؑ كے واقعہ مىلى ہے:

﴿قَالُوا يَلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ﴾ (هود: ۸۱)

”فرشتوں نے کہا: لوط! ہم تو تيرے پروردگار كے بھیجے ہوئے (فرشتے) هىں۔ يہ تجھ تك ہرگز نہىں پہنچ پائىں گے پس تو اپنے لوگوں كو كچھ رات گئے (يہاں سے) لے نكل۔“

يہ آيت ﴿فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ﴾ (سورہ دخان: ۲۳) مىلى بهى موجود ہے اور سورہ طہٰ مىلى حضرت موسىٰ ؑ كے واقعہ مىلى ہے:

﴿وَلَقَدْ اَوْحَيْنَا اِلَىٰ مُوسَىٰ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِى﴾ (طہ: ۷۷)

”اور بلاشبہ ہم نے موسىٰ (ؑ) پر وحى كى كہ ميرے بندوں كو راتوں رات لے جا۔“  
اور سورہ شعراء مىلى ہے:

﴿وَاَوْحَيْنَا اِلَىٰ مُوسَىٰ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِى اِنَّكُمْ مُّتَّبِعُونَ﴾ (الشعراء: ۵۲)

”اور ہم نے موسىٰ (ؑ) پر وحى بھیجى كہ ميرے بندوں كو راتوں رات لے كر نكل جا۔ تمہارا تعاقب ضرور كيا جائے گا۔“  
اور يہى آيت سورہ دخان مىلى بهى مذكور ہے:

ان تمام آيات مىلى لفظ ”اسراء“ كا جس طرح اطلاق كيا گيا ہے اس سے دو حقيقتوں پر روشنى پڑتى ہے۔ ايک يہ كہ ”اسراء“ اس سيرا اور اس چلنے كو کہتے هىں جو رات مىلى پيش آئے اس ليے دن يا شام كے چلنے پر ”اسراء“ كا اطلاق نہىں ہو سكتا۔  
دوسرى بات يہ كہ ”سرى يا اسراء“ ان تمام آيات مىلى روح مع جسد پر اطلاق هوا ہے يعنى لوط اور موسىٰ ؑ اور ان كے متبعين جن كے ليے يہ حكم هو رہا ہے كہ وه دشمنوں سے بچ كر راتوں رات ان بستیوں (مصر اور سدوم) سے نكل جائىں، ان كا رات كے حصہ مىلى نكل جانا نہ خواب كى شكل مىلى تھا اور نہ روحانى طور پر اور نہ روياء كشفى كے طريقه پر بلکہ عالم بيدارى مىلى روح مع جسد كے تھا۔  
پس جبکہ قرآن كے ان تمام اطلاقات مىلى اسراء كے يہ معنى بغير كسى تاويل كے قابل تسليم هىں تو بنى اسرائيل كى آيت ﴿سُبْحٰنَ الَّذِىْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾ مىلى ”اسراء“ كو روح مع جسد تسليم كرنے مىلى كيوں پس وپيش هو اور كس ليے اس واقعہ كو فقط روحانى، منامى، يا بين النوم واليقظہ كشفى طريقه كے ساتھ مخصوص كيا جائے؟ جبکہ اس آيت ﴿اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ كَيْلًا﴾ مىلى ايک لفظ بهى ايسا موجود نہىں ہے جو اس اسراء كو قرآن كے عام اطلاقات سے جدا معنى پر دلالت يا اشارہ كرتا هو۔



رہا یہ مسئلہ کہ بنی اسرائیل کی آیت ﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ﴾ (بنی اسرائیل: ۶۰) کے لفظ ”رویا“ سے فائدہ اٹھا کر یہ کہنا کہ چونکہ ”رویا“ عالم خواب پر بولا جاتا ہے، اس لیے اسراء کا واقعہ منامی یا روحانی تھا، بدیں وجہ صحیح نہیں ہے کہ عربی بول چال میں جس طرح ”رویا“ کا اطلاق خواب کی حالت پر ہوتا ہے اسی طرح وہ اس رویت پر بھی بولا جاتا ہے جس کا مشاہدہ آنکھ بحالت بیداری کرتی ہے۔ چنانچہ عربی کے نہایت مستند اور مشہور لغت لسان العرب میں یہ تصریح موجود ہے:

اور بلاشبہ ”رویا“ بیداری میں عینی مشاہدہ کے لیے بھی آتا ہے۔

اور صاحب لسان نے جاہلی شاعر راعی کے اس شعر کو اس معنی کے لیے سند ٹھہرایا ہے:-

فكبر للرؤيا و هس فواده و بشر نفسا كان نفسا يلومها

”اس نے تکبر کہی اور اس کا دل مسرت سے لبریز ہو گیا اور اس نے اپنے نفس کو پہلے ملامت کر رکھا تھا خوشخبری دی اس منظر

کو دیکھ کر جس کا اس نے عینی مشاہدہ کیا۔“ اسی طرح متنبی کے اس مصرعہ کو بھی سند قرار دیا ہے:

و رويك احدى في العيون من الغصص ”اور تیرا دیدار (میری) آنکھوں میں نیند سے بھی زیادہ لذیذ ہے۔“

ان مستند اقوال عرب کے بعد ”رویا“ کو صرف خواب کی حالت کے ساتھ مخصوص کر دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ اب جبکہ

﴿أَسْرَى بَعْدَهُ﴾ میں ”اسراء“ کے متبادر معنی ”سیر روح مع جسد“ کے ہیں اور ”رویا“ کا اطلاق دونوں قسم کی رویت پر ہوتا رہا ہے تو اس

مقام پر ”اسراء“ کا قرینہ اس کا متقاضی ہے کہ یہاں ”بحالت بیداری عینی مشاہدہ“ کے معنی ہی متعین ہونے چاہئیں اور دوسرے معنی قیاسی اور تاویلی حیثیت سے زیادہ وقع نہیں ہیں۔

بعض معاصر علماء نے ”اسراء“ کو روحانی قرار دیتے ہوئے لسان العرب کے پیش کردہ سندات کو اول تو مستند ہی تسلیم نہیں کیا

اور بفرض تسلیم کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان ہر دو شاعروں راعی اور متنبی کے شعر و مصرعہ سے رویا کے معنی ”خواب میں رویت“ ہی کے

نکلتے ہیں نہ کہ رویاء بصری کے مگر تعجب یہ ہے کہ دونوں باتیں محض دعویٰ پر ہی ختم ہو گئی ہیں اور دعوے کے لیے زحمت دلیل کی ضرورت

نہیں محسوس کی گئی۔ تسلیم کر لیجئے کہ لغت عرب کے لیے متنبی مستند نہیں ہے مگر مشہور جاہلی شاعر راعی کس لیے غیر مستند قرار پایا جبکہ کلام

عرب کی سند کے لیے جاہلی شعراء سے زیادہ کوئی سند مقبول نہیں سمجھی گئی نیز راعی نے جبکہ جملہ ”فکبر“ کو ”للروياء“ کے ساتھ وابستہ کیا

ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ ”رویاء“ کی وجہ سے اس نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور ظاہر ہے کہ نعرہ تکبیر خواب میں بلند نہیں ہوا تھا

بلکہ عالم بیداری کا واقعہ تھا، اسی طرح متنبی کے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ شب وصل میں تیرے دیدار کے مقابلہ میں نیند بیچ ہے اگرچہ

یہ صحیح ہے کہ نیند خود بہت شیریں ہے مگر دیدار محبوب کے مقابلہ میں اس کی شیرینی بھی بے حقیقت ہے۔

اس لغوی حقیقت کے آشکارا ہو جانے کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد جوج صحیح بخاری میں مذکور ہے:

رويا عين اريها رسول الله صلى الله عليه وسلم.

سونے پر سہاگہ ہے کیونکہ وہ لغت عرب کے امام بھی ہیں اور ترجمان القرآن بھی، اور ان کے مقابلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد پیش کرنا قطعاً مرجوح ہے کہ وہ اسراء کو رویا بمعنی خواب مراد لیتے ہیں۔

مرجوح اس لیے ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما سے جو روایات اس سلسلہ میں منقول ہیں وہ

لحاظ صحت روایت وہ درجہ نہیں رکھتیں جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو حاصل ہے بلکہ محدثین کے نزدیک بچند وجوہ ان کی



صحت غیر مستند ہے۔ مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کتب حدیث کی بجائے فقط سیرت کی روایت ہے اور پھر محمد بن اسحاق رضی اللہ عنہ اس کے متعلق یہ کہتے ہیں ”حدثنی بعض الی ابی بکر“ ”مجھ سے یہ روایت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے ایک فرد نے بیان کی ہے“ اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ روایت منقطع ہے کیونکہ درمیان کا ایک راوی مجہول ہے جس کے متعلق کوئی علم نہیں کہ وہ کس درجہ کا راوی ہے نیز اس روایت کے طریق میں بھی باہم اختلاف ہے اس لیے کہ بعض روایت میں ہے:

ما فقدت جسد رسول الله صلى الله عليه وسلم.

”میں نے رسول اللہ ﷺ کا جسد اطہر گم نہیں پایا۔“

حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حریم نبوی ﷺ میں ہجرت کے بعد داخل ہوئی ہیں اور واقعہ معراج ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ”ما فقدت“ ”میں نے گم نہیں پایا“ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اس لیے بلاشبہ اس روایت میں جرح و نقص ہے۔

اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی سیرت میں منقول روایت ہے جس کو محمد بن اسحاق رضی اللہ عنہ نے یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس سے روایت کیا ہے اور محدثین اس پر متفق ہیں کہ یعقوب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا، اس لیے یعقوب اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ضرور کوئی راوی متروک ہے، جس کا روایت میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ پس یہ روایت بھی مجروح و منقطع ہے اور بروایت ابن اسحاق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول ”قال كانت رويها من الله صادقة“ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”معراج اللہ تعالیٰ کی جانب سے سچا خواب تھا“ کسی طرح بھی صحت کو نہیں پہنچتا۔

اب ایک مرتبہ پھر احادیث معراج پر نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ ایک جانب بخاری و مسلم اور صحاح کی وہ روایات ہیں جو متن و سند کے لحاظ سے مسلم اور صحت کے اعلیٰ معیار پر قائم سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی تفصیلات واقعہ معراج کو بحسد عنصری ظاہر کرتی ہیں اور اسی لیے جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اسی مسلک کو اختیار کیے ہوئے ہیں اور دوسری جانب محمد بن اسحاق کی سیرت میں منقول اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب وہ روایات ہیں جن کی صحت تک مجروح ہے، اس لیے بات صرف یہی نہیں ہے کہ جو شخص سورہ بنی اسرائیل کی آیت میں ”رویا“ بمعنی ”خواب“ لیتا ہے اس کا قول درست نہیں ہے بلکہ بلحاظ سند یہ انتساب بھی صحیح نہیں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ روایا منامی کے قائل ہیں کیونکہ جن جلیل القدر محدثین و مفسرین نے اس قول کو ان بزرگوں کی جانب منسوب کیا ہے اس کا مدار محمد بن اسحاق کی ہی یہ ہر دو روایات ہیں اور ان دونوں کی صحت کا حال ابھی روشن ہو چکا۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے بعض روایات میں واقعہ کی ابتداء اس طرح مذکور ہے ”بینا انانائم“ یا ”بین النائم واليقظان“ یعنی نبی اکرم ﷺ بحالت خواب تھے یا بیداری اور خواب کی درمیانی حالت میں تھے کہ خدا کا قاصد ”جبرئیل“ آیا، نیز بخاری کی شریک والی روایت کے ختم پر ہے ”استيقظ وهو في المسجد الحرام“ اور آپ ﷺ جاگ اٹھے جبکہ آپ ﷺ مسجد حرام میں تھے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ گزرا خواب میں گزرا۔

مگر یہ اس لیے صحیح نہیں کہ پہلے دو جملوں کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ جب معراج یا اسراء کا واقعہ پیش آنے والا تھا تو اس وقت آپ ﷺ سورہ تھے لیکن واقعہ بحالت بیداری پیش آیا جیسا کہ باقی تمام روایات سے ظاہر ہوتا ہے اور بقول قرطبی رضی اللہ عنہ



دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ راوی اس بیداری کا ذکر کر رہا ہے جو علی الصبح نماز فجر کے لیے ہوئی یعنی اگرچہ آپ ﷺ ابتداء شب میں ام ہانی کے مکان میں سوئے تھے مگر کچھ حصہ شب میں جب معراج کا واقعہ پیش آیا اور آپ اس سے فارغ ہو کر کرۂ ارضی پر واپس تشریف لائے تو باقی رات مسجد حرام میں سو کر گزاری اور جب آپ صبح کو بیدار ہوئے ہیں تو لوگوں نے مسجد حرام میں آپ کو پایا۔ علاوہ ازیں شریک کی روایت میں تعبیر ادا کی فاش غلطیاں ہو گئی ہیں جن پر محدثین نے تنبیہ فرمائی ہے مثلاً ان کی روایت کہتی ہے کہ معراج کا واقعہ بعثت سے بھی قبل پیش آیا:

انه جاءته ثلاثة نفر قبل ان يوحى اليه وهو نائم في المسجد الحرام.

”آپ کے پاس تین فرشتے بعثت اور نزول وحی سے قبل اس حالت میں آئے کہ آپ ﷺ مسجد حرام میں سو رہے تھے۔“ چنانچہ امام نووی، خطابی، ابن حزم، عبدالحق، قاضی عیاض رحمہم اللہ نے شریک کی روایت پر سخت تعاقب کیا ہے امام نووی رحمہم اللہ فرماتے ہیں: شریک نے اس روایت میں بہت سی غلطیاں کی ہیں جن کا علماء نے انکار کیا ہے اور مسلم نے بھی یہ الفاظ کہہ کر شریک کے اوہام پر تنبیہ کی ہے: ”شریک نے روایت میں مقدم و موخر کر دیا ہے اور کم و بیش کر دیا ہے، اوہام میں سے ایک وہم یہ ہے کہ شریک کی روایت میں ہے: ”معراج کا واقعہ نزول وحی سے قبل پیش آیا ہے۔“ حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے اور اس قول کا کوئی راوی بھی موافق نہیں ہے۔ حافظ عبدالحق رحمہم اللہ نے اپنی کتاب الجمع بین الصحیحین میں اس شریک والی روایت کو نقل کر کے کہا ہے کہ شریک نے اس میں بہت سی غیر معروف (ناقابل قبول) باتیں بڑھادی ہیں اور غیر معروف الفاظ کا بھی اضافہ کر دیا کیونکہ اسراء کی حدیث کو حافظ حدیث کی ایسی جماعت نے نقل کیا ہے جو بلند پایہ اور ہر قسم کی جرح سے محفوظ اور مشہور ائمہ حدیث ہیں۔ مثلاً ابن شہاب زہری، ثابت بنانی، قتادہ، عن انس اور ان میں سے کوئی ایک حافظ حدیث بھی ان اجزاء کو بیان نہیں کرتا جن کو شریک نے بیان کیا ہے اور شریک محدثین کے نزدیک حافظ حدیث نہیں ہے۔

بہر حال فتح الباری میں معراج اور اسراء کے متعلق اتحاد و تغائر کی بحث کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہم اللہ یہی فیصلہ فرماتے ہیں کہ معراج بحالت بیداری اور روح مع الجسد ہوئی ہے:

فمنهم من ذهب الى ان الاسراء والمعراج وقع في ليلة واحدة في اليقظة بجسد النبي ﷺ و روحه بعد المبعث و الى هذا ذهب الجمهور من علماء المحدثين والفقهاء المتكلمين و تواردت عليه ظواهر اخبار الصحيحة ولا ينبغي العدول عن ذلك اذ ليس في العقل ما يحيله حتى يحتاج الى تاويله. \*  
”پس ان علماء میں سے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ بلاشبہ واقعات اسراء و معراج دونوں ایک ہی رات میں بحالت بیداری جسم اور روح کے ساتھ بعثت کے بعد پیش آئے۔ تمام محدثین، فقہاء اور متکلمین کا یہی مذہب ہے اور صحیح احادیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اور اس سے تجاوز کرنا یعنی اس کا انکار کرنا مناسب ہے اس لیے کہ ایسا ہونا عقل کے نزدیک محال نہیں ہے کہ تاویل کرنے کی احتیاج ہو۔“

اور قاضی عیاض شفاء میں یہی تحریر فرماتے ہیں:



و ذهب معظم السلف والمسلمين الى ان الاسراء بالجسد في اليقظة وهو الحق وهذا قول ابن عباس و جابر و انس و حذيفة و عمرو ابى هريرة و مالك بن صعصعة ابى حبة البدرى و ابن مسعود و ضحاک و سعيد بن جبیر و قتادة ابن لسيب و ابن شهاب ابن زيد و الحسن و ابراهيم و مسروق و مجاهد و عكرمة و ابن جريج و هو دليل قول عائشة و هو قول الطبراني و ابن حنبل و جماعة عظيمة من المسلمين و هو قول اكثر المتأخرين من الفقهاء والمحدثين والمتكلمين والمفسرين.

”جليل القدر سلف صالحين اور بزرگ ترين مسلمان اس جانب میں کہ اسراء بحسد عنصري بیداری میں پیش آیا اور یہی مذہب حق ہے اور یہی ابن عباس، جابر، حذیفہ، عمر، ابو ہریرہ، مال بن صعصعہ، ابو حبہ بدری، ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور ضحاک، سعید ابن جبیر، قتادہ، ابن مسیب، ابن شہاب، ابن زید، حسن، ابراہیم نخعی، مسروق، مجاہد، عکرمہ، ابن جریج رضی اللہ عنہم کا قول ہے، اور یہی دلیل ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول کی اور یہی طبرانی رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور ابن حنبل رضی اللہ عنہ کا اور مسلمانوں کی جماعت عظیم کا، اور یہی قول ہے متأخرین میں سے اکثر فقہاء، محدثین، متکلمین اور مفسرین کا۔“

اور خفاجی نسیم الریاض میں قاضی عیاض کی اس عبارت ”و هو دليل قول عائشة“ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ بات بظاہر خلاف معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جانب جو قول منسوب ہے وہ اس کے قطعاً خلاف ہے لیکن قاضی عیاض رضی اللہ عنہ کا یہ دعویٰ ہے کہ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ نقول اس امر کی دلیل ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب منسوب قول صحیح نہیں ہے اور وہ بھی جمہور ہی کے ساتھ ہیں۔

الحاصل قرآن عزیز اور احادیث صحیحہ بغیر کسی تاویل کے بصراحت یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسراء اور معراج کا واقعہ بحسد عنصري اور بحالت بیداری پیش آیا ہے اور ان دلائل کو بطور فہرست اس طرح شمار کرایا جاسکتا ہے:

① سورہ بنی اسرائیل کی آیت ﴿أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ﴾ میں اسراء کے متبادر معنی وہی ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت لوط علیہما السلام سے متعلق آیات میں ہیں یعنی بحالت بیداری اور بحسد عنصري رات میں لے چلنا۔

② آیت ﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي آرَيْنَاكَ﴾ میں ”رویا“ بمعنی عینی مشاہدہ ہے نہ کہ خواب یا روحانی رؤیت اور لغت عرب میں ”رویا“ کے یہ معنی مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہیں۔

③ آیت ﴿إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ﴾ میں قرآن نے اس واقعہ کو اقرار و انکار کی شکل میں ایمان و کفر کے لیے معیار قرار دیا ہے اور اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مشاہدہ یا خواب پر بھی مشرکین و منکرین کا انکار و جحود ممکن اور ثابت ہے لیکن اس جگہ متبادر یہی ظاہر کرتا ہے کہ واقعہ کی عظمت و فخامت کے پیش نظر منکرین کا انکار اس لیے شدید سے شدید تر ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو عینی مشاہدہ کی طرح بیان فرمایا۔

④ سورہ النجم کی آیت ۱۷ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ﴾ میں رؤیت جبرئیل نہیں بلکہ واقعہ اسراء کا مشاہدہ عینی مراد ہے اور سورہ کی آیت ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ﴾ میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا قلب نے ہو بہو اس کی تصدیق کی اور متبادر نہ رؤیت عینی نے کجی اختیار کی اور نہ رؤیت قلبی نے اس حقیقت کا انکار کیا بلکہ دونوں کی مطابقت نے اس کی



صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

⑤ صحیح حدیث میں ہے کہ جب مشرکین نے اس واقعہ کے انکار پر یہ حجت قائم کی کہ اگر یہ صحیح ہے تو نبی اکرم ﷺ بیت المقدس کی موجودہ جزئی تفصیلات بتائیں کیونکہ ہم کو یقین ہے کہ نہ انہوں نے بیت المقدس کو کبھی دیکھا ہے اور نہ بغیر دیکھے جزئی تفصیلات بتائی جاسکتی ہیں، تب نبی اکرم ﷺ کے سامنے سے بیت المقدس کے درمیانی حجابات منجانب اللہ اٹھادیئے گئے اور آپ ﷺ نے ایک ایک چیز کا مشاہدہ کرتے ہوئے مشرکین کے سوالات کے صحیح جوابات مرحمت فرمائے جن میں مسجد کی بعض تعمیری تفصیلات تک زیر بحث آئیں، یہ دلیل ہے اس امر کی کہ مشرکین یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ ﷺ اسراء کو بحالت بیداری اور بحسد عنصری ہونا بیان فرما رہے ہیں اور نبی اکرم ﷺ نے ان کے خیال کی تردید نہیں فرمائی بلکہ اس کی تائید کے لیے معجزانہ تصدیق کا مظاہرہ فرما کر ان کو لاجواب بنا دیا۔

⑥ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بسند صحیح منقول ہے کہ قرآن میں مذکور ”رویاء“ سے مراد ”رویاء عین“ ہے نہ کہ خواب یا روحانی مشاہدہ۔

④ آیت ﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّعْيَا الَّتِي آرَبْنِكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ ۗ﴾ (بنی اسرائیل: ۶۰) میں یہ مذکور ہے کہ واقعہ اسراء اور جہنم کے اندر سینڈھ کے درخت کا موجود ہونا اور آگ میں نہ جلنا یہ دونوں واقعے اقرار و انکار کی صورت میں ایمان و کفر کے لیے آزمائش ہیں پس جبکہ مہینوں کی غذا کے لیے ایک مادی خاردار درخت کا موجود ہونا، سرسبز و شاداب رہنا اور آگ سے نہ جلنا مشرکین کے انکار کا باعث ہوا، بلاشبہ اسراء کے واقعہ میں بھی آزمائش کا پہلو یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کس طرح زمان و مکان کی قیود کو توڑ کر بحسد عنصری و بحالت بیداری وہ سیر کر لی جس کا ذکر سورہ بنی اسرائیل اور وانجم میں اور صحیح احادیث میں ہے اور یقیناً مشرکین نے اس کا انکار کیا جس کے رد میں قرآن نے اس کو ﴿إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ﴾ کہہ کر اس قدر اہمیت دی ورنہ تو انبیاء علیہم السلام کے روحانی مشاہدات اور خواب کے واقعات کا انکار تو ان کے لیے ایک عام بات تھی۔

⑧ اسراء کا واقعہ جب پیش آیا تو صبح کو نبی اکرم ﷺ نے جن صحابہ رضی اللہ عنہم کی محفل میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا وہ سب باتفاق یہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ بحسد عنصری و بحالت بیداری پیش آیا مثلاً حضرت عمر، حضرت انس، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ اور اس کے برعکس ذیل کے قائلین میں حضرت امیر معاویہ، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اسمائے گرامی ہیں جن کا اسلام یا حرم نبوی سے تعلق اس واقعہ سے برسوں بعد مدینہ کی زندگی پاک سے وابستہ ہے اس لیے واقعہ کے ایام میں موجود اصحاب کا قول راجح ہے۔

⑨ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کا جو مسلک جمہور کے خلاف منقول ہے وہ بلحاظ درجہ روایت و صحت سند نہ صرف مرجوح بلکہ مجروح ہے اس لیے اول تو ان بزرگوں کی جانب اس قول کا انتساب ہی درست نہیں اور بالفرض صحیح بھی ہو تو جمہور کے مسلک کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے مرجوح ہے۔ وذلک تسع آیات بینات۔

وانجم اور واقعہ معراج:

واقعہ معراج کی تفصیلات اگرچہ مستند، مشہور اور مقبول روایات و احادیث سے ثابت و منصوص ہیں لیکن خود قرآن عزیز



(والنجم) میں بھی بنص صریح بعض وہ تفصیلات مذکور ہیں جن کو بنی اسرائیل کے اجمال کی تفسیر کہنا چاہیے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چند آیات کی تفسیر بھی بیان کر دی جائے۔

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝۱ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۝۲﴾ (النجم: ۱-۲)

نجم، تارہ کو کہتے ہیں، اور ”النجم“ کہہ کر کبھی خاص ستارہ ثریا پر بھی اطلاق کرتے ہیں اور ”ہوی“ کے معنی سقوط و غروب کے ہیں اور ”والنجم“ میں ”واو“ قسم کے لیے ہے جس سے استعمالات قرآنی میں اکثر مضمون مابعد کی اہمیت کے پیش نظر استشہاد مقصود ہوتا ہے ”ضل“ ضلالت سے ہے، گمراہ ہونے اور بہک جانے کو کہتے ہیں اور ”غوی“ غوایت سے جس کے معنی بے راہ روی اور بچل جانے کے ہیں۔ پس ہر دو آیات کا مطلب یہ ہوا کہ شب دیبجور کے یہ ستارے یا ثریا اس امر کی شہادت ہیں کہ جس طرح نظام شمسی میں ثریا بلکہ تمام ستارے طلوع سے غروب تک ایسے محکم اور مضبوط نظام فطرت میں منسلک ہیں کہ مقررہ وقت و معین رفتار کے ساتھ بغیر بھٹکنے پچلے ہوئے جاری و ساری ہیں، ٹھیک اسی طرح روحانی نظام شمسی کے تمام ستارے (انبیاء علیہم السلام) بھی نبوت و رسالت کے مقررہ اصول و معین راہ پر جاری و ساری رہے ہیں اور کبھی خدا کے معین کردہ نظام نبوت سے نہ بھٹکے اور نہ بے راہ ہوئے تو پھر یقین کرو کہ اس نظام روحانیت (نبوت) کا آفتاب عالمتاب یعنی تمہارا رفیق (محمد ﷺ) بھی نہ بھٹکا اور نہ بے راہ ہوا، اور ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ ایسا ہونے پر سارا نظام نبوت ہی درہم برہم ہو کر رہ جاتا اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا، یا یوں کہہ لیجئے کہ تمہارے سامنے جس شب کا ذکر ہو رہا ہے اس شب دیبجور میں ثریا جیسے روشن ستارہ کا طلوع ہو کر غروب ہو جانا اس پورے نظام شمسی کے تغیر و فنا کی بولتی تصویر ہے پس اگر تمہارا رفیق (محمد ﷺ) کسی ایسے واقعہ کا اظہار کرتا ہے جو عام قانون قدرت کے پیش نظر عجیب و غریب معلوم ہوتا اور اس نظام شمسی کے ایک خاص دور انقلاب اور حیرت زان تغیر کا پتہ دیتا ہے تو تم کو یقین کرنا چاہیے کہ یہ واقعہ بلاشبہ عالم وجود میں آیا اور تمہارا رفیق اس معاملہ میں نہ بھٹکا اور نہ بے راہ ہوا بلکہ جو کچھ دیکھا اور جو کچھ نقل کیا وہ سب حرف بحرف حق مبنی برحقیقت ہے۔

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝۱﴾ (النجم: ۳) ”نطق“ گویائی اور ”ہوی“ خواہش نفس۔ ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝۲﴾ ”وحی“ وہ یقینی الہام جو خدا کی جانب سے نبی پر نازل ہوتا ہے اور جس کے خدا کی جانب سے ہونے میں کسی قسم کا شک و تردد نہیں ہوتا یعنی ”رسالت“ اور یہ بھی واضح رہے کہ تمہارے رفیق کی صدق مقالی کا یہ عالم ہے کہ وہ خدا کی باتیں کبھی بھی اپنی خواہش نفس سے نہیں کہتا بلکہ جو کچھ بھی کہتا ہے وہ خدا کی ہی وحی سے ہوتا ہے۔

﴿عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝۱ ذُو مِرَّةٍ ۝۲ فَاسْتَوَىٰ ۝۳ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۝۴ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ

۝۵ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ۝۶﴾ (النجم: ۵-۹)

”علمہ“ تعلیم، سکھانا، ”شدید القوی“ زبردست روحانی طاقتوں والا، ”مرۃ“ زور آور ”فاستوی“ استواء، سیدھا ہو بیٹھا، ”افق الاعلیٰ“ (آسمان کا) اونچا کنارہ ”دنی“ دنو، قریب ہونا، ”فتدلی“ تدلی، جھک آنا، ”قاب قوسین“ دو کمان کی مقدار، ”ادنی“ قریب یا کم۔

صاحب وحی (محمد ﷺ) اور وحی نازل کرنے والے (خدا) کے باہم رشتہ وحی کا اظہار کرنے کے بعد ضرورت تھی کہ ان



دونوں کے درمیان جو وحی کے لیے رابطہ ہے یعنی جبرئیل علیہ السلام کچھ اس کے متعلق بھی کہا جائے، کیونکہ مشرکین مکہ اس کی شخصیت اور اس کے فرض کی تفصیلات سے قطعاً نا آشنا تھے اور یوں بھی وحی کی عظمت، صاحب وحی کی جلالت اور وحی نازل کرنے والی ہستی کے جلال و جبروت کا تقاضا تھا کہ رابطہ وحی کی شخصیت کے بعض نمایاں اوصاف کو بھی بیان کیا جائے۔ اس لیے ارشاد ہوا۔ اس پر (محمد ﷺ پر) جو وحی لاتا ہے وہ زبردست روحانی و جسمانی طاقتوں کا پیکر ہے۔ وہ پیغمبر خدا ﷺ کو اپنی حقیقی ہیئت و صورت میں صاف نمایاں نظر آیا اور آپ ﷺ نے اس کو آسمان کے بلند کنارے پر دیکھا، پھر وہ قریب ہو گیا، پس (پیغمبر خدا ﷺ کی جانب) جھک آیا، پھر ہو گیا اتنا قریب جیسا کہ دو کمان کی مسافت یا اس سے بھی قریب تر۔

﴿فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۚ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۚ أَفَتُرَوُّنَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۚ﴾ (النجم: ۱۰-۱۲)

”فواد“ قلب ”رای“ رویت بھر ”تمارونہ“ ہماراۃ بمعنی مقابلہ کرنا، جھگڑا کرنا۔

جب صاحب وحی (محمد ﷺ) اور وحی کے لانے والے (جبرئیل علیہ السلام) کے درمیان صورت حال یہ پیش آئی تو اس کے بعد موچی (وحی کرنے والے خدا) نے اپنے بندے پر جو کچھ چاہا وہ براہ راست وحی فرمائی یعنی جب اس مقام رفیع پر بلا کر جہاں کسی مخلوق کا گزرنہ ہوا اور نہ ہو، مخاطب کو کیا بتلایا جائے کہ خدا اور اس کے پیغمبر کے درمیان کیا کچھ وحی کی سرگوشیاں ہوئیں، کیونکہ کسی کو وہ رفعت جب نصیب ہی نہیں تو وہ ان حقائق کو سمجھ ہی کیا سکتا ہے، لہذا اسی قدر کافی ہے کہ یہ یقین کر لو کہ خدا نے جو چاہا اپنے بندہ (محمد ﷺ) سے بات چیت کی اور یہ کہ اس کی آنکھ نے اس شب میں جن اسرار الہی کو دیکھا، قلب نے اس کو جھوٹا نہیں کہا، بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کے بارے میں چشم و قلب دونوں کے درمیان مطابقت و تصدیق کا ہی سلسلہ قائم رہا تو پھر اے مخاطبین جو کچھ اس (محمد ﷺ) نے دیکھا ہے کیا تم اس کے متعلق جھگڑتے ہو؟

﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ۚ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ ۚ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ ۚ إِذْ يُغْشَىٰ السِّدْرَةَ

مَا مَآ يَغْشَىٰ ۚ﴾ (النجم: ۱۳-۱۶)

”نزلة اخزی“ ایک قسم کا نزول یا دوسری مرتبہ ”سدرہ“ بیری کا درخت ”سدرۃ المنتہی“ ملاء اعلیٰ کا ایک مقام رفیع ”جنتہ الماوی“ نیکوں کے قیام کی جنت ”یغشی“ غشیان، ڈھانپ لینا۔

حالانکہ جھگڑنے کی کوئی بات نہیں اس لیے کہ اس نے وحی کرنے والے (خدا) کو ایک خاص کیفیت نزول کے ساتھ دیکھا ہے اور اس وقت دیکھا جب وہ (محمد ﷺ) سدرۃ المنتہی کے پاس تھا جس کے قریب جنت الماوی ہے اور اس وقت اس سدرہ کو ڈھانپنے والی شے (یعنی فرشتوں) نے ڈھانپ رکھا تھا۔ \* یا یہ کہے کہ اس نے جبرئیل علیہ السلام کو دوسری مرتبہ (اصلی ہیئت میں) دیکھا۔ سدرۃ المنتہی کے قریب... الخ۔ پس نہ مشاہدہ جلوہ حق کوئی جھگڑنے کی بات ہے اور نہ رویت جبرئیل علیہ السلام کہ جس کو اس سے قبل بھی اس نے دیکھا ہے اور چشم حق میں اور قلب حق آگاہ کے لیے ان میں سے ایک بات بھی قابل نزاع نہیں۔

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۚ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ ۚ﴾ (النجم: ۱۷-۱۸)



”زاغ“ ذبیح، کچی۔ طغی، طغیان، سرکشی، خلاف حق رجحان۔

بہر حال اس کے مشاہدہ حق پر کوئی جھگڑے اور انکار کرے یا تسلیم کرے اور حق جانے، حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے لیلۃ الاسراء میں جو کچھ بھی مشاہدات کیے اور آنکھوں سے جو کچھ بھی دیکھا اس چشم حق میں نے حقیقت حال کے خلاف نہ کسی قسم کی کجی اختیار کی اور نہ وہ راہ سے بے راہ ہوئی اور بلا شائبہ شک و شبہ اس نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے نشان دیکھے۔

### واقعہ کی تفصیلات:

وہ نشان کیا تھے جن کو اس جگہ ﴿لَقَدْ دَايَ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ﴾ کہا، اور بنی اسرائیل میں ﴿لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا﴾ فرمایا اور اسی سورہ میں دوسرے مقام پر ﴿وَمَا جَعَلْنَا الزُّعْيَا لَتَبَىٰ أَرَبِنَا إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾ کہہ کر ان کی اہمیت کو روشناس کرایا تو بخاری و مسلم میں منقول صحیح، مشہور اور مقبول روایات کا مجموعی بیان یہ ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے ایک صبح کو ارشاد فرمایا: گزشتہ شب میرے خدا نے مجھ کو اپنے خاص مجد و شرف سے نوازا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ شب گذشتہ جبکہ میں سو رہا تھا، رات کے ایک حصہ میں جبرئیل علیہ السلام آئے اور مجھ کو بیدار کیا، ابھی پوری طرح جاگ بھی نہ پایا تھا کہ حرم کعبہ میں اٹھالائے اور تھوڑی دیر لیٹا تھا کہ پوری طرح بیدار کر کے اول میرا سینہ چاک کیا اور ملاء اعلیٰ کے ساتھ مناسبت تام پیدا کرنے کے لیے عالم دنیا کی کدورتوں کو (دھویا اور ایمان و حکمت سے بھر دیا۔ اس کے بعد حرم کے دروازہ پر لایا گیا اور وہاں جبرئیل علیہ السلام نے میری سواری کے لیے خچر سے کچھ چھوٹا جانور براق پیش کیا جو سفید رنگ کا تھا۔ جب میں اس پر سوار ہو کر روانہ ہوا تو اس کی سبک رفتاری کا یہ عالم تھا کہ حدنگاہ اور حد رفتار یکساں نظر آتی تھی کہ اچانک بیت المقدس جا پہنچے، یہاں جبرئیل علیہ السلام کے اشارہ پر براق کو مسجد کے دروازہ کے اس حصہ سے باندھ دیا جس سے انبیاء بنی اسرائیل مسجد اقصیٰ کی حاضری پر اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے (اور جو اس وقت تک بطور یادگار قائم تھا) پھر میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا اور دو رکعات پڑھیں، اب یہاں سے ملاء اعلیٰ کی تیاری شروع ہوئی تو اول جبرئیل علیہ السلام نے میرے سامنے دو پیالے پیش کیے ان میں سے ایک شراب (خمر) سے لبریز تھا اور دوسرا دودھ (لبن) سے، میں نے دودھ کا پیالہ قبول کیا اور شراب کا پیالہ مسترد کر دیا، جبرئیل علیہ السلام نے یہ دیکھ کر کہا: آپ ﷺ نے دودھ کا پیالہ قبول کر کے دین فطرت کو اختیار کیا (یعنی خدا کی جانب سے جو میں نے آپ ﷺ کو یہ دو پیالے پیش کیے تو دراصل یہ تمثیل تھی دین فطرت اور دین زلیغ کی، مگر آپ ﷺ نے اس حقیقت کو پہچان لیا اور دودھ کے پیالہ کو قبول فرما کر جو دین فطرت کی تمثیل تھا دین فطرت کو قبول فرمایا) اس کے بعد ملاء اعلیٰ کا سفر شروع ہوا اور جبرئیل علیہ السلام کی ہمرکابی میں براق نے آسمان کی جانب پرواز کی، جب ہم پہلے آسمان (اسماء دنیا) تک پہنچ گئے تو جبرئیل علیہ السلام نے نگہبان فرشتوں سے دروازہ کھولنے کو کہا، نگہبان فرشتہ نے دریافت کیا، کون ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: میں جبرئیل ہوں، فرشتہ نے دریافت کیا، تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا: محمد (ﷺ) فرشتہ نے کہا: کیا خدا کے مدعو ہو کر آئے ہیں؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا: بیشک، فرشتہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا: ایسی ہستی کا آنا مبارک ہو۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ جبرئیل علیہ السلام نے میری جانب مخاطب ہو کر کہا یہ آپ کے والد (اور نسل انسانی کے مورث اعلیٰ) آدم علیہ السلام ہیں، آپ ﷺ ان کو سلام کیجئے، میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے جواب سلام دیتے



ہوئے فرمایا: ”مرحبا بالابن الصالح والنبی الصالح“ ”خوش آمدید، برگزیدہ بیٹے اور برگزیدہ نبی“ اس کے بعد دوسرے آسمان تک پہنچے اور پہلے آسمان کی طرح سوال و جواب ہو کر دروازہ میں داخل ہوئے تو وہاں یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام سے ملاقات ہوئی، جبرئیل علیہ السلام نے ان کا تعارف کرایا اور کہا کہ آپ ﷺ سلام پر پیش قدمی فرمائیے، میں نے سلام کیا اور ان دونوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا: ”مرحبا بالابن الصالح والنبی الصالح۔“ ”خوش آمدید اے برگزیدہ بھائی اور برگزیدہ نبی“ پھر تیسرے آسمان تک پہنچ کر یہی مرحلہ پیش آیا اور جب میں آسمان ثالث میں داخل ہوا تو حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی جبرئیل علیہ السلام نے تقدیم سلام کے لیے کہا اور میرے سلام کرنے پر یوسف علیہ السلام نے بھی جواب سلام کے بعد یہی کلمہ کہا: ”خوش آمدید، اے برگزیدہ بھائی اور برگزیدہ نبی“ بعد ازاں چوتھے آسمان پر اس سوال و جواب کے ساتھ حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام سے اور چھٹے آسمان پر موسیٰ علیہ السلام سے اسی طرح ملاقات ہوئی لیکن جب میں وہاں سے روانہ ہونے لگا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رقت طاری ہو گئی، میں نے سب دریافت کیا تو فرمایا: مجھے یہ رشک ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے ایسی ہستی کو جو میرے بعد مبعوث ہوئی یہ شرف بخش دیا کہ اس کی امت میری امت کے مقابلہ میں چند در چند زیادہ جنت سے فیضیاب ہوگی۔ اس کے بعد سابق سوالات و جوابات کا مرحلہ طے ہو کر جب میں ساتویں آسمان پر پہنچا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی جو بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے اور جس میں ہر روز ستر ہزار نئے فرشتے (عبادت کے لیے) داخل ہوتے ہیں، انہوں نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: ”مبارک اے میرے برگزیدہ بیٹے اور برگزیدہ نبی“ یہاں سے پھر مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا (تمہاری بول چال میں یہ ایک انتہاء کی بیری کا درخت ہے) جس کا پھل (بیر) ہجر کی ٹھلیا کے برابر ہے اور جس کے پتے ہاتھی کے کان کی طرح چوڑے ہیں۔\* اس پر ملائکہ اللہ جگنو کی طرح بے تعداد چمک رہے تھے اور خدا کی خاص تجلی نے اس کو حیرت انگیز طور پر روشن و پُر کیف بنا دیا تھا۔

اسی سفر میں میں نے چار نہروں کا بھی معائنہ کیا ان میں سے دو ظاہر نظر آتی تھیں اور دو باطن میں بہ رہی تھیں، یعنی دو نہریں جن کا نام نیل اور فرات\* ہے آسمان دنیا پر نظر پڑی اور دو نہریں جنت کے اندر موجود پائیں اور ان مشاہدات کے بعد محمد ﷺ کو شراب (خمر) دودھ اور شہد کے پیالے پیش کیے گئے اور میں نے دودھ کو قبول کر لیا اس پر جبرئیل علیہ السلام نے مجھے بشارت سنائی

\* سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق مختلف روایات کا حاصل یہ ہے کہ جڑ چھٹے آسمان پر ہے اور اس کی شاخیں ساتویں آسمان سے بھی نکل گئی ہیں اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے چیزیں زمین پر اترتی اور زمین سے اوپر چڑھ کر وہاں تک پہنچتی ہیں گویا نزول و عروج کا مقام اتصال ہے۔ اس مقام سے آگے نبی اکرم ﷺ کے علاوہ نہ جبرئیل علیہ السلام اور دوسرے ملائکہ اللہ کا گذر ہوا اور نہ کسی نبی مرسل کا۔

محدثین کہتے ہیں کہ یہ مقام اس درخت کی شکل میں دراصل ”ایمان و حکمہ“ کی حقیقت کو مشکل و مصور ظاہر کرتا ہے، اس لیے کہ ایمان، نیت صالح اور عمل صالح کا جامع ہے، پس یہ درخت پھل کے ذائقہ اپنی خوشبو اور اپنے سایہ ہر سہ صفات کے لحاظ سے حقیقت ایمان کا مظہر ہے یعنی اس درخت کے پھل کا لذیذ ذائقہ نیت صالح کا مظہر ہے اور عمدہ خوشبو قول صالح اور راحت بخش سایہ عمل صالح کا مظہر ہے اور اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے ایمان کی تشبیہ شجر کے ساتھ دی ہے۔ ارشاد مبارک ہے: الايمان بضع سبعون شعبه الحديث

\* تو یہ مراد ہے کہ جس وقت آپ نے جنت میں دو نہریں دیکھیں تو آپ نے اسی وقت جب دنیا کی جانب نگاہ کی تو وہاں سامنے نیل اور فرات بہتی ہوئی نظر آئیں اور یا ملاء اعلیٰ کی نہروں کے اسی طرح نام ہیں جس طرح دنیا کے دو دریا نیل اور فرات ہیں۔



کہ آپ ﷺ نے ”دین فطرت“ کو قبول کر لیا (یعنی جو ہر قسم کی کدورتوں سے پاک اور شفاف ہے عمل میں شیریں اور خوشگوار اور نتیجہ میں حد درجہ مفید اور احسن ہے)۔

پھر خدائے تعالیٰ کا خطاب ہوا کہ تم پر شبانہ روز پچاس نمازیں فرض قرار دی گئیں جب میں ان اسرار الہی کے مشاہدات سے فارغ ہو کر نیچے اترنے لگا تو درمیان میں موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، انہوں نے دریافت کیا: معراج کا کیا تحفہ لائے؟ میں نے کہا: پچاس نمازیں، انہوں نے فرمایا: تمہاری امت اس بارگراں کو برداشت نہ کر سکے گی اس لیے واپس جائیے اور تخفیف کی التجاء کیجئے کیونکہ میں تم سے قبل اپنی امت کو آزما چکا ہوں۔ چنانچہ میں درگاہ الہی میں رجوع ہوا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے پانچ کی تخفیف ہو گئی، موسیٰ علیہ السلام تک لوٹ کر آیا تو انہوں نے پھر اصرار کیا کہ اب بھی زیادہ ہیں اور کم کراؤ، اور میں اسی طرح چند مرتبہ آتا جاتا رہا حتیٰ کہ صرف پانچ نمازیں رہ گئیں، مگر موسیٰ علیہ السلام مطمئن نہیں ہوئے اور فرمایا میں بنی اسرائیل کا کافی تجربہ اور ان کی اصلاح کر چکا ہوں، اس لیے مجھے اندازہ ہے کہ آپ ﷺ کی امت یہ بھی برداشت نہ کر سکے گی، اس لیے تخفیف کے لیے مزید عرض کیجئے، تب میں نے کہا کہ اب عرض کرتے شرم آتی ہے، میں اب راضی برضا اور اس کے فیصلہ کے سامنے سر نیاز جھکتا ہوں۔ جب میں یہ کہہ کر چلنے لگا تو ندا آئی ”ہم نے اپنا فرض نافذ کر دیا اور اپنے بندوں کے لیے تخفیف کر دی یعنی مشیت الہی قبل ہی یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ امت محمد (ﷺ) پر بصورت اداء اگرچہ پانچ نمازیں فرض رہیں گی مگر ان کا اجر و ثواب پچاس ہی کے برابر ہوگا اور یہ تخفیف ہمارا فضل و کرم ہے۔“ ان ہی روایات میں ہے کہ میں نے جنت و جہنم کا بھی مشاہدہ کیا اور پھر مشاہدہ کی تفصیلات بھی منقول ہیں۔

### معراج میں رویت باری :

کیا معراج میں نبی اکرم ﷺ نے ذات احدیت کے جمال جہاں آراء کا بے حجاب مشاہدہ کیا؟ صحیح روایات میں اس مسئلہ کے متعلق جو تعبیرات مذکور ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاہدہ ضرور کیا تاہم نبی اکرم ﷺ اس مشاہدہ کی کیفیت کے حقیقی اظہار سے اس لیے قاصر ہیں کہ دنیوی تعبیرات میں کوئی تعبیر ایسی موجود نہیں کہ بلند سے بلند ترین مخلوق اس کے ذریعہ جمال جہاں آراء کی کیفیت و حقیقت کو بیان کر سکے اس لیے آپ ﷺ نفس واقعہ کا اقرار فرماتے ہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں منقول ہے ”رایتہ نورا میں نے اس کو ”نور“ دکھا“ اور مشاہدہ کے باوجود جمال جہاں آراء کی ناقابل بیان کیفیت کا پھر ان الفاظ میں اظہار بھی فرماتے جاتے ہیں ”نور انی اراہ“۔ اس نور بحت کا حقیقی مشاہدہ کہاں ہو سکتا تھا۔

پس حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے مقابلہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے رویت باری کی نفی میں آیت قرآنی کا یہ استدلال ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ (الانعام: ۱۰۳) ”اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کا یعنی دیکھنے والوں کی پوری حقیقت کا ادراک کیے ہوئے ہے۔“ اس لیے مرجوح ہے کہ آیت میں موجودہ دنیا کی مادی اور محدود بصارت کے مشاہدہ کا انکار ہے جو لاریب حق ہے لیکن ملاء اعلیٰ کا وہ مقام معراج جہاں زمان و مکان اور حدود و قیود سے آزاد اسرار الہی کے مشاہدات کے لیے کسی کو نواز گیا ہو تو اس کے مشاہدہ حقیقت کا یہ آیت کسی طرح انکار نہیں کرتی۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے آج تک محققین علماء کی ایک کثیر جماعت سلفا عن خلف سورہ والنجم کی آیات ﴿اَفْتَرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یُرٰی﴾ ﴿مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰ﴾ کی تفسیر میں صحیح احادیث کی استمداد سے یہ ثابت کرتی رہی ہے کہ ان



مقامات میں رویت سے ”رویت باری“ مراد ہے چنانچہ محقق عصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ نے سورہ والنجم کی دقتی و لطیف اور بے بہا تفسیر میں اس حقیقت کو باحسن وجوہ بیان فرمایا ہے۔\*

## ہجرت

ہجرت لفظ ”ہجر“ سے ماخوذ ہے جس کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں اور اسلام کی اصطلاح میں ”اللہ کے لیے ترک وطن کر دینا“ ہجرت کہلاتا ہے۔

### ہجرت حبش:

اللہ کے دین پر استقامت اور کلمہ حق کی حفاظت کی خاطر فداکاران اسلام کو ترک وطن کی پہلی آزمائش اس وقت پیش آئی جبکہ کفار مکہ اور مشرکین قریش نے ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر مسلمانوں کے لیے ان کے محبوب وطن (مکہ) میں دین حق پر قائم رہتے ہوئے لمحات زندگی کو ناممکن بنا دیا اور اب ترک وطن کے علاوہ کوئی چارہ کار باقی نہ چھوڑا، پس مٹھی بھر مسلمانوں پر مشرکین کے ناقابل برداشت مظالم اور مسلمانوں کے حیرت زا صبر و استقلال نے دنیا تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا جو ”ہجرت حبش“ کے عنوان سے معنون ہے۔

حبشہ کا موجودہ فرمانروا اصمہ\* عیسائی تھا اور دین مسیحی کا عالم بھی اس لیے نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ سردست حبشہ کو ہجرت کر جائیں، توقع ہے کہ اصمہ کی حکومت ان کا خیر مقدم کرے گی اور وہ کسی مزاحمت کے بغیر دین حق پر قائم و مستقیم رہ سکیں گے۔

ہجرت کے اس دور کی نمایاں شخصیت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کی رفیقہ حیات رسول اللہ ﷺ کی لخت جگر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا ہیں، نبی اکرم ﷺ نے اس مقدس جوڑے کو رخصت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ لوط اور ابراہیم علیہما السلام کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جو خدا کی راہ میں ہجرت کر رہا ہے۔\* پھر آہستہ آہستہ یہ تعداد اسی تک پہنچ گئی ان مہاجرین میں نبی اکرم ﷺ کے عم زاد بھائی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بھی تھے یہی وہ مرد حق کوش ہیں جنہوں نے قریش کے وفد کی مہاجرین سے متعلق زہر چکانی اور مطالبہ مراجعت کے سلسلہ میں نجاشی حبشہ کے دربار میں اسلام پر بے نظیر تقریر فرمائی اور جس کا ذکر صفحات گذشتہ میں ہو چکا ہے۔

\* تفسیر کا یہ حصہ فتح الملہم شرح مسلم جلد اول از علامہ شبیر احمد عثمانی اور مشکلات القرآن لکھنوی نور اللہ مرقدہ، دونوں میں منقول ہے اور اپنی جگہ قابل مراجعت ہے۔

\* حبشہ کے بادشاہ کا لقب ”نجاشی“ تھا جو ”نجوسی“ کا معرب ہے نجوسی حبشی زبان میں حکمران کو کہتے ہیں۔

\* مستدرک حاکم ج ۴ ص ۴۰



## ہجرت مدینہ کے اسباب:

۱۱ نبوت موسم حج کے موقعہ پر الحراء اور منیٰ کے درمیان مقام عقبہ میں یثرب (مدینہ) کے چند لوگوں نے شب کی تنہائی میں نبی اکرم ﷺ کا پیغام حق سنا اور اسلام قبول کر لیا۔ یہ چھ یا آٹھ اشخاص تھے۔ دوسرے سال چند سابق اشخاص اور بعض دوسرے حضرات نے جو تعداد میں بارہ تھے حاضر خدمت ہو کر اسلام پر تبادلہ خیالات کیا اور مشرف باسلام ہو گئے ان کے اسماء گرامی بروایت محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ یہ ہیں: ابو امامہ، عوف بن الحارث، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر، عقبہ بن عامر، معاذ بن حرث، ذکوان بن عبد قیس، خالد بن مخلد، عبادہ بن صامت، عباس بن عبادہ، ابو الہیثم، عدیم بن ساعدہ۔

حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت فرماتے ہیں کہ ہم نے عقبہ اولیٰ میں حسب ذیل شرائط کے ساتھ اسلام پر بیعت کی تھی۔

① خدائے واحد کے ماسوا کسی کی پرستش نہیں کریں گے۔ ② چوری نہیں کریں گے۔

③ زنا نہیں کریں گے۔ ④ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔

⑤ کسی پر جھوٹی تہمتیں نہیں لگائیں گے اور نہ کسی کی غیبت کریں گے۔

⑥ اور کسی بھی اچھی بات میں آپ ﷺ (یعنی نبی اکرم ﷺ) کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

بیعت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، اگر تم نے ان شرائط کو پورا کیا تو تمہارے لیے جنت کی بشارت ہے اور اگر تم ان برائیوں میں سے کسی کے مرتکب ہوئے تو پھر تمہارا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے چاہے بخش دے اور چاہے جرم پر سزا دے۔

اس واقعہ نے مدینہ کے ہر گھر میں اسلام کا چرچا کر دیا اور آہستہ آہستہ ہر ایک خاندان میں آفتاب اسلام کی ضیاء باری ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ اوس و خزرج کی تمام شاخوں میں سے ۱۳ نبوت کو تہتر مرد اور دو عورتیں اسی مقام عقبہ پر موسم حج میں شب کی تاریکی کے اندر آفتاب نبوت کی درخشانی سے فیضیاب ہونے جا پہنچے۔ نبی اکرم ﷺ بھی اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کو ہمراہ لے کر وہاں پہنچ گئے اور ان کے سامنے اسلام پر ایک مؤثر وعظ فرمایا جس سے ان کے قلوب نور ایمان سے جگمگا اٹھے۔ اس کے بعد انصار اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان اس امر پر گفتگو ہوئی کہ اگر ذات اقدس ﷺ مدینہ میں نزول اجلال فرمائیں تو اشاعت اسلام کو بھی بہت زیادہ فائدہ پہنچے اور ہم کو بھی فیضیاب ہونے کا بخوبی موقع میسر آئے اور اس سلسلہ میں جانبین سے محبت و مودت کے قول و قرار بھی ہوئے جن کی تفصیل کتب سیر و تاریخ میں مذکور ہیں۔ ان ہی حضرات میں نبی اکرم ﷺ نے بارہ اشخاص کو منتخب فرما کر دعوت و تعلیم اسلام کے لیے اپنا نقیب مقرر فرمایا۔

یثرب (مدینہ) میں اسلام کی اشاعت نے جب اس طرح روز افزوں ترقی اختیار کر لی تو اب وحی الہی نے نبی اکرم ﷺ کی زبانی جاں نثاران اسلام کو اجازت دی کہ وہ مشرکین مکہ کی ہولناک ایذا رسانی سے محفوظ ہو جانے کے لیے مدینہ ہجرت کر جائیں اور خدا کے لیے ترک وطن اختیار کریں، چنانچہ آہستہ آہستہ مسلمانوں نے مدینہ کو ہجرت شروع کر دی، مشرکین مکہ نے یہ دیکھ کر مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لیے مظالم میں اور اضافہ کر دیا اور انسداد ہجرت کے لیے ممکن ذرائع کو اختیار کیا مگر خدا کا ارادہ اسلام



کا جذبہ ہجرت فرو نہ ہوا بلکہ وہ کثرت کے ساتھ مال، جان، آبرو اور اولاد کی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر اللہ کی راہ میں وطن عزیز کو خیر باد کہتے رہے اور اکثر ایسا ہوا کہ جب اہل مکہ نے ان کے اموال اور اہل و عیال کو ساتھ لے جانے سے روک دیا تو ان مردانِ خدا نے صبر آزمائی زندگی کے ساتھ ہجرت حق کی خاطر ان کو بھی وہیں چھوڑا اور تنہا خدا کے بھروسہ پر مدینہ روانہ ہو گئے۔

### ہجرت نبوی ﷺ:

اب مکہ میں مشاہیر مسلمانوں میں سے صرف ابو بکر اور علی رضی اللہ عنہما ہی باقی رہ گئے تھے اور ایک قلیل تعداد باقی مسلمانوں کی تھی تب قریش نے سوچا کہ محمد ﷺ کو قتل کر کے اسلام کو مٹا دینے کا اس سے بہتر دوسرا کوئی موقعہ نہیں آئے گا۔

### دارالندوہ:

چنانچہ تمام سردارانِ قریش قصی بن کلاب کے قائم کردہ گورنمنٹ ہاؤس ”دارالندوہ“ میں جمع ہوئے اور سرورِ عالم ﷺ کے قتل سے متعلق سازشی مجلس مشاورت قائم کی۔ اس مجلس میں عتبہ، شیبہ، ابوسفیان، طیعمہ بن عدی، جبیر بن مطعم، حارث بن عامر، نضر بن حارث، ابوالختری، رفیع بن اسود، حکیم بن حزام، ابو جہل، منبہ بن الحجاج، امیہ بن خلف جیسے صنادید قریش شریک مشورہ تھے۔ مشورہ شروع ہونے والا ہی تھا کہ ایک شیطان ”شیخ نجدی“ دارالندوہ کے دروازہ پر آ موجود ہوا اور شرکتِ مجلس کا خواستگار بنا، قریش مکہ نے ہم مشرب پا کر بخوشی اجازت دی اور اب مشورہ شروع ہوا مختلف اہل الرائے نے مختلف رائیں دیں لیکن شیخ نجدی نے ہر ایک رائے کو غلط قرار دیا۔ آخر ایک شخص نے کہا: تمام قبائل میں سے ایک ایک جوان لیجئے اور ان سے کہئے کہ وہ بیک وقت محمد ﷺ پر حملہ کر کے قتل کر دیں اس سے کام بھی بن جائے گا اور بنو عبد مناف کسی سے قصاص لینے کی جرأت بھی نہ کر سکیں گے اور صرف خون بہاء پر معاملہ طے ہو جائے گا۔ شیخ نجدی نے اس رائے کو بہت سراہا اور یہی رائے طے پا گئی۔ ادھر جبریل علیہ السلام نے وحی الہی کے ذریعہ ذاتِ اقدس ﷺ کے سامنے اس پوری داستان کو کہہ سنایا اور عرض کیا کہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ آپ ﷺ آج کی شب اپنے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سلا کر خود مدینہ کو ہجرت کر جائیے، چنانچہ وحی الہی کے مطابق آپ ﷺ قریش کے نوجوانوں کی حراست کے باوجود سورہ یسین کی چند آیات ﴿فَاعْشَيْنَهُمْ فَهْمًا لَا يُبْصِرُونَ﴾ پڑھتے ہوئے اور ”شاہت الوجوہ“ فرما کر مٹھی بھر خاک ان کے سروں پر ڈالتے ہوئے صاف بیچ کر نکل گئے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر جا کر اور وحی الہی کا مژدہ رفاقت سنا کر ان کو ہمراہ لیے مدینہ کو روانہ ہو گئے۔

ہجرت کا یہ واقعہ ربیع الاول ۱۳ نبوت دوشنبہ کے روز پیش آیا یہ واقعہ اپنے خصوصی حالات اور معجزانہ اثرات کے ساتھ بہت مشہور اور صحیح احادیث و روایات میں مذکور ہے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سفر ہجرت میں رفاقت کی عظمت و جلالت کے لیے رہتی دنیا تک قرآن عزیز اس طرح ناطق ہے:

﴿ثَانِي اثْنَيْنِ إِذْ هَبَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (التوبہ: ۴۰)

”دوسرا تھا دو کا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے کہ یہ اپنے رفیق (ابو بکر رضی اللہ عنہ) سے کہہ رہا تھا ابو بکر (رضی اللہ عنہ) غم نہ کھا بلاشبہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔“



نبی اکرم ﷺ نے اس موقع پر ابو بکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ فرمایا ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ نہیں فرمایا۔ یہ اس لیے کہ ”خوف“ اور ”حزن“ کے لغوی فروق میں سے ایک دقیق فرق یہ بھی ہے کہ عموماً ”خوف“ اپنی مضرت کے سلسلہ میں ہوا کرتا ہے بخلاف ”حزن“ کے کہ وہ اس رنج کو کہتے ہیں جو اکثر دوسرے کی مصیبت کی وجہ سے خود کو پیش آتا ہے۔ گویا قرآن عزیز بنص صریح ناطق ہے اس حقیقت کے لیے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اپنی جان اور اپنی ذات کا خوف نہیں تھا بلکہ ذات اقدس ﷺ کی گرفتاری اور مشرکین کے ہاتھوں ظلمِ رسائی کا حزن و ملال جانکا ہی پر آمادہ کیے ہوئے تھا، پس حضور ﷺ قدسی صفات نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اس حالت کا اندازہ لگایا تو ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ کی جگہ ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ ارشاد فرمایا اور ساتھ ہی ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ فرما کر ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رفاقت کی مقبولیت پر بھی مہر تصدیق ثبت فرمادی۔ دنیا اپنے بغض و عناد اور زندقہ والحاد سے جو چاہے کہے لیکن رسول اکرم ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کی ”معیت حقہ“ کے لیے قرآن کے جملہ ﴿اللَّهُ مَعَنَا﴾ کی ناطقیت کے بقاء و دوام کو ساری کائنات بھی مل کر مٹانا چاہے تو نہیں مٹا سکتی۔

﴿ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ ۱۱

### قرآن عزیز اور ہجرت مدینہ:

واقعہ معراج میں گزر چکا ہے کہ درحقیقت اسراء تمہید تھی ہجرت کے عظیم الشان واقعہ کی یعنی واقعہ اسراء کے عجائبات اس امر کی تمہید تھے کہ اب آپ ﷺ کی تبلیغی زندگی کا دور ایک دوسرا رخ اختیار کرنے والا ہے جو کامرانیوں اور کامیابیوں سے بھرپور ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ پہلے آپ کو قبلتین اور ملاءِ اعلیٰ کے اسرار و غوامض سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ مکی زندگی جب مدنی حیات میں منقلب ہو تو اس سے قبل نبوت و رسالت کے کمالات غایتِ قصویٰ تک پہنچ چکے ہوں اور آپ کا منصب ہدایت اس مقام رفیع تک جا پہنچا ہو، جہاں خدا کی بلند سے بلند ترین مخلوق کا بھی گزر نہ ہوا ہوتا کہ آپ ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِينًا﴾ (المائدہ: ۳) کے شرف کو حاصل کر سکیں۔

پس سورہ بنی اسرائیل از ابتداء تا انتہاء ہجرت مدینہ کے ہی اسرار و لطائف سے معمور ہے چنانچہ ابتدائی آیات میں اسراء کا بیان ہے اور پھر ذکر آ گیا ہے رشد و ہدایت کے اصول کا اور درمیان میں امم سابقہ اور ان کے ہدایۃ انبیاء و رسل کے واقعات تبلیغی کا تذکرہ شواہد و نظائر بن کر سامنے آ جاتا ہے اور اس ضمن میں معراج کے حکم و اسرار کا بھی ذکر ہوتا جاتا ہے اور اس کے بعد ﴿رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ...﴾ (الایۃ) سے مکہ سے خروج اور مدینہ کی ہجرت کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور یہ ذکر آخر سورت تک جاری رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے مسطورہ ذیل ہر دو آیات کے سلسلہ مضامین کو ہجرت مدینہ سے ہی وابستہ قرار دیا ہے:

﴿وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذَا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلْفَكَ اِلَّا

قَلِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل: ۷۶)

”اور قریب تھا کہ وہ (مشرکین) البتہ تجھ کو عاجز کر دیتے سرزمین (مکہ) سے تاکہ تجھ کو اس سے نکال دیں اور ایسی حالت میں ان کی ہلاکت بہت قلیل عرصہ میں سامنے آ جاتی۔“



یہ مشرکین کے حق میں سخت قسم کی تہدید و تحویف ہے کہ جب بھی تمہارے مظالم کی بدولت نبی اکرم ﷺ کو ہجرت مدینہ پیش آئے گی تمہاری اجتماعی زندگی کی ہلاکت قریب سے قریب تر ہو جائے گی، گویا ہجرت مدینہ، اسلام کی روز افزوں ترقی اور معاندین اسلام کی موت و ہلاکت کے لیے تقدیر مبرم ہے۔

﴿وَقُلْ رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل: ۸۰)

”اور کہئے! اے میرے پروردگار مجھ کو داخل کر (مدینہ) میں اچھا داخلہ اور نکال مجھ کو (مکہ) سے عزت کے ساتھ اور میرے لیے اپنی جانب سے زبردست نصرت و مدد عطا کر۔“  
اسی طرح سورہ انفال میں بعض واقعات کے ضمن میں ہجرت مدینہ کا تذکرہ موجود ہے:

﴿وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُبْتَلُوْكَ اَوْ يَخْرُجُوْكَ ۗ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْبٰكِرِيْنَ ۗ﴾ (الانفال: ۳۰)

”اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب منکرین تیرے خلاف سازش کر رہے تھے تاکہ تجھ کو قید کر لیں یا مار ڈالیں یا (مکہ سے) نکال دیں اور وہ اپنی سازشوں میں لگے ہوئے تھے خدا (اس کے خلاف) تدبیر کر چکا تھا اور اللہ تدبیر کرنے والوں میں سب سے بہتر مدبر ہے۔“

اور اسی طرح سورہ توبہ میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عظمت و جلالت قدر کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ہجرت مدینہ کا ذکر اس طرح موجود ہے:

﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثٰنِيْ اٰثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصٰحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۗ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدٰهُ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَاَجْعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا السُّفْلٰى ۗ وَكَلِمَةَ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۗ﴾ (التوبہ: ۴۰)

”اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کرو گے تو (نہ کرو) اس کی اللہ تعالیٰ نے اس وقت مدد فرمائی جب اس کو منکرین نے (مکہ سے) نکالا جبکہ وہ دونوں (محمد ﷺ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) غار (حراء) میں (روپوش) تھے جب وہ (رسول) اپنے رفیق (ابو بکر رضی اللہ عنہ سے) کہہ رہا تھا، تو غم نہ کھا بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے، پس اللہ نے اس پر اپنا سکینہ (طمینیت) اتارا اور اس کو ایسے لشکر کے ذریعہ قوت پہنچائی کہ تم اس کو نہیں دیکھ رہے تھے اور (اس طرح) خدا نے کافروں کا کلمہ پست کر دیا اور اللہ کا کلمہ ہی سب سے بلند ہے اور بلاشبہ اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔“

## ہجرت؟:

اسلام میں ”ہجرت“ ایک اہم فریضہ ہے، کون نہیں جانتا کہ انسان کے لیے وطن، مال اور اہل و عیال کس درجہ عزیز ہوتے



ہیں اور وہ ان ہی متاعِ گرانیہ پر اپنی بیوی دنیوی عیش و راحت اور بقاءِ حیات کا مدار سمجھتا ہے لیکن اس کی انسانیت اور انسانیت کا ارتقاء ان تمام مقاصدِ حیات سے بھی ایک بلند اور رفیع مقصدِ زندگی کا طالب ہے اور وہ خالق کائنات اور رب العالمین کی معرفت ہے جس کی ربوبیت نے اس کو یہ جامہ ہستی عطاء کیا، اسی معرفت کا نام ”دین“ اور ”ملت“ ہے۔ انسان جب اس مقصدِ حقیقی کو پالیتا ہے تو پھر اس کی نگاہ میں اس درجہ وسعت اور رفعت پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا کی ان تمام رنگینیوں اور نیرنگیوں کا دامن وسیع بھی اس کو تنگ نظر آتا اور وہ اس تنگ دامنی سے عاجز ہو کر آخر کار ”حیاتِ روحانی“ کی آغوش میں ہی تسکین پاتا ہے اور جب اس مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس حیاتِ باقی ”دینِ حق“ کی خاطر وہ دنیا کی تمام متاعِ گرانیہ تن، من، دھن، حتیٰ کہ اہل و عیال کو بھی تہ تیغ دیتا ہے اور اس دُربے بہا کو آنچ تک نہیں آنے دیتا جس کا نام ”ایمان“ ہے۔ اسی حقیقت حال کو اسلام کی مقدس اصطلاح میں ”ہجرت“ کہا جاتا ہے۔

اسی بناء پر ”ہجرت“ ایک صادق الایمان اور مخلص مسلمان کے اور منافق اور کافر ہستی کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے بہترین ”کسوٹی“ اور ”معیار“ ہے، نیز فضاءِ روحانی کا ٹمپرچر معلوم کرنے کے لیے ”جہاد“ اور ”ہجرت“ ہی ایسے دو ”مقیاس الحرات“ ہیں جن سے مومنوں کے ایمان کی حرارت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

قرآن عزیز نے ہجرت کی اہمیت پر جگہ جگہ توجہ دلائی ہے اور اس کو ایمان و اسلام کی کسوٹی قرار دیا ہے۔ جس کے لیے یہ مقامات خصوصیت کے ساتھ قابلِ مطالعہ ہیں: (البقرہ پ ۲ آیت ۲۱۸، آل عمران پ ۴ آیت ۱۹۵، سورہ انفال پ ۱۰ آیت ۷۴، سورہ توبہ پ ۱۰ آیت ۲۰، سورہ النحل پ ۱۴ آیت ۱۰۹، ۱۰۰/۴، سورہ نساء پ ۵ آیت ۹۷، سورہ النحل پ ۱۴ آیت ۴۱، سورہ نساء آیت ۴۱)۔

ابتداءً اسلام میں مکہ دارالکفر اور دارالحرب تھا، اس لیے وہاں سے مدینہ کو ہجرت کر جانا اسلام کے اہم ترین فرائض میں سے تھا تا کہ مسلمان مدینہ میں امن و عافیت کے ساتھ احکامِ اسلام کی پیروی کر سکیں اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اسلام کے مقصدِ عظمیٰ ”امر بالمعروف“ اور ”نہی عن المنکر“ کی یاد دوسرے الفاظ میں ”اعلاء کلمۃ اللہ“ کی صحیح خدمت انجام دے سکیں مگر جب ۸ ہجری میں ”فتحِ مبین“ نے مکہ کی اس حالت کو بدل کر ”دارالاسلام“ بنا دیا تو اب ہجرت کا یہ خاص فرض ختم ہو گیا اور زبانِ وحی ترجمان نے ((لا ہجرت بعد الفتح)) فرما کر اس حقیقت کا اعلان کر دیا، البتہ اب بھی مرکزِ توحید کے ساتھ والہانہ عشق و محبت کے جذبہ میں مکہ اور مدینہ ہجرت کر کے جانا اجر و ثواب کا ضرور استحقاق پیدا کرتا ہے۔

اور اگر کسی مقام اور کسی ملک میں بھی مسلمانوں کے لیے حیاتِ ایمانی کے پیش نظر وہی صورت حال پیدا ہو جائے جو اسلام کے ابتدائی دور (مکی دور) میں تھی تو اس وقت مسلمانوں کے لیے وہی احکامِ عائد ہو جائیں گے جو ”مکی دور“ کے متعلق قرآن و حدیث اور ان سے مستنبط ”فقہِ اسلامی“ میں پائے جاتے ہیں اور اصولی طور پر اس وقت صرف دو ہی اسلامی مطالبے سامنے آ جائیں گے یا ”جہاد فی سبیل اللہ“ کے ذریعہ اس حالت کا انقلاب“ اور یا پھر ”ہجرت“ اور کسی طرح بھی یہ جائز نہیں ہوگا کہ حالتِ راہنہ (موجودہ حالت) پر قناعت کر کے مطمئن زندگی بسر کی جائے۔

❖ فتح مکہ کے بعد مدینہ کی ہجرت فرض نہیں رہی۔

❖ البتہ جہاد فی سبیل اللہ کے طرق و اسباب پر وقت کے تقاضے کے پیش نظر ہی عمل واجب ہوگا۔



مکہ جب دارالکفر اور دارالحرب تھا تو اس وقت ہجرت مدینہ کو اسلام نے کس درجہ اہمیت دی اور اس مقصد فریج کے لیے مسلمانوں سے کس درجہ قربانی اور ایثار نفس کا مطالبہ کیا۔ آیات ذیل سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:

﴿ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۗ ثَوَابًا مِمَّنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾ (آل عمران: ۱۹۵)

”جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور میری راہ میں لڑے اور مارے گئے میں ضرور ان کے گناہ ان سے دور کر دوں گا اور ان کو ایسی جنتوں میں داخل کروں گا جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں، یہ بدلہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کے پاس اچھا بدلہ ہے۔“

﴿ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ لِأَعْظَمِ دَرَجَةٍ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿۲۰﴾ (التوبہ: ۲۰)

”جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اللہ کے نزدیک بہت بلند رہنے والے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔“

﴿ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْتُمُ الْمَلَائِكَةَ ظَالِمِينَ لِنَفْسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ ۗ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۗ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۗ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۗ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿۹۸﴾ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿۹۹﴾ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿۱۰۰﴾

(النساء: ۹۷-۹۹)

”بیشک جن کو فرشتوں نے ایسی حالت میں موت سے دوچار کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے ان سے (فرشتوں نے) پوچھا کہ تم کس حالت میں تھے انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور تھے، فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے سو یہی ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے مگر وہ کمزور مرد اور عورتیں اور بچے جو ہجرت کے لیے کوئی حیلہ نہیں کر سکتے اور نہ ہجرت کے لیے (راہ پاتے ہیں تو یہ وہ ہیں کہ امید ہے اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے اور اللہ بے شبہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔“

## ختم نبوت:

نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پہنچا تھا رشد و ہدایت کے اسلوب و نبی کے لحاظ سے اس معنی میں یکسانیت رکھتا ہے کہ اس تمام سلسلہ میں نبوت و رسالت جغرافیائی حدود میں محدود رہی ہے اور اس لیے



مختلف زبانوں میں ایک ہی وقت میں متعدد انبیاء علیہم السلام کی بعثت فرائض رسالت ادا کرتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیغام حق نے اگرچہ ایک گونہ وسعت اختیار کی اور بنی اسرائیل کی گم کردہ راہ بھیڑوں کے علاوہ بھی بعض حلقہ انسانی اس دعوت کی مخاطب بنی تاہم انہوں نے عالمگیر دعوت و پیغام کا دعویٰ نہیں کیا اور انجیل شاہد ہے کہ خود ذات قدسی نے بصراحت کہہ دیا کہ ان کی بعثت کا مخاطب محدود ہے۔

لیکن یہ سلسلہ آخر کب تک اسی طرح محدود رہ سکتا تھا اور جو حلقہ دعوت و ارشاد آہستہ آہستہ ترقی پذیر اور وسعت گیر ہوتا جا رہا تھا وہ قانون قدرت کے عام اصول کے خلاف کس طرح ہمیشہ کے لیے محصور رہ سکتا تھا۔ البتہ انتظار تھا تو اس کا کہ وہ وقت قریب آ جائے جبکہ دنیا کی وسیع پہنائیوں اور عالمگیر وسعتوں کے درمیان ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جائے کہ نہ ایک کے مفاد و مضار دوسرے حصوں سے اوجھل ہو سکیں اور نہ بیگانہ و بے تعلق رہ سکیں بلکہ خدا کی یہ وسیع کائنات مادی اسباب کی ہمہ گیری کی بدولت ایک ”کنبہ“ بن جائے اور انسان کبیر (عالم) کے تمام جوارح (ممالک و امصار) ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جائیں کہ ایک کا نفع و ضرر دوسروں کے نفع و ضرر پر اثر انداز ہونے لگے۔ بلکہ قانون فطرت اپنا مظاہرہ کرے اور مادی دنیا کی ہمہ گیری ہم آہنگی کے رونما ہونے سے قبل روحانی پیغام سعادت کو عالمگیر وسعت اور ہمہ گیر عظمت عطاء فرمائے۔ چنانچہ عالم اسباب میں فطرت کے عام قانون کی طرح رشد و ہدایت کا جو آغاز پہلے انسان کے ذریعہ ہوا تھا اس کا انجام اس مقدس ہستی تک پہنچ کر کامل و مکمل ہو گیا جس کا نام محمد اور احمد ﷺ ہے۔

﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِينًا﴾ (المائدہ: ۳)

مسئلہ کے اس پہلو کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں دو زندگیاں توام اور ہم رشتہ نظر آتی ہیں ایک مادی اور دوسری روحانی اور خدائے برتر کی ربوبیت کاملہ نے عالم کی ان ہر دو حیات کی راہ گزر کے لیے روشنی کا بھی انتظام کیا ہے تاکہ ان پر عمل پیرا ہو کر زندگی کی ٹھوکروں، لغزشوں اور تاریک راہوں سے محفوظ رہا جاسکے، چنانچہ اسی مقصد کے لیے اس نے مادی دنیا کے لیے آگ کا درخت لگایا:

﴿اَفْرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ﴿۷۱﴾ ؕ اَنْتُمْ اَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُونَ ﴿۷۲﴾﴾ (الواقعه: ۷۱-۷۲)

چقماق میں آگ پیدا کی اور تیل کو ذریعہ بنا کر دیے کو روشنی بخشی۔

﴿يَكَادُ زَيْتُهَا يَضِيءُ ؕ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ﴿۳۵﴾﴾ (النور: ۳۵)

مگر اس روشنی کو آغاز بھی بخشا اور انجام بھی اور فطری اور مصنوعی دونوں طریقوں سے اس کی ابتداء کو انتہاء تک پہنچا کر کامل و مکمل کر دیا کہ اس کے بعد نہ روشنی کی طلب باقی رہے نہ انتظار۔

غرض جو روشنی صنعت کے ہاتھوں دیے کی شکل میں نمود پذیر ہوئی اور شمع کا فوری، لائین، روشن گیس اور بجلی کے قلموں کی شکل میں ترقی کرتی رہی اور جو روشنی براہ راست فطرت کے ہاتھوں چھوٹے سے ستارہ کی صورت میں چمکی اور بڑے بڑے روشن ستاروں اور بدرو قمر کی شکل میں روبہ ترقی نظر آتی رہی وہ آخر کار ایک ایسی روشنی پر جا کر رک گئی جس کے بعد کسی روشنی کی ضرورت ہی



باقی نہ رہی اور طلب و انتظار کی تمام فرصتیں اس روشنی پر جا کر ختم ہو گئیں، دنیا نے جس کو آفتاب کہہ کر پکارا۔

اسی طرح اس کی رحمت عام اور ربوبیت کامل نے روحانی روشنی کا آغاز پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ کیا اور مادی دنیا کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ اس کی نوح، ہود، صالح، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام جیسے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ روحانی ستارے اور قمر و بدر بنا کر وسعت عطاء فرمائی اور آہستہ آہستہ ترقی دے کر اس درجہ پر پہنچا دیا کہ مناسب وقت آنے پر وہ روشنی محمد ﷺ کے پیغام رشد و ہدایت کی شکل میں آفتاب روحانیت بن کر سارے عالم پر چھا گئی۔

یہی وجہ ہے کہ اگر قرآن عزیز نے سورہ قمر میں مادی آفتاب کے لیے ”سراج“ کی تشبیہ دے کر اس کی عالمگیر درخشانی کا ذکر فرمایا تو سورہ احزاب میں روحانی آفتاب محمد ﷺ کو ”سراجاً منیراً“ کہہ کر دونوں آفتاب ہائے درخشاں کی ہم آہنگی کا اعلان فرمایا اور مادی و روحانی ہر دو آفتاب عالم تاب کو سراج (چراغ) سے تشبیہ دے کر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ گویا روشنیاں اپنی ہمہ گیر وسعت کے لحاظ سے آفتاب کہلانے کی مستحق ہیں تاہم یہ بات کسی طرح فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ یہ انجام اصل کے اعتبار سے اسی آغاز کا کامل و مکمل نمونہ ہے جس کی ابتدائی نمود روحانی اور مادی دیے (سراج) سے ہوئی اور روحانی وسعت و عظمت کے لحاظ سے بعض کو بعض پر اور ایک کو سب پر فضیلت و برتری حاصل ہوئی مگر اصل اور بنیاد کے پیش نظر سب کی نہاد ایک ہی روشنی ”وحی الہی“ سے وابستہ و پیوستہ ہے۔

الانبياء اخوة من علات امهاتهم شتى ودينهم واحد

ان ہر دو حقائق کے پیش نظر لانے کے بعد یہ حقیقت بھی لائق توجہ ہے کہ فطرت ہم کو روز و شب یہ تماشا دکھلا رہی ہے کہ اس کارزار حیات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ زیر و بم، نشیب و فراز، عروج و زوال اور زوال و کمال کے دائرہ میں محدود و محصور ہے یعنی جب کسی امر کے متعلق کہا جائے کہ یہ عروج و کمال کو پہنچ رہا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اب سے قبل اس میں جو کمی تھی وہ پوری ہو رہی ہے اور اسی طرح جب یہ سنا جاتا ہے کہ فلاں شے ابھی ابتدائی درجہ میں ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس کو ابھی بحد کمال پہنچنا ہے۔

غرض آغاز اور انجام، ابتداء اور انتہاء ان ہی دو نقطوں سے کارزار ہستی کا دائرہ بنتا ہے اور یہی دونوں زوال و عروج، نقص و کمال اور نشیب و فراز کی پرکار بناتے ہیں۔ پس آدم علیہ السلام نبوت کا آغاز تھے اور محمد ﷺ اس کا آخری انجام۔

پس جو شخص بھی دلیل یا وجدان کی ہدایت سے یہ تسلیم کرتا ہے کہ کائنات ہست و بود سب کچھ اسی کی مخلوق ہے تو گویا وہ یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ یہ سب نہ ازلی ہیں نہ ابدی بلکہ ان کے لیے آغاز بھی ہے اور انجام بھی اور اس لیے انسانی تخلیق نے کوئی بھی روپ اختیار کیا ہو بہر حال پہلا انسان اپنے ساتھ ہی مادی و روحانی ہدایت لے کر آیا ہے اور یہی وہ آغاز تھا جس کو ادیان سماوی نے نبوت آدم کے نام سے یاد کیا ہے اور جس کا سلسلہ برابر اس دنیا میں قائم رہا تا آ نکہ محمد ﷺ کا ظہور ہوا اور ذات قدسی صفات نے بعثت عام کا اعلان فرمایا۔

تو اب اس روحانی رشد و ہدایت یا پیغام الہی کے نشو و ارتقاء کے لیے اگر ذات اقدس محمد ﷺ کے ساتھ ختم نبوت کو وابستہ نہ سمجھا جائے تب تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہی وقوع پذیر تسلیم کی جاسکتی ہے ایک یہ کہ سلسلہ نبوت و رسالت نبی اکرم ﷺ پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس سے آگے ترقی و تکمیل کی راہ پر گامزن ہے یہاں تک کہ اس حد کمال تک پہنچ جائے جس کے بعد کسی تکمیل کی



حاجت باقی نہ رہے، دوسری صورت یہ کہ اس سلسلہ کے آغاز نے جو ترقی کی راہ اختیار کی ہے وہ تنزل کی جانب مائل ہو جائے اور یہ پیغام کسی طرح بھی شرمندہ تکمیل نہ ہو سکے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ جو سلسلہ ایک خاص حیثیت میں رو بہ ترقی ہے وہ جب حد تکمیل کو پہنچ جائے تو پھر کمال صورت زوال اختیار کر لے یا یوں کہہ دیجئے کہ حد کمال آغاز کی جانب لوٹ جائے اور تحصیل حاصل کا نمونہ پیش کر دے۔

لیکن آخری دو شکلیں غیر معقول بلکہ فطری تقاضا کے خلاف ہیں، پہلی صورت تو اس لیے کہ اس سے خدائے تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ اور صفت رحمت و قدرت کا نقص لازم آتا ہے کہ جس مقصد سے اس نے ایک آغاز کیا تھا اس مرضی و مشیت کے باوجود اس کو درجہ تکمیل نہ دے سکا۔ تعالیٰ اللہ علوا کبیرا۔

اور اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو گویا یہ مان لینا ہوگا کہ کائنات ہست و بود میں نقص، نشیب، زوال، اور ابتداء کے علاوہ کمال، فراز، عروج اور انتہاء کا وجود ہی نہیں ہے گویا دوکان فطرت میں عیب کے سواء ہنر کا کوئی سودا موجود ہی نہیں۔ اسی طرح دوسری مشکل، اس لیے جب کہ تکمیل ایسی حقیقت کا نام ہے جس کے بعد اس سلسلہ کی نہ ضرورت باقی رہے نہ طلب تو پھر رشد و ہدایت اور پیغام حق جیسی روشن شے کے پایہ تکمیل تک پہنچ جانے کے بعد اس کو ابتداء سے پھر دہرانا بے معنی بات ہے اور تحصیل حاصل نہ عقل کا کام ہے نہ حکمت و دانائی کا چہ جائیکہ ایسے فعل کی نسبت اس ذات کی جانب ہو جس کے لیے کہا گیا ہے: ان ربك علیم حکیم۔

پس اگر مؤخر الذکر دونوں صورتیں غیر معقول اور ناقابل توجہ ہیں تو اب پہلی شکل ہی لائق غور رہ جاتی ہے، مگر جب اس کی تحلیل کی جائے تو یہ سوال خود بخود سامنے آ جاتا ہے کہ جب کہ تاریخ ادیان و ملل نے بلکہ واقعات و حقائق نے یہ ثابت کر دیا اور روشن دلائل و براہین سے ثابت کر دیا کہ قرآن عزیز ایک ایسا روحانی قانون، دستور، آئین اور پیغام رشد و ہدایت ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے تمام سابقہ ادیان اور موجودہ مدعیان وحی و الہام عاجز و در ماندہ رہے ہیں اور ہیں تو پھر علم و عقل اور حکمت و دانش کا وہ کون سا تقاضا ہے جس کے پیش نظر ﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾ کا انکار کیا جاسکے اور جو تکمیل کہ محمد ﷺ کے ذریعہ ہو چکی اس کو جھٹلا کر اور تاریخ ادیان کی صاف اور صادق شہادت کا منکر بن کر اس سلسلہ کی آخری کڑی ”نبی منتظر“ کے لیے چشم براہ ہوا جاسکے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن عزیز نے ﴿وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾ (الاحزاب: ۴۰) کہہ کر روشن کیا ہے اور جس کی شہادت خود ذات قدسی صفات نے یہ کہہ کر دی ہے:

((قال رسول الله ﷺ: مثل النبيين كمثل رجل بنى داراً فاتمها الا لبنة واحدة فجئت انا

فاتمت تلك اللبنة)). (مسلم)

”میری اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے مکان بنایا اور اس کو مکمل کر لیا مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی پس میں قصر نبوت کی وہی اینٹ ہوں جس نے آ کر اس قصر کی تکمیل کر دی۔“

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس بات کو مان لینے میں کیا حرج ہے کہ قصر نبوت کی تکمیل آپ ﷺ ہی کی ذات سے ہوئی لیکن پھر آپ ﷺ کے کمال نبوت کے مختلف اطوار و احوال میں سے یہ امتیازی شان بھی منصہ شہود پر آئی کہ جو شخص بھی جدید نبی یا رسول بنے



اس کا انتساب آپ ﷺ ہی کے فیض نبوت کے ساتھ وابستہ ہو یعنی آئندہ بھی نبی اور رسول آتے رہیں مگر وہ مستقل نہ ہوں بلکہ آپ ﷺ کے ماتحت اور قرآن ہی کے زیر نگیں ہوں، لیکن یہ کہنا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ جو بات کہی گئی اس کو خواہ کسی خوبصورت سے خوبصورت عنوان سے کہتے سب کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کے بعد نبی اور رسول کی احتیاج باقی ہے اور اس کے بغیر دین الہی اور پیغام ربانی تشنہ تکمیل ہے ورنہ تو تکمیل نبوت کے بعد نبی اور رسول کی جگہ خاتم النبیین کے صرف نائب اور جانشین ہونے چاہئیں تا کہ ان کے ذریعہ پیغام کامل اور ہدایت تام کی یاد دہانی ہوتی رہے اور یہی وہ نیابت و وراثت ہے جس کا حق خدمت علماء امت ”علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل“ اور ”العلماء ورثة الانبیاء“ کے مصداق بن کر ادا کرتے چلے آئے ہیں اور تا قیام حشر کرتے رہیں گے۔

اس اہم مسئلہ کی وضاحت یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ کتاب کائنات کے وہ صفحات جن پر مذاہب و ملل کی تاریخ ثبت ہے شاہد ہیں کہ اقطاع عالم کے درمیان رسل و رسائل اور دیگر وسائل کے مفقود ہونے کی وجہ سے جبکہ فطرت نے رشد و ہدایت کے پیغام کو عرصہ مدید تک جغرافیائی حدود میں محدود رکھا اور اس لیے ایک ہی دور میں متعدد مقامات پر متعدد انبیاء و رسل کا ظہور ہوتا رہا اور پھر جب کائنات پر وہ زمانہ پر تو ڈالنے لگا جس کے قریبی عرصہ میں ساری کائنات کے باہم روابط نے ہم آہنگی اور تعارف کی بنیاد ڈال دی اور فطری تقاضا کی بناء پر روحانی پیغام نے بھی بعثت خاص کی جگہ بعثت عام کی شکل اختیار کر لی اور ایک ایسا پیغام آ گیا جو تمام عالم کے لیے یکساں طور پر بیک وقت رشد و ہدایت کا آفتاب بن کر درخشاں ہے تو اس کے بعد یا تو یہ ہونا چاہیے کہ وہی پیغام رہتی دنیا تک کے لیے رشد و ہدایت کا پیغام بنے اور جس پیغمبر کی معرفت وہ پیغام آیا ہے اس کی ذات اقدس کو اس پیغام کا مکمل و متمم مان کر خاتم الانبیاء و الرسل تسلیم کیا جائے ورنہ غور کیا جائے کہ محدود پیغام و دعوت حق کے بعد جب بعثت عام نے ساری کائنات کی راہنمائی کا فرض انجام دے دیا تو اس کے بعد ضرورت و طلب کا کون سا عنوان باقی رہا جس کی تکمیل کے لیے اس سلسلہ کو پھر بھی جاری رکھا جائے اور یا بعثت خاص کو دہرایا جائے جس کا حاصل عروج سے انحطاط کی شکل میں ظاہر ہو اور یا بعثت عام کی تحصیل حاصل کی غیر معقولیت، معقولیت کی شکل اختیار کرے اور آیت ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ﴾ (سبا: ۲۸) کی بشارت کو بے حقیقت بنا دیا جائے۔

ذات اقدس ﷺ کی بعثت عام کے بعد ایسی حیثیت سے اس سلسلہ کا اجراء تحصیل حاصل اور غیر معقول اس لیے ہے کہ فطرت کے مادی اور روحانی تقاضہ کے خلاف اگر قدرت حق کو یہ منظور تھا کہ پیغام و دعوت اور نظام رشد و ہدایت تدریجی طور پر ترقی پذیر نہ ہو اور مادی دنیا کے محدود حالات سے بے نیاز ہو کر انجام پائے تو بلاشبہ آغاز ہی میں وحی الہی ”بعثت عام“ کی شکل اختیار کرتی اور پھر رہتی دنیا تک وہی بروئے کار ہوتی اور یا اس کا سلسلہ کسی تکمیل کا محتاج نہ ہو کر رہتی دنیا تک تجدید کی شکل میں جاری رہتا۔

مگر واقعات اور مشاہدات اس کے خلاف ہیں اور اول محدود پیغامات کا سلسلہ اور ان کے درمیان ترقی پذیر وسعت کا دائرہ اور پھر دعوت عام کی شکل میں اس ترقی کی انتہاء یہ پوری تدریجی کیفیت صاف بتلا رہی ہے کہ فطرت الہی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دوسرے امور کی طرح رشد و ہدایت الہی کا یہ پیغام بھی آغاز کی نمود کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ ترقی پذیر اور وسعت گیر ہوتا رہے تا آنکہ وہ وقت آجائے کہ یہ وسعت عالمگیر دعوت بن کر پایہ تکمیل کو پہنچ جائے اور یہ سلسلہ اس حد پر پہنچ کر ختم ہو جائے اور آئندہ نبی و رسول کی جگہ ناسبین رسول ”علماء“ تا قیام ساعت اس مکمل قانون دعوت کی روشنی میں تبلیغ حق کا فرض انجام دیتے رہیں



تاکہ ایک جانب ”وحدت امت“ کا وہ نظام جو بعثت عام اور دعوت عام سے وابستہ ہو چکا ہے پارہ پارہ نہ ہو سکے اور دوسری جانب حیات عالم کے ساتھ ساتھ اس پیغام حق کا فرض بھی مسلسل ادا ہوتا رہے اور اس طرح خدائے برتر کا یہ اعلان ﴿تَبْرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ (الفرقان: ۱) جدید نبی منتظر اور رسول مطلوب کے نظریہ کی شکل میں بے روح ہو کر نہ رہ جائے۔

سطور بالا میں انبیاء علیہم السلام کے پیغام حق کی وحدت کا تذکرہ آچکا ہے مسئلہ ختم نبوت کے ساتھ اس کا بہت گہرا تعلق ہے اور اس سلسلہ کی دلیل روشن کے لیے تمہید و توطیہ بننے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہم اس خاکدان ہستی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے کہ ہر کثرت کے لیے کوئی نقطہ وحدت ضرور ہے۔ چنانچہ افراد کے لیے نوع، انواع کے لیے جنس، اجناس کے لیے جوہر، جوہر کے لیے وجود اور وجودات کے لیے وجود سحت (خالص) محور و مرکز ہے۔ اسی طرح اجسام کے لیے سطح، سطحات کے لیے خط اور خطوط کے لیے نقطہ مرکز و مدار ہے، نیز اعداد خواہ اپنی کثرت میں کسی حد تک کیوں نہ پہنچ جائیں ان کا محور و مرکز ہر حالت میں ”اکائی“ ہے۔

غرض جب بھی کسی کثرت کا تصور کیجئے اس کے ساتھ وحدت کا تصور لازم و ضروری ہے اور اگر وحدت کو پیش نظر لائیے تو وہ کسی نہ کسی کثرت کے لیے محور و مرکز ہونے کا ضرور پتہ دیتی ہے پس وحدت و کثرت کا یہی رابطہ ہے جس نے حدود عدم سے گزر کر ہست کے ساتھ تعلق پیدا کیا اور اس کو عالم ہست و بود کا نام دیا۔

تو اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر جب ہم سلسلہ نبوت و رسالت پر نظر ڈالتے ہیں اور سبع سموات کی طرح سطح عالم پر مختلف ادوار میں ہزاروں سیارگان رشد و ہدایت کو ضوفاں پاتے ہیں تب مسطورہ بالا حقیقت کی بنیاد پر فطرت تقاضا کرتی ہے کہ اس کثرت کا بھی کوئی نقطہ وحدت ضرور ہونا چاہیے جو کثرت کے لیے محور و مرکز بن سکے اور جس طرح ”اکائی“ کے بعد کثرت کے لیے کوئی اور مبداء و منتہا نہیں ہے اسی طرح انبیاء و رسل کے سلسلہ کثرت کے لیے بھی ایک ہی مبداء و منتہا ہونا از بس ضروری ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جو ”ختم نبوت“ کے نام سے موسوم ہے اور اسی کو قرآن حکیم نے اس جوہر حکمت کے ساتھ ادا کیا ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾ (الاحزاب: ۴۰)

”محمد ﷺ مردوں میں سے کسی کے صلیبی باپ نہیں ہیں تاہم وہ خدا کے پیغمبر اور آخر الانبیاء ہیں۔“

نبوت ”نبا“ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ”خبر دینا“ ہے اور رسالت کے معنی ”پیغام“ ہیں اور اسلام کی اصطلاح میں نبوت و رسالت خدا کی جانب سے ایک منصب ہے جو مخلوق کی رشد و ہدایت کے لیے کسی مخصوص انسان کو عطاء ہوتا ہے اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو ”وحی“ کہتے ہیں کیونکہ یہ پیغام درحقیقت پیغامبر کا اپنا کلام نہیں ہوتا بلکہ خدائے برتر کا فرمان ہوتا ہے جس میں خطا و قصور یا سہو و نسیان کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی۔

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (ختم السجدہ: ۴۲)

”اس (وحی الہی) کے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے باطل کا گذر بھی نہیں ہوتا یہ تو اتارنا ہے حکمت والے ہر طرح



قابل ستائش والے کی جانب سے (یعنی خدا کی جانب سے)۔“

گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب خدائے برحق کسی شخصیت کو نبوت و رسالت یعنی پیغام حق سے سرفراز کر دیتا ہے تو تمام انسانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک خدا کے فرمان ”وحی الہی“ کے سامنے بے چون و چرا تسلیم خم کر دیں۔ وہ شخصیت کی صداقت اور خدا کی جانب سے اس کے دعویٰ وحی کی حقانیت کا تو ہر حیثیت سے حق رکھتے ہیں لیکن اگر اس کے دونوں دعوؤں کی تصدیق و تائید عقل کی راہ سے دلائل و براہین کے ساتھ ہو جائے اور کسوٹی پر اس کی صداقت بے لوث اور صاف روشن ہو جائے تب اس کے دیے ہوئے پیغام خدا کو ماننے نہ ماننے میں وہ آزاد نہیں رہ سکتے اور بلاشبہ اس کے پیغام کو پیغام حق سمجھ کر قبول کر لینا اور اس کے سامنے سر نیاز جھکا دینا فرض اولین ہے۔ ہاں چونکہ وہ پیغام کسی بڑے سے بڑے عاقل و فرزانہ انسان کا پیغام نہیں بلکہ ”پیغام الہی“ ہے اس لیے وہ خود یہ ضروری سمجھتا ہے کہ جو کچھ کہے عقل کی کنج و کاؤ سے خواہ کتنا ہی بالاتر ہو لیکن عقل کی نگاہ میں اور دلائل و براہین کی ترازو میں ناممکن اور محال نہ ہو کیونکہ فطرت اور عقل کے درمیان بیر نہیں ہے بلکہ عقل، فطرت کے قوانین کے سمجھنے اور سمجھ کر قبول کرنے کے لیے بہترین ذریعہ اور آلہ ہے اور وحی الہی درحقیقت فطرت کے روحانی قوانین کی ترجمان ہے۔

بہر حال کسی نبی یا رسول کے مبعوث ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا کی مخلوق ”جن و بشر“ اپنی روحانی سعادت اور اخلاق و کردار کی بلندی کے لیے اپنے عقل و دماغ کے اختراع کی بجائے پیغام حق کو راہنما بنائے تاکہ ذی عقل کائنات الہی اس راہ میں رقیبانہ تضاد و تصادم سے بے نیاز ہو کر انسانوں کے نہیں بلکہ انسانوں کے پیدا کرنے والے خدا کے قوانین پر عمل پیرا ہو کر اجتماعی وحدت، عالم گیر اخوت و مساوات کی قدروں کو حاصل کر سکیں اور ایک دوسرے کا حاکم و محکوم اور آقا و غلام بننے کے بجائے سب ہی یکساں طور پر صرف اپنے پیدا کرنے والے ہی کے محکوم و غلام بن جائیں۔

دوسری جانب اس خاکدان عالم کا یہ حال ہے کہ اس کی ہر ایک شے نشو و ارتقاء کے قانون قدرت میں جکڑی ہوئی نظر آتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مادی اور روحانی قوانین و نوا میں کی خالق ایک ہی ذات ہے تو بلاشبہ دونوں کے نوا میں و قوانین میں ہم آہنگی اور وحدت کا رفرمانظر آنی چاہیے ورنہ العیاذ باللہ وحدت و اکائی کی جگہ دوئی کو محور و مرکز ماننا پڑے گا جو فطرتاً ناممکن اور عقلاً محال ہے۔

تب از بس ضروری ہے کہ رشد و ہدایت کے اس منصب ”نبوت و رسالت“ کا سلسلہ بھی قانون ارتقاء سے اسی طرح جکڑا ہوا ہونا چاہیے جس طرح مادیات کا اور اس لیے تسلیم کرنا ہوگا کہ رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ ارتقائی بنیادوں پر اس طرح ترقی پذیر ہو کہ کائنات انسانی اپنے بقاء و وجود تک کسی وقت بھی اس راہ میں نشو و ارتقاء سے محروم نہ رہے۔

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب رشد و ہدایت کے اس نظام کو جو منصب نبوت و رسالت کے نام سے معنون ہے یوں سمجھنا چاہیے کہ قانون قدرت نے ایک جانب انسان کی مادی نشو و ارتقاء کا یہ سامان مہیا کیا کہ اس کی عقل و دانش اور اس کے شعور و دماغی کو آہستہ آہستہ ترقی پذیر کرنا شروع کیا اور دوسری جانب اسی معیار پر انسان کو روحانی و اخلاقی تربیت کا ساز و سامان بھی انبیاء و رسل کے ذریعہ آہستہ آہستہ ترقی پذیر شکل میں عطا فرمایا اور آخر ایک وقت وہ بھی آیا کہ انسان عقل و شعور کی ابتدائی اور متوسط منازل سے گزر کر بلوغ و کمال کی اس حد پر پہنچ گئے جس کو ان کے لیے حد کمال کہا جاسکتا ہے اور جس معراج کمال پر پہنچ کر انسان ”انسان کامل“ کہلانے کا بجا طور پر مستحق ہو جاتا ہے تاہم حد بلوغ کی اس معراج ارتقاء پر پہنچ جانے پر بھی اس کی جلاء اور صیقل کے لیے رہتی



دنیا تک نئے سامان ہوتے رہیں گے اور خالق کائنات کی ربوبیت کاملہ ان کے کمال کو نقص سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی تربیت حق کا ہاتھ ان سے نہ اٹھائے گی۔

ٹھیک اسی طرح نبوت و رسالت کی شمع رشد و ہدایت کا یہی حال رہا ہے کہ وہ ہزار ہا ہزار سال تک اپنے ابتدائی اور متوسط منازل ارتقاء سے گزرتی رہی اور آخر کار وہ وقت بھی آ پہنچا کہ اس کی ترقی اور نشو و ارتقاء نے ”کمال و تمام“ کی شکل اختیار کر لی اور اس حد کمال پر پہنچ گئی جہاں اس کے ذریعہ کائنات ہست و بود کے سامنے ایسا قانون مکمل اور دستور کامل آ گیا جو ہر طرح عقل و شعور انسانی کے حد بلوغ کے مناسب حال ہے اور جس کی راہنمائی اور روشنی ”عروج و کمال“ کی ضامن و کفیل ہے۔ ساتھ ہی اس میں یہ لچک بھی موجود ہے کہ گویہ قانون رشد و ہدایت اپنے بنیادی اصول کے لحاظ سے اٹل اور غیر متبدل ہے مگر عقل و شعور کے کمال و بلوغ کے تحفظ کے لیے جس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ نے راہیں مسدود نہیں کیں بلکہ رہتی دنیا تک اس کی تربیت کے سامان مہیا کیے ہیں اسی طرح اس منصب نبوت و رسالت کی تکمیل اور نقطہ ارتقاء کے حد کمال پر پہنچ جانے کے بعد اس کی عطاء کردہ رشد و ہدایت کے تحفظ کی راہیں بھی بند نہیں کیں اور تا قیام قیامت اس کے جلاء و صیقل کے لیے ((علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل)) کا سلسلہ قائم و دائم رکھا۔

یہی حقیقت ہے جس کو حدیث نبوی ﷺ نے خاتم النبیین کی تفسیر کو ایک روشن مثال کے ذریعہ سمجھایا اور ”ختم نبوت“ کی حقیقی روح کو مادی شکل میں پیش کر کے حرف آخر قرار دیا۔

((عن ابی ہریرۃ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ مِثْلِي وَمِثْلَ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِي كَمِثْلِ رَجُلٍ بَنَى بَيْتًا فَاحْسَنَهُ وَاجْمَلَهُ الْأَمْوَاعَ لِبِنْتٍ مِنْ زَاوِيَةِ فَجَعَلَ النَّاسَ يَطُوفُونَ بِهِ وَيَعْجَبُونَ لَهُ وَيَقُولُونَ هَلَّا وُضِعَتْ هَذِهِ اللَّبْنَةُ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ))

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اور مجھ سے پہلے نبیوں اور رسولوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے گھر بنایا اور اس کو بہت عمدہ آراستہ و پیراستہ کیا مگر اس کے ایک گوشہ میں ایک اینٹ کی جگہ تعمیر میں چھوڑ دی تو اب لوگ اس کو دیکھنے جوق در جوق آتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی کہتے جاتے ہیں کہ یہ ایک اینٹ بھی کیوں نہ بھر دی گئی (تا کہ تعمیر کی تکمیل ہو جاتی) اور میں نبیوں کو ختم کرنے والا ہوں۔“

وَفِي بَعْضِ الْفَاقِظِ فَكُنْتُ أَنَا سُدَّتْ مَوْضِعَ اللَّبْنَةِ وَخَتَمَ لِي الْبَنِيَانُ وَخَتَمَ لِي الرَّسُلُ.

”چنانچہ میں نے اسی جگہ کو پر کیا ہے اور میں وہی نبوت کی آخری اینٹ ہوں جس سے قصر مکمل ہو گیا اور میں ہی آخر الانبیاء ہوں۔“

حاصل کلام یہ ہے کہ رب العالمین کی ربوبیت کاملہ نے کائنات ہست و بود میں قانون ارتقاء کو جس طرح نافذ فرمایا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ عقل و شعور انسانی کے حد بلوغ پر پہنچ جانے کے باوجود اس کی ترقی کا سلسلہ تا ابد جاری رہے اور اس میں ایسی پابندی یا روک نہ ہونی چاہیے جس سے اس کی صلاحیتوں کے نشو و ارتقاء کا سدباب ہو جائے اور دوسری جانب پیغام حق کا جو سلسلہ نبوت و رسالت (بذریعہ وحی الہی) عالم کی رشد و ہدایت کے لیے عطاء ہوا ہے وہ بھی حد کمال و تمام پر پہنچ جانے کے باوجود فطرت کے قانون



ارتقاء کے مطابق نہ کمال سے نقص کی جانب رجوع کرے کہ حقیقت ظل اور بروز کے پردہ میں مستور ہو کر رہ جائے اور نہ ربوبیت حق کے اس عطاء و نوال اور بخشش کا ہی سدباب ہو جائے جو ”رشد و ہدایت“ کے عنوان سے معنون اور عالم انسانی کی حقیقی راہنما ہے، اس لیے طریقہ یہ رکھا گیا کہ جب انسان اپنے عقل و شعور میں حد بلوغ تک پہنچ گیا یا اس کے سامان پوری طرح مہیا ہو گئے تب نبوت و رسالت کو بھی بہ حد کمال و تمام پہنچا کر ختم کر دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (المائدہ: ۳)

”آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت (نبوت و رسالت) کو پورا کر دیا۔“ مگر رشد و ہدایت کو رہتی دنیا تک اس طرح باقی رکھا کہ آخری پیغمبر کے ذریعہ جو آخری پیغام کامل و مکمل بن کر آیا وہ اساس و بنیاد قرار پائے اور نئی مادی ترقیات کے ساتھ ساتھ اس کا فیضان علم بھی درخشاں و تاباں رہے اور یہ خدمت علماء حق کے سپرد ہو، یہی وہ حقیقت ہے جس کو کلام معجز نظام نے اس انداز میں بیان کیا ہے:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ﴾ (النساء: ۵۹)

”اگر تم کسی معاملہ میں اختلاف کرو تو اس اختلاف کو اللہ اور اس کے پیغمبر محمد ﷺ کی جانب رجوع کرو۔“ ظاہر ہے کہ اگر نبوت و رسالت محمد ﷺ پر پہنچ کر کامل نہ ہوتی اور اس کا سلسلہ کمال نبوت ہی کی شکل میں آگے بڑھتا رہتا تو یہ نہ کہا جاتا کہ محمد ﷺ کی جانب یعنی ان کے ارشادات حق کی جانب رجوع کرو بلکہ خطاب یہ ہوتا کہ تم اللہ کی جانب اور جو نبی تم میں موجود ہو اس کی جانب رجوع کرو اس لیے نبوت و رسالت کو ظل و بروز کی اصطلاحوں کی آڑ میں باقی رکھنے کی کوشش کرنا قانون فطرت اور دین حق کے صریح خلاف اور باطل ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے قرآن حکیم نے کئی جگہ مختلف معجزانہ خطابت کو اختیار کیا ہے، ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَأَوْحَىٰ إِلَيْنَا هَذَا الْقُرْآنَ لِأَنذِرْكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ﴾ (الانعام: ۱۹)

”اور میری جانب اس قرآن کی وحی کی گئی تاکہ اس کے ذریعہ میں تم کو (بری باتوں سے) ڈراؤں اور ان تمام لوگوں کو بھی جن کو (رہتی دنیا تک) یہ قرآن پہنچے۔“ اور دوسری جگہ ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (الانبیاء: ۱۰۷)

”اور نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر۔“ اور ایک جگہ ہے:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۗ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ

شَهِيدًا﴾ (الفتح: ۲۸)



”اللہ وہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو ہدایت اور دین حق دے کر تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کرے اور اللہ اس کے لیے بطور گواہ کافی ہے۔“

اور ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: ۵۹)

”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (محمد ﷺ) کی اور ان کی اطاعت کرو جو تم میں سے اولوالامر ہیں۔“

اس آیت میں صاف طور پر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اب انسانی رشد و ہدایت کے لیے صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ کی اور محمد ﷺ کی اطاعت کی جائے اور محمد ﷺ کے علاوہ اب کسی نبی و رسول کی اطاعت کا سوال نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا آخری طریقہ یہ ہے کہ تم میں سے جو صاحب امر ہوں (علماء مجتہدین خلفاء حق) ان کی پیروی کرو۔

ان آیات بینات کے علاوہ قرآن حکیم نے جن آیات میں خدا کی کتابوں یا رسولوں پر ایمان لانے کی ہدایت کی ہے وہاں یہ کہہ کر ﴿بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (النساء: ۶۰)۔ ﴿أَمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ﴾ (النساء: ۱۳۶) کہ محمد ﷺ اور ان سے پہلے نبیوں اور رسولوں اور قرآن اور اس سے قبل کی کتابوں پر ایمان لاؤ، اس حقیقت کو نمایاں کیا اور ابھارا ہے کہ جہاں تک پیغمبر اور کتاب اللہ پر ایمان لانے کا تعلق ذات اقدس، قرآن حکیم اور اس سے قبل کے نبیوں، رسولوں اور کتابوں کا ہے اور یہ صرف اس لیے کہ یہ سلسلہ آگے بشکل نبوت و رسالت اور وحی الہی نہیں چلے گا بلکہ محمد ﷺ کی رسالت ہی بہ حد کمال پہنچ کر قیامت تک بلا فصل باقی اور جاری رہے گی اور قرآن حکیم کامل و مکمل دستور ہدایت بن کر ہمیشہ اس کے لیے زندہ شہادت دے گا۔

حق تعالیٰ کی جانب سے ”خاتم النبیین“ کا جو منصب جلیل ذات اقدس ﷺ کو عطاء ہوا ہے عقل و نقل دونوں اعتبار سے ایک اور صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے اور وہ یہ کہ محمد ﷺ آخر انبیاء و رسل ہیں اور نبوت و رسالت کا سلسلہ آپ ﷺ پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔

تاج العروس میں ہے (و) الخاتم (من كل شئ عاقبته و آخرته كخاتمه و الخاتم (آخر القوم كالخاتم) و منه قوله تعالیٰ و خاتم النبیین ای اخرهم (فصل الخاء من باب السیم)۔

تاج العروس کے علاوہ تمام معتبر اور مشہور عربی لغات ناطق ہیں کہ ”خاتم“ بفتح تاء ہو یا بہ کسرہ تا ”آخر شئ“ اس کے حقیقی معنی ہیں اور جب کسی شخصیت کے لیے بولا جائے تو ”آخر القوم“ مراد ہوتے ہیں، اس لیے آخر الانبیاء و الرسل ہونا ذات اقدس ﷺ کی وہ خصوصیت ہے جس میں دوسرا کوئی شریک و سہیم نہیں۔

یہ درست ہے کہ خاتم بمعنی ”مہر“ بھی حقیقی معنی ہیں اور یہی نہیں، ان دونوں کے ماسواء اس لفظ کے چند اور معانی بھی حقیقی ہیں لیکن اطلاقات ہی اس کو ظاہر کر سکتے ہیں کہ ان ہر دو حقیقی معنی میں سے کون سے معنی بر محل ہیں مثلاً جب آپ ہاتھ میں انگشتری پہنے ہوئے ہوں اور اس پر آپ کا نام کندہ ہو، اس وقت اگر کہا جائے کہ ”خاتمک فی انملک“ تو اس وقت خاتم بمعنی ”مہر“ حقیقی ہوں گے لیکن اس لفظ خاتم کو اگر کسی انسان پر اطلاق کریں تو اس وقت خاتم بمعنی ”آخر“ حقیقی معنی ہوں گے اور خاتم القوم یا خاتم الانبیاء تب



ہی صحیح ہوگا کہ آنے والا شخص قوم کا آخری فرد یا نبیوں کا آخری نبی ہو اور اس حقیقی اطلاق کی موجودگی میں مجازی معنی تب ہی قابل اعتناء ہوں گے کہ یا حقیقی معنی اس مقام پر ناممکن الاستعمال ہوں اور یا مجازی معنی، حقیقی معنی سے مغائر و متضاد نہ ہوں بلکہ اس کے ساتھ پوری مطابقت رکھتے ہوں۔

تب یہ بات واضح اور صاف ہے کہ اگر کوئی شخص بلاغت قرآن اور اعجاز نظم قرآنی کے خلاف بلکہ عربیت کے عام اصول کے خلاف آیت کریمہ ”خاتم النبیین“ میں خاتم کے حقیقی معنی ترک کر کے بلحاظ اطلاق مجازی معنی ”مہر“ کے لیتا ہے تب بھی مجازی معنی اور مفہوم وہی صحیح اور لائق توجہ ہو سکتے ہیں جو حقیقی معنی ”آخر“ سے متبائن اور متخالف نہ ہوں اور ”نبیوں کی مہر“ کا یہ مطلب ہوگا کہ جس طرح کسی تحریر یا کسی شے کے ختم پر ”مہر“ اس لیے لگائی جاتی ہے کہ اس پر تحریر یا شے کا اختتام ہو گیا اور اب کسی بھی اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہی، اسی طرح ذات اقدس ﷺ انبیاء و مرسلین کے سلسلہ کے لیے ”مہر“ ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد اب فہرست انبیاء و مرسل میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں رہی اور اس سلسلہ پر مہر لگ گئی اور جس طرح کاغذ یا لفافہ پر مہر ثبوت ہے اس امر کا کہ اب اس کے بعد کسی مضمون یا لفظ و جملہ کی توقع عبث ہے، اسی طرح نبیوں کی مہر اس کے لیے کھلی دلیل ہے کہ اب کسی اضافہ کی توقع محال ہے، پس ”مہر“ بہ اطلاق مجاز کے اس مفہوم کو چھوڑ کر اگر کسی خاص مزمومہ کی بناء پر یہ معنی مراد ہوں کہ ذات اقدس ﷺ نبیوں کے لیے مہر ہیں کہ جس طرح کوئی کاغذ یا تحریر جب ہی مستند ہوتی ہے کہ اس پر ذمہ دار شخصیت کی مہر ثبت ہو اس طرح کوئی نبی ”نبی یا رسول“ نہیں بن سکتا جب تک آپ ﷺ اس کے لیے مہر تصدیق نہ بن جائیں“ تو یہ مراد دو وجہ سے باطل ہے: اول اس لیے کہ یہ مفہوم حقیقی معنی ”آخر“ کے متضاد و متبائن ہے دوم اس لیے کہ ہزاروں یا لاکھوں انبیاء علیہم السلام جو ذات اقدس ﷺ کے زمانہ بعثت سے قبل اس کائنات ارضی پر مبعوث ہو چکے اپنی اپنی امت کے زمانہ میں ان کی نبوت غیر مستند اور ناقابل قبول رہی، اس لیے کہ ان کی نبوت کی تصدیق کنندہ ”مہر“ ان کی بعثت سے ہزاروں یا سینکڑوں برس کے بعد آئی جبکہ وہ اپنے اپنے فرض منصبی سے سبکدوش ہو چکے تو اب بے سود و بے فائدہ، اور اگر یہ مراد ہے کہ آپ ﷺ کے بعد جو نبی آئیں گے ان کے لیے آپ ﷺ ”مہر“ ہیں تو یہ ترجیح بلا مرجح کیوں؟ کہ ہزاروں لاکھوں انبیاء و مرسل کے لیے تو مہر نہ بنے اور بعد میں آنے والوں کے لیے ”مہر“ قرار پائے اور اگر یہ مطلب ہے کہ اگلوں اور پچھلوں سب ہی انبیاء و مرسل کے لیے مہر تصدیق ہیں تب بھی اگلوں کے لیے مہر ہونا بے کار رہا کہ ان کے وقت نبوت گزر جانے کے بعد مہر تصدیق پہنچی۔

علاوہ ازیں یہ احتمالات خود ساختہ اور ظنی ہیں اور کسی ایک احتمال کے یقینی ہونے کی بھی قرآن میں صراحت موجود نہیں ہے تو پھر حقیقی اطلاق کو ترک اور حقیقی سے مطابق مجازی مفہوم سے روگردانی کے بعد ایسے احتمالات جو حقیقی مفہوم کا حق نہ ادا کرتے ہوں باطل نہیں تو اور کیا ہیں؟

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن کا حکیمانہ طریق استدلال یہ ہے کہ وہ ایک مقام پر جو بات کہنا چاہتا ہے اس کو متعدد جگہ مختلف اسالیب بیان کے ساتھ اس طرح ادا کر دیتا ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کی خود ہی تفسیر بن جاتی اور حقیقت حال روشن ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس حقیقت کو مفسرین نے اس طرح ادا کیا ہے کہ ”القرآن یفسر بعضہ بعضا“ یعنی قرآن کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ کی خود تفسیر کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہی صورت حال یہاں بھی موجود ہے، وہ یہ کہ قرآن حکیم اسلام کی خوبی بیان کرتے



ہوئے اعلان کرتا ہے:

﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (المائدہ: ۳)

”آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت میں پسند کر لیا۔“

آیت کریمہ کو ایک مرتبہ خوب غور سے پھر پڑھئے اور دیکھئے کہ اس جگہ نہ ”خاتم“ ہے اور نہ ”خاتم“ کہ اس کو معرض بحث میں لا کر خود ساختہ احتمالات پیدا کر لیے جائیں، بلکہ یہاں صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو دین اسلام وجود انسانی کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت کا مرکز بنا ہوا ہے اس کو آج ”کامل“ اور اس نعمت دین کو تمام کر دیا گیا اور ظاہر ہے کہ ”کامل“ کا مقابل ”ناقص“ اور ”تمام“ کا متوازی ”نا تمام“ ادھورا ہوتا ہے یعنی ایک چیز آہستہ آہستہ ترقی پذیر تھی اور رفتہ رفتہ اس حد پر پہنچ گئی جس کے بعد اب ترقی کا خاتمہ ہے اس لیے کہ وہ کامل و مکمل ہو کر سامنے آگئی جس کے بعد ناقص یا نا تمام کے دہرانے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

سواگر یہ صحیح ہے کہ اسلام، دور محمدی ﷺ پر پہنچ کر ہی کامل اور تمام ہوا ہے تو بلاشبہ آیت کریمہ ﴿وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾ (الاحزاب: ۴۰) کے یہی معنی صحیح ہو سکتے ہیں محمد ﷺ اسی دین کے پیغامبر ہیں جو کائنات انسان کی ابتداء سے ہی رشد و ہدایت انسانی کا فرض انجام دے رہا ہے اور خدا کا پسندیدہ ﴿وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ﴾ اور انسانیت کی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ بھی روحانی مدارج ارتقاء طے کرتے ہوئے آج ”کامل“ اور ”تمام“ ہو گیا اور اب کسی جدید پیغام کی حاجت نہیں رہی اور جب جدید پیغام کی ضرورت نہیں ہے تو اب نئے پیغامبر کی بھی ضرورت خود بخود باقی نہیں رہی اور رہتی دنیا تک یہی کامل پیغام اور پیغامبر انسانی دنیا کے لیے کافی اور بس ہے: ﴿وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾

لہذا حقیقی اطلاق لیجئے یا مجازی ”خاتم“ کے معنی اور مفہوم میں ”آخر“ ہونے کا تصور غیر منطقی اور لازم ہے اور اس کے خلاف جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے۔

آیت کریمہ کا شان نزول اگرچہ ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے ہمہ گیر اور غیر موقت ہے اور عربیت اور نقل و روایات دونوں لحاظ سے ایک ٹھوس حقیقت کا اظہار کرتی ہے۔

اس آیت کے تین حصے ہیں، ایک میں کہا گیا ہے کہ محمد ﷺ تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں اس لیے کہ آپ ﷺ کی اولاد ذکور حیات مستعار کو پورا کر چکی اور آپ ﷺ صلیبی بیٹا نہیں رکھتے اور اسلام میں لے پالک ”متبنی“ بے معنی رسم ہے اور اس سے دوسرے کا بیٹا گود لینے والے کا بیٹا نہیں بن جاتا اور اس کے احکام حاصل نہیں کر لیتا تو ایسی شکل میں زید بن ابیہاشم کو محمد ﷺ کا بیٹا کہنا ہر طرح غلط ہے۔ ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبًا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾ مگر اس سے یہ احساس پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ جب آپ ﷺ مردوں میں سے کسی کے صلیبی باپ نہیں ہیں تو امت کے ساتھ کس طرح آپ ﷺ کو شفقت پدری ہو سکتی ہے حالانکہ امم سابقہ و سالفہ میں انبیاء و رسل اپنی اپنی امتوں کے بیشتر صلیبی باپ بھی رہے ہیں اور روحانی باپ بھی۔ یہ احساس اس لیے نہیں ہونا چاہیے کہ اگرچہ آپ ﷺ امت مرحومہ کے صلیبی باپ نہیں ہیں تو نہ ہوں مگر روحانی باپ تو ہیں جیسا کہ ہمیشہ انبیاء و رسل اپنی اپنی امتوں کے



روحانی باپ ہوتے ہیں بلکہ روحانی باپ کا رشتہ و رابطہ تو صلیبی باپ سے بھی ہزار ہا درجہ بڑھ چڑھ کر ہے کیونکہ وہ مادی و روحانی دونوں تربیتوں کا کفیل و مربی ہے اس لیے دوسرے نبیوں اور رسولوں کی طرح آپ ﷺ بھی خدا کے رسول ہیں ﴿وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ﴾ یہ آیت کا دوسرا حصہ ہے۔

پھر یہ بات اسی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ امت مرحومہ کے لیے اس سے بھی بلند و بالا یہ بشارت ہے کہ آپ ﷺ سے قبل جس قدر بھی روحانی باپ (انبیاء و رسل) گزرے ہیں علیٰ قدر مراتب ان میں امت کے لیے شفقت و رحمت کا جذبہ محدود رہا ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے گزر جانے کے بعد دوسرا روحانی باپ (نبی یا رسول) مبعوث ہو کر امت پر میری ہی طرح یا مجھ سے زیادہ شفقت و تربیت کا حق ادا کرنے والا ہے لیکن ذات اقدس ﷺ کی یہ شان رفیع ہے کہ آپ ﷺ صرف اللہ کے رسول ہی نہیں ہیں بلکہ آخر الانبیاء و الرسل ہیں جن کے بعد کسی نبی اور رسول کی بعثت کی ضرورت نہیں رہی اس لیے کہ دین کامل ہو گیا اور خدا کی نعمت پوری ہو گئی، ایسی صورت میں تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اس کی شفقت و رحمت کا کیا ٹھکانا ہو گا جو مربی یہ سمجھتا ہو کہ اب اگلوں کی طرح اس کے بعد دوسرا کوئی مربی آنے والا نہیں ہے کہ امت پر اپنی رحمت نچھاور کرے اب تو رہتی دنیا تک اس کی آغوش تربیت وا رہے گی اور اسی کی نبوت و رسالت کا غیر منقطع سلسلہ جاری رہے گا۔ ”وخاتم النبیین“۔

خلاصہ یہ کہ محمد ﷺ کی شان مبارک اس خصوصی امتیاز کی حامل ہے کہ اس کی بعثت کے بعد کسی نبی یا رسول کی بعثت کی حاجت باقی نہیں رہی اور اس طرح یہ حقیقت بھی روشن ہو گئی کہ ذات اقدس ﷺ اس امر کے باعث نہیں ہیں کہ انہوں نے نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم کر دیا بلکہ جب خدا تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اب یہ سلسلہ نبوت و رسالت اس ارتقائی منزل پر پہنچ گیا ہے کہ آخری پیغام بن کر کامل و تمام ہو جائے تو ذات اقدس ﷺ کو اس نے اس کے لیے جن لیا اور بلا شرکت غیرے ان کو یہ منصب عظیمی عطا فرمایا:

﴿ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝﴾

پھر کسی نادان کا یہ کہنا کہ اگر آپ ﷺ آخر الانبیاء و الرسل ہیں تو یہ آپ ﷺ کی منقبت نہیں بلکہ نقص ہے کہ آپ ﷺ اس رحمت کے لیے سد باب ثابت ہوئے جو نبوت و رسالت کے عنوان سے جاری تھی۔

اس نادان کا یہ خیال اسی طرح فاسد ہے جس طرح اس شخص کا خیال جس نے ایک محفل میں شرکت کی اور دیکھا کہ جو معزز مہمان بھی آتا ہے اس کا پر جوش استقبال ہوتا ہے اور اس سے محفل کی رونق میں اضافہ ہوتا جاتا ہے مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ ایک شخص ایسا بھی آ پہنچا جس کو سب نے حاصل محفل سمجھ کر نہ صرف پر جوش استقبال ہی کیا بلکہ تمام محفل کا سر تاج کہا اور اس کے بعد محفل اپنا کام کر کے ختم ہو گئی تو یہ نادان بہت کڑھا اور پچھتانے لگا کہ کاش یہ حاصل محفل نہ بنتا اور محفل اسی طرح سچی بجائی رہتی اور مہمانوں کی آمد کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا۔

ٹھیک اسی طرح محمد ﷺ کے آخر الانبیاء و الرسل ہونے پر یہ نادان اپنے فساد خیال کا اظہار کر رہا اور باطل تاویلات کے درپے ہو رہا ہے۔ ﴿يُضِلُّ بِهٖ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي بِهٖ مَنْ يَشَاءُ﴾

قرآن عزیز نے اکثر مقامات پر ”نبی“ اور ”رسول“ کے ایک ہی معنی لیے ہیں جس کو اردو میں پیغمبر سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن



خاص خاص مقامات پر وہ نبی اور رسول میں فرق بھی کرتا ہے اس فرق کو علماء اسلام نے یوں ظاہر کیا ہے کہ نبی عام ہے اور رسول خاص۔ یعنی خدائے تعالیٰ جس شخصیت کو ہم کلامی کا شرف عطا فرماتے ہیں وہ ”نبی“ کہلاتا ہے کیونکہ لغت میں ”نبی“ خبر دینے والے کو کہتے ہیں گویا جو شخص خدا سے براہ راست لے کر بندگان خدا کو اس کے احکام کی خبر دے وہ نبی ہے قطع نظر اس امر کے کہ اس کو جدید کتاب یا جدید شریعت عطا کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو لیکن جب خدا نے ہم کلامی کے منصب کے ساتھ ساتھ اس شخصیت کو ”کتاب جدید“ یا ”شریعت جدیدہ“ بھی عطاء کی ہو تو اس کو ”رسول“ کہتے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر قرآن حکیم نے اسی فرق و امتیاز کو معجزانہ اسلوب کے ساتھ ظاہر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ جہاں تک گذشتہ انبیاء و رسل کی فہرست کا تعلق ہے اس فہرست میں آپ ﷺ کا منصب صرف ”نبی“ ہی نہیں بلکہ ”رسول“ ہے، اور خود قرآن اس کے لیے شہادت جاوید ہے، اور جبکہ وہ پیغام الہی کے سلسلہ میں آخری پیغامبر ہیں تو اس جگہ یہ یقین کر لینا چاہیے کہ وہ صرف مصطلحہ رسولوں کے ہی آخر نہیں ہیں بلکہ سرتاسر سلسلہ نبوت کے لیے ”آخر“ ہیں تاکہ ظاہر ہو جائے کہ جب وہ خاتم الانبیاء ﷺ ہیں تو خاتم الرسل بدرجہ اولیٰ و اتم ہیں کیونکہ جب عام ہی کا وجود مفقود ہے تو خاص کا وجود کس طرح کتم عدم سے ظاہر ہو سکتا ہے ”و خاتم النبیین“ اور اسی نمایاں حقیقت کو خود ذات اقدس ﷺ نے ایک طویل صحیح حدیث میں برہان قاطع کے طور پر ظاہر کیا ہے:

((لانی بعدی)).

”میرے بعد اب کسی نبی کی بعثت نہیں ہے“

((ان الرسالة و النبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی)).

”بلاشبہ رسالت اور نبوت دونوں ختم ہو گئے۔ پس میرے بعد نہ رسول ہے اور نہ نبی۔“

((ختم بی الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام)).

”مجھ پر انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا۔“

((انا العاقب الذی لیس بعدہ نبی)).

”میرا نام عاقب ہے جس کے بعد نبی کی بعثت نہیں ہے۔“

((و ختم بی النبیین)).

”اور مجھ پر نبیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔“





## غزوة بدر

### غزوة:

ارباب سیر و حدیث نے یہ اصطلاح مقرر کر لی ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں جس لشکر کے ساتھ نبی اکرم ﷺ ہوں اس کو سریہ اور جس میں بنفس نفیس خود شرکت فرمائیں اس کو ”غزوة“ کہتے ہیں۔

### بدر:

قرآن عزیز نے جن اہم غزوات کا تذکرہ کیا ہے ان میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت ”غزوة بدر“ کو حاصل ہے بدر دراصل ایک کنویں کا نام ہے جس کی نسبت سے یہ وادی بھی بدر ہی کہلاتی ہے، یہ وادی مکہ اور مدینہ کے درمیان مدینہ سے قریب سلطانی راستہ پر واقع ہے اسی جگہ وہ اہم غزوة پیش آیا جس نے دنیا کی تاریخ ادیان و ملل ہی کا نہیں بلکہ ہر شعبہ حیات کا رخ پلٹ کر ظلم سے عدل کی جانب پھیر دیا۔

### واقعہ:

یہ واقعہ چونکہ ادیان و ملل کی تاریخ انقلاب میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس لیے راویان حدیث و سیرت نے اس کے ہر ایک جزئی کی تفصیل کو واضح طور پر بیان کیا ہے تاکہ اس تاریخی واقعہ کا کوئی گوشہ بھی تشنہ تکمیل نہ رہے لیکن ہم اس مقام پر مختصر مگر جامع الفاظ میں اس کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں۔

ہجرت مدینہ مشرکین کے لیے کچھ اس درجہ برہمی اور اشتعال کا باعث ہوئی اور وہ پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں کو اپنی ناقابل برداشت ایذا رسانی سے محفوظ دیکھ کر کچھ اس درجہ برا فروختہ ہوئے کہ اب انہوں نے طے کر لیا کہ جس قیمت پر بھی ہو سکے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینا چاہیے۔ چنانچہ اس کے لیے انہوں نے ہجرت سے متصل ہی معرکہ جگ کی ابتداء کر دی اور غزوة بواط اور غزوة عثیرہ جیسے چھوٹے چھوٹے غزوات اسی سلسلہ میں پیش آئے مگر مشرکین مکہ کی آتش حسد کے لیے یہ کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ ہو جائے۔

اس ارادہ کی تکمیل کے لیے انہوں نے ضروری سمجھا کہ سامان حرب و ضرب بافراط میسر آئے اور اس کے لیے بہترین طریقہ یہ سوچا کہ ابوسفیان کی سرکردگی میں ایک قافلہ تجارت شام کی منڈیوں میں جائے اور نفع کثیر حاصل کر کے اس سے سامان جنگ مہیا کیا جائے اور اس جذبہ نے جوش و خروش کی یہ کیفیت پیدا کر دی کہ جب قافلہ تجارت کی تیاری شروع ہوئی تو مکہ کے ہر تنفس نے اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ اس تجارت کے لیے پیش کیا حتیٰ کہ ایک بڑھیا (عجوز) نے بھی اپنی محنت کی معمولی پونجی اس خدمت کے لیے پیش کر



دی اور تقریباً ستر قریشیوں پر مشتمل یہ قافلہ ابوسفیان کی قیادت میں شام کو روانہ ہو گیا۔

مشہور محدث و مفسر ابن جریر طبری اپنی کتاب ”تاریخ الامم والملوک“ میں قریش کی اس کیفیت کا اس طرح تذکرہ فرماتے ہیں:

وقد كانت الحرب بينهم قبل ذلك فقتلت قتلى و قتل ابن الحضرمي في ناس بنخلة و اسرات أسارى من قریش و كانت تلك الواقعة حاجت الحرب بين رسول الله ﷺ و بين قریش و ذلك قبل مخرج ابی سفیان و اصحابه الى الشام. \*

”اور قافلہ کی روانگی سے قبل مسلمانوں اور قریش مکہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی اور ان لڑائیوں میں لوگ مارے جا چکے تھے اور (مشہور مشرک) ابن حضرمی مارا جا چکا تھا اور قریش کے لوگ قیدی بھی بنائے جا چکے تھے اور یہ واقعہ قریش کے اور مسلمانوں کے درمیان جنگ کے مشتعل ہو جانے کا باعث بن گیا اور یہ سب کچھ ابوسفیان اور اس کے رفقاء کے شام کی جانب قافلہ تجارت کی شکل میں نکلنے سے قبل پیش آچکا تھا۔“

اور جلیل القدر محدث و مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں تحریر فرماتے ہیں:

باب سرية عبد الله بن جحش التي كان سبباً لغزوة بدر العظيمة و ذلك ﴿يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّتَقَى الْجَمْعَانِ﴾ و الله على كل شيء قدير ﴿﴾ \*

”اب سر یہ عبد اللہ بن جحش (سر یہ نخلہ) جو سبب بنا بدر کبریٰ کے غزوہ کا اور جس کے متعلق قرآن نے یہ کہا ”اور یہ دن ہے حق و باطل کے نکھر جانے کا وہ دن جبکہ (حق و باطل کی جنگ کے لیے) دو جماعتیں آپس میں ملیں اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔“

قریش کا تجارتی قافلہ جب نفع کثیر حاصل کر کے شام سے واپس ہو کر مکہ جا رہا تھا بدر سے قریب ہو کر گزرا تو نبی اکرم ﷺ کو علم ہوا۔ آپ ﷺ نے فوراً صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے مشورہ فرمایا تب بعض حضرات نے تو بخوشی اس کے مقابلہ کے لیے آمادگی ظاہر کی اور بعض نے یہ سمجھ کر کہ کسی اہم جنگ کا معاملہ نہیں ہے اس کے تعاقب پر آمادگی کا ثبوت نہیں دیا، چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے:

وقال ”هذه غير قریش فيها اموالهم فاخرجوا اليها لعل الله ينغلكموها فاتتدب الناس فحفف بعضهم و ثقل بعض و ذلك انهم لم يظنوا ان رسول الله يلقى حرباً. \*

”نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ قریش کا قافلہ جا رہا ہے جس میں ان کا مال تجارت ہے اس کا تعاقب کرو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے لیے مال غنیمت بنا دے پس لوگوں کو اس کے لیے پکارا گیا تو بعض نے اس کو پسند کیا اور بعض نے نکلنے میں گرانی محسوس کی اور یہ عدول حکمی کے پیش نظر نہیں بلکہ اس لیے تھی کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کسی جنگ کے ارادہ سے نہیں جا رہے ہیں۔“

مسلمانوں کا یہ لشکر جو قافلہ کے تعاقب میں نکلا سامان حرب سے بے پرواہ ہو کر مدینہ سے نکلا مشہور روایت کے مطابق ان



کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی جبکہ بچہ اللہ مدینہ کے اندر ہی مسلمانوں کی آبادی ہزار ہا بالغ نفوس پر مشتمل تھی اور چند تلواریں دو تین گھوڑے ساٹھ زرہ اور صرف ساٹھ اونٹ ان کا متاع جنگ تھا درآنحالیکہ مسلمانوں کے پاس بلکہ خود نکلنے والے مجاہدین کے پاس مدینہ میں بیش از بیش سامان جنگ اور اونٹ گھوڑے موجود تھے غرض یہ لشکر جنگی لشکر نہیں تھا بلکہ فداکارانِ توحید کا ایک مختصر سا قافلہ تھا جو قریش کے حرب و ضرب کے سرمایہ پر قابض ہو کر دشمن کو بے مایہ بنانے نکلا تھا۔

ابوسفیان کو مسلمانوں کے تعاقب کا حال معلوم ہوا تو گھبرایا اور فوراً مضمضہ نامی ایک شخص کو اجیر بنا کر مکہ روانہ کیا کہ وہ قریش کو اس معاملہ کی خبر دے اور مدد طلب کرے قریش نے جب حقیقت حال کو سنا تو ان میں بہت زیادہ جوش پیدا ہو گیا اور تمام سردارانِ قریش آمادہ جنگ ہو کر اپنے اپنے لشکر کو لے کر نکل کھڑے ہوئے اور اس کروفر سے نکلے کہ تعداد میں ایک ہزار تھے نیزے اور تلواریں بے شمار تھیں سات سوزرہ، ستر گھوڑے اور بے تعداد اونٹ تھے وہ اونچی بنے، نیزے اور تلواریں سجے، ڈھالیں اور بکتر لگائے نشہ غرور میں جھومتے ہوئے بدر کی جانب بڑھے۔

ادھر مسلمان آگے بڑھتے ہوئے جب وادی صفراء کے قریب پہنچے تو نبی اکرم ﷺ نے بسبس بن عمرو اور عدی بن الزغباء کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ قافلہ کا حال معلوم کر کے آئیں ابن اسحاق کہتے ہیں کہ یہ دونوں بدر پہنچے تو وہاں کنویں کے قریب قبیلہ، جہینہ کا ایک شخص مجدی بن عمرو موجود تھا اور نزدیک ہی دو لڑکیاں آپس میں بات چیت کر رہی تھیں۔

ایک نے دوسری سے کہا کہ کل یا پرسوں یہاں قریشی قافلہ آنے والا ہے میں اس میں کام کروں گی اور تیرا قرض اتار دوں گی اور پھر مجدی نے اس لڑکی کی تصدیق کی بسبس نے یہ سنا تو وہ اور عدی اونٹوں کو پانی پلا کر فوراً روانہ ہو گئے۔  
دوسری جانب ابوسفیان ڈرتا اور چھپتا چھپاتا قافلہ سے آگے بڑھ کر تجسس حال کے لیے بدر پہنچا مجدی وہاں موجود تھا ابوسفیان نے دریافت کیا تو نے کسی اجنبی کو تو یہاں نہیں دیکھا؟ مجدی نے کہا اور تو کوئی نئی بات نظر نہیں آئی البتہ تھوڑی دیر ہوئی کہ غیر متعارف دو آدمی ضرور یہاں آئے تھے اور اونٹوں کو پانی پلا کر واپس ہو گئے۔

ابوسفیان کنویں کے پاس گیا تو اونٹوں کی لید پڑی دیکھی اس نے لید کو کریدا تو کھجور کی گٹھلیاں نکلیں، ابوسفیان نے یہ دیکھ کر کہا بلاشبہ یہ اونٹ یثرب کے تھے اور تیزی کے ساتھ قافلہ تک پہنچا اور حالات سے باخبر کر کے قافلہ کا رخ ساحل کی جانب پھیر دیا اور بدر کو بائیں ہاتھ چھوڑتا ہوا مکہ کو چل دیا۔

اس مدت میں مسلمان وادی صفراء سے گزر کر وادی ذفران تک پہنچ چکے تھے یہاں اترے تو ایک جانب بسبس اور عدی سے یہ معلوم ہوا کہ عنقریب ابوسفیان کا قافلہ بدر پہنچنے والا ہے دوسری جانب یہ پتہ لگا کہ مکہ سے قریش ایک ہزار جمعیت لے کر کروفر کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کی غرض سے بدر کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

ابوسفیان نے جب ساحلی جانب اختیار کر لی اور اس کو یہ یقین ہو گیا کہ اگر مسلمان میرے تعاقب کے لیے بدر کی جانب آئیں گے تو میں ان کی زد سے محفوظ رہوں گا۔ اس لیے اس نے مکہ کی جانب دوسرا قاصد روانہ کیا کہ اب جنگ کی ضرورت نہیں ہے بس مسلمانوں کی زد سے بچ کر جلدی مکہ پہنچ جانے والا ہوں قریش بدر کے قریب آ چکے تھے کہ قاصد نے ابوسفیان کا پیغام سنایا مگر



ابو جہل نے واپسی کے لیے سختی کے ساتھ انکار کر دیا اور کہا کہ اب بدر ضرور پہنچنا ہے اور مسلمانوں کا قلع قمع کر کے اس کانٹے کو ہمیشہ کے لیے نکال دینا ہے۔

بہر حال مسلمانوں کو جب وادی ذفران میں یہ دونوں خبریں ملیں تو نبی اکرم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے دوبارہ مشورہ ضرور سمجھا کیوں کہ اب معاملہ کٹھن تھا۔ مسلمان بے سروسامان اور پھر تھوڑی تعداد میں تھے اور دشمن ہر طرح وقت کے ہتھیاروں سے مسلح کثیر سامان جنگ کے مالک تھے اور تعداد میں تین گنے سے بھی زیادہ اور بقول ارباب سیرت انصار اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی معیت سفر کو صد ہزار باعث نازش و مباہات سمجھتے اور ہمرکاب رہتے تھے لیکن عقبہ ثانیہ کے وقت وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ یہ معاہدہ کر چکے تھے کہ جب تک قریش یا غیر قریش اپنی جانب سے مدینہ پر حملہ آور نہ ہوں انصار مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کے لیے مجبور نہیں ہوں گے۔

مشورہ کے لیے یہ اہم وجوہ تھیں جن کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دشمن سر پر ہے اور قافلہ قریش! اب بتاؤ کیا چاہتے ہو، جنگ کر کے حق و باطل کا فیصلہ یا بغیر کانٹا لگے قافلے پر قبضہ؟ مسلمانوں نے جب یہ سنا تو بعض نے طبعی طور پر جنگ کی مخالفت کی اور اس بارے میں گرانی محسوس کی، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ ہم جنگ کے ارادے سے نہیں نکلے تھے، اس لیے بے سروسامان ہیں ہم تو اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ قافلہ پر قبضہ کر کے واپس چلے جائیں، نبی اکرم ﷺ نے اس کمزور رائے کو ناپسند فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: قافلہ کو چھوڑو، اب اس قوم کے متعلق رائے دو جو تمہارے مقابلہ کے لیے مکہ سے نکل آئی بعض لوگوں نے جب دوبارہ عذر کیا تو آپ ﷺ نے پھر پہلی بات لوٹادی تب جلیل القدر صحابہ ابوبکر، عمر، علی، رضی اللہ عنہم سمجھ گئے کہ مرضی مبارک حق و باطل کی جنگ سے وابستہ ہے اس لیے انہوں نے جذبہ وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم ہر طرح جنگ کے لیے تیار ہیں اور اسلام کی خاطر آپ ﷺ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کو حاضر ہیں اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے تو اس شد و مد کے ساتھ فداکارانہ جذبات کا اظہار کیا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان کی تقریر پر رشک ہونے لگا۔ مگر آپ ﷺ اب بھی نگاہ مبارک سے کسی بات کے طالب نظر آ رہے تھے یہ دیکھ کر انصار میں سے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم انصار کی جانب اشارہ ہے کہ ہم کچھ عرض کریں اور پھر انصار کی جانب سے پوری وفاداری اور فداکاری کا یقین دلاتے ہوئے نہایت موثر تقریر فرمائی۔

مہاجرین و انصار کی یہ تقاریر سن کر سرور عالم ﷺ کا چہرہ مبارک مسرت سے تھما اٹھا اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اب اللہ کے نام پر آگے بڑھو اور بشارت حاصل کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ دو گروہ (قافلہ اور مشرکین مکہ کا لشکر) میں سے ایک کو تمہارے قبضہ میں دے دوں گا اور قافلہ نہیں بلکہ مشرکین کا لشکر تمہارے قبضہ میں دے دیا جائے گا اور خدا کا وعدہ بلاشبہ سچا ہے اور قسم بخدا میں جنگ سے قبل ابھی سے قوم کے سرداروں کی قتل گاہ کو دیکھ رہا ہوں اور صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے بدر پہنچ کر زمین پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ ”اس جگہ فلاں قریشی مارا جائے گا اور یہاں فلاں قتل ہوگا۔“

سلف سے خلف تک تمام مفسرین، محدثین اور اصحاب سیر و تاریخ اس پر متفق ہیں کہ یہی وہ مشورہ ہے جس کے متعلق سورہ انفال کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں:



﴿ كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَرِهُونَ ۙ  
يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۖ ۝۸۱ وَإِذْ يَعِدُكُمُ  
اللَّهُ إِحْدَى الظَّالِمَاتِينَ أَنَّهُمَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشُّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ  
أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ۖ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ  
الْمُجْرِمُونَ ۖ ۝۸۲﴾ (الانفال: ۵-۸)

”اللہ اور رسول کے لیے ہیں) اس لیے کہ تیرے پروردگار نے تجھ کو حق کے لیے تیرے گھر سے نکالا اور حالت یہ ہو گئی کہ مسلمانوں کا ایک فریق اس نکتے پر گرانی کا اظہار کر رہا تھا اور وہ تجھ سے حق کے بارے میں حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد جھگڑا کر رہے تھے گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کے منہ میں ہنکائے جا رہے ہیں اور (یہ واقعہ اس وقت پیش آیا) جبکہ اللہ تم کو وعدہ دے رہا تھا کہ دونوں فریق (قافلہ اور مشرکین مکہ کا لشکر) میں سے ایک فریق کو تمہارے قبضہ میں دے دے گا اور تم یہ شبہ کرتے تھے کہ تم کو وہ گروہ ملے جس کے مقابلہ میں کانٹا بھی نہ لگے اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے وعدہ کے کلمات سے حق کو ثابت کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے اور اس طرح حق کو حق کر دے اور باطل کو باطل اگرچہ مجرموں کو یہ بات پسند نہ آئے۔“

اب مسلمان آگے بڑھے اور بدر کے قریب پہنچ کر مدینہ کی جانب والے رخ ”عدوۃ الدنیا“ پر خیمہ زن ہو گئے اور مشرکین آگے بڑھے تو بدر پہنچ کر مدینہ سے دور مکہ کی جانب والے رخ ”عدوۃ القصوی“ پر اترے اور محاذ جنگ کا نقشہ اس طرح بنا کہ مسلمان اور مشرکین بالمقابل تھے اور ابوسفیان کا قافلہ اس وقت ساحل کی جانب نیچے نیچے مشرکین کے لشکر کی پشت پر سے گزر رہا تھا کہ جب وہ چاہیں تو مشرکین مکہ کی نصرت و مدد کے لیے بے روک ٹوک آسکتے اور مکہ کا کام دے سکتے ہیں اور پھر یہ عجیب صورت حال تھی کہ مسلمانوں کا محاذ جنگ اس درجہ ریتلا تھا کہ انسانوں اور چوپاؤں دونوں کے قدم ریت میں دھنسے جا رہے تھے اور چلنا دشوار ہو رہا تھا مگر مشرکین کا محاذ جنگ ہموار اور پختہ فرش کی طرح تھا غرض دشمن تعداد میں تین گنے سے زیادہ سامان جنگ میں پوری طرح مکمل ذرائع رسل و رسائل میں ہر طرح مطمئن جائے وقوع نہایت عمدہ اور ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ قافلہ کی کمک متوقع تھی اور خود اپنی حالت یہ کہ تعداد میں بہت کم اسلحہ جنگ برائے نام سامان حرب نہ ہونے کے برابر، سوار یوں کا شمار برائے بیت، جائے وقوع حد درجہ خراب اور ان تمام ناسازگار حالات کے ساتھ کمک قطعاً غیر متوقع، اور حد یہ کہ دشمن پانی پر قابض اور مسلمان اس سے محروم۔

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کو ان کی ذاتی رائے پر چھوڑ دیا جاتا تو ان کی عقل و خرد بہ اسباب ظاہر اس کے سواء ورنہ کیا فیصلہ کر سکتی تھی کہ وہ اس وقت کو ٹال دیں اور دشمن سے کسی ایسے دوسرے وقت کے لیے جنگ کا قول و قرار کریں کہ وہ دشمن کی لرح ہر حیثیت سے جنگ کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ اسی بناء پر مسلمانوں نے وادی ذفران میں شوری کے وقت ابتداء یہی کہا بھی مگر نبی الہی کے ذریعہ چونکہ نبی اکرم ﷺ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خدا کا یہ وعدہ کہ تم کو سعیر اور نفیر دونوں میں سے ایک پر مسلط کر دیا جائے گا صرف اس شکل میں پورا ہونے والا ہے کہ مسلمان مشرکین کے لشکر (نفیر) کا مقابلہ کریں اور حق و باطل کے اس معرکہ میں



مسلمان کامیاب ہوں اور مشرکین ناکام و خاسر اس لیے مسلمانوں نے پیغمبر ﷺ کی مرضی پا کر ہمہ قسم کی بے سروسامانی کے باوجود خود کو حق و باطل کی معرکہ آرائی کے لیے والہانہ و فداکارانہ جذبہ پاک کے ساتھ پیش کر دیا۔ ایسی صورت حال کو قرآن عزیز نے اس معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ ظاہر کیا ہے:

﴿إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّقِيِ الْجَمْعِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۴۱﴾ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدُوِّ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدُوِّ الْقُصُوِّ وَالرَّكْبُ اسْفَلَ مِنْكُمْ ۗ وَ لَوْ تَوَاعَدْتُمْ لِاِخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعَادِ ۗ وَ لَكِنْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۗ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنۢ بَيْنَتِهِ وَيُحْيِيَ مَنْ حَيَّ عَنۢ بَيْنَتِهِ ۗ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَبِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾﴾

(الانفال: ۴۱-۴۲)

”اگر تم اللہ پر اور اس (غیبی مدد) پر یقین رکھتے ہو جو ہم نے فیصلہ کر دینے والے دن اپنے بندہ پر نازل کی تھی جبکہ لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے تو چاہیے کہ اس تقسیم پر (یعنی مال غنیمت کی مقررہ تقسیم پر) کاربند ہو اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ (بدر کا دن تھا کہ) تم ادھر قریب کے ناکہ پر تھے ادھر دشمن دور کے ناکہ پر اور قافلہ تم سے نچلے حصہ میں تھا (یعنی سمندر کے کنارے کنارے گزر رہا تھا) اور اگر تم آپس میں لڑائی کی بات ٹھہراتے تو ضرور جنگ کے وقت کے بارہ میں تم اختلاف کرتے کیونکہ تم چاہتے ہو کہ کسی حالت میں جنگ نہ ہو اور دشمن چاہتا ہے کہ ضرور جنگ ہو (یعنی تمہیں دشمنوں کی کثرت اور اپنی بے سروسامانی کا اندیشہ تھا اور قافلہ پر تسلط آسان نظر آ رہا تھا اور دشمن اپنی کثرت اور ساز و سامان کے بل پر گھمنڈ کیے ہوئے تھا لیکن اللہ نے دونوں لشکروں کو بھڑا دیا تاکہ جو بات ہونے والی تھی اسے کر دکھائے نیز اس لیے کہ جسے ہلاک ہونا ہے تمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہنے والا ہے تمام حجت کے بعد زندہ رہے اور بلاشبہ اللہ سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔“

﴿وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرِ وَاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۗ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يُّكْفِيَكُمْ اَنْ يُبَدِّدَ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ اَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۴۴﴾ بَلٰٓءٌ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَاِيْتُوْكُمْ مِّنۢ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُبَدِّدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَّكُمْ وَ لِتَطْمِئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهِ ۗ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِّنۢ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۴۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خٰٓبِيْنَ ﴿۴۷﴾﴾

(آل عمران: ۱۲۳-۱۲۷)

”اور اللہ تمہاری مدد کر چکا ہے بدر کی لڑائی میں اور تم کمزور حالت میں تھے پس اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم شکر گزار ہو۔ (یہ جب ہوا) کہ تو مسلمانوں سے کہہ رہا تھا کیا تم کو کافی نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد کو آسمان سے اترنے والے تین



ہزار فرشتے بھیجے ہاں بلاشبہ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو اور پھر ایسا ہو کہ دشمن اسی دم تم پر چڑھ آئے تو تمہارا پروردگار (بھی) پانچ ہزار نشان رکھنے والوں سے تمہاری مدد کرے گا اللہ نے صرف یہ اس لیے کیا کہ تمہارے لیے خوشخبری ہو اور اس کی وجہ سے تمہارے دل مطمئن ہو جائیں اور مدد و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی ہی طرف سے ہے اس کی طاقت سب پر غالب ہے اور وہ اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے اور نیز اس لیے تاکہ منکرین حق کی جمعیت و طاقت کا ایک حصہ بیکار کر دے۔ انہیں اس درجہ ذلیل و خوار کر دے کہ وہ نامراد ہو کر اٹے پاؤں پھر جائیں۔“

### دعائے نصرت:

غرض اس حالت میں دونوں فریق جنگ کے لیے صف آرا ہوئے تو اول آپ ﷺ نے مسلمانوں کی صفوف کو درست فرمایا اور پھر اس عریش (خس پوش جھونپڑی) کے نیچے جا کر جو آپ ﷺ کے لیے میدان جنگ میں بنا دی گئی تھی درگاہ الہی میں الحاح و تضرع کے ساتھ دعا شروع کی اور عرض کیا:

اللهم انجز لی ما وعدتني اللهم ان تهلك هذه العصابة من اهل الاسلام لا تعبد فی الارض.

”خدا یا! تو نے مجھ سے جو وعدہ (نصرت) فرمایا اس کو پورا کر دیا! اگر یہ مٹھی بھر مسلمان ہلاک ہو گئے تو پھر خطہ زمین پر کوئی تیرا عبادت گزار باقی نہیں رہے گا۔“

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو قریب آئے اور عرض کیا خدا کے رسول ﷺ! بس کیجئے اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔

### غیبی نصرت و امداد:

اور آخر یہی ہوا بھی کہ ہر قسم ناسازگار حالات اور اس درجہ کمزوری کے باوجود کہ کسی مسلمان کا اس معرکہ سے صحیح و سالم بچ کر نکل جانا خود ایک معجزہ ہوتا مسلمانوں کو غیبی نصرت و مدد نے بامراد اور کامیاب کیا فتح اور نصرت نے قدم چومے اور تاریخ عالم کا ایک بے نظیر اور حیرت زا انقلاب پیش کر دیا اور مشرکین قریش کے تمام سردار اور مشہور نبرد آزما ہی قتل نہیں ہوئے بلکہ شرک و کفر کی اجتماعی طاقت ہی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ غیبی نصرت کیا تھی؟ قرآن حکیم اس کا جواب متعدد آیات میں یہ دیتا ہے:

① مسلمانوں کی نگاہ میں دشمنوں کی تعداد اصل تعداد سے کم نظر آئی تاکہ مسلمان مرعوب نہ ہوں اور مشرکین کی نگاہوں میں مسلمان مٹھی بھر معلوم ہوئے تاکہ وہ جنگ سے جی نہ چرائیں اور معرکہ حق و باطل ٹل نہ جائے۔

﴿ اِذْ يُرِيكُمُ اللَّهُ فِي مَنَايِكَ قَلِيلًا ۗ .. اِلٰى .. وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُورُ ۗ ﴾ (الانفال: ۴۳-۴۴)

اور ایک وقت میں دو گنے معلوم ہوئے تاکہ مسلمانوں سے مرعوب ہو کر رہ جائیں۔

﴿ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۗ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ ۗ يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأَى الْعَيْنِ ۗ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي

الْأَبْصَارِ ۗ ﴾ (آل عمران: ۱۳)



② مسلمانوں کی دعاء پر اول ان کی مدد ایک ہزار فرشتوں سے کی گئی۔

﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِالْفِ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرَدِّفِينَ ①﴾ (الانفال: ۹)  
اور پھر یہ تعداد بڑھا کر تین ہزار کر دی گئی۔

﴿أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آفِ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنَزَّلِينَ ②﴾ (آل عمران: ۱۲۴)  
اور اگر دشمن تم پر یک لخت حملہ کر دے تو ہم تین ہزار کی بجائے پانچ ہزار فرشتوں سے مدد کریں گے۔

﴿يُمِدُّكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آفِ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ③﴾ (آل عمران: ۱۲۵)

③ مسلمانوں پر عین معرکہ کے وقت اونگھ طاری کر دی جس کے چند منٹ بعد ان کی بیداری نے ان میں ایک نئی تازگی اور نئی روح پیدا کر دی ﴿إِذْ يُغَشِّيكُمُ الْتُّعَاسُ أَمَنَةً مِّنْهُ﴾ (الانفال: ۱۱)

④ آسمان سے پانی برسا کر مسلمانوں کے لیے ریتلی زمین کو پختہ فرش کی طرح بنا دیا اور نشیب کی وجہ سے حوض نما گڑھے میں پانی مہیا کر دیا اور دشمنوں کی زمین کو کچھڑ کی طرح دلدل بنا ڈالا۔

﴿وَيُنزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمُ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَى قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ④﴾ (الانفال: ۱۱)

### نتیجہ جنگ:

بہر حال معرکہ جنگ بپا ہوا اور دونوں جانب سے نبرد آزما ایک دوسرے کے مقابل ہو کر ”هل من مبارنا“ پکارنے اور داد شجاعت دینے لگے اور پھر یکا یک ہجومی جنگ شروع ہو گئی مسلمان اول تو جنگ مغلوبہ لڑے مگر فراغت دعاء کے بعد جب میدان جنگ میں آ کر نبی اکرم ﷺ نے ”شاهت الوجوه“ ”چہرے روسیہ ہوں“ پڑھتے ہوئے مٹھی بھر خاک اور کنکریاں دشمنوں کی جانب پھینکیں تو خدائے برحق کی معجزانہ قدرت نے ہوا کے ذریعہ اس کے ذرات تمام مشرکین کی آنکھوں تک پہنچا دیے اور وہ اس ناگہانی پریشانی سے مضطرب ہو کر آنکھیں ملنے لگے اور جنگ مغلوبہ ”جنگ غالبہ“ کی شکل میں بدل گئی۔

﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ⑤﴾ (الانفال: ۱۷)

”اے محمد ﷺ اور تو نے جب (کنکریاں) پھینکیں تو درحقیقت تو نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں (کیونکہ انسانی ہاتھ ایک مٹھی میں اتنے بڑے لشکر کے ہر آدمی پر رمی نہیں کر سکتا تھا یہ جو کچھ ہوا نبی ﷺ کے ہاتھ پر خدا کا معجزہ ہوا)۔“  
اور دیر نہیں لگی کہ مشرکین کے بڑے بڑے آدمی مارے گئے اور دشمنوں کے پیرا کھڑ گئے وہ بھاگتے تھے مگر بھاگنے کا موقع نہ پاتے تھے۔ چنانچہ ان کے ستر آدمی قتل ہوئے اور ستر گرفتار اور باقی نے راہ فرار اختیار کی۔

مسلمان اگرچہ خدا کی نصرت اور اس کے فضل سے کامیاب ہوئے اور فتح و کامرانی کے مالک بنے تاہم بائیس مجاہدین نے



بھی جام شہادت نوش کیا۔

## جنگ بدر نے تاریخ عالم کا رخ بدل دیا:

بدر کا معرکہ مؤرخین اور اصحاب سیر سے بھی اگرچہ اپنی تاریخی اہمیت کا اعتراف کراتا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ معرکہ بدر ایک ہنگامی معرکہ نہیں تھا بلکہ اس نے قریش مکہ کی قوت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور مسلمانوں کے لیے اعلیٰ کلمۃ اللہ کی راہیں کھول دیں لیکن وہ بھی اس حقیقت حال سے شاید بے خبر ہیں کہ معرکہ بدر صرف مشرکین مکہ اور مسلمانوں کی آویزش حق و باطل کا معرکہ نہیں تھا بلکہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اس وقت دنیا ایک موڑ پر کھڑی تھی اور تاریخ عالم کا اشہب تیز گام اس موڑ پر حیران و سرگرداں کھڑا تھا کہ کس جانب رخ کرے اس لیے بدر کا انقلاب عالمگیر انقلاب تھا۔

صفحہ عالم پر اگر بدر کا معرکہ پیش نہ آتا اور مشرکین مکہ کی طاقت شکست و ریخت نہ ہوتی تو بلاشبہ نہ صرف حجاز نہ صرف عرب و عجم بلکہ کائنات ہستی کا ہر ایک بحر و بر ظلم، سرکشی اور باطل سے دوچار رہتا۔ آزادی ضمیر فنا ہو جاتی جذبات حق مٹ کر رہ جاتے اور یہ سب ظلم و جبر کے بل پر اپنے لیے آپ جگہ پیدا کر لیتے اب جبکہ بدر کا معرکہ پیش آ گیا اور مشرکین مکہ کی قوت ٹوٹ گئی تو دنیا نے موڑ سے آگے بڑھ کر وہ راہ اختیار کر لی جو آزادی ضمیر عدل و انصاف حق پرستی اور نیکو کاری کی راہ تھی جہاں ضعیفوں کی نصرت فرض اور بیچاروں کے لیے چارہ کار مہیا تھا اس لیے خدا کا یہ عظیم الشان احسان کہ بدر میں حق کو فتح و کامرانی نصیب ہوئی صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں تھا بلکہ تمام کائنات انسانی پر احسان عظیم تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا خوب فرمایا:

بعض اوقات قدرتی حوادث کا ایک معمولی سا واقعہ بھی فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتا ہے جنگ و اثر لو کے تمام مؤرخین متفق ہیں کہ اگر ۱۷ اور ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کی درمیانی شب ٹل بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا کیونکہ اس صورت میں نیولین کو زمین خشک ہونے کا برہ بچے تک انتظار نہ کرنا پڑتا۔ سویرے ہی لڑائی شروع کر دیتا نتیجہ یہ نکلتا کہ بلوشر کے پہنچنے سے پہلے ویلنگٹن کو شکست ہو جاتی و اثر لو میں اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا لیکن اگر بدر میں نہ ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ تمام کرۂ ارضی کی ہدایت و سعادت کا نقشہ الٹ جاتا اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی دعاء میں اشارہ کیا تھا: اللھم ان تھلک ہذا العصابۃ فلا تعبد فی الارض۔ خدایا! اگر خدام حق کی یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہو گئی تو کرۂ ارضی میں تیرا سچا عبادت گزار کوئی نہیں رہے گا۔

## قرآن عزیز کی روشنی میں غزوہ بدر پر دوبارہ نظر:

غزوہ بدر سے متعلق بیان کردہ تفصیلات جمہور علماء اسلام کے نزدیک مسلم ہیں خصوصاً اس مسئلہ میں تو سلف و خلف میں سے کسی کی بھی دورائے نہیں ہیں کہ مسلمان جب مدینہ سے نکلے تو صرف قافلہ پر حملہ مقصود تھا لیکن وادی ذفران میں پہنچ کر قدرتی حادثہ نے ایک دوسرے مقابلہ سے دوچار کر دیا اور یہ مشرکین مکہ کی وہ یورش تھی جو مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ظہور میں آئی، اور اب مسلمانوں کو ”عمیر و نفیر“ دو کے ساتھ واسطہ پڑ گیا۔ اس لیے یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کو بذریعہ وحی یہ بشارت سنائی گئی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا جائے گا اور بعض مسلمانوں نے اگرچہ انسانی کمزوری کی بناء پر ”نفیر“ کے مقابلہ میں



”عمیر“ کو ترجیح دینے کا خیال ظاہر کیا مگر نبی اکرم ﷺ کو وحی نے اطلاع کر دی تھی کہ اللہ تعالیٰ ”نفیر“ کے مقابلہ کو مقدر کر چکا ہے اور اس کا وعدہ اسی شکل میں پورا ہوگا اس لیے ذات اقدس ﷺ کا رجحان اسی جانب ہوا اور مشورہ کے بعد آخر وہی فیصلہ ہوا جو خدا اور خدا کے رسول ﷺ کی مرضی تھی..... چنانچہ قرآن عزیز کی آیات ﴿كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ﴾ (الانفال: ۵) اور ﴿إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ (الانفال: ۴۲) اسی حقیقت کا اعلان کر رہی ہیں۔

مگر جمہور کے ان مسلمات کے خلاف مولانا شبلی (مرحوم و مغفور) نے سیرت النبی ﷺ جلد اول میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ مسلمان شروع ہی میں مدینہ سے صرف ”نفیر“ کے لیے نکلے تھے اور خدا کے وعدہ ”عمیر و نفیر“ کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا اور نبی اکرم ﷺ نے ”عمیر و نفیر“ کے متعلق جو کچھ مشورہ کیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو کتب سیر میں مذکور زبردست تقاریر فرمائیں وہ سب وادی ذفران میں نہیں بلکہ مدینہ ہی میں ہو چکا تھا۔

مولانا نے مرحوم نے اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے طویل بحث فرمائی ہے اور احادیث و سیر میں مذکور واقعات کی ترتیب کا اس لیے انکار کر دیا ہے کہ وہ اس ترتیب کو قرآن کی تصریحات کے خلاف سمجھتے ہیں اور یہ کہ بعض صحیح احادیث و روایات بھی ان کے خیال کی ہی تائید کرتی ہیں۔

چونکہ یہ مسئلہ علمی نظر و فکر سے تعلق رکھتا ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ قرآن عزیز ہی کی روشنی میں مناظرانہ اسلوب سے بچ کر خالص تحقیقی رنگ میں اس پر ”محاکمہ“ کیا جائے تاکہ اصل حقیقت واضح ہو سکے۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کی تفصیلات دیتے ہوئے دو جگہ بصراحت اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ ”نفیر“ کا معاملہ مدینہ سے ”عمیر“ کی خاطر نکلنے کے بعد اچانک سامنے آیا اور اس لیے بعض مسلمانوں نے نفیر کے مقابلہ کو ابتداءً خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور گراں محسوس کیا۔

① پہلا مقام سورہ انفال کی وہ چند آیات ہیں جو ﴿كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ﴾ سے شروع ہو کر ﴿وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ﴾ تک مسلسل چلی گئی ہیں جو تقریباً سات یا آٹھ آیات ہیں۔

قرآن عزیز نے ان آیات میں اس پورے واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے جو معرکہ بدر میں از اول تا آخر پیش آیا یعنی مدینہ سے نکلنے پر مسلمانوں کے سامنے کیا کیا صورتیں پیش آئیں وہ سب ہی ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے بیان کی گئیں ہیں۔ پس جس طرح ﴿كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ﴾ کے ساتھ ﴿وَإِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَرِهُونَ﴾ کا تعلق ہے اسی طرح ﴿وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ﴾ اور ﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ﴾ اور ﴿إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ﴾ - ﴿يُنزِلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾ وغیرہ واقعات کا بھی تعلق ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مولانا شبلی مرحوم بھی جمہور کے ساتھ اس پر متفق ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا درگاہ الہی میں استغاثہ پیش کرنا ملائکہ کی مدد کا آنا، مسلمانوں پر اونگھ طاری کر کے تازہ دم کر دینا، آسمان سے پانی کا برس کر مسلمانوں کے حق میں رحمت ثابت ہونا، یہ کل معاملات اس آن ہی نہیں پیش آ گئے تھے، جس آن میں مسلمان مدینہ سے نکلے تھے بلکہ یہ ایک طویل سلسلہ تھا جو ایک مدت کے اندر وقوع پذیر ہوتا رہا ہے۔



پس اگر بقول مولانا نے مرحوم آیت ﴿كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ﴾ میں اس آن کے ماسوا جو مدینہ سے خروج کے ساتھ مربوط ہے اور کچھ مراد نہیں ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ باقی وہ تمام واقعات جو اس آیت کے ساتھ مربوط کر کے بیان ہوئے ہیں گو کلام مستانف ہی کی حیثیت میں کیوں نہ ہوں وہ سب بھی ایک ہی آن سے متعلق ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ قطعاً باطل اور خلاف واقعہ ہے اس لیے اس آیت کا صاف اور صریح مطلب یہ ہے کہ قرآن عزیز عام بول چال اور محاورہ کے مطابق یہ کہہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو ذرا اس واقعہ کی جانب بھی نظر کرنی چاہیے۔

”جب پروردگار نے تم کو ایک مرتبہ مدینہ سے باہر حق کی خاطر نکالا تھا اور تمہارے سامنے ایسی صورت حال پیش آ گئی تھی کہ تم پر یہ گراں گزرنے لگا تھا کہ کیوں ہم مدینہ سے باہر نکلے کہ آخر کار ہمارے سامنے یہ صورت گراں بار آ گئی اور یہ وہ وقت تھا جبکہ خدا نے تم سے ”عمیر و نفیر“ میں سے ایک کا وعدہ کیا، وغیرہ وغیرہ۔“

یہی وجہ ہے کہ تمام مفسرین آیت ﴿وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَرِهُونَ﴾ کے متعلق عربیت کے قاعدہ سے یہ فرما رہے ہیں:

والجبلۃ فی موضع الحال وھی حال مقدرۃ لان الکراهۃ وقعت بعد الخروج کما تراہ ان شاء اللہ تعالیٰ و یعتبر ذلک مبتدأ.

”اور یہ جملہ حال واقعہ ہو رہا ہے اور یہ حال مقدرہ ہے اس لیے کہ جس کراہت کا آیت میں ذکر ہو رہا ہے وہ مدینہ سے نکلنے کے بعد پیش آئی تھی جیسا کہ انشاء اللہ ابھی تجھ کو معلوم ہو جائے گا یا یوں کہئے کہ یہ اس پوری حالت کا نقشہ بیان ہو رہا ہے جو مدینہ سے نکلنے کے وقت سے معرکہ بدر کے ختم تک پیش آئی یعنی ﴿أَخْرَجَكَ﴾ میں اخراج سے زمانہ ممتد مراد ہے آئی مراد نہیں ہے۔“

تو اب صورت حال یہ بنی کہ جو شخص ﴿لَکَرِهُونَ﴾ میں مذکورہ واقعہ کراہت کو آئی قرار دیتا ہے اور اس پورے واقعہ کو مدینہ کے اندر ہونا ثابت کرتا ہے اس کے پاس تو صرف ایک ایسا تخمینہ احتمال ہے جس کا ثبوت ان قرآن سے قطعاً نہیں ملتا جو ما بعد آیات میں موجود ہیں اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ آیت ﴿أَخْرَجَكَ﴾ میں اخراج آئی نہیں ہے بلکہ وہ ممتد مدت مراد ہے جس میں یہ معرکہ پیش آیا تو بعد کی تمام آیات بلاشبہ اس کے دعوے کے لیے واضح قرینہ بنتی اور دعوے کی تصویب کرتی نظر آتی ہیں۔

② دوسرا مقام سورہ انفال ہی کی وہ آیات ہیں جو ﴿وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّتَقَى الْجَعْنُ﴾ سے شروع ہو کر ﴿إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾ پر ختم ہوتی ہیں۔ ان آیات میں قرآن حکیم نے اول مسلمانوں اور مشرکوں کے محاذ جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ مسلمانوں کا محاذ جنگ مدینہ سے قریب وادی میں تھا اور مشرکین مکہ ان کے بالمقابل جانب بعید کی وادی میں خیمہ زن تھے اور اس وقت ابوسفیان کا قافلہ مسلمانوں کی وادی سے نیچے نیچے سمندر کے کنارے اس طرح گزر رہا تھا کہ وہ مکی فوج کی پشت پر تھا کہ اگر وہ چاہے تو مسلمانوں کی زد سے محفوظ ہو کر بے خوف اپنی فوج کی مدد کر سکتا ہے۔

﴿إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ اور اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے اس درجہ ناسازگار تھی کہ اگر تقدیر الہی یہ فیصلہ نہ کر لیتی کہ بدر کا معرکہ ضرور پیش آئے گا اور اس کا انجام



مسلمانوں کے حق میں ہوگا اور جنگ کے معاملہ کو مسلمانوں اور مشرکوں کے باہمی عہد و پیمان پر چھوڑ دیا جاتا تو مسلمان آپس میں بھی مختلف المیعا ہو جاتے بعض کہتے کہ اس میدان میں حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے تو اچھا ہے، اور بعض کہتے کہ ہم ان ناسازگار حالات میں ہرگز جنگ کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے دوسرے وقت کے لیے اس جنگ کو ٹال دینا چاہیے اور ”نفیر“ کی جگہ ”عمیر“ کو قبضہ میں کر لینا چاہیے جیسا کہ پیش آیا اور بعض کو جنگ کا معاملہ سخت گراں گزرا اور ہو سکتا تھا کہ سب ہی مسلمان یہ چاہتے کہ اس وقت معرکہ جنگ پانہ ہو اور مشرکین اپنے ساز و سامان کے زعم پر یہ اصرار کرتے کہ اس وقت اور اسی جگہ معرکہ ہو جانا از بس ضروری ہے اور یہ نقشہ سامنے آ جاتا ﴿ وَ لَوْ تَوَاعَدْتُمْ لِاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ﴾ مگر ہوا یہ ﴿ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ﴾۔

ان آیات میں قابل غور بات یہ ہے کہ اگر مشرکین مکہ کی فوج کشی کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا اور نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں سے مدینہ ہی میں وہ مشورہ فرمایا تھا جس کا ذکر تمام کتب حدیث و سیرت میں موجود ہے اور اس مقام پر خدا نے ﴿ اِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ ﴾ کا وعدہ فرما کر اپنے نبی کو وحی کے ذریعہ یہ بھی بتا دیا تھا کہ خدا کی مرضی معرکہ حق و باطل کی ہے قافلہ پر بظاہر نہیں ہے تو پھر عقل حیران ہے کہ ان تمام امور کے معلوم ہو جانے کے بعد مسلمان خود کو کس لیے بے سرو سامان سمجھ رہے تھے اور کس وجہ سے بعض مجاہدین اسلام جنگ سے جی چرارہے تھے جبکہ مدینہ میں مسلمانوں کے پاس ہزاروں اونٹ موجود تھے گھوڑے بھی کم نہیں تھے، سو پچاس گھوڑوں کا مہیا ہونا معمولی بات تھی تلواروں اور نیزوں کی بھی کچھ کمی نہیں تھی اور ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ جب ان کو دشمنوں کی عددی طاقت کا بھی صحیح اندازہ تھا تو آخر وہ کیا سبب تھا کہ مسلمان جن میں انصار بھی ہیں اور مہاجرین بھی صرف تین سو تیرہ ہی کی تعداد میں کیوں نکلے؟ اور نکلے بھی اس بے سرو سامانی کے ساتھ کہ نیزے اور تلواریں تک بھی ہر ایک کے پاس موجود نہیں چہ جائیکہ باقی سامان حرب و ضرب مکمل ہوتا اور کیا بدر کے اس واقعہ کے علاوہ کسی بھی ایسے غزوہ یا سریہ کا حوالہ دیا جاسکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس کے لیے مدینہ میں بیٹھ کر تیاری فرمائی ہو اور مسلمانوں میں دشمن کے مقابلہ کے لیے وہ ہر آسانی اور گرانی پیدا ہوئی ہو جس کا ذکر قرآن ان جملوں میں کرتا نظر آتا ہے:

﴿ وَاِنَّ ذٰلِكَ لَمِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۱۰۰ ﴾ ﴿ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ ﴾ ﴿ وَ لَوْ تَوَاعَدْتُمْ لِاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ﴾

کیا ہمارے سامنے غزوہ تبوک (غزوہ عسرت) کا نقشہ موجود نہیں ہے کہ دشمن کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے اور مشرکین مکہ جیسے غیر متمدن نہیں بلکہ متمدن عیسائی طاقت سے معاملہ ہے جو ہر قسم کے متمدن ساز و سامان جنگ سے مسلح ہے اور پھر نبی اکرم ﷺ نے مدینہ میں نہیں مدینہ کے قرب و جوار میں نہیں بلکہ خود دشمن کے گھر پر جا کر معرکہ حق و باطل گرم کرنا چاہتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک مسلمان بھی ہراساں نہیں، گراں خاطر نہیں بلکہ پروانہ وار نثار ہونے کو ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے مدینہ سے تبوک کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔

بات بالکل صاف ہے کہ مسلمان درحقیقت اس بے سرو سامانی کے ساتھ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ قافلہ پر قبضہ کرنے کے لیے نکلے تھے اور اس کے لیے یہ جمعیت اور یہ صورت حال کافی تھی لیکن بدر کے قریب پہنچ کر اچانک صورت حال تبدیل ہو گئی اور



مسلمانوں کو دو باتوں کا ایک ساتھ علم ہوا ابو جہل مکہ سے لشکر کشی کر کے آ رہا ہے اور ابوسفیان کا قافلہ بدر سے گزر کر مکہ جا رہا ہے تب وہ سب کچھ پیش آیا جس کو تفصیل کے ساتھ سن آئے ہو اور یہی وہ حالت تھی جس کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا:

﴿وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكِرِهُونَ ﴿۱﴾﴾ اور ﴿وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَأَخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ﴿۲﴾﴾

بہر حال ان ہر دو مقامات کا تبادر، کلام الہی کا سیاق و سباق اور آیات کے اندر موجود قرآن و دلائل کے سامنے مصنف سیرت النبی ﷺ کا ﴿كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ﴾ کے اجمال سے بے دلیل ایک دعویٰ کر دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور آیت ﴿وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكِرِهُونَ ﴿۱﴾﴾ میں ”و“ حالیہ کے لیے بقاعدہ عربیت ہرگز یہ ضروری نہیں کہ حال اور ذوالحال کا زمانہ اس طرح ایک ہو کہ دونوں آن واحد سے وابستہ ہوں بلکہ زمانہ کا امتداد نہ صرف ممکن الوقوع بلکہ اکثر الوقوع ہوتا ہے نیز ”حال مقدرہ“ کی مثالیں کلام عرب میں بیشتر موجود ہیں اور ”حال مقدرہ“ کا حال یہ ہے کہ جو واقعہ کسی ایک بات کی بناء پر آئندہ قریبی زمانہ میں پیش آنے والا ہے اس کو برسبیل تقدیر و احوالیہ کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ گویا وہ اسی آن میں پیش آیا ہے کیونکہ اس کا پیش آنا یقینی ہے اور اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ مدینہ سے خروج اس حالت میں ہوا کہ جب صورت حال نازک بن کر سامنے آئی تو مسلمانوں کے ایک گروہ پر گراں گزرنے لگا کہ اے کاش! مدینہ سے کیوں نکلے جو اس صورت کے ساتھ دو چار ہونا پڑا۔

③ یہ بھی واضح نہیں ہے کہ کاروان تجارت مسلمانوں کے ہاتھ سے اس طرح بچ کر نکل گیا تھا کہ مسلمان اس کا تعاقب نہ کر سکیں اور اس کو قابو میں نہ لاسکیں۔ چنانچہ آیت ﴿وَالزَّكٰبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ﴿۱﴾﴾ اس پر صاف دلالت کر رہی ہے البتہ مسلمانوں کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ جو کچھ قافلہ کے متعلق معلوم ہوا تھا اس کے پیش نظر یہ خیال اب بھی تھا کہ ابوسفیان کا قافلہ بدر ہی لگے راستہ سے گزرے گا اور اس لیے وہ وادی ذفران میں مشورہ کے وقت کاروان تجارت کے طالب تھے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا کہ دونوں میں سے کسی ایک گروہ پر تم کو ضرور مسلط کر دیں گے درحقیقت حال کے پیش نظر ہی یہ بھی اپنے رسول کو بتلادیا کہ ”عیر“ سے نہیں بلکہ ”نفیر“ سے تم کو واسطہ پڑے گا اور تم کامیاب ہو گے۔

اس صورت حال کو اگرچہ بعض اصحاب سیرت نے واضح نہیں کیا مگر محققین ارباب سیرت نے اس حقیقت کو مستند روایات سے

ثابت کیا ہے:

چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری اور شیخ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے عمدۃ القاری میں بسند اس واقعہ کو حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

قال رسول الله ﷺ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ونحن بالمدينة اني اخبرت عن عيرابي سفيان انها مقبلة فهل لكم ان تخرجوا قبل هذه العير لعل الله يغنيناها فقلنا نعم فخرج وخرجنا فلما سرنا يوماً او يومين قال لنا ماترون في قتال القوم فانهم قد اخبروا بخرجكم فقلنا لا والله مالنا طاقة لقتال العدو ولكن اردنا العير. (الحديث) \*



”ہم مدینہ میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے ابھی معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا کاروان تجارت شام سے آ رہا ہے کیا تم تیار ہو کہ اس سے قبل اس کی راہ گھیر لو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس بہانہ ہم کو مال غنیمت عطا کر دے ہم سب نے عرض کیا ”ہاں“ پس آپ ﷺ بھی نکلے اور ہم بھی نکلے ابھی ایک یا دو دن کی مسافت پر ہی پہنچے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ اہل مکہ فوج کشی کے ارادہ سے آ رہے ہیں اب کیا ارادہ ہے؟ تب ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! قسم بخدا اس حالت میں ہم میں دشمن کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے البتہ قافلہ پر حملہ کا ارادہ ضرور ہے۔“

یہ اور اسی قسم کی روایات بکثرت موجود ہیں جن میں صراحت ہے کہ مسلمان وادی ذفران میں کاروان تجارت پر حملہ آور ہونے کے متوقع تھے اور وجہ یہی تھی کہ ان کے جاسوسوں نے بدر میں اس کے آنے کی خبر دی تھی۔

④ آیت ﴿وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشُّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ﴾ (انفال: ۷) میں جمہور کے نزدیک نبی اکرم ﷺ اسی جانب ہیں جس جانب خدا ہے اور جب بعض مسلمانوں نے نبی اکرم ﷺ کے رخ کو پہچان لیا تو پھر وہ بھی خدا اور خدا کے رسول ﷺ کی مرضی کے ساتھ ہو گئے اس لیے اس حقیقت کو ان جذباتی الفاظ سے بے حقیقت نہیں بنایا جاسکتا۔

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلہ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں دوسری طرف خدا ہے (جو چاہتا ہے) کہ حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہو گا میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔ \* پس اس آیت کو بھی اپنے دعوے کے لیے سند بنایا کس طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

⑤ کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے بدر میں آئے ان کی نسبت قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطْرًا وَرِغَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ

اللَّهِ﴾ (الانفال: ۴۷)

”ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور خدا کی راہ سے روکے ہوئے نکلے۔“

اگر قریش صرف قافلہ تجارت کے بچانے کے لیے نکلتے تو خدا کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لیے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے..... الخ“

یہ بھی مصنف سیرت النبی کا ایک انوکھا استدلال ہے اس لیے کہ جن روایات میں یہ ہے کہ کفار قریش قافلہ تجارت کے بچانے کے لیے نکلے ان ہی میں یہ بھی بصراحت موجود ہے کہ جب ابوسفیان نے قاصد کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ ہم مسلمانوں کی زد سے بچ گئے ہیں تم اب مکہ واپس چلے جاؤ تو ابو جہل نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اب تو ہم مسلمانوں کا قلع قمع کر کے ہی جائیں گے اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے کفار قریش کو بدر کی جانب سے نخوت کے ساتھ پیش قدمی کے لیے ابھارا جس کا ذکر قرآن حکیم اس آیت میں کر رہا ہے:

اس کے بعد مولانا نے مرحوم نے احادیث سے اپنے مقصد کی تائید چاہی ہے اور اس سلسلہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ تمام ذخیرہ حدیث میں کعب بن مالک کی روایت کے علاوہ کہیں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت ﷺ بدر میں قریش کے قافلہ تجارت پر حملہ آوری کے



لیے نکلے نیز کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت مولانا کے نزدیک متعدد وجوہ سے قابل بحث ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی روایت بخاری میں اس طرح منقول ہے:

عن عبد الله بن كعب قال كعب لم اتخلف عن رسول الله ﷺ في غزوة غزاها الا غزوة تبوك غير ان كنت تخلفت في غزوة بدر ولم عاتب احد تخلف عنها انما خرج النبي ﷺ يريد غير قریش حتى جمع الله بينه وبينهم على غير ميعاد. (جلد ثانی کتاب الغزوات)

”کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا بجز غزوہ تبوک کے اور وہاں غزوہ بدر میں بھی شریک نہیں تھا اور جو اس میں شریک نہیں ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں کیوں کہ آنحضرت ﷺ قریش کے قافلہ کے لیے نکلے تھے کہ خدا نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا۔“

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی اس روایت کی تائید ذخیرہ حدیث میں دیگر روایات سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ گذشتہ صفحات میں ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث جس کو ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم سے تمام محدثین دارباب سیر نے نقل کیا ہے گزر چکی ہے اس میں صراحت کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اول مدینہ سے ابوسفیان کے قافلہ کے لیے نکلے اور جب ایک یا دو دن کی مسافت پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کفار مکہ کا لشکر مقابلہ کے لیے آ رہا ہے تب آپ ﷺ نے پھر مشورہ کیا اور اسی مشورہ میں بعض مسلمانوں نے جنگ کے حق میں گرانی کا اظہار کیا اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذخیرہ حدیث میں کعب کی روایت کے علاوہ کوئی روایت اس کو ظاہر نہیں کرتی کہ نبی اکرم ﷺ مدینہ سے ابوسفیان کے قافلہ کے لیے نکلے تھے۔

رہا کعب کی حدیث کا معرض بحث ہونا تو یہ دعویٰ خود محل نظر ہے جو حسب ترتیب لائق توجہ ہے:

① فرماتے ہیں کہ حضرت کعب چونکہ غزوہ بدر میں شریک نہیں تھے اس لیے ان کی روایت اس موقعہ مشاہدہ و واقعیت کی روایت نہیں۔

میدان استدلال میں یہ عجیب دلیل ہے اس لیے کہ جب مصنف سیرت النبی ﷺ کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم ﷺ مدینہ سے شروع ہی میں کفار قریش سے جنگ کے ارادہ سے نکلے تھے اور مدینہ میں ہی مشہور تاریخی مشورہ فرمایا تھا تو کعب بن مالک رضی اللہ عنہ خواہ غزوہ بدر میں شریک نہ ہوئے ہوں لیکن مدینہ میں بہر حال موجود تھے اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی اکرم ﷺ انصار و مہاجرین سے مشورہ فرمائیں اور موجودہ صحابہ رضی اللہ عنہم شرکت نہ کریں۔ لہذا حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی روایت کو مشاہدہ و واقعیت کی روایت تسلیم نہ کرنا قطعاً بے سند ہے۔ البتہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جنگ کے متعلق مشورہ مدینہ سے باہر کسی وادی میں ہوا تھا تب یہ بیشک کہا جاسکتا ہے کہ کعب رضی اللہ عنہ اگر اس مشورہ کے متعلق کچھ فرمائیں تو وہ مشاہدہ و واقعیت کی روایت نہیں ہوگی کیونکہ وہ غزوہ بدر میں شریک نہیں تھے۔

② اس واقعہ کی روایت سے ان کا مقصود یہ ہے کہ غزوہ بدر کی اہمیت کم ہو جائے تاکہ عدم شرکت سے ان کا وزن کم نہ ہو۔ الخ مولانا کا ایک صحابی کے متعلق یہ سوء ظن بھی قطعاً بے سند اور بے دلیل ہے اس لیے کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ بدر کی اہمیت کو کم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کی اہمیت اور عظمت کا احساس ہی ان کو اس پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنی عدم شرکت کے لیے معذرت پیش کریں کہ ان کو یہ سعادت اس لیے نصیب نہ ہو سکی کہ جب مسلمان مدینہ سے نکلے تھے تو چونکہ کاروان تجارت کے لیے نکلے تھے اس لیے سب



کی شرکت ضروری نہیں تھی تاہم جو نکلے ان کو وہ بے نظیر شرف ہاتھ آ گیا جس سے ہم جیسے محروم رہ گئے۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں ایک اور باریک نکتہ مستور ہے جو مولانا کے دعوے کو یکسر پاور ہوا بنا دیتا ہے وہ یہ کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ اس جانب بھی توجہ دلا رہے ہیں کہ اگر بدر کا معرکہ غزوہ تبوک کی طرح مدینہ کے اندر ہی طے شدہ ہوتا اور نبی اکرم ﷺ مدینہ سے اس ہی غرض کے لیے نکلتے تو یہ ناممکن تھا کہ اس قدر اہم اور عظیم الشان غزوہ کے لیے ”نفیر عام“ نہ ہوتا اور جو لوگ جی چرا کر یہاں بیٹھ رہتے واپسی پر ان سے باز پرس نہ کی جاتی جبکہ غزوہ تبوک میں انہی کعب رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء سے عدم شرکت پر اس قدرت سخت باز پرس ہوئی تھی کہ ذات اقدس ﷺ نے ان کے مقاطعہ کا حکم صادر فرما دیا تھا اور جب تک ان کی توبہ کے قبول پر وحی الہی کا نزول نہیں ہوا تقریباً پچاس دن مقاطعہ کا سلسلہ جاری رہا اس لیے یہ یقین کرنا چاہیے کہ غزوہ تبوک میں مجھ پر ناراضی کا اظہار اور مقاطعہ کا اعلان اور بدر میں ان امور کا فقدان بلاشبہ اس لیے تھا کہ معرکہ بدر ارادی نہیں تھا بلکہ حسب اتفاق بالکل اچانک پیش آ گیا اور درحقیقت نبی اکرم ﷺ اور مسلمان مدینہ سے ”عیر“ کے ہی لیے نکلے تھے غرض حضرت کعب رضی اللہ عنہ غزوہ بدر کی حیثیت کو کم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اپنے عذر عدم شرکت کی معقولیت کو ظاہر کرنا اور واقعہ کی نوعیت کو واضح کاف کرنا چاہتے ہیں۔

پھر یہ عجیب بات ہے کہ مصنف سیرت النبی تو یہ معلوم کر سکیں کہ قرآن ناطق ہے کہ نبی اکرم ﷺ مدینہ سے ہی کفار قریش کے مقابلہ میں نکلے اور ان کے بقول احادیث بھی یہی صراحت کر رہی ہیں لیکن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ پر ساری عمر یہ حقیقت آشکارا نہ ہو سکی ہاں یہ حقیقت جدا ہے کہ مولانا کے نزدیک کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اپنی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے جان بوجھ کر کذب بیانی تک پر آمادہ ہو گئے مگر میں تو اس کے تصور سے بھی کانپ اٹھتا ہوں۔

③ مولانا کے نزدیک بخاری میں مذکور کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت کے بھی خلاف ہے جو مسلم اور مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے:

عن انس رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ ان رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شاور حِينَ بَلَغَهُ اقبال ابى سفيان قال فتكلم ابوبكر

رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ فاعرض عنه فتكلم عمر رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ فاعرض عنه فقام سعد بن عبادَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ فقال ايانا

تريد يا رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ والذي نفسي بيده لو امرتنا ان نخيضها البحر لا خضناها.... الخ

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے مشورہ

طلب کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بولے تو آپ ﷺ نے توجہ نہ فرمائی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے آپ ﷺ نے ان کی طرف

بھی توجہ نہ کی۔ پھر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ ﷺ کا روئے خطاب ہم انصار

کی طرف ہے خدا کی قسم اگر دریا میں سواری ڈالنے کا آپ ﷺ حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے..... الخ“

یعنی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت آپ ﷺ نے مہاجرین و

انصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی اور ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا ہے اس بنا پر یہ محقق طور پر

ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لیے آپ ﷺ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی۔

مگر مولانا کا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اس روایت میں راوی نے ایک بہت بڑی غلطی کر دی ہے وہ یہ کہ اس



نے انصار مقررین میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا نام لیا ہے، حالانکہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ غزوة بدر میں شریک نہیں تھے اور تمام ذخیرہ حدیث میں اس تقریر کو حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب کیا گیا ہے اور یہی صحیح و درست ہے البتہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اسی قسم کی تقریر حدیبیہ کے موقع پر کی تھی جس کا ذکر روایات میں بکثرت موجود ہے تو ثابت ہوا کہ اس روایت میں راوی نے واقعہ کو خلط ملط کر دیا ہے۔ پس حدیث انس رضی اللہ عنہ کے ابتدائی جملوں میں بھی یا تو ابہام و اجمال ہے اور یا راوی کے وہم کی وجہ سے مدینہ کے ابتدائی مشورہ اور وادی ذفران کے مشہور تاریخی مشورہ کے درمیان خلط ہو گیا ہے۔ چنانچہ مشہور محدث اور بخاری کے شارح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی روایت انس رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں:

ووقع فی مسلم ان سعد بن عبادۃ هو الذی قال ذلک و کذا اخرجہ ابن ابی شیبۃ من مرسل عکرمۃ و فیہ نظر لان سعد بن عبادۃ لم یشہد بدرًا و یکن الجمع بان النبی ﷺ استشارہم فی غزوة بدر مرتین الاولی و هو بالمدينة اول ما بلغہ خبر العیر مع ابی سفیان و ذلک مبین فی روایۃ مسلم و وقع عند الطبرانی ان سعد بن عبادۃ قال ذلک بالحديبية و هذا اولی بالصواب.

”اور مسلم میں ہے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے وہ تقریر کی جو مقداد رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہے اور ابن ابی شیبہ رضی اللہ عنہ نے بھی ”مصنف“ میں اسی طرح عکرمہ کے مرسل کے ذریعہ نقل کیا ہے اور اس پر اعتراض واقع ہوتا ہے اس لیے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ غزوة بدر میں شریک نہیں ہوئے ہاں حدیث مسلم کے اس مضمون کو دوسری صحیح حدیث کے ساتھ اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ دراصل بدر کے معاملہ میں دو مشورے ہوئے ہیں ایک مدینہ کے اندر ہوا جب نبی اکرم ﷺ کو ابوسفیان کے قافلہ کا حال معلوم ہوا مسلم کی روایت میں شاید اس کا ذکر ہے اور دوسرا مشورہ راستہ میں وادی ذفران میں ہوا جیسا کہ فتح الباری میں بصراحت مذکور ہے اور طبرانی میں ہے کہ دراصل سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر حدیبیہ کے موقع پر ہوئی تھی (اور راوی نے اس جگہ خلط ملط کر دیا ہے) اور یہی صحیح اور درست ہے۔“

غرض حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی مولانا کا استدلال صحیح نہیں ہے رہا یہ معاملہ کہ انصار جب قافلہ کے لیے مدینہ سے نکل چکے تھے تو پھر اس اہمیت کے ساتھ وادی ذفران میں ان کی رائے معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی تھی تو یہ شبہ بھی نادرست ہے کیونکہ سابق میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ سے نکلتے وقت بھی ابوسفیان کے قافلہ پر قابض ہونے کے لیے مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا تھا وہ غالباً اس لیے کیا ہوگا کہ انصار بھی شریک ہونا چاہتے ہیں اور جب اچانک جنگ کا یہ معاملہ بہت ہی شدید پیش آ گیا اور صورت حال انتہائی نازک ہو گئی تو انصار سے دریافت کرنا از بس ضروری تھا کہ اس حالت میں بھی وہ مدینہ سے باہر معرکہ آرائی کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔

بہر حال بخاری، نسائی، ترمذی اور دیگر کتب حدیث میں مذکور غزوة بدر سے متعلق روایات کے خلاف مسلم کی روایت انس رضی اللہ عنہ کے آخری ٹکڑوں میں جو کچھ بھی مذکور ہے وہ سب اسی مشورہ سے متعلق ہے جو وادی ذفران میں مدینہ سے باہر ہوا تھا اور تمام صحیح روایات کے خلاف یہ راوی کا وہم ہے کہ اس نے پہلے ٹکڑے کے ساتھ دوسرے ٹکڑوں کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ گویا یہ سب کچھ ابوسفیان کے قافلہ کے وقت ہی پیش آیا تھا اور اس پر بھی مستزاد یہ کہ اس روایت میں کفار قریش سے جنگ کا اشارہ تک بھی نہیں ہے کہ مولانا کے لیے دلیل ہو سکے بلکہ ابوسفیان کے قافلہ ہی کا مذکور ہے اس لیے مولانا کو پھر اس روایت کے ٹکڑوں کو بھی اپنے



موافق بنانے میں تکلفات کرنے پڑتے ہیں۔

اسی طرح مولانا نے مرحوم کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے استناد بھی صحیح نہیں جس میں بدر کے واقعہ کا ان الفاظ میں ذکر ہے:

عن علی رضي الله تعالى عنه قال لما قدمنا المدينة اصبنا من ثارها فاجتونا واصابتنا بها و عك و كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشركين قد اقبلوا سار رسول الله صلى الله عليه وسلم الى بدر و بدر بئر فسبقنا على المشركين اليها. (الحديث)

”حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج تھے اس لیے ہم بیمار ہو گئے، آنحضرت ﷺ بدر کو پوچھا کرتے تھے، جب ہم کو خبر ملی مشرکین آ رہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ بدر کو چلے بدر ایک کنویں کا نام ہے جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔“

یہ روایت طویل ہے مگر اس میں ابتدائی واقعات کو نظر انداز کر کے صرف معرکے کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ چنانچہ اس میں نہ مدینہ کے اندر مشورہ کا ذکر ہے نہ بعض مسلمانوں کی کراہت اور گرانی کا تذکرہ ہے اور نہ مہاجر و انصار کی ولولہ انگیز تقاریر مذکور ہیں حتیٰ کہ مسلمانوں کی تعداد اور بے سروسامانی تک کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے اور اس پر طرہ یہ کہ مدینہ کی آمد کے وقت مہاجرین کی ناموافق آب و ہوا کے بعد ہی متصل بدر کے واقعہ کا ذکر شروع کر دیا گیا ہے حالانکہ اس درمیان میں کتنے سرایا اور دوسرے اہم واقعات پیش آچکے تھے جو کتب احادیث میں بسند صحیح منقول ہیں۔

پس اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اس بات کے لیے سند ہو سکتی ہے کہ اس میں قافلہ کے لیے نکلنے کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ مشرکین مکہ سے جنگ کا ہی ذکر ہے تو بلاشبہ یہ روایت اس شخص کے لیے ہی سند ہو سکتی ہے جو بدر کے معرکے سے متعلق ان تمام ابتدائی واقعات کا انکار کر دے جس کا اس روایت میں ذکر موجود نہیں حالانکہ قرآن اور دوسری روایات میں بصراحت وہ واقعات مذکور ہیں۔

روایت و درایت کا مسلمہ اصول ہے کہ جب ایک ہی واقعہ سے متعلق مفصل و مجمل دونوں قسم کی روایات بسند صحیح موجود ہوں تو ہمیشہ مجمل کی تفصیل و تشریح، مفصل ہی کے ذریعہ کی جائے گی اور اگرچہ بہت سے مقامات پر مولانا بھی اس کو تسلیم فرماتے ہیں مگر یہاں نہ معلوم کیوں نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔

تفصیل و اجمال کی اس حقیقت کے پیش نظر ابن جریر رضی اللہ عنہ نے اپنی تاریخ میں، امام احمد رضی اللہ عنہ نے مسند میں ابن ابی شیبہ رضی اللہ عنہ نے مصنف میں اور بیہقی رضی اللہ عنہ نے دلائل میں بدر کی مفصل و مجمل روایات کے ضمن میں اس روایت کو بھی نقل کر دیا ہے اور جن روایات میں قافلہ کا تذکرہ ہے اور جن میں نہیں ہے ان سب کو بیان کر کے ایک دوسرے کے متضاد نہیں سمجھا۔

مصنف سیرۃ النبی قرآن اور احادیث سے استشہاد کے بعد واقعہ کے بعض پہلوؤں سے عقلی استشہاد کرنا چاہتے ہیں جو قابل

توجہ ہیں:

① رسول اللہ ﷺ نے بدر سے قبل جس قدر سرایا بھی بھیجے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی انصار کو نہیں بھیجا۔ پس اگر مدینہ میں



ہی مشورہ نہ ہوا ہوتا تو کاروان تجارت کے مقابلہ میں بھی انصار نہ نکلتے حالانکہ وہ مہاجرین سے زیادہ تعداد میں نکلے یعنی کل فوج (۳۰۵) تھی جن میں (۷۰) مہاجرین تھے باقی سب انصار۔

لیکن یہ استشہاد بھی اس لیے درست نہیں ہے کہ کاروان تجارت کا یہ معاملہ چونکہ زیادہ اہم نہیں تھا اور دشمن میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی اس لیے نبی اکرم ﷺ نے یہ چاہا کہ اس سلسلہ میں جو مال غنیمت ہاتھ آئے اس میں انصار کا بھی حصہ ہو مگر عقبی میں انصار کے معاہدہ کے پیش نظر ضرورت تھی اس بات کی کہ ان سے مشورہ لیا جائے کہ وہ نکلنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ کاروان تجارت کے سلسلہ میں مدینہ کے اندر ہی مشورہ کیا گیا تھا جس میں انصار نے بخوشی رفاقت کو منظور کیا تھا۔ چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے بسند یہ روایت کی ہے:

لما سمع رسول الله ﷺ ما يبئس ما يبئس من السفين مقبلاً من الشام ندب المسلمين اليهم وقال هذا عير قریش فيها اموالهم فاخرجوا اليها لعل الله ينفلكموها فاتتدب الناس فخلف بعضهم و ثقل بعض و ذلك انهم لم يظنوا ان رسول الله ﷺ لم يلقى حرباً.

”نبی اکرم ﷺ نے جب ابوسفیان کی شام سے آمد کا حال سنا تو مسلمانوں کو کاروان ابوسفیان کے لیے پکارا اور فرمایا ”یہ قریش کا کاروان ہے اس میں ان کا مال تجارت ہے پس اس کے لیے نکلو کیا تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ مال غنیمت تمہارے ہاتھ لگا دے پس لوگ تیار ہو گئے بعض نے تو اس مقابلہ کو پسند کیا اور بعض کو نکلنا شاق گزرا کیونکہ ان کو یہ خیال ہی نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس سفر میں جنگ سے دوچار ہوں گے۔“

اس روایت کا جملہ ((لعل الله ينفلكموها)) اور ((لم يظنوا ان رسول الله ﷺ لم يلقى حرباً)) صاف پتہ دے رہے ہیں کہ انصار اس مرتبہ اس لیے مدینہ سے نکلے کہ جنگ کا اندیشہ نہیں تھا اور کثیر مال غنیمت کی توقع تھی اور اسی بنا پر نبی اکرم ﷺ نے اس مرتبہ ان کو ہمراہ لینے کا ارادہ فرمایا۔

④ ابوسفیان کا کاروان تجارت جب شام سے روانہ ہو کر حدود مدینہ و شام سے نکل گیا اور مکہ کی راہ پر پڑ گیا تب نبی اکرم ﷺ کو جاسوسوں نے اطلاع دی اس سے قبل اطلاع نہ ہو سکی۔ لہذا مولانا نے مرحوم کا یہ عقلی استدلال واقعہ کی اصل حقیقت کو نہیں بدل سکتا کہ مکہ سے شام کو جو قافلہ تجارت جاتا تھا وہ مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا اس لیے شام سے آنے والے قافلہ کے لیے آپ ﷺ کو شام کی جانب بڑھنا چاہیے تھا نہ کہ مکہ کی جانب جہاں قریش کے اثرات زیادہ تھے۔

اس کے بعد مولانا نے جمہور کے مسلک کو پیش نظر رکھ کر پانچ دفعات میں اپنی جانب سے واقعہ بدر کے اسباب کی ایسی ترتیب دی ہے کہ جس پر مولانا کو آخر میں یہ کہنے کا موقع مل سکا:

”کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوش عداوت اور رسول اللہ ﷺ کی شان نبوت کے موافق ہے۔“

مولانا نے مرحوم بہترین ادیب ہیں اور وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی اچھے سے اچھے واقعہ کو بھی اگر مخالفانہ رنگ دینے کی کوشش کی جائے تو اس کو الفاظ کی تعبیرات میں بھیانک سے بھیانک رنگ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔



مسئلہ طلاق، نکاح بیوگان، تعدد ازدواج جیسے مسائل کے متعلق عیسائی پادریوں اور ہندو آریہ سماجیوں نے جن توہین آمیز اور مضحکہ خیز تعبیرات میں رنگ کر اپنے معتقدین کے سامنے پیش کیا ہے وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں مگر آج کی دنیا تہذیب و تمدن میں جب انہی عیسائیوں اور ہندوؤں نے سینکڑوں اور ہزاروں سال کے تجربہ کے بعد یہ یقین کر لیا کہ سوسائٹی کا ”معاشرتی نظام“ رحمۃ للعالمین کے لائے ہوئے قانون کو اختیار کیے بغیر صحیح نہیں ہو سکتا، تو آج وہ پارلمنٹ کونسل اور اسمبلیوں کے ذریعہ ان ہی قوانین طلاق، نکاح بیوگان وغیرہ کو اپنی معاشرت میں شامل اور ان امور کے جواز کے لیے بہتر سے بہتر عقلی دلائل و ادبی تعبیرات اختیار کر رہے ہیں۔

پس غزوہ بدر کیوں پیش آیا؟ اس کے لیے جمہور نے با اتفاق تاریخ و سیرت یہی کہا ہے کہ مسلمانوں کا مدینہ میں محفوظ رہ کر تبلیغ اسلام کرنا مشرکین کو کسی طرح برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں شروع کر دی تھیں کہ اس اثناء میں ”سریہ عبداللہ بن جحش پیش آ گیا، جس میں ان کا مشہور سردار عمرو بن حضرمی قتل ہو گیا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کيسان جیسے بہادر سردار قید ہو گئے اس بناء پر کفار مکہ کو اشتعال آ جانا ایک فطری بات تھی۔ چنانچہ مشہور محدث ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں اس سریہ کا عنوان ہی یہ قائم کر دیا ہے:

”باب سریة عبداللہ بن جحش التي كانت سببا لغزوة بدر العظيمة وذلك ﴿يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّقِي الْجَمْعِ﴾<sup>۱</sup>  
وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱﴾

ابھی یہ اشتعال بڑھ ہی رہا تھا کہ ابوسفیان کے کاروان تجارت کا قصہ مزید پیش آ گیا جو دراصل کاروان تجارت نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کے استیصال کا وہ ”سرمایہ“ تھا جس کے گھمنڈ پر قریش یقین کیے بیٹھے تھے کہ جوں ہی وہ مکہ میں بحفاظت تمام پہنچ جائے گا سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں کے خاتمہ کا سامان ہاتھ آ گیا۔

تو اب خود ہی انصاف کیجئے کہ اس میں کون سی بات ایسی ہے جو نبی اکرم ﷺ کی شان نبوت کے خلاف اور قریش کے جوش عداوت کے منافی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے آرنلڈ<sup>۲</sup> کی رہنمائی کے لیے یا اس کی تقلید میں اس واقعہ کے تمام نقشہ کو جمہور کے خلاف اس لیے پلٹنے کی سعی فرمائی ہے کہ وہ وقت کے عیسائی مستشرقین کے اس اعتراض سے مرعوب ہو گئے ہیں کہ ”قافلہ کا لوٹنا انتہائی معیوب بات ہے“ لہذا جو شخص نبوت کا مدعی ہو وہ کیسے ایسا فعل کر سکتا ہے حالانکہ یہ بات مرعوب ہونے کی نہیں تھی بلکہ ضرورت تھی اس امر کی کہ ان تاریخی اسباب و وسائل کو روشنی میں لایا جائے جن کے پیش نظر مشرکین مکہ کے کاروان تجارت کو روکنا اور ان پر قابض ہونا لوٹ کھسوٹ نہیں بلکہ جنگی نقطہ نظر اور مسلمانوں کی جماعتی بقاء و حفاظت کے اعتبار سے از بس ضروری تھا۔

صورت حال یہ تھی کہ مکہ کے قیام میں نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں پر تیرہ سال مسلسل مشرکین مکہ نے جو مظالم کیے ان پر صبر و ضبط کے بعد جب مدینہ کو ہجرت کر گئے تب بھی ان مشرکین نے مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیا اور جنگ و جدل اور سازشی مکر و فریب میں لگے رہے۔ چنانچہ ابوداؤد میں ہے:

۱ آرنلڈ نے بھی غزوہ بدر کے متعلق انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔



ان کفار قریش کتبوا الی ابن ابی و من کان یعبد معہ الاوثان من الاوس والخزرج رسول اللہ ﷺ  
یومئذ بالمدینۃ قبل وقعة بدر انکم آیتم صاحبنا و انا نقسم باللہ لتقاتلنہ او لتخرجن او نسیرن الیکم  
باجعینا حتی نقتل مقاتلتکم ونستبیح نساءکم۔ (الحديث باب فی خبر النضیر)  
”نبی اکرم ﷺ مدینہ میں تشریف لے آئے تھے کہ بدر کے واقعہ سے بہت پہلے کفار قریش نے عبد اللہ بن ابی اور اس کے  
بت پرست ساتھیوں کو جو اوس اور خزرج میں باقی رہ گئے تھے یہ لکھا کہ تم نے ہمارے صاحب کو پناہ دی ہے اور ہم خدا کی  
قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم ان سے لڑو یا ان کو نکال دو ورنہ تو ہم سب تم پر چڑھ آئیں گے اور تمہارے جوانوں کو قتل کریں  
گے اور تمہاری عورتوں کو باندیاں بنا لیں گے۔“

پھر معاملہ دھمکیوں تک ہی نہیں رہا بلکہ کاروان تجارت کی آمد و رفت کے پردہ میں منافقین اور یہود مدینہ سے برابر مسلمانوں  
کے استیصال کے لیے مختلف تدابیر پر خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ اب کاروان تجارت کا مقصد محض  
تجارتی کاروبار تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ نفع کے حصول کو مسلمانوں کے مقابلہ کی تیاریوں پر صرف کرنا نصب العین بنا لیا گیا۔  
ایسی حالت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ دشمن کو اپنے خلاف اور اپنے استیصال کے لیے سازش کرنے کے مقابلہ کی  
تیاریوں میں مشغول رہنے کاروان تجارت کے ذریعہ مدینہ میں مقیم دشمنوں کے ساتھ مشرکین مکہ کو معاندانہ خط و کتابت جاری رکھنے اور  
خود کاروان تجارت کے ذریعہ اپنے استیصال کے لیے سرمایہ فراہم کرنے دینے کے لیے آزاد چھوڑ دینا اور اس طرح ہمیشہ کے لیے اپنا  
خاتمہ کرا لینا یا ان تمام ذرائع کا سدباب کر کے فتنہ کا سرکچل دینے کی کوشش کرنا؟

لہذا مسلمانوں نے وہی کیا جو عقل، تدبیر، سیاست، اخلاق مدن کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ واجب اور ضروری تھا، یہی وہ  
امور تھے جن کی جانب ارباب سیر و تاریخ نے بھی توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے سریہ ”سریہ حمزہ“ کے متعلق (جو کہ مشرکین کے  
کاروان تجارت کے روکنے کے لیے نکلا تھا) زرقانی شرح مواہب میں تحریر فرماتے ہیں:

فخرجوا یعترضون عینا لقریش جاءت من الشام ترید مکتة ای یعترضون لها لیمنعوها من مقصدها  
باستیلائہم.... الخ (جلد ۱ ص ۴۵۲)

”پس وہ نکلے کہ قریش کے کاروان تجارت کے درپے تھے جو شام سے مکہ جا رہا تھا یعنی وہ یہ چاہتے تھے کہ جس مقصد کے  
لیے یہ کاروان تجارت آ جا رہے ہیں ان پر غلبہ کر کے اس مقصد کو پورا نہ ہونے دیں۔“

اور ابوسفیان کے جس کاروان تجارت کے واقعہ سے بدر کے معرکہ کا تعلق ہے اس کے متعلق تو تمام ارباب سیر و تاریخ متفق  
ہیں کہ قریش کے اندر مسلمانوں کے استیصال کا جوش و خروش اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ جب ابوسفیان کا کاروان تجارت مکہ سے چلا ہے  
تو کوئی قریشی اور قریشیہ باقی نہیں رہی تھی جس کے پاس ایک مثقال بھی موجود تھا کہ اس نے اپنا اس المال کاروان کے حوالہ نہ کر دیا  
ہو۔ زرقانی میں ہے:

کان فیہا خمسون الف دینار و کان لم یبق قرشی ولا قرشیة لہ مثقال الابعث بہ فی العید۔ (جلد ۱ ص ۴۷۶)  
”کاروان تجارت کے ساتھ پچاس ہزار دینار سرخ تھے اور کوئی قرشی و قریشیہ نہ جس کے پاس ایک مثقال بھی موجود تھا ایسے



نہیں تھے کہ جس نے قافلہ میں اپنا اس المال نہ لگایا ہو۔“

ابوسفیان کا یہ کاروان صرف کاروان تجارت ہی نہ تھا بلکہ سامان حرب و ضرب کے لیے بنیاد کار تھا اس کا اندازہ ابو جہل کے اس قول سے بھی ہوتا ہے جو قافلہ کے گھر جانے پر اس نے قرشیوں کو مشتعل کرتے ہوئے کہا:

النساء النجاء علی کل صعب و ذلول غیر کم اموالکم ان اصابہا محمد (ﷺ) لم تفلحوا بعدھا ابداً.  
”نجات حاصل کرو انتہائی مصیبت و ذلت سے نجات حاصل کرو کاروان تجارت کاروان نہیں ہے تمہارے مال و دولت کا ذخیرہ ہے اگر محمد (ﷺ) اس پر قابض ہو گئے تو پھر تم ہمیشہ کے لیے ناکام و نامراد ہو کر رہ جاؤ گے۔“

کیا ابو جہل کا یہ خطرہ محض کاروان تجارت کے لٹ جانے پر ہو سکتا تھا؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ تجارت کا کاروان نہیں ہے بلکہ سامان جنگ کی وہ ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی حفاظت کی خاطر آج کی مہیب جنگوں میں فیصلہ کن لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔ تو اب انصاف فرمائیے کہ اس قسم کے کاروان تجارت پر حملہ کر کے دشمن کی تجارت کا سدباب کرنا کون سا گناہ تھا جس کے لیے ہم دوسروں کی ہرزہ سرائی سے مرعوب ہو کر حقائق کا انکار کرنے لگیں۔

مولانا کو یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ زر و مال کے حاجت مند انصار سے زیادہ مہاجرین تھے تو پھر نبی اکرم ﷺ کی اس رفاقت میں مہاجرین کے مقابلہ میں انصار کیوں زیادہ تعداد میں تھے سوان احتمالات عقلی کا باب تو اس درجہ وسیع ہے کہ جس قدر جی چاہے وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جائیے ورنہ بات صاف ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے رجحان طبع نے صورت ہی ایسی پیدا کر دی کہ انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ ہو گئی ورنہ شاید حالت برعکس ہوتی البتہ مولانا کی توجیہ کے خلاف یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر مدینہ ہی میں جنگ کے لیے مشورہ ہوا تھا تو پھر مہاجرین جو انصار کے بغیر بھی اب تک مختلف غزوات و سرایا میں سر بکف میدان جنگ میں جاتے رہے تھے آج اس عظیم الشان غزوہ میں انصار کے مقابلہ میں کیوں پیچھے رہے۔

اس موقع پر بار بار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی تقریر کا حوالہ دینا بھی اس لیے غیر موزوں ہے جبکہ ہم محدثین سے یہ نقل کر چکے کہ مسلم کی حدیث میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا نام راوی کا وہم ہے اور دراصل ان کی یہ تقریر حدیبیہ کے موقع پر ہوئی تھی نہ کہ معرکہ بدر کے موقع پر۔

مولانا نے مرحوم نے سیرت النبی میں طبری کے حوالہ سے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے ”جس کو ہم گذشتہ صفحات میں نقل کر آئے ہیں اور جو یہ ثابت کرتی ہے کہ مدینہ میں ابوسفیان کے قافلہ سے متعلق جو مشورہ ہوا تھا اس میں بعض مسلمان اس لیے نکلتے ہوئے کسماتے رہے کہ جنگ کا معاملہ نہیں ہے صرف قافلہ کا معاملہ ہے۔“ یہ تنقید فرمائی ہے:

”لیکن یہ واقعات صریح آیات قرآن کے خلاف ہیں قرآن مجید میں بہ تصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسماتے تھے وہ عدم ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔“  
مگر تنقید فرماتے ہوئے مولانا کو یہ بات فراموش ہو گئی کہ انہوں نے جمہور کے خلاف کوئی دلیل نہیں پیش فرمائی بلکہ جو دعویٰ تھا وہی دلیل بنا کر پیش کر دیا گیا اس لیے جمہور کا دعویٰ مع دلیل تو یہ ہے کہ قرآن عزیز کی زیر بحث آیات مدینہ کے مشورہ سے متعلق ہی



نہیں ہیں بلکہ وادی ذفران کے مشورہ سے متعلق ہیں جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مدلل خود قرآن سے ہی ثابت کیا جا چکا ہے اور اس روایت میں جس مشورہ کا ذکر ہے وہ قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ البتہ احادیث و روایات سیر میں بسند صحیح منقول ہے لہذا دونوں مواقع پر کسمانے کی وجوہ جدا جدا تھیں اور قرآن نے اس پورے واقعہ کے ان ہی خاص اجزاء کو بیان کرنا مناسب سمجھا جو مسلمانوں کی بے سروسامانی اور دشمن کی قوت اور پھر مسلمانوں پر خدا کی نصرت کے نزول سے تعلق رکھتے ہیں۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ مدینہ سے ایک میل پر پہنچے تو لشکر کا جائزہ لیا، ابن عمر رضی اللہ عنہما اس زمانہ میں کمن تھے لہذا ان کو واپس کر دیا۔ \* اس سے بھی مولانا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ مدینہ سے قافلہ کے مقابلہ کے لیے نہیں بلکہ کفار مکہ سے جنگ کے لیے ہی نکلے تھے اور نہ تو ایسے نوخیز لڑکے قافلہ کو لوٹنے میں زیادہ مفید ثابت ہو سکتے تھے مگر یہ بھی مولانا کا محض قیاس ہی قیاس ہے اس لیے کہ قافلہ کے مقابلہ میں اگرچہ کسی بڑی جنگ کی توقع نہیں تھی، مگر بہر حال معمولی جنگ کا خطرہ تو موجود ہی تھا کیا ابوسفیان اور اس کے تیس چالیس بہادر قریشی ایک ہزار اونٹ پر لدا ہوا سامان آسانی سے حوالہ کر دیتے یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ پس اگر معمولی جنگ کا خطرہ بھی تھا تو نو عمر لڑکوں کو واپس کر دینا اس کے لیے کس طرح دلیل بن سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ شروع ہی میں قافلہ کے مقابلہ کو نہیں بلکہ کفار مکہ سے فیصلہ کن جنگ کے لیے نکلے تھے۔

اسی طرح استیعاب میں سعد بن خثیمہ کا جو واقعہ مذکور ہے اس سے بھی مولانا کا مقصد حل نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اگر باپ کی فرمائش پر بیٹے نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنی بجائے باپ کو اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نکلنے دے تو اس سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ اگر مسلمان مدینہ سے قافلہ پر حملہ کے لیے نکلے تو اس یقین کے ساتھ نکلے تھے کہ ان میں سے کسی ایک شخص کو بھی چشم زخم نہیں پہنچے گا اور سب ہی صحیح سالم واپس آ جائیں گے۔ تو بد قسمتی سے عیسائی مستشرقین سے مرعوب ہو کر ہم نے بزعم خود یہ تصور کر لیا کہ قافلہ پر حملہ کے معنی گویا ڈاکوؤں کا قافلہ لوٹنے کے مترادف ہے۔

مسلمان تو جب بھی دشمنوں کے مقابلہ کو نکلے خواہ وہ براہ راست جنگ کے ارادے سے نکلے ہوں یا دشمن کو دوسرے معاملات میں زک دینے ہمیشہ جہاد اور شہادت ہی کے نقطہ نظر سے نکلتے تھے اور مال غنیمت تو ان کے لیے خدا کا مزید فضل و احسان تھا جو کبھی بغیر جنگ ہی ہاتھ آ گیا اور کبھی خون میں نہانے کے بعد حاصل ہوا۔

اب ہم مصنف سیر النبی ﷺ کے غزوہ بدر کے متعلق ان تمام دعاوی و شبہات پر تحقیقی نظر ڈالنے کے بعد جو جمہور کے خلاف ان کی جانب سے پیش کیے گئے ہیں صرف ایک سوال پر اس بحث کو ختم کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ اگر معرکہ بدر میں ابتداء ہی سے یہ بذریعہ وحی بتا دیا گیا تھا کہ خدا کی مرضی معرکہ حق و باطل کی ہے اور قافلہ پر حملہ کرنے یا بقول مولانا کے ”قافلہ لوٹنے“ کا تصور و تخیل گناہ عظیم اور شان اسلام کے خلاف ہے تو آخر جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسا تصور قائم ہی کیوں کیا اور اگر کیا بھی تھا تو قرآن نے ﴿إِحْدَى الظَّالِمَاتِينَ﴾ کا وعدہ کر کے اس گناہ عظیم کے تصور کی حوصلہ افزائی کیوں کی اور کیوں صاف صاف یہ نہیں کہہ دیا کہ خدائے تعالیٰ ایک لمحہ کے لیے بھی تم کو قافلہ پر قابو پانے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اس کا تصور بھی گناہ عظیم ہے البتہ اس کا وعدہ کرتا ہے



کہ تم کو دشمنوں پر قابو دے گا اور تم کامیاب ہو گے تو کیا پھر قرآن عزیز کا ﴿إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ﴾ کا اس طرح ذکر کرنا اس امر کی صاف شہادت نہیں ہے کہ معرکہ بدر سے قبل ضرور چند اکابرین اسلام کی یہ مٹھی بھر جماعت قافلہ کے لیے نکلی تھی مگر اچانک جب کفار مکہ سے سابقہ پڑ گیا اور مسلمانوں نے بے سرو سامانی کو دیکھ کر قافلہ پر قبضہ چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اول یہ وعدہ دیا کہ ان دونوں ”عمیر و نفیر“ میں سے ایک تم کو ضرور دیں گے اور پھر نبی اکرم ﷺ کو بذریعہ وحی یہ اطلاع کر دی کہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ وہ اب قافلہ کی بجائے معرکہ حق و باطل میں مسلمانوں کو کامیابی عطا کر کے ہمیشہ کے لیے تاریخ ظلم کا رخ عدل کی جانب پھیر دینے والا ہے۔

الحاصل قرآن و حدیث اور تاریخی حقائق کی روشنی میں معرکہ حق و باطل ”غزوہ بدر“ کے متعلق جمہور علماء اسلام کا مسلک ہی صحیح ہے اور بلاشبہ واقعات کی صحیح و مستند تفصیلات کسی طرح بھی شان نبوت کے خلاف نہیں اور نہ علم الاخلاق و علم الاجتماع اور حق و صدق پر مبنی سیاسیات مدن کے منافی ہیں۔ ”ہذا هو الحق و الحق احق ان يتبع“۔





## غزوة أحد

**أحد:**

أحد مدینہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے، یہ مدینہ منورہ سے جانب جنوب تقریباً دو میل (ایک فرسخ) پر واقع ہے۔

**غزوة أحد:**

یہی وہ مقام ہے جہاں شوال ۳ھ مطابق جنوری ۶۲۵ عیسوی میں مسلمانوں اور مشرکوں کے مقابلہ میں معرکہ حق و باطل گرم ہوا، اس لیے اس کا نام غزوة "أحد" ہے۔

غزوة أحد بھی بہت اہم غزوة ہے اور اپنی تفصیلات و جزئیات کے اعتبار سے اپنے دامن میں عبرت و موعظت کا بے شمار ذخیرہ رکھتا ہے، اس غزوة کے تفصیلی حالات کتب حدیث و سیرت اور تفاسیر قرآن حکیم میں مکمل طور پر مذکور ہیں۔

ان حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ بدر میں جو زخم قریش کو لگ چکا تھا اس نے ناسور کی شکل اختیار کر لی تھی، کیونکہ بدر کے واقعہ ہانکہ سے قریش کا ہر گھرماتم گسار اور عرب کے مشرک قبائل نوحہ خواں تھے ابوسفیان نے تو قسم کھالی تھی کہ جب تک بدر کا انتقام نہ لے لوں گا نہ غسل کروں گا، نہ تبدیل لباس عکرمہ بن ابوجہل اور دوسرے نوجوانوں کی تقریریں اور عورتوں کی نوحہ خوانی قریشیوں اور قبائل عرب کو غیرت اور اشتعال دلا کر جنگ کے لیے آمادہ کر رہی تھیں اور اس طرح ابوسفیان کی سرکردگی میں تین ہزار نبرد آزما سوراؤں کا لشکر جرار مکہ سے مسلمانوں کو مٹانے کے لیے نکلا اور أحد کے سامنے آ کر خیمہ زن ہو گیا۔ نبی اکرم ﷺ کو جب ابوسفیان کی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا، عمر رسیدہ اور تجربہ کار صحابہ نے یہ رائے دی کہ ہم کو باہر نکل کر جنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مفید طریقہ یہ ہے کہ ہم مدینہ کے اندر ہی دشمن کا انتظار کریں اور جب وہ مدینہ پر حملہ آور ہو تو اس کا پر زور مقابلہ کریں، ہمارے اس طرز عمل سے اول تو دشمن کو جرأت ہی نہ ہوگی کہ مدینہ پر حملہ آور ہو، اور اگر اس نے اقدام کیا تو بلاشبہ شکست فاش اٹھا کر راہ فرار اختیار کرے گا، مگر ان صحابہ رضی اللہ عنہم کو جو بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے اور بدر کی فضیلت کو اس وقت حاصل کرنا چاہتے تھے، یہ رائے پسند نہیں آئی اور نوجوانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور اکثریت کی رائے یہ قرار پائی کہ ہم کو دشمنوں کا مقابلہ میدان میں نکل کر ہی کرنا چاہیے، نبی اکرم ﷺ نے جب اکثریت کا رجحان یہ پایا تو اس پر صاف فرما کر حجرہ میں تشریف لے گئے تو تجربہ کار اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے اصغر کو ان کی رائے پر ملامت کی کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے رجحان کے خلاف کیوں اپنی آزادانہ رائے سے آپ ﷺ کو پریشان کیا، چنانچہ جب آپ ﷺ باہر تشریف لائے تو ان نوجوانوں اور شیخ اسلام کے پروانوں نے اپنی رائے پر

ہم نے زیادہ حصہ فتح الباری ج ۷ سے لیا ہے اور باقی سیرت حلبیہ اور زرقانی اور تاریخ ابن کثیر سے۔



اظہارِ ندامت کیا اور عرض کیا آپ ﷺ مدینہ ہی کے اندر دشمن کا مقابلہ کریں یہی مناسب ہے۔ یہ سن کر حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”نبی کی شان کے یہ خلاف ہے کہ جب خدا کی راہ میں ہتھیار سج کر تیار ہو جائے تو پھر معرکہ حق و باطل کے بغیر ہی ان کو اتار دے، اب خدا کا نام لے کر میدان میں نکلو۔“

نبی اکرم ﷺ جب مدینہ سے نکلے تو ایک ہزار کا لشکر جلو میں تھا، اس لشکر میں تین سو منافقین عبد اللہ بن ابی کی سرکردگی میں ہمراہ تھے، یہ مدینہ ہی میں مشرکین مکہ کے ساتھ سازش کر چکے تھے کہ مخلص مسلمانوں کو بزدل بنانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کریں گے کہ اول مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ نکلیں گے اور راہ سے ہی ان سے کٹ کر مدینہ واپس آ جائیں گے، چنانچہ راس المنافقین یہ بہانہ کر کے لشکر اسلام سے کٹ کر جدا ہو گیا اور مدینہ واپس آ گیا کہ جب نبی اکرم ﷺ نے ہم جیسے تجربہ کاروں کی بات نہ مان کر الٹے نوجوانوں کی رائے کو ترجیح دی تو ہم کو کیا ضرورت ہے کہ مخواہ مخواہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالیں۔

مگر منافقین کا مقصد پورا نہ ہوا اور ان فداکارانِ اسلام پر ان کی مراجعت کا مطلق کوئی اثر نہ پڑا اور ایسے جانباز اور شارانِ اسلام پر اثر ہی کیا پڑتا جن کے بچوں کی جانبازی اور اسلام پر فداکاری کا جذبہ اور ولولہ یہ ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ سے باہر جب لشکر اسلام کا جائزہ لیا اور صغیر السن لڑکوں کو واپسی کا حکم دیا تو رافع بن خدیج جو ابھی نو عمر ہی تھے یہ دیکھ کر بچوں کے بل کھڑے ہو گئے کہ دراز قد بن کر جنگ کے سپاہی رہ سکیں۔ چنانچہ ان کی تدبیر کارگر ہو گئی۔ اسی طرح جب سمرہ بن جندب صغیر سن شمار کر لیے گئے تو رونے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ اگر رافع شریک جنگ ہو سکتا ہے تو میں کیوں خارج کیا جا رہا ہوں جبکہ میں رافع کو کشتی میں پھچاڑ دیا کرتا ہوں، آخر دونوں کی کشتی کرائی گئی۔ اور سمرہ نے رافع کو پھچاڑ دیا اور مجاہدین میں شامل کر لیے گئے، البتہ مسلمانوں کے دو قبیلے بنو سلمہ، بنو حارثہ میں کچھ بددلی سی پیدا ہو چلی تھی مگر فداکار مسلمانوں کے جوش و ولولہ کو دیکھ کر ان کی ہمت بھی بلند ہو گئی۔ غرض اس ولولہ اور جذبہ کے ساتھ مجاہدین کا لشکر اُحد پہنچا اور دونوں صفیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئیں۔ نبی اکرم ﷺ نے لشکر اسلام کو اس طرح صف آرا کیا کہ اُحد کو پس پشت لے لیا اور پچاس تیر اندازوں کو حضرت عبد اللہ بن جبیر کی کمان میں پہاڑ کی ایک گھاٹی پر مقرر فرما دیا کہ فتح و شکست کسی حال میں بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کریں تاکہ پشت کی جانب سے دشمن حملہ آور نہ ہو سکے۔ اب جنگ شروع ہو گئی اور دونوں صفیں بالمقابل نبرد آزما ہو کر جو ہر شجاعت دکھانے لگیں، ابھی جنگ کو کچھ زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ مسلمانوں کا پلہ بھاری ہو گیا اور مشرکین مکہ کا لشکر درہم برہم ہو کر بھاگنے لگا، نبرد آزما مسلمانوں نے جب مالِ غنیمت جمع کرنے کا ارادہ کیا تو تیر اندازوں سے صبر نہ ہو سکا اور وہ گھاٹی چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ کمان افسر حضرت عبد اللہ بن جبیر نے ہر چند روکا۔ اور فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو، مگر انہوں نے یہ کہہ کر جگہ چھوڑ دی کہ آپ کا حکم جنگ تک محدود تھا اب جبکہ جنگ ختم ہو گئی تو خلاف ورزی کیسی؟ حصولِ غنیمت کے شوق نے ادھر مسلمان تیر اندازوں سے جگہ خالی کرادی۔ ادھر خالد بن ولید (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) اپنے جنگی دستہ کے ساتھ میدانِ خالی دیکھ کر گھاٹی کی جانب سے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے، اب مسلمان گھبرائے اور اس اچانک حملہ سے ان کے پیر اکھڑ گئے اور اس طرح فتح و نصرت یک بیک شکست سے بدل گئی۔ اگرچہ نبی اکرم ﷺ کے گرد و پیش ابو بکر، عمر علی، طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہم جیسے فداکار موجود تھے، تاہم مسلمانوں کے فرار سے دشمنوں کو موقع مل گیا اور ایک شقی ازلی نے نبی اکرم ﷺ کے پتھر کھینچ کر مارا جس سے آپ کا ایک دندان مبارک شہید ہو گیا، آپ پتھر کے صدمہ سے قریب کی ایک گھاٹی



میں گر گئے، ابھی آپ سنبھلے بھی نہ تھے کہ ایک مشرک نے پکار دیا ان محمداً قدمات۔ محمد (ﷺ) کا انتقال ہو گیا۔ اس آواز نے مسلمانوں میں اور زیادہ انتشار اور سخت بے چینی پیدا کر دی مگر مسلمان فوراً سنبھلے اور ثابت قدم صحابہ رضی اللہ عنہم نے لکارا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اب ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے آؤ اور جنگ کا فیصلہ کر کے دم لو؟ اس صدائے حق نے مسلمانوں کے دل میں غیرت کا جذبہ پیدا کر دیا، وہ سب پلٹ پڑے اور حملہ آور ہونے کی غرض سے سمٹ کر یکجا ہو گئے، مگر نقشہ جنگ بدل چکا تھا اور قریش اپنی کامیابی پر نازاں ہو کر میدان سے الگ ہو چکے تھے مسلمانوں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو جلوہ جہاں آراء پر نظر پڑتے ہی ان کے دل میں بھی سکون پیدا ہو گیا اور پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہو گئے، غار میں گر جانے سے خود سر میں گھس گیا اور زرہ کی کڑیوں کی زد سے چہرہ مبارک اور بازووں پر بھی ہلکے زخم آ گئے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خود کو سر سے نکالا اور زخموں کو دھویا اور بور یا جلا کر راکھ کو زخم کے اندر بھر دیا، جس سے خون بند ہو گیا۔

### حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت:

اس غزوہ میں ستر مسلمان شہید اور بہت سے زخمی ہوئے نبی اکرم ﷺ کے حقیقی چچا دودھ شریک بھائی بے تکلف دوست اور جان نثار صحابی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت اس واقعہ کا زبردست سانحہ ہے، زبان وحی ترجمان نے ان کو سید الشہداء کا لقب عطا فرمایا۔ مشرکین مکہ نے اس جنگ میں درندوں اور خونخوار حیوانوں کی طرح مردہ نعشوں تک کے ناک کان کاٹ ڈالے اور پیٹ چاک کر کے دل و جگر کو نیزوں کی آنی سے چھید چھید کر دل کا بخار نکالا، ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے تو سید الشہداء کا جگر چاک کر کے دانتوں سے چبا ڈالا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو ایک حبشی غلام وحشی نے شہید کیا تھا جس کی خوشی میں ہندہ نے اس کو اپنا سونے کا ہار عطاء کیا۔ ابوسفیان اپنی کامیابی کی مسرت میں کہہ رہا تھا اعلیٰ ہبل اعلیٰ ہبل۔ ہبل کی جے ہو، ہبل کی جے ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم اس کے جواب میں یہ پکارو۔ اللہ اعلیٰ و اجل، اللہ اعلیٰ و اجل۔ اللہ ہی سب سے بلند و بالا اور بزرگ ہے۔ ابوسفیان نے پھر طیش میں آ کر کہا: لنا العزی و لاعزی لکم۔ ہماری مددگار عزیٰ دیوی ہے اور تمہارے پاس عزیٰ کا ہمسر نہیں ہے۔ ”حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عمر تم یہ جواب دو، اللہ مولانا و لامولی لکم۔ ہمارا والی و مددگار اللہ تعالیٰ ہے اور تمہارا کوئی بھی مددگار نہیں۔ بہر حال ابوسفیان یہ کہہ کر کہ آئندہ سال پھر بدر میں معرکہ آرائی ہوگی، اپنا لشکر لے کر واپس چلا گیا۔

### قرآن عزیز اور غزوہ احد:

مسلمانوں کا غزوہ احد کے لیے تیار ہونا، منافقین کا لشکر اسلام سے جدا ہو کر مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کی سعی کرنا، مسلمانوں کا اول خدا کی مدد سے کامیاب ہونا، اور پھر اپنی غلط کاری اور محمد ﷺ کے حکم کے خلاف ورزی کی پاداش میں شکست کھا جانا اور فتح کا شکست سے بدل جانا اور خدائے تعالیٰ کا مسلمانوں کی تسلی کرنا، ان تمام امور کو قرآن عزیز نے آل عمران میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ محمد بن اسحاق سے منقول ہے:

انزل اللہ فی شان احد ستین آية من آل عمران.



”اللہ تعالیٰ نے غزوہ احد کی شان میں آل عمران کی ساٹھ آیتیں نازل فرمائی ہیں۔“

وروی ابن ابی حاتم من طریق المسور بن مخرمۃ قال قلت لعبدالرحمن بن عوف اخبرنی عن قصتکم یوم احد قال اقرأ العشرین و مائة من ال عمران تجدها ﴿وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ الی قوله ﴿اَمَنَةٌ نُّعَاسًا﴾. (الآیات)

”اور ابن ابی حاتم نے بطریق مسور بن مخرمہ روایت کیا ہے کہ وہ کہتے تھے میں نے عبدالرحمن بن عوف سے عرض کیا، آپ غزوہ احد کا اپنا قصہ بیان فرمائیں۔ انہوں نے فرمایا: تم آل عمران کی ایک سو بیس آیات پڑھو تو تم کو سارا واقعہ معلوم ہو جائے گا۔ یہ آیات یہاں سے شروع ہو کر ﴿وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ ... اَمَنَةٌ نُّعَاسًا... الایہ پر ختم ہوتی ہیں۔“

﴿وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ وَاللَّهُ سَبِيحٌ عَلِيمٌ ﴿۱۳۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَآئِفَتْنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا ﴿۱۳۲﴾ وَ عَلٰى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۳۳﴾

(آل عمران: ۱۳۱-۱۳۳)

”اور (اے پیغمبر! قابل ذکر ہے وہ بات) جبکہ تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے (اور احد کے میدان میں) لڑائی کے لیے مورچوں پر مسلمانوں کو بٹھارہے تھے اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ پھر جب ایسا ہوا تھا کہ تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں (اور واپس لوٹ چلیں) حالانکہ اللہ مددگار تھا اور جو ایمان رکھنے والے ہیں ان کو چاہیے کہ ہر حال میں اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔“

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ ۱۳۱ ﴿إِنْ يَسْأَلْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ﴾ ۱۳۲ ﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَ يَتَّخِذُ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ ۱۳۳ ﴿﴾ (آل عمران: ۱۳۹-۱۴۰)

”اور دیکھو! نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو، تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو بشرطیکہ تم سچے مومن ہو! اگر تم نے (احد) میں زخم کھایا ہے تو دوسروں کو بھی ویسے ہی زخم (بدر میں) لگ چکے ہیں۔ دراصل یہ (ہارجیت کے) اوقات ہیں جنہیں ہم انسانوں میں ادھر ادھر پھراتے رہتے ہیں، علاوہ بریں یہ اس لیے تھا تا کہ اس بات کی آزمائش ہو جائے، کون سچا ایمان رکھنے والا ہے کون نہیں اور اس لیے کہ تم میں سے ایک گروہ کو (ان واقعات اور ایام کے نتیجوں کا) شاہد حال بنا دے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔“



## غزوة احزاب (غزوة خندق)

غزوة احزاب تمام غزوات میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے نرالا ہے، اس لیے کہ اس غزوة میں مسلمانوں کو تمام کافر جماعتوں سے بیک وقت واسطہ پڑا اور قبائل عرب، یہود اور ان کے حلیف سب کے سب جمع ہو کر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے نکلے تھے۔ اور مدینہ کے اندر بھی منافقین کا گروہ خفیہ ان کی مدد کر رہا تھا حزب کے معنی چونکہ گروہ کے ہیں اور ”احزاب“ اس کی جمع ہے۔ اس لیے یہ غزوة احزاب کہلایا، اور جب کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے مسلمانوں نے پہلی مرتبہ خندق کھود کر مدینہ کو دشمن سے محفوظ رکھنے کی تدبیر اختیار کی، اس لیے اس کو غزوة خندق بھی کہتے ہیں۔ یہ غزوة شوال ۵ھ مطابق فروری ۶۲۷ء میں پیش آیا جبکہ ابوسفیان دس ہزار پر مشتمل لشکر جرار کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کے لیے مکہ سے نکلا۔ اس واقعہ سے متعلق تاریخ و سیر کی کتابوں کے علاوہ صحیح بخاری میں بھی بہت کافی تفصیلات ملتی ہیں اور اس کے بہت سے اہم اجزا پر روشنی پڑتی ہے۔ مختصر طور پر واقعات کی تفصیل یہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو دشمنوں کی نقل و حرکت کا علم ہوا، تو حسب دستور آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا! ہم اہل فارس کا دستور یہ ہے کہ ایسے موقع پر خندق کھود کر دشمن سے خود کو محفوظ کر لیتے اور اس کو مجبور بنا دیتے ہیں، نبی اکرم ﷺ نے اس مشورہ کو قبول فرما کر خندق کھودنے کا حکم دیا اور کدال لے کر خود بھی بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ کائنات انسانی کی تاریخ میں آقا اور غلام، حاکم اور محکوم، افسر اور ماتحت، مخدوم اور خادم کے درمیان یہ پہلا منظر تھا جو آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا کہ دو جہان کا سردار ہاتھ میں کدال لیے تین دن کے فاقہ سے پیٹ پر پتھر باندھے مہاجرین و انصار کے ساتھ خندق کھودنے میں برابر کا شریک نظر آتا ہے بلکہ ایک سخت پتھر کے حائل ہو جانے پر جب سب صحابہ رضی اللہ عنہم نے زور لگایا اور اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی اور خدمت اقدس ﷺ میں اس واقعہ کو پیش کیا تو آپ ﷺ نے ”بسم اللہ“ کہہ کر کدال کی ایک ضرب سے اس کو پارہ پارہ کر دیا۔

آپ کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تین شبانہ روز بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھے دین حق کی حمایت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر مصروف کار تھے۔

ایک جانب اگر لبثنا ثلاثہ ایام لا نذوق ذاقا کا مظاہرہ تھا تو دوسری جانب زبان وحی ترجمان پر یہ دعائیہ کلمہ جاری تھا اللهم ان العیش عیش الاخرة فاغفر الانصار والمہاجرۃ۔ خدایا عیش تو آخرت کا عیش ہے، پس تو انصار و مہاجرین کو مغفرت سے نواز اور جب جاں نثاران توحید، شمع نبوت سے یہ سنتے تو پروانوں کی طرح والہانہ جوش کے ساتھ یہ کہہ کہہ کر قربان ہونے لگتے۔



نحن الذين بايعوا محمداً على الجهاد ما بقينا ابداً

”ہم وہ ہیں جنہوں نے زندگی بھر کے لیے نبی اکرم محمد ﷺ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کر لی ہے۔“

اور جت شمع نبوت کے پروانوں سے آپ ﷺ یہ والہانہ رجز سنتے ہیں تو مسرت و شادمانی کے ساتھ پھر ارشاد فرماتے ہیں:

اللهم لا خير الا خيرا الاخرة فبارك في الانصار والمهاجرة

”خدا یا! خیر و نیکی تو آخرت ہی کی ہے پس تو انصار و مہاجرین کے درمیان اپنی برکت کا نزول فرما۔“

اور براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوہ خندق میں خدا کے رسول ﷺ کی حالت یہ تھی کہ خندق سے مٹی اٹھا کر ادھر ادھر منتقل کر رہے تھے اور جسد مبارک گرد آلود ہو رہا تھا، اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔

والله لو لا الله ما اهتدينا و لا تصدقنا و لا صلينا

”قسم بخدا اگر خدا کی ہدایت رہنمائی نہ کرتی تو نہ ہم کو ہدایت نصیب ہوتی اور نہ صدقہ و نماز۔“

فانزلن سكينه علينا و ثبت الاقدام ان لاقينا

”پس اے خدا! تو ہم پر طمانیت نازل فرما، اور میدان جنگ میں ہم کو ثابت قدم رکھ۔“

ان الاولى قد بغوا علينا اذا ارادوا فتنه ابينا

”اور جن لوگوں نے ہم پر سرکشی کرتے ہوئے چڑھائی کی ہے جب انہوں نے فتنہ کا ارادہ کیا تو ہم نے انکار کر دیا (ان کو ناکام کر دیا) اور تنہا جوش کے ساتھ ”ابینا“ کو بلند آواز سے کہتے تھے۔“

خندق کی کھدائی کا کام چند روز جاری رہا اور اس طرح دشمن سے حفاظت کا پوری طرح سامان ہو گیا، لیکن جب محاصرہ کو بیس روز ہو گئے تو یہود بنی قریظہ کی عہد شکنی اور مسلسل محاصرہ سے کچھ اکتانے اور مضطرب ہونے لگے، اس وقت خدا کی نصرت نے نزول کیا اور مسلمانوں کی کامرانی کے اسباب مہیا ہو گئے، ہوا یہ کہ کفار کے لشکر میں ایک شخص نعیم بن مسعود نخعی تھا، یہ گوا بھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا، لیکن اس کے قلب میں صداقت اسلام گھر کر چکی تھی، اس لیے اس نے اپنی ہوشیاری سے مشرکین مکہ اور یہود مدینہ کے درمیان بے اعتمادی پیدا کر دی اور جنگ کے معاملہ میں دونوں فریق میں ایسا اختلاف پیدا ہو گیا کہ ایک نے دوسرے کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے انکار کر دیا اور ابھی مشرکین مکہ واپس بھی نہ ہوئے تھے کہ قدرت کی جانب سے ہوائے تند کا ایسا طوفان اٹھا کر جس نے آن کی آن میں دشمن کے تمام لشکر کو زیر و بر کر ڈالا، خیمے اکھڑ کر گرنے لگے، چوپائے بھڑک بھڑک کر بھاگنے لگے اور سارے لشکر میں ابتری پھیل گئی اور دشمن نے محاصرہ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے فتنہ سے نجات دی۔

نبی اکرم ﷺ نے اسی موقع پر ارشاد فرمایا:

((نصرت بالصبا و اهلكت العاد بالدبور)).

”اللہ تعالیٰ کی جانب سے مجھ کو پروا ہوا کے ذریعہ فتح عطا کی گئی اور عاد چھوٹا ہوا سے ہلاک کیے گئے تھے۔“

نبی اکرم ﷺ کو جب دشمن کی خبریں معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی تو تین مرتبہ آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ اس خدمت کو کون انجام دے گا، اور تینوں مرتبہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے پیش قدمی کر کے عرض کیا: اس خدمت کے لیے میں حاضر



ہوں۔ تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ان لكل نبی حواریا وان حواری الزبیر))۔

”ہر ایک نبی کے حواری ہوتے ہیں اور میرے حواری زبیر ہیں۔“

اور اس موقع پر حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

((اللهم منزل الكتاب سريع الحساب، اهزم الاحزاب، اللهم اهزمهم وذلزلهم))۔

”اے کتاب (قرآن) کے نازل کرنے والے خدا! اے جلد حساب لینے والے، تو مشرکین کی جماعتوں کو شکست دے

دے، الہی ان کو فرار کر اور ان کو ڈگمگا دے۔“

لا اله الا الله وحده عز جندة ونصر عبدة وغلب الاحزاب وحده فلا شئ بعدة۔

”کوئی خدا نہیں اللہ کی ذات کے ماسوا جو یکتا و بے ہمتا ہے اس نے اپنے لشکر (مسلمانوں) کو عزت بخشی اور اپنے بندہ (محمد

ﷺ) کی مدد کی اور یکتا ذات احزاب (سب جماعتوں) پر غالب ہے اور اس کے ماسوا سب فانی ہے۔“

یہی وہ غزوہ ہے جس میں مشغولیت جہاد کی وجہ سے حضور اقدس ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی نماز عصر قضا ہو گئی اور آپ ﷺ

نے مغرب کے وقت دونوں نمازوں کو ادا کیا۔

### قرآن عزیز اور غزوہ احزاب:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: یہ آیت غزوہ خندق ہی کے متعلق نازل ہوئی:

﴿إِذْ جَاءُوكُم مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ﴾

”اور جب چڑھ آئے (مشرکین) تم پر اوپر کی جانب سے اور نیچے کی جانب سے اور جب پھر گئیں (دہشت کی وجہ سے)

آنکھیں اور پہنچ گئے دل گلوں تک (یعنی کلیجے منہ کو آ گئے)۔ ﴿ (الاحزاب: ۱۰)

قرآن حکیم میں اسی غزوہ کی نسبت سے اس سورت کا نام ہی احزاب ہو گیا۔ اس سورت کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں

اسی واقعہ کا تذکرہ ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ كُورُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَ

جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿۹﴾ ... الی ... وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

قَدِيرًا ﴿۱۰﴾ ﴿ (الاحزاب: ۹-۲۷)

”اے ایمان والو! اللہ کی نعمت کو یاد کرو جو تم پر اس وقت کی گئی جب تم پر (مشرکین کے) لشکر چڑھے تھے۔ پس ہم نے ان

پر ہوا کو اور ایسے لشکروں کو بھیج دیا جن کو تم نہیں دیکھ رہے تھے اور جو کام بھی تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ ان کاموں کو دیکھنے والا

ہے۔ ﴿ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿۱۰﴾ تک۔“



## واقعہ حدیبیہ

حدیبیہ مکہ مکرمہ سے جدہ کی جانب ایک منزل پر واقع ہے، اور آج کل شمیسیہ کے نام سے مشہور ہے، حدیبیہ دراصل کنویں کا نام ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے ساتھ ”فتح مبین“ اور بیعت رضوان کی مقدس تاریخ وابستہ ہے۔

۶ ہجری مطابق فروری ۶۲۸ء ماہ ذی قعدہ روز دوشنبہ وہ وقت سعید تھا کہ سرور دو عالم ﷺ چودہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے جلو میں اداء عمرہ کے ارادہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے اور جب ذوالحلیفہ پہنچے تو قربانی کے جانوروں کے قلاوہ ڈالا اور احرام باندھا اور بنی خزاعہ کے ایک شخص کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ قریش کے حالات کا اندازہ لگا کر خبر دے۔

حضور اقدس ﷺ جب غدیر اشطاط پہنچے تو جاسوس نے آ کر خبر دی کہ قریش کو آپ ﷺ کی آمد کی اطلاع ہو چکی ہے اور وہ قبائل کو جمع کر کے مقابلہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں، ان کا ارادہ ہے کہ آپ کو مکہ مکرمہ میں داخل نہ ہونے دیں۔

نبی اکرم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

”خدا کے رسول ﷺ! ہم تو بیت اللہ کے قصد سے نکلے ہیں، جنگ یا قتل و قتال ہمارا مقصد نہیں ہے، لہذا ہم بیت اللہ کی

زیارت کو اپنا مقصد سمجھتے ہوئے ضرور آگے بڑھتے رہیں گے اور جو جماعت خواہ مخواہ سدراہ ہوگی اس سے مجبوراً لڑنا پڑے گا۔“

مشورہ کے بعد ذات اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((امضوا علی اسم اللہ)) ”اب خدا کا نام لے کر بڑھے چلو۔“

زارین بیت اللہ خدا کے عشق میں چور، اور بیت اللہ کی زیارت میں سرور مکہ کی جانب قدم بڑھائے چل رہے تھے کہ خدا کے رسول ﷺ نے فرمایا: خالد بن ولید فوج کا دستہ لیے عتیم میں گھات لگائے تمہارا منتظر ہے، اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس جانب سے کاوا کاٹ کر داہنی جانب چلیں اور اچانک بے خبری میں اس کے مقابل پہنچ جائیں، جب مسلمان اچانک خالد بن ولید کے دستہ فوج کے سامنے آگئے تو اپنی گھات کو ناکام دیکھ کر خالد گھبرا گئے، دستہ فوج کو لے کر تیزی کے ساتھ مشرکین مکہ کے پاس جا پہنچے اور ان کو مسلمانوں کی آمد سے مطلع کیا۔

نبی اکرم ﷺ جب اس ٹیلہ پر پہنچے کہ اس کے بعد وادی میں اتر کر مکہ پہنچ جانا تھا تو اچانک آپ کی اونٹنی قصواء بیٹھ گئی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ دیکھ کر اس کو چوکے دیئے بھڑکایا اور کوشش کی کہ کسی طرح وہ اٹھ کھڑی ہو مگر وہ نہ اٹھی۔ لوگ جب بار بار ”حل حل“ کہہ کر تھک گئے تو کہنے لگے: ”خلات القصواء“ ”قصواء نافرمان ہو گئی۔“

نبی اکرم ﷺ نے یہ سنا تو فرمایا: ((ما خلات القصواء ما ذاک لها بخلق و لکن حبسها حابس الفیل)) ”قصواء ہرگز نافرمان نہیں ہوئی اور نہ یہ اس کی عادت ہے بلکہ اس کو اس خدا نے روک دیا تھا جس نے ہاتھی والوں کو روک دیا تھا، یعنی قریش مکہ کی

مکہ کے قریب ایک مقام ہے۔ بخاری باب غزوة الحدیبیہ۔ اونٹنی کو اٹھانے کے لیے بولتے ہیں۔



بیہودگی اور جنگی ذہنیت کی وجہ سے چونکہ جنگ کی صورت حال پیدا ہوگئی ہے اس لیے خدا کی مرضی یہ ہے کہ ہم اس وقت تک آگے نہ بڑھیں جب تک کہ کعبہ کی حرمت کا عہد نہ کر لیں۔

چنانچہ اس ارشاد کے بعد ذات اقدس ﷺ نے فرمایا:

((والذی نفسی بیدة لا یسلونی خطة یعضون فیہا حرمت اللہ الا اعطیتہم ایہا)).

”اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ مجھ سے جو بھی ایسی بات چاہیں گے کہ اس میں حرمت اللہ کی عظمت ان کے پیش نظر ہو تو میں ضرور اس کو پورا کروں گا۔“

حضور اقدس ﷺ جب یہ اعلان فرما چکے تو اب جو قصوا کو کھڑا ہونے کے لیے ڈپٹا وہ فوراً کھڑی ہوگئی اور چل پڑی اور حدیبیہ کے میدان میں جا پہنچی۔

جب زائرین بیت اللہ کا مقدس قافلہ حدیبیہ میں فروکش ہو گیا تو صلاح یہ قرار پائی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا جائے تاکہ وہ مشرکین مکہ پر یہ واضح کریں کہ ہمارا ارادہ بجز زیارت بیت اللہ کے اور کچھ نہیں، لہذا تم کو روکنا مناسب نہیں ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب مکہ میں داخل ہوئے اور ابوسفیان وغیرہ سے مل کر گفتگو کی تو انہوں نے ایک نہ سنی اور کہنے لگے کہ تم اگر چاہتے ہو کہ تنہا طواف بیت اللہ کر لو، تو کر لو، ورنہ ہم محمد (ﷺ) اور ان کے دوسرے رفقاء کو ہرگز مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”یہ تو میں ہرگز نہیں کر سکتا کہ خدا کے رسول ﷺ کے بغیر طواف اور عمرہ کو ادا کر لوں“ قریش نے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ اصرار دیکھا تو ان کو واپس جانے سے روک لیا۔

### بیعت رضوان:

یہ خبر مسلمانوں تک اس طرح پہنچی کہ عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیے گئے، مسلمانوں کے لیے یہ خبر ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس سے ہر شخص مضطرب اور بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی وقت ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مسلمانوں سے اس بات پر بیعت لی کہ مرجائیں گے، مگر ہم میں سے کوئی ایک بھی راہ فرار اختیار نہیں کرے گا۔ نبی اکرم ﷺ جب سب مسلمانوں سے بیعت لے چکے تو ان میں حیرت انگیز والہانہ جوش و خروش پیدا ہو گیا، جس کی خبر شدہ شدہ مکہ بھی پہنچ گئی، مشرکین مکہ بہت گھبرائے اور خوف زدہ ہو کر مسلمانوں تک یہ خبر پہنچائی کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر غلط ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صحیح سلامت حدیبیہ واپس تشریف لے آئے۔

چونکہ جہاد کی یہ بیعت بہت ہی نازک اور اہم موقع پر لی گئی اور مسلمانوں نے پورے ولولہ اور جذبہ ایثار کے ساتھ اس بیعت کو کیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی اس فداکاری کی قدر و منزلت فرمائی اور سورۃ فتح میں اپنی رضا اور خوشنودی کا پروانہ مرحمت فرما کر ان کے اس کارنامہ کو زندہ جاوید بنا دیا اور اسی حقیقت کے پیش نظر اسلامی تاریخ میں اس کا نام ”بیعت رضوان“ قرار دیا۔

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ

السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا﴾ (الفتح: ۱۸)

”بلاشبہ اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جبکہ وہ تیرے ہاتھ پر اس درخت کے نیچے بیعت کرنے لگے اور جان لیا اللہ نے جو



ان کے جی میں تھا، پس اتارا ان پر اطمینان و سکون اور انعام میں دیا، ان کو ایک فتح قریب۔ ﴿﴾  
مسلمانوں کے فداکارانہ جوش اور والہانہ جذبہ نے مشرکین مکہ پر ایسا اثر کیا کہ اب وہ خود صلح پر آمادہ ہو گئے اور پیش قدمی کر کے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ نبی اکرم ﷺ سے شرائط صلح طے کرے تاکہ یہ قضیہ ختم ہو جائے، مگر یہ شرط بہر صورت رہے گی کہ مسلمان اس سال نہیں بلکہ آئندہ سال عمرہ کر پائیں گے۔ ﴿﴾

### معادۂ صلح:

سہیل بن عمرو جب مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچا تو حضور اقدس ﷺ نے صلح کے نقطہ خیال کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور طویل گفت و شنید کے بعد حسب ذیل دفعات پر دونوں جانب سے معاہدہ کی تصدیق و توثیق عمل میں آ گئی۔

① اس سال مسلمان مکہ میں داخل ہوئے بغیر ہی واپس چلے جائیں۔

② آئندہ سال مسلمان مکہ میں بغرض عمرہ اس طرح داخل ہوں گے کہ معمولی حفاظتی ہتھیاروں کے علاوہ کوئی جنگی ہتھیار نہیں ہوگا اور تلواریں نیام کے اندر ہی رہیں گی اور صرف تین دن قیام کریں گے، اور جب تک وہ رہیں گے ہم مکہ چھوڑ کر پہاڑیوں پر چلے جائیں گے۔

③ معاہدہ کی مدت کے اندر دونوں جانب امن و عافیت کے ساتھ آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

④ اگر کوئی شخص مکہ سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مسلمان ہو کر بھی مدینہ چلا جائے گا تو اس کو مکہ واپس کرنا ہوگا، اور اگر مدینہ سے کوئی شخص مکہ بھاگ آئے گا تو ہم اس کو واپس نہیں کریں گے۔

⑤ تمام قبائل آزاد ہیں کہ ہر دو فریق میں سے جو جس کا حلیف بنا پسند کرے اس کا حلیف بن جائے۔

⑥ یہ معاہدہ دس سال تک قائم رہے گا اور کوئی فریق اس مدت کے اندر اس کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ ﴿﴾

معاہدہ کی تحریر کے وقت نام مبارک کے ساتھ رسول اللہ لکھنے پر سہیل نے اعتراض کیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ہے تو یہ واقعہ اور حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن ہم کو چونکہ صلح مقصود ہے اس لیے تم اگر یہ پسند نہیں کرتے تو مجھ کو اصرار نہیں، اور یہ فرما کر آپ ﷺ نے کاتب معاہدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اس جملہ کو محو کر دیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ کب ممکن تھا کہ وہ اس جملہ کو اپنے ہاتھ سے مٹائیں جس کی نسبت نے ساری کائنات میں انقلاب پیدا کر کے ظلمت کو نور سے، شرک کو ایمان سے، اور جہل کو علم سے بدل ڈالا۔ نبی اکرم ﷺ نے جب یہ محسوس کیا تو مقام تحریر کو معلوم کر کے دست مبارک سے اس جملہ کو محو کر دیا۔ ﴿﴾

معاہدہ جب مکمل ہو گیا تو مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ اس میں ہمارا پہلو کمزور رہا، اور صورت حال یہ ہو گئی کہ گویا ہم نے دب کر صلح کی ہے حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام کی سر بلندی کے جذبہ نے مجبور کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کریں ”یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ حدیبیہ کا واقعہ ”فتح“ ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ہاں!“

﴿﴾ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿وَأَنَابَهُمْ فَتَحًا قَرِيبًا﴾ میں فتح قریب سے مراد فتح خیبر ہے جو حدیبیہ کے بعد پیش آیا اور مسلمانوں کو جس میں بہت مال غنیمت ہاتھ آیا اور یہی صحیح قول ہے ج ۷ ص ۳۵۵۔

﴿﴾ البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۱۶۷-۱۶۸ ﴿﴾ ایضاً ص ۱۶۱-۱۶۹ ﴿﴾ تاریخ طبری ج ۳ ص ۸۰



قسم بخدا بلاشبہ یہ ”فتح“ ہے۔

یہ واقعہ جو اپنی دفعات معاہدہ کے لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بظاہر شکست اور ذلت کا باعث نظر آتا تھا ”فتح مبین“ کیسے تھا؟ تو اس کا جواب جلیل القدر محدثین کی زبانی سنئے۔ امام حدیث و سیرت زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اسلام میں جو عظیم الشان فتوحات شمار کی گئی ہیں، ان میں سب سے پہلی ”فتح عظیم“ صلح حدیبیہ ہے، اس لیے کہ اس سے قبل برابر کفار و مشرکین سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری تھا، اور جب یہ ”صلح“ عمل میں آگئی تو اس کی وجہ سے ہر دو فریق کو امن و اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع میسر آیا اور تبادلہ خیالات کی آزادی نصیب ہوئی، نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص بھی اسلام کو اپنی عقل صحیح سے جانچتا اور اس کی حقیقت پر غور کرتا، اس کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ باقی نہ رہتا تھا کہ وہ فوراً اسلام قبول کر لے، چنانچہ ان دو سال میں (جب تک معاہدہ پر عمل رہا اور مشرکین نے اپنی جانب سے اس کی خلاف ورزی نہیں کی) لوگ اس قدر مسلمان ہوئے کہ اس سے قبل کی پوری مدت میں اسی قدر یا اس سے بھی کم مسلمان ہوئے تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

”اس مقام پر ”فتح مبین“ سے مراد واقعہ حدیبیہ ہے، صلح حدیبیہ نے درحقیقت ”فتح مبین“ ”فتح مکہ“ کے لیے راہ کھول دی، یہ اس لیے کہ جب جنگ کا خطرہ درمیان سے جاتا رہا اور امن و اطمینان کی صورت پیدا ہوگئی تو مکہ اور مدینہ کے درمیان سلسلہ آمد و رفت بے خوف خطر ہونے لگا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے شجاع اور مدبر حضرات کا قبول اسلام اسی صلح کا کارنامہ ہے اور یہی اسباب ترقی آہستہ آہستہ ”فتح مکہ“ کا باعث ہے۔

اور ابن ہشام رحمۃ اللہ علیہ، امام زہری رحمۃ اللہ علیہ، کی توجیہ کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”زہری کے قول کی تائید اس حقیقت حال سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ واقعہ حدیبیہ میں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے ہیں تو چودہ سو مسلمان جلو میں تھے اور دو سال بعد جب فتح مکہ کے لیے نکلے ہیں تو دس ہزار کی تعداد تھی۔“





## الفتح الاعظم

رمضان المبارک ۸ ہجری مطابق جنوری ۶۳۰ء میں ”فتح مکہ“ کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ حدیبیہ کے معاہدہ میں یہ طے پا گیا تھا کہ قبائل عرب اس کے لیے آزاد ہوں گے کہ نبی اکرم ﷺ اور قریش میں سے جس کے بھی حلیف بننا چاہیں بن جائیں، جب معاہدہ پر دونوں جانب سے دستخط ہو گئے تو فوراً عرب کے قبیلہ خزاعہ نے اعلان کیا کہ ہم مسلمانوں کے حلیف ہونا پسند کرتے ہیں، اور قبیلہ بنو بکر نے کہا کہ ہم قریش کے حلیف بننا چاہتے ہیں، اور دونوں قبائل اس طرح الگ الگ دو جماعتوں کے حلیف ہو گئے۔

تقریباً ڈیڑھ سال تو معاہدہ پر ہر دو جانب سے پوری طرح عمل ہوتا رہا، لیکن ڈیڑھ سال کے بعد ایک نیا واقعہ پیش آیا وہ یہ کہ بنی خزاعہ اور بنی بکر کے درمیان عرصہ سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہ چکا تھا جو اس درمیانی مدت میں اگرچہ بند رہا مگر اچانک کسی بات پر پھر جنگ چھڑ گئی اور بنو بکر ایک شب کو مقام ذنیرہ\* میں بنو خزاعہ پر جا چڑھے، قریش کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہنے لگے شب کا وقت ہے اور مسلمان یہاں سے بہت دور ہیں، آج موقعہ ہے کہ بنی خزاعہ کو پیغمبر اسلام ﷺ کے حلیف ہونے کا مزہ چکھایا جائے، چنانچہ انہوں نے بھی بنی بکر کا ساتھ دیتے ہوئے بنی خزاعہ کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔

عمر و بن سالم نے جب یہ حال دیکھا تو ایک وفد لے کر دربار قدسی میں استغاثہ کیا، اور بنی خزاعہ کی دردناک حالت کو پیش کرتے ہوئے طالب امداد ہوا۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

والله لا يمنعكم ما امنع نفسي منه.

”قسم بخدا میں جس چیز کو اپنی ذات سے روکوں گا تم کو بھی اس سے ضرور محفوظ رکھوں گا۔“

ادھر قریش کو جب یہ علم ہوا تو وہ ڈرے، اپنی حرکت بیجا پر نام ہوئے اور انہوں نے ابوسفیان کو مامور کیا کہ وہ مدینہ جائے اور مسلمانوں کے اشتعال کو دور کرنے کی یہ تدبیر کرے کہ قریش چاہتے ہیں کہ سابق معاہدہ کی مدت میں مزید اضافہ اور از سر نو معاہدہ کی توثیق ہو جائے۔ ابوسفیان مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں داخل ہوا جو نبی اکرم ﷺ کی رفیقہ حیات تھیں۔ ابوسفیان نے جونہی ارادہ کیا کہ نبی اکرم ﷺ کے بچھے ہوئے بستر پر بیٹھ جائے، ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے فوراً اس کو سمیٹ دیا، اور کہنے لگیں: ”باپ! یہ خدا کے نبی ﷺ کا بچھونا ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ ”پھر کیا ہوا، میں تیرا باپ ہوں۔“

ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ”یہ صحیح ہے مگر تو مشرک ہے اور یہ پیغمبر خدا کا پاک بستر۔“



ابوسفیان اگرچہ اس وقت بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا، مگر اس حیرت زا واقعہ نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور وہ سمجھا کہ حقیقت حال کیا ہے؟

غرض وہ دربار اقدس ﷺ میں حاضر ہوا، اور عرض و معروض کرنے لگا، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ تجھ یثرب و توشیح کی کیا حاجت ہے، کیا کوئی نیا واقعہ پیش آ گیا ہے؟ ابوسفیان نے عرض کیا: ”نہیں نئی کوئی بات نہیں ہے۔“ تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ”تم مطمئن رہو کہ ہم اپنے عہد پر قائم ہیں۔“

ابوسفیان اس جواب کو سن کر مطمئن نہ ہوا، اس لیے کہ وہ حقیقت حال کو چھپا کر جھوٹ بول چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اس طرح نبی اکرم ﷺ کو دھوکا دے کر اپنا مقصد پورا کر لے، لیکن اس صاف اور سچے جواب نے اوس ڈال دی اور اس کا مقصد پورا نہ ہو سکا۔ تب اس نے صدیق اکبر، فاروق اعظم، علی حیدر رضی اللہ عنہم کی خدمت میں حاضر ہو کر جدا جدا گفتگو کی اور چاہا کہ معاملہ قریش کے حسب مراد طے ہو جائے لیکن اس کی مراد بر نہ آ سکی، اور بے نیل و مرام مکہ واپس ہو گیا۔

نبی اکرم ﷺ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو صورت حال سے آگاہ فرمایا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے اور قریش کے درمیان تو معاہدہ ہے۔“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تھا، مگر قریش نے خود نقض عہد کر دیا ہے۔“ اب جہاد کی تیاری شروع ہوئی، مگر عام طور پر یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ کس جانب ارادہ ہے، آپ ﷺ نے اطراف مدینہ میں نفیر عام کر دیا کہ جو شخص بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے وہ رمضان تک مدینہ پہنچ جائے، آپ ﷺ پوری کوشش فرما رہے تھے کہ کسی طرح ہماری تیاری کا حال قریش کو نہ معلوم ہو جائے، کیونکہ آپ ﷺ کی دلی خواہش یہ تھی کہ مکہ میں جنگ پانا نہ ہونے پائے اور قریش مرعوب ہو کر منقاد و مطیع ہو جائیں کہ اسی اثناء میں ایک حادثہ پیش آ گیا۔

### حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ ایک بدری صحابی تھے، ان کے اہل و عیال مکہ ہی میں تھے کہ یہ صورت حال پیش آ گئی، انہوں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس واقعہ کا حال بہر حال مشرکین کو معلوم ہو ہی جائے گا، سو اگر میں بھی قریش مکہ کو اس کی اطلاع کر دوں تو ہمارا (مسلمانوں کا) کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا اور میں ان کی ہمدردی حاصل کر کے اپنے اہل و عیال کو ان کی مضرت سے بھی محفوظ رکھ سکوں گا، مشرکین مکہ کے نام ایک مکتوب لکھ دیا، نبی اکرم ﷺ کو بذریعہ وحی الہی یہ معلوم ہو گیا، اور آپ ﷺ نے حضرت علی، مقداد، زبیر رضی اللہ عنہم کو مامور فرمایا کہ روضۃ خانہ جاؤ، وہاں ناقہ سوار عورت ملے گی، وہ جاسوس ہے، اس کے پاس ایک خط ہے، وہ اس سے چھین لو، یہ حضرات روضۃ خانہ پہنچے تو عورت کو موجود پایا، انہوں نے خط کا مطالبہ کیا، عورت نے انکار کیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے، مگر جب انہوں نے جامہ تلاشی کی دھمکی دی تو مجبور ہو کر اس نے سر کے بالوں میں سے ایک پرچہ نکال کر دیا۔

یہ پرچہ جب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو وہ حضرت حاطب کا خط تھا، نبی اکرم ﷺ نے ان کی جانب مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا: حاطب! یہ کیا؟ حاطب نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! عجلت نہ فرمائیں، یہ خط میں نے اس لیے لکھا کہ میں جانتا ہوں



کہ مدینہ میں مقیم سب مہاجرین کا مکہ کے قریشیوں کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا رشتہ اور تعلق ہے، ایک میں ہی ایسا ہوں جس کا ان کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے، تو میں نے یہ صرف اس یقین پر کیا ہے کہ مسلمانوں کو تو اس بات سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور میں اس طرح قریش کی ہمدردی حاصل کر کے اپنے اہل و عیال کو محفوظ کر سکوں گا، یا رسول اللہ ﷺ! بخدا میں نے ہرگز، ہرگز یہ کام ارتداد اور کفر پر رضا کی نیت سے نہیں کیا، میں اب بھی اسلام کا شیدائی اور فدائی ہوں۔

نبی اکرم ﷺ نے یہ سب سن کر ارشاد فرمایا: ”حاطب نے تمہارے سامنے سچ سچ بات کہہ دی۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں“ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”حاطب بدر کے مجاہد ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے شرکائے بدر کے لیے یہ ارشاد فرمایا ہے: ”اعلوا ما شئتم فقد غفرت لكم“ حاطب کے واقعہ پر ہی قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ...﴾

السَّبِيلِ ① ﴿ (المتحنہ: ۱)

بہر حال رمضان کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ ذات اقدس ﷺ دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ مکہ کی جانب روانہ ہوئے، آپ جب کدید اور عسفان کے درمیان کدید تک پہنچے تو دیکھا کہ مسلمانوں پر روزہ کی سختی حد سے متجاوز ہوتی جا رہی ہے، تب آپ ﷺ نے پانی طلب فرمایا اور مجمع کے سامنے نوش فرمایا۔ تاکہ صحابہ رضی اللہ عنہم دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ مسافرت اور پھر جہاد کے موقعہ پر افطار کی اجازت ہے، اور قرآن کی دی ہوئی رخصت کا یہی مطلب ہے۔

اسی سفر میں ذات اقدس ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ مسلمان ہو کر حاضر خدمت ہوئے، آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اہل و عیال کو مدینہ بھیج دو، اور تم ہمارے ساتھ رہو۔

اسلامی لشکر جب مکہ کے قریب پہنچا تو ابوسفیان چھپ کر لشکر کا صحیح اندازہ کر رہے تھے کہ اچانک مسلمانوں نے گرفتار کر کے خدمت اقدس میں پیش کیا، آپ ﷺ نے ابوسفیان پر نگاہ کرم ڈالتے ہوئے معاف کر دیا، اور قید سے آزاد کر دیا، ابوسفیان نے رحمۃ للعالمین ﷺ کا یہ خلق دیکھا تو فوراً مشرف باسلام ہو گئے، اسی طرح عبداللہ بن ابی امیہ بھی اسلام کے والہ و شیدا بن کر حاضر خدمت ہوئے، آپ ﷺ نے ان حضرات کے قبول اسلام پر بہت مسرت کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ لَا تَثْرِبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يُغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ①﴾ (یوسف: ۹۲)

نبی اکرم ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ابوسفیان کو ابھی مکہ واپس نہ جانے دو اور سامنے کی پہاڑی پر لے جاؤ تاکہ وہ مسلمانوں کی طاقت و شوکت کا اندازہ کر سکے۔

ابوسفیان اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ پہاڑی پر کھڑے ہوئے اسلامی لشکر کا نظارہ کر رہے تھے، اور مہاجرین و انصار قبائل کے جدا



جد لشکر اپنے پرچم لہراتے ہوئے سامنے سے گزر رہے تھے، اور ابوسفیان ان کو دیکھ دیکھ کر متاثر ہو رہے تھے کہ انصاری قبیلہ کا ایک لشکر پاس سے گذرا، اس لشکر کا پرچم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا، انہوں نے ابوسفیان کو دیکھا تو جوش میں آ کر کہنے لگے:

”اليوم يوم الملحمة اليوم تستحل الكعبة.“

”آج کا دن جنگ کا دن ہے، آج کعبہ میں بھی جنگ حلال ہے۔“

ابوسفیان کی نسلی عصبيت پھڑک گئی اور کہنے لگا:

”يا عباس حبنا يوم الذمار.“

”اے عباس جنگ کا دن مبارک ہو۔“

جب سب لشکر اسی طرح گذر گئے تو آخر میں ایک چھوٹی سی جماعت کے جلو میں سرور دو عالم ﷺ سامنے سے گزرے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں پرچم تھا اور وہ آگے آگے چل رہے تھے، ابوسفیان کی نگاہ جب نبی اکرم ﷺ پر پڑی تو اس نے خدمت اقدس ﷺ میں سعد اور اپنے درمیان مکالمہ کا حال سنایا۔ یہ سن کر ذات اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: سعد نے جھوٹ بولا۔

”هذا يوم يعظم الله فيه الكعبة ويوم تكسى فيه الكعبة.“

”آج کا دن وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں کعبہ کی عظمت کو بالا کرے گا اور آج کعبہ پر غلاف چڑھایا جائے گا۔“

اور یہ فرما کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ہر طرف کر کے پرچم اور لشکر کی سیادت حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو عطا کر دی۔

اب نبی اکرم ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ تم مکہ کے زیریں حصہ کی جانب سے داخل ہونا اور کسی کو قتل نہ کرنا، ہاں اگر کوئی خود اقدام کرے تو دفاع کی اجازت ہے، اور بنفس نفیس مکہ کے بلند حصہ سے داخل ہوئے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے بعض قبائل کے افراد نے مزاحمت کی، اس لیے ان کے ہاتھوں چند مقتول ہو گئے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ بغیر کسی مزاحمت کے مکہ میں داخل ہوئے۔ (بخاری)

جب مرانظہر ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو قبول اسلام کے لیے خدمت اقدس میں پیش کیا تھا تو یہ بھی عرض کیا تھا: یا رسول اللہ ﷺ! ابوسفیان میں فخر کا مادہ ہے اس لیے اگر اس کو کوئی امتیازی حیثیت نصیب ہو جائے تو بہتر ہو۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من دخل دار ابی سفیان فهو امن.

”جو شخص ابوسفیان کے مکان میں داخل ہو جائے گا اس کو امن ہے۔“

غرض جب آپ ﷺ باعزت و اجلال مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت یہ اعلان کرادیا:

① جو مکان بند کر کے بیٹھ جائے اس کو امن ہے۔

② جو ابوسفیان کے مکان میں پناہ لے اس کو امن ہے۔

③ جو مسجد حرام میں پناہ لے اس کو امن ہے۔

البتہ اس امن عام اور عفو عظیم سے چند ایسی ہستیوں کو مستثنیٰ فرمادیا جنہوں نے اسلام کے خلاف بہت زہر چکانی کی تھی اور



مسلمانوں کی ایذا رسانی میں بہت زیادہ حصہ لیا تھا، سر پر مغفراڑھے اور اس پر سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھے اور سورہ ﴿إِنَّا فَتَحْنَا﴾ پڑھتے ہوئے آیات کو بلند آواز سے دہراتے جاتے تھے، اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ درگاہِ الہی میں خشوع و خضوع کے ساتھ ناقہ پر اس درجہ جھکے ہوئے تھے کہ چہرہ مبارک ناقہ کی پیٹھ کو مس کر رہا تھا۔

### بت شکنی:

جب نبی اکرم ﷺ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ کعبہ سے تمام بت نکال کر پھینک دیے جائیں اور دیواروں پر جو تصاویر منقوش ہیں وہ مٹادی جائیں، چنانچہ جب تین سو ساٹھ بتوں کے سرنگوں ہونے کا وقت آیا تو دو مورتیاں حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اس حالت میں سامنے آئیں کہ ان کے ہاتھوں میں بانسوں کے تیر تھے، آپ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا خدا ان مشرکوں کو مارے، یہ خوب جانتے تھے کہ یہ دوں مقدس ہستیاں اس ناپاک بات سے مقدس اور پاک تھیں۔

نبی اکرم ﷺ نے کعبہ کا طواف کیا اور پھر بتوں کے سامنے کھڑے ہو کر لکڑی سے ان کو چرکا دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے:

﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۱) ﴿وَمَا يُبَدِّئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ﴾

”حق آ پہنچا اور باطل اڑ گیا اور باطل نہ کسی شے کو پیدا کرے اور نہ پھیر کر لائے (یعنی باطل تو خود فنا ہونے کے لیے ہے۔“

### رحمۃ اللعالمین کی شان:

کعبہ جب بتوں کی نجاست و تلویث سے پاک کر دیا گیا تو نبی اکرم ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے اور اس کے گوشوں میں گھومتے ہوئے بلند آواز سے تکبیرات کہتے رہے اور نماز نفل ادا کی، باہر تشریف لائے تو مصلیٰ ابراہیمی پر جا کر نماز ادا کی، جب آپ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم وضو فرما رہے تھے تو مشرکین انگشت بدنداں و حیران تھے کہ بایں فتح و کامرانی نہ جشن ہے نہ کبر و نخوت کا اظہار، بلکہ درگاہِ الہی میں اظہارِ عبودیت کے لیے ہر ایک مجاہد بیتاب نظر آتا ہے، بلاشبہ یہ ”بادشاہت“ نہیں ہے بلکہ دوسرا ہی کوئی عالم ہے۔

آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ ہمارے لیے دو خدمتیں ”حجابہ اور سقایہ“ جمع فرما دیجئے اور کعبہ کی کنجی ہمارے حوالہ کر دیجئے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعدد بار عرض کرنے کا کوئی جواب نہیں دیا اور بار بار یہی فرمایا: ”عثمان بن طلحہ کہاں ہیں؟“ جب عثمان رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے کعبہ کی کلید ان کے حوالہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

هاك مفتاحك يا عثمان اليوم يوم برو ووفاء.

تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص ۳۰

سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانے کی خدمت بنی ہاشم کے سپرد تھی، اب وہ کلید برداری کا شرف بھی جمع کرنا چاہتے تھے۔



”عثمان لو یہ اپنی کنجی، آج کا دن بھلائی اور وفاء عہد کا دن ہے۔“

اب لوگ منظر تھے کہ دیکھے جن مشرکین نے برسوں تک آپ ﷺ کو اور مسلمانوں کو ہر قسم کی ایذا دی، مصائب میں مبتلا کیا، آج ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے؟

آپ ﷺ نے تمام قریشی قیدیوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور جب سب خدمت اقدس میں پیش ہوئے تو آپ نے دریافت فرمایا: ”اے قریشی گروہ! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کس طرح پیش آؤں؟ انہوں نے جواب دیا: ”ہم آپ سے خیر کی امید رکھتے ہیں۔“

آپ ﷺ نے یہ سن کر زبان وحی ترجمان سے یہ ارشاد فرمایا: ((اذہبوا فاتم الطلقاء)) ”جاؤ تم سب آزاد ہو۔“ یہ سننا تھا کہ نہ صرف قریش بلکہ ہر صاحب بصیرت کے سامنے یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ بادشاہ اور پیغمبر کی زندگی کا امتیازی نشان کیا ہے؟ پیغمبرانہ زندگی نہ ذاتی عداوت و کدورت کو کوئی وقعت دیتی ہے اور نہ اس کا غیظ و غضب ہوا نفس کے تابع ہوتا ہے، ایک نبی کو اگر صبر آزما حد تک ایذا و تکلیف دی جائے اور پھر موزی شخص رحم کا طالب ہو تو وہ بلاشبہ ”عفو و کرم“ ہی پائے گا اور مکارم اخلاق کے ہر پہلو کا مظاہرہ دیکھے گا، چنانچہ اس درمیان میں جب ایک شخص لرزتا، کانپتا آپ ﷺ خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے شیریں گفتاری کے ساتھ ارشاد فرمایا:

ہون عليك فاني لست بملك انما انا ابن امرأة من قریش كانت تاكل القديد.

”گھبراؤ نہیں، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں میں تو خشک گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت ہی کا بیٹا ہوں۔“

اسی عفو و کرم کا یہ نتیجہ نکلا کہ زعماء قریش جوق در جوق حاضر خدمت ہوتے اور دولت اسلام سے مشرف ہو کر سعادت کبریٰ سے محظوظ ہوتے تھے، چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد ابوقحافہ رضی اللہ عنہ جیسے حضرات اسی دن مسلمان ہوئے۔

## خطبہ:

نبی اکرم ﷺ نے اس موقع پر ایک اہم خطبہ بھی دیا جو اسلام کے بہت سے احکام کی اساس و بنیاد ہے اس خطبہ کے چند اہم اعلانات یہ ہیں:

- ① مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔
- ② معاملات اور قضا یا میں مدعی کے ذمہ گواہوں کا پیش کرنا اور گواہوں کی عدم موجودگی میں مدعا علیہ کے ذمہ حلف اٹھانا ہے۔
- ③ کسی عورت کو تین دن کا سفر بغیر ذی رحم محرم کے درست نہیں ہے۔
- ④ صبح اور عصر کے بعد کوئی نفل نماز نہیں ہے اور عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ جائز نہیں ہے۔
- ⑤ اے گروہ قریش! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے نخوت جاہلیت اور باپ دادا کے نام و نسب پر فخر کا خاتمہ کر دیا ہے، آگاہ رہو کہ تمام

یہ وہی عثمان بن طلحہ ہیں جنہوں نے کلید کعبہ طلب کرنے پر نبی اکرم ﷺ کو نہیں دی تھی لیکن رحمت عالمیاں کی درگاہ میں انتقام بے حقیقت شے تھی، اس لیے آپ ﷺ نے ان ہی کے خاندان میں یہ سعادت باقی رہنے دی، یہی خاندان آج تک کعبہ کا مجاور اور شیبی کے لقب سے مشہور ہے، کیونکہ حضرت عثمان بن طلحہ بنو شیبہ میں سے تھے۔



انسانی دنیا آدم علیہ السلام کی اولاد ہے اور آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۗ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝﴾ (حجرات: ۱۳)

### فتح مکہ اور قرآن عزیز:

سورہ فتح، حدید، نصر، ان تینوں سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے متعلق اشارات فرمائے ہیں۔ مثلاً سورہ الفتح پارہ ۲۶

آیت ۳ میں ہے:

﴿وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيمًا ۝﴾ (الفتح: ۳)

”اور خدا تجھ کو مدد دے گا زبردست مدد۔“

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ فتح مکہ کی جانب اشارہ ہے۔ اور سورہ حدید میں ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَتْلٍ ۗ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدِ وَقَتْلُوا ۗ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۗ﴾ (الحدید: ۱۰)

”تم میں برابر نہیں ہیں وہ کہ جس نے کہ خرچ کیا فتح مکہ سے پہلے اور جہاد کیا، ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے ان سے جو کہ خرچ کریں فتح مکہ کے بعد اور جہاد کریں اور سب سے وعدہ کیا ہے اللہ نے خوبی کا۔“

اور سورہ نصر میں ہے:

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۗ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝﴾ (النصر: ۱-۲)

”جب آجائے اللہ کی مدد اور فتح (مکہ) اور تم دیکھو لوگوں کو کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں۔“

یہاں باجماع امت ”فتح“ سے مراد فتح مکہ ہے۔ \* حافظ ابن حجر امام شعبی رحمہ اللہ سے نقل فرماتے ہیں ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝﴾ میں ”فتح مبین“ صلح حدیبیہ کی جانب اشارہ ہے اور ”فتح قریب“ سے بھی صلح حدیبیہ کے ہی ثمرات و نتائج مراد ہیں اور سورہ نصر کی آیت ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝﴾ میں ”نصر و فتح“ سے باتفاق فتح مکہ مراد ہے۔

اور اس نقل کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

”ان آیات کے مفہوم و مراد میں صلح حدیبیہ اور فتح مکہ سے متعلق جو مختلف اقوال پائے جاتے ہیں اور موجب اشکال بنتے ہیں، شعبی رحمہ اللہ کی اس تقریر سے تمام اقوال میں مطابقت بھی ہو جاتی ہے اور اشکال بھی دور ہو جاتا ہے۔“



سورہ الفتح، النصر اور الحدید کی مسطورہ بالا آیات کا مصداق فتح مکہ ہے یا صلح حدیبیہ؟ اس بارہ میں مختلف اقوال و روایات اور امام شعبی رضی اللہ عنہ کی توجیہ اور اس پر حافظ حدیث ابن حجر رضی اللہ عنہ کی تائید و تصدیق کے مطالعہ کے بعد بھی ہم یہ کہنے کی جرات کر سکتے ہیں کہ سورہ فتح میں ”فتح مبین“ ”نصر عزیز“ اور ”فتح قریب“ کا ذکر اور پھر سورہ حدید میں انفاق و جہاد فی سبیل اللہ کو ”الفتح“ کے قبل اور بعد کے ساتھ تقسیم درجات و فضائل کا تذکرہ اور پھر سورہ نصر کی ایک آیت ﴿نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ﴾ میں ”نصر و فتح“ کا اجتماعی ذکر صاف صاف اس حقیقت کا اعلان ہے کہ ان مقامات میں ایسے واقعہ کا تذکرہ ہے جس کی ابتداء جہاد و قتال سے شروع ہو کر ایک ایسی فتح و نصرت پر نتیجہ خیز ہوئی ہو جس کے بعد سرزمین حجاز ہمیشہ کے لیے شرک و بت پرستی کی توہین سے پاک ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ شرف بلاشبہ فتح مکہ کو ہی حاصل ہے، البتہ اس میں بھی شبہ نہیں کہ صلح حدیبیہ کے وقت سورہ الفتح کا نزول اور ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ کا اسلوب بیان یہ بھی واضح کرتا ہے کہ صلح حدیبیہ چونکہ اپنے اسباب و عواقب اور نتائج و ثمرات کے لحاظ سے فتح مکہ کا پیش خیمہ اور اس کے لیے تمہید ثابت ہوئی، اس لیے وہ بھی ”فتح مبین“ کہلانے کی مستحق ہے، یعنی وہ واقعہ ”فتح قریب“ ”نصر عزیز“ اور ”الفتح“ و ”نصر“ کا باعث ہو وہ یقیناً ”فتح مبین“ کہلانے کا حق رکھتا ہے۔





## غزوة حنین

”فتح عظیم“ کے بعد مشرکین عرب کی شوکت و صولت کا قریب قریب خاتمہ ہو گیا، اور اب عرب قبائل جو ق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے، یہ دیکھ کر دو قبائل کی حمیت جاہلیت بھڑک اٹھی اور وہ اسلام کی ترقی کو برداشت نہ کر سکے، ہوازن اور ثقیف دونوں قبائل کے سرداروں کا اجتماع ہوا اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ محمد (ﷺ) اپنی قوم (قریش) کو مغلوب کر کے مطمئن ہو گئے ہیں، لہذا اب ہماری باری ہے، پس کیوں نہ ہم ہی پیش قدمی کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائیں اور ان کا قلع قمع کر کے رکھ دیں، دونوں نے یہ منصوبہ باندھا اور مالک بن عوف نضری کو اپنا بادشاہ تسلیم کر کے آتش حسد کو مسلمانوں کے خون سے بجھانے کی کوشش کی، مالک نے بہت سے قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

نبی اکرم ﷺ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع فرمایا اور بعد مشاورت، مدافعت کے لیے آمادہ ہو کر حنین کو روانہ ہو گئے۔ اس وقت لشکر اسلامی میں بارہ ہزار جاں نثار موجود تھے، ان میں سے دس ہزار مہاجرین و انصار اور مدنی جاں نثار تھے اور دو ہزار وہ تھے جو فتح مکہ کے وقت مشرف باسلام ہوئے اور اسی (۸۰) وہ مشرکین (طلقاً) تھے جو اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود رحمۃ للعالمین کے مظاہرے دیکھ کر خود اپنی خواہش سے مسلمانوں کے رفیق جنگ بن گئے تھے۔

۱۰ شوال ۸ ہجری مطابق فروری ۶۳۰ء کو ذات اقدس ﷺ کے جلوس میں مجاہدین اسلام کا لشکر حنین جا پہنچا۔ آپ نے دشمن کے مقابلہ میں جب اسلامی فوج صف آراء ہونے کا حکم دیا تو مہاجرین کا پرچم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمایا اور انصار میں سے بنی خزرج کا پرچم خباب بن منذر کو بخشا اور اوس کا اسید بن حضیر کو عنایت فرمایا۔ اور اسی طرح مختلف قبائل کے سرداروں کو ان کی فوج کا پرچم عطاء فرمایا۔

نبی اکرم ﷺ بھی بنفس نفیس ہتھیار سجے، دوزرہ ملبوس کیے خود سر پر رکھے اپنے مشہور خنجر پر سوار اسلامی فوج کی کمان کر رہے تھے۔ ابھی جنگ نے قتل و قتال کی صورت نہیں دیکھی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے لشکر کی اکثریت اور فوج کی فراوانی اس درجہ اثر کر گئی کہ بعض مسلمانوں کی زبان سے ان شاء اللہ کہے بغیر ہی اپنی قوت کے گھمنڈ پر یہ نکل گیا کہ آج ہماری قوت کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ مسلمان خدائے واحد کا پرستار مسلمان، اور خدائے قدوس پر بھروسہ کی بجائے اپنی عددی اکثریت پر گھمنڈ کرے، یہ اس کی بھول ہے، اس لیے خدا کو مسلمانوں کا یہ فخر پسند نہیں آیا اور اس لیے ان پر یہ تازیانہ عبرت لگا کہ جب جنگ کا افتتاح ہوا اور مسلمانوں کے لشکر نے پیش قدمی کی تو اچانک دشمن کی ان ٹولیوں نے جو گوریلہ جنگ لڑنے کے لیے پہاڑ کی مختلف گھاٹیوں میں گھات لگائے بیٹھی تھی، چہار جانب سے اسلامی لشکر پر بارش کی طرح تیر باری شروع کر دی۔

اسلامی لشکر اس بے محابا تیر باری کا متوقع نہ تھا اس لیے ان کی صفوں میں تزلزل پیدا ہو گیا اور تھوڑی سی دیر میں مسلمانوں



کے قدم اکھڑ گئے اور نبی اکرم ﷺ اور مشہور مہاجرین و انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ تمام بدوی قبائل اور مدنی لشکر کی اکثریت نے راہ فرار اختیار کی۔ نبی اکرم ﷺ اس حالت میں بھی یہ رجز پڑھتے اور شجاعانہ مظاہرہ فرماتے جاتے تھے۔ انا النبی لا کذب، انا ابن عبدالمطلب۔ غرض اس وقت نبی اکرم ﷺ کے اشارہ پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے مفرور مسلمانوں کو لکارا۔ ”یا معشرا الانصار“ یا ”یا اصحاب بیعة الرضوان“۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی صدائے حق گونجی ہی تھی کہ ایک ایک مسلمان اپنی حالت پر متأسف ہو کر پلٹ پڑا، اور منٹوں میں تمام جاں نثار نبی اکرم ﷺ کے گرد جمع ہو کر داد شجاعت دینے لگے اور نتیجہ یہ نکلا کہ شکست مبدل بہ فتح و نصرت ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم نے ہزیمت کو ”نصر عزیز“ سے بدل دیا۔

مشرکین کی جماعت میں ایک مشہور ذی رائے درید بن صمہ نامی تھا، اس نے مالک کے اس طرز عمل کی سخت مخالفت کی تھی کہ میدان میں عورتوں، بچوں اور مال و دولت کے خزانوں کو ساتھ لے جائے، مگر مالک نے اس کی رائے پر عمل نہ کیا اور سب کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ چنانچہ یہ سب مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور مشرکین کی رہی سہی طاقت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ بہت سے مشرکین اور ان کے قبائل پر اگرچہ اسلام کی صداقت روشن ہو چکی تھی مگر پھر بھی وہ اپنے خیال میں مادی شوکت کو ہی مدار صداقت تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں پر خدائے تعالیٰ کے اس فضل و کرم کو جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھ لیا تو اب وہ بھی برضا و رغبت حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

### غزوة حنین اور قرآن حکیم:

غزوة حنین میں مسلمانوں کے اپنی کثرت پر عجب و غرور اور اس کے انجام میں ابتداء شکست اور پھر خدا کے فضل سے فتح و نصرت کا حال قرآن حکیم نے سورہ توبہ میں اپنے معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح کیا ہے:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۗ وَ يَوْمَ حُنَيْنٍ ۖ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ۖ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ۗ ۝ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ ۖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ وَ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنِّي مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝﴾

(التوبہ: ۲۵-۲۷)

”بلاشبہ اللہ بہت میدانوں میں تمہاری مدد کر چکا ہے اور حنین کے دن (بھی) جب تم اپنی کثرت پر اتر آ گئے تھے تو دیکھو وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی پوری وسعت پر بھی تم پر تنگ ہو گئی اور آخر کار ایسا ہوا کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول (ﷺ) پر اور مومنوں پر اپنی جانب سے دل کو سکون و قرار نازل فرمایا اور ایسی فوجیں اتار دیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں اور ان لوگوں کو عذاب دیا جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کی جزاء یہی ہے، اس کے بعد اللہ جس پر چاہے گا اپنی رحمت سے لوٹ آئے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا رحمت والا ہے۔“



## غزوہ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب واقعہ

### على الثلاثة الذين خلفوا

تبوک ”شام“ کا ایک مشہور شہر ہے، ۹ ہجری میں سردار دو عالم ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ قیصر روم ہرقل ایک عظیم الشان لشکر مسلمانوں پر چڑھائی کے لیے تیار کر رہا ہے اور کئی لاکھ نبرد آزما ولینٹیر اب تک بھرتی ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ وقت بہت ہی کٹھن تھا، سر زمین حجاز میں قحط پڑا ہوا تھا زمین پیداوار سے خالی، نہریں اور تالاب خشک اور گرمی نہایت شدت کی پڑ رہی تھی اور تمام آدمی عسرت کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔ اس کے باوجود موسم بہار تھا، باغوں میں کھجوریں پک رہی تھیں، کھجور کے پتوں سے سائبان تیار کیے جا رہے تھے اور عرب کے دستور کے مطابق لوگ باغوں میں خیمہ زن موسم کی بہار لوٹنا چاہتے تھے کہ اچانک یہ خبر آئی۔ سخت آزمائش کا وقت تھا، سینکڑوں میل کی راہ بادِ سموم اور تپتے ہوئے ریت سے واسطہ، مگر فداکارانِ اسلام عیش دنیا اور مصائبِ موسم سے بے پروا اور بے خوف ہو کر پروانہ دارِ اسلام پر نثار ہونے کے لیے مدینہ میں جمع ہو رہے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کا عمو ما یہ دستور تھا کہ جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو عام طریقہ سے یہ ظاہر نہ ہونے دیتے کہ کہاں کا قصد ہے تاکہ دشمن صحیح حالات نہ پاسکے لیکن غزوہ تبوک میں چونکہ سخت موسم تھا، حجاز میں قحط سالی، ناسازگاری حالات اور دشمن کی زبردست قوت کا مقابلہ کرنا تھا، اس لیے اس کڑی آزمائش میں ذاتِ اقدس ﷺ نے تمام قبائل عرب میں اصل حقیقت کا اعلان کر دیا تاکہ جو شخص بھی اس وادی پر خار میں قدم رکھے سوچ سمجھ کر رکھے۔

### مالی استعانت:

مسطورہ بالا نازک حالات کے پیش نظر یہ پہلا غزوہ ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے مجاہدین کی مالی استعانت کے لیے ترغیب دی اور جلیل القدر جاں نثارانِ اسلام کو اپنی مالی فداکاری کا ثبوت دینے کے لیے موقعہ بہم پہنچایا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار دینار سرخ، تین سواونٹ اور پچاس گھوڑے پیش کیے اور ذاتِ اقدس ﷺ نے ان کے اس جذبہ اخلاص پر یہ دعا فرمائی:

اللهم ارض عن عثمان فاني راض عنه.

”خدا یا تو عثمان سے راضی ہو اس لیے کہ میں اس سے راضی ہوں۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا نصف مال پیش کر دیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے سواوقیہ، اور حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ نے ساٹھ وسق کھجوریں پیش کیں اور حضرت عباس و حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما نے زر کثیر پیش کیا اور عورتوں نے بھی اپنے حوصلہ سے زیادہ زیورات پیش کیے۔ حتیٰ کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تو اپنا کل مال ہی اسلام پر قربان کر دیا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب اپنا مال لے کر حاضر خدمت



ہوئے تو نبی اکرم ﷺ نے دریافت کیا: ”ابوبکر رضی اللہ عنہ تم اپنے اہل و عیال کے لیے بھی کچھ چھوڑ کر آئے ہو؟“ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”ہاں یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے گھر میں اللہ اور اس کے رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں۔“

غرض ان عظیم الشان تیاریوں کے بعد جب مسلمانوں کا لشکر جرار اعلیٰ کلمۃ اللہ کے فداکارانہ ولولہ اور جوش کے ساتھ تبوک کی طرف بڑھا تو ہرقل کو بھی جاسوسوں نے خبر کر دی۔ ہرقل یا تو کروفر کے ساتھ جنگ کی تیاریوں میں مشغول تھا اور یا یہ خبر سنتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھا اور ”رومی“ مسلمانوں کے عدیم النظیر جذبہ ایثار و فداکاری سے متاثر و خائف ہو کر تبوک میں مسلمانوں کے پہنچنے سے قبل ہی منتشر ہو گئے اور نبی اکرم ﷺ راہ کے چند عیسائی امراء کو امن کا پروانہ دیتے اور معاہدات کرتے ہوئے کامرانی کے ساتھ واپس آ گئے۔

### عذرخواہی:

جب آپ مدینہ جلوہ افروز ہوئے تو منافقین نے اس عظیم الشان آزمائش میں عدم شرکت کے لیے جھوٹے اعذار تراش کر خدمت اقدس میں عذرخواہی کی اور ذات اقدس ﷺ نے اسلام کے جماعتی نظام کی مصالح کے پیش نظر ان سے درگزر فرمایا۔ مگر عذرخواہ جماعتوں میں تین اشخاص مخلصین اسلام میں سے بھی تھے اور وہ کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع جیسی ہستیاں تھیں۔ انہوں نے منافقین کی طرح حاضر ہو کر کذب بیانی سے کام نہیں لیا اور صاف صاف عرض کر دیا کہ اے خسرودین و دنیا میں چاہتا تو منافقین کی طرح کوئی جھوٹا عذر پیش کر کے آپ کے مواخذہ سے بچ جاتا لیکن اگر کسی دنیا دار سے ایسا معاملہ پیش آتا تو کر بھی لیتا مگر خدا کے نبی ﷺ کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔ سچ بات یہ ہے کہ میں محض اپنی کاہلی کی وجہ سے ”محروم الجہاد“ رہا، ہر دن یہ خیال کرتا رہا کہ آج اپنے باغوں کے لطف سے اور سیر ہولوں کل ضرور روانہ ہو جاؤں گا اور لشکر اسلام کو ایک دو منزل ہی پر جا پکڑوں گا، آخر کار اس کاہلی کا نتیجہ محرومی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اب جو حکم ہو اس کے لیے سر تسلیم خم ہے۔ یہی ہلال اور مرارہ نے بھی کہا اور اس طرح تینوں مجرموں کی طرح حکم رسول ﷺ سننے کے لیے گوش بر آواز ہو گئے۔

### معاشرتی مقاطعہ:

یہ تینوں حضرات اسلام کے فدائی، اخلاص کے پیکر اور عاشقان رسول ﷺ تھے اس لیے ان کا معاملہ منافقین کا سا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ نظام جماعت کی خلاف ورزی کر گزریں اور جہاد جیسے عظیم ترین رکن ملت کو محض کاہلی اور سستی پر قربان کر دیں اور پھر ان کو معمولی معذرت پر معاف کر دیا جائے اس لیے ضرورت تھی کہ اس معاملہ میں ایسا فیصلہ دیا جائے کہ آئندہ کسی مخلص مسلمان کو ایسی غلط کاری اور نظام کی خلاف ورزی کی جرات نہ ہو سکے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اما هذا فقد صدق ققم حتی يقضى الله فيك.

”تم نے سچ سچ بات کہہ دی، اب جاؤ اور خدا کے فیصلہ کا انتظار کرو۔“

تینوں، اس حکم کے بعد گھر واپس آ گئے اور نبی اکرم ﷺ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم فرما دیا کہ ان تینوں سے کلام و سلام سب ترک کر دیا جائے، چنانچہ تمام مسلمانوں نے ان کا معاشرتی مقاطعہ کر دیا۔



## ضبط و نظم کی عدیم النظیر مثال:

کعب خود فرماتے ہیں کہ اس واقعہ نے ہم تینوں پر جو کچھ اثر کیا اس کا اندازہ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔ میرے دونوں رفیقوں پر تو اس درجہ اثر پڑا کہ انہوں نے باہر نکلنا ہی ترک کر دیا۔ مگر میں سخت جان تھا، برابر نمازوں کے اوقات میں مسجد نبوی میں حاضر ہوتا رہا۔ جب میں مسجد میں حاضر ہوتا تو نبی اکرم ﷺ کو سلام کرتا اور دیکھتا رہتا کہ لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں مگر بد قسمتی اور محرومی کے سوا کچھ نہ پاتا، البتہ یہ محسوس کرتا تھا کہ جب میں نماز میں مشغول ہوتا تو آپ میری جانب دیکھتے رہتے اور جب میں فارغ ہو کر آپ ﷺ کی جانب متوجہ ہوتا تو میری جانب سے رخ مبارک پھیر لیتے۔

لیکن اس تمام واقعہ میں مسلمانوں کی اسلام دوستی اور امر رسول پر امتثال و والہانہ استقامت کا یہ حال تھا کہ جب میں لوگوں کی اس سختی سے اکتا گیا تو ایک روز اپنے سب سے محبوب عزیز اور چچا زاد بھائی ابوقنادہ کے پاس گیا، اس ابوقنادہ کے پاس جو اس سے قبل مجھ پر جان چھڑکتا تھا اور میرا عاشق و جاں نثار تھا، میں نے اس کو سلام کیا، مگر قسم بخدا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس حالت کو دیکھ کر تڑپ گیا اور ابوقنادہ سے کہا! ابوقنادہ! میں خدا کی قسم دے کر تجھ سے دریافت کرتا ہوں، کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں اور میں عاشق خدا اور رسول ہوں؟ ابوقنادہ پھر بھی خاموش رہا اور کوئی جواب نہیں دیا، میں نے دو مرتبہ پھر اس بات کو دہرایا مگر اس نے سکوت ہی اختیار کیا اور کوئی جواب نہ دیا، آخر جب تیسری مرتبہ کہا تو صرف یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

”اللہ ورسولہ اعلم“ ”اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتا ہیں۔“

یہ سن کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں کہ اللہ اکبر! یہ انقلاب اور صرف یہیں تک معاملہ ختم نہیں ہوا بلکہ چالیس دن گزرنے پر رسول اکرم ﷺ نے حکم فرمایا کہ ان تینوں کی رفیقہ حیات کو بھی چاہیے کہ شوہروں سے مقاطعہ کر کے الگ ہو جائیں۔ چنانچہ ان اللہ کی بندیوں نے ہمارے ساتھ قلبی تعلق کے باوجود حکم رسول کو مقدم سمجھا اور اپنے میکے چلی گئیں، البتہ ہلال بن امیہ کی رفیقہ زندگی نے دربار رسالت میں جا کر عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہلال بہت بوڑھے ہیں، ان کی خدمت گزار صرف میں ہوں، دوسرا کوئی نہیں، اگر وہ میری خدمت سے محروم ہو گئے تو ان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے، اب کیا حکم ہے؟ تب آپ نے فرمایا: ”خدمت کرتی رہو، باقی تعلقات کو سرد دست منقطع کر دو یہ سن کر اس نے سر تسلیم خم کر دیا اور اس کے باوجود کہ شوہر اور بیوی یا عزیزوں اور رشتہ داروں کے درمیان دوسرا کوئی موجود نہیں ہوتا تھا تب بھی کیا مجال کہ ایک لمحہ کے لیے بھی کسی نے امر رسول سے انحراف کرنے کی جرات کی ہو۔ اللہ اللہ! یہ ہے سچی شان انقیاد اور اطاعت خدا اور رسول۔“

## عشق رسول اور صداقت اسلام کا حیرت انگیز معیار:

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا چالیس دن سے مسلسل معاشرتی مقاطعہ ہے، غیروں کا تو ذکر ہی کیا، قریبی عزیز و رشتہ دار حتیٰ کہ رفیقہ زندگی بھی اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے حکم پر پروانہ وار نثار ہوتے ہوئے ”کعب“ کا مقاطعہ کئے ہوئے ہیں، گویا اس طرح کعب رضی اللہ عنہ پر خدا کی زمین تنگ ہو گئی اور وہ اس مایوسی اور حیرانی کی حالت میں مدینہ کے بازار سے گزر رہے ہیں کہ اچانک شام کا ایک نبٹلی پکارتا ہوا نظر آیا: ”من یدل علی کعب بن مالک“ ”مجھ کو کوئی کعب بن مالک تک پہنچا دے۔“



لوگوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ کعب وہ جا رہے ہیں، نبی آگے بڑھا اور کعب کی راہ روک کر ان کی خدمت میں ایک خط پیش کیا، کعب نے پڑھا تو شاہ غسان کا خط تھا، اس میں لکھا تھا:

اما بعد! فانه قد بلغني ان صاحبك قد جفاك ولم يجعلك الله يدار هو ان ولا مضية فالحق بنا نواسك. \*  
 ”اما بعد! مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھی (محمد ﷺ) نے تم پر بڑا ظلم کر رکھا ہے، خدا نے تم جیسی ہستی کو اس ذلت اور ضیاع کے لیے نہیں بنایا۔ پس تم فوراً یہاں چلے آؤ ہم تمہاری خاطر خواہ عزت کریں گے۔“

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں خط پڑھتے ہی مجھ کو سخت رنج و ملال ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ یہ آزمائش و بلا پہلی آزمائش سے بھی زیادہ کٹھن ہے، میں اور شاہ غسان کو میرے متعلق یہ گمان کہ اس امتحان سے گھبرا کر اس کے پاس بھاگ جاؤں اور خدا اور خدا کے رسول سے منہ موڑ لوں، آہ یہ بہت ہی تکلیف دہ صورت حال ہے۔ بہر حال شاہ غسان کی اس ذلیل حرکت پر مجھے ایسا غصہ آیا کہ میں ایک تنور کے سامنے پہنچا اور اس کے خط کو اس میں جھونک کر نبی سے کہا: ”یہ ہے تیرے بادشاہ کے خط کا جواب اور میں خدمت اقدس میں حاضر ہو کر بے چینی کے ساتھ عرض رسا ہوا“ ”شاہ ہر دوسرا! آخر یہ اعراض کیوں اس درجہ کو پہنچ گیا کہ اب مشرکین تک مجھے پھسلانے کی جرات کرنے لگے۔“ \*

غرض اسی طرح پچاس راتیں گزر گئیں اور ہماری محرومی کی گرہ نہ کھلی اور ارشاد خداوندی کے بموجب خدا کی زمین وسیع ہونے کے باوجود ہم پر تنگ ہو گئی اور اپنی جان و مال نظر آنے لگی کہ یک بیک صبح کی نماز کے بعد سلح کی چوٹی پر سے ایک پکارنے والے نے پکارا ”اے کعب بشارت ہو“ میں تو انقلاب حال کا منتظر ہی تھا، فوراً سمجھ گیا کہ درگاہ الہی میں توبہ قبول ہو گئی، اب کیا تھا مسرت و خوشی سے پھولانہ سما یا اور وہیں سجدہ میں گر گیا۔

اب جوق در جوق لوگ آ رہے ہیں اور قبول توبہ کا مژدہ سنا رہے ہیں اور کل تک جو اجنبی نظر آتے تھے اس وقت جاں نثار اور محب بن کر اظہار مسرت کر رہے ہیں اور رفقہ حیات کی جانب سے بھی مبارک باد پیش کی جا رہی ہے، سب سے پہلے جس شخص نے مجھ کو قبول توبہ کی مفصل بشارت سنائی وہ ایک سوار تھا، میں نے انتہاء خوشی میں جو کپڑے پہنے ہوئے تھا اتار کر اس کو دے دیئے۔ خدا کی شان کہ میرے پاس اور کپڑے بھی نہیں تھے اس لیے مستعار مانگ کر پہنے اور بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا، راہ میں بھی لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور مجھ پر مبارک باد یوں اور بشارتوں کے پھول، برسائے جا رہے تھے، دربار رسالت پہنچا تو آنحضرت ﷺ آگے بڑھے اور مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارک باد پیش کی، اسی مسرت کے ساتھ میں جلوہ جہاں آرا کا طلب ہوا تو دیکھا کہ چہرہ مبارک مسرت و شادمانی سے برق کی طرح چمک رہا ہے، مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ابشرا بخير يوم مر عليك منذ ولدتك امك.

”اس مبارک دن میں بشارت حاصل کر، تیری ولادت سے آج تک جس سے بہتر کوئی دن نہیں آیا۔“

میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ قبول توبہ آپ کی جانب سے ہے یا خدا کی جانب سے؟ حضور ﷺ نے فرمایا میری جانب سے نہیں خدا کی جانب سے ہے۔“



آپ ﷺ نے یہ جواب مرحمت فرمایا اور رخ انور قمر کی طرح روشن نظر آنے لگا۔ میں نے مسرت کے لہجہ میں عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ”میری قبول توبہ کا ایک جز یہ بھی ہو جائے کہ میں اپنا کل مال خدا کی راہ میں تصدق کر دوں۔“ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بہتر یہ ہے کہ کچھ حصہ اپنے لیے رکھ لو“ میں نے عرض کیا: ”بہتر ہے، خیبر کا جو حصہ میرے پاس ہے اس کو روک لیتا ہوں“ میں نے یہ بھی عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ یہ سچائی کا صدقہ ہے کہ آج اس نعمت بیکراں سے مالا مال ہوں اس لیے عہد کرتا ہوں کہ عمر بھر صدق مقال کے ماسواء میرا شعار کچھ نہ ہوگا۔

حضرت کعب بن لؤیؓ فرماتے ہیں میرے اس معاملہ میں میں رنج و غم کے ہر دور رفقاء کا بھی مسرت و بہجت سے یہی حال ہوا اور ہماری قبول توبہ پر جو آیات فضل نازل ہوئی تھیں نبی اکرم ﷺ نے ہمارے سامنے ان کی تلاوت فرمائی۔

### قبول توبہ اور سورہ توبہ:

﴿لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبَ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٤﴾ وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَفُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَّتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحَبَتْ وَضَاقَّتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوٓا۟ أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ۖ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١١٥﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿١١٦﴾﴾ (التوبہ: ۱۱۷-۱۱۹)

”بے شک اللہ اپنی رحمت سے نبی پر متوجہ ہو گیا اور مہاجرین اور انصار پر بھی جنہوں نے بڑی تنگی اور بے سروسامانی کی حالت میں اس کے پیچھے قدم اٹھایا اور اس وقت اٹھایا کہ قریب تھا ان میں سے ایک گروہ کے دل ڈگمگائیں، پھر وہ اپنی رحمت سے ان سب پر متوجہ ہو گیا۔ بلاشبہ وہ شفقت رکھنے والا، رحمت کرنے والا ہے، اور ان تین شخصوں پر بھی (اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہوا) جو معلق حالت میں چھوڑ دیئے گئے تھے حتیٰ کہ نوبت یہ آگئی کہ زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی تھی اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آگئے تھے اور انہوں نے جان لیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انہیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی مگر خود اسی کے دامن میں۔ پس اللہ ان پر اپنی رحمت کے ساتھ لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں، بلاشبہ اللہ ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے، بڑا ہی رحمت والا۔“

### قرآن عزیز اور غزوہ تبوک:

قرآن عزیز نے صرف اسی واقعہ کا ذکر نہیں کیا بلکہ غزوہ تبوک کی اہمیت کے پیش نظر اس کی بہت سی تفصیلات بیان کیں اور اس سلسلہ میں پند و موعظت کے ذریعہ مسلمانوں کی رشد و ہدایت کا سامان مہیا کیا ہے۔ چنانچہ اس سورہ میں چھٹے رکوع سے لے کر آخر سورہ تک اسی غزوہ اور غزوہ سے متعلق حالات و مواضع کا تذکرہ ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّا قَلَّتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۖ ... إِلَى ... فَإِن تَوَلَّوْا فَعَلَّ حَسْبِيَ اللَّهُ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿١٢٩﴾﴾ (التوبہ: ۳۸، ۱۲۹)



## اہم غزوات اور نتائج و بصائر

### بدر الکبریٰ:

① عقائد اسلامی و افکار ملی کے بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ فتح و شکست کا مدار عددی اکثریت و اقلیت پر نہیں ہے بلکہ صرف عنایت خداوندی اور اس کے فضل و کرم پر ہے۔

﴿كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (البقرہ: ۲۴۹)

② جو جماعت احساس فرض کے ساتھ عدل و نصفت کے لیے میدان میں نکلتی ہے کبھی ناکام نہیں ہوتی اور انجام اسی کے ہاتھ رہتا اور خدا کی نصرت کا پیغام اسی کو نصیب ہوتا ہے۔

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ﴾ (آل عمران: ۱۲۳)

③ اگر قلب میں اخلاص اور صداقت حق کا جذبہ موجود ہو۔ اور خدا اور اس کے رسول پاک ﷺ کے حکم و ارشاد کے سامنے گردن خم ہے تو بہ اسباب دنیوی بشری تقاضے کے پیش نظر اپنی جانب سے خوف و ہراس قابل ملامت نہیں ہے اور خدائے برتر ضرور اس کو ثبات و استقامت عطا فرماتا ہے۔

④ ”صبر و استقامت“ ایسے بیٹھے پھل ہیں جن کی شیرینی دنیا و دین دونوں ہی میں لذت و سکون اور رفعت و سعادت سے ہمکنار کرتی ہے، چنانچہ غزوہ بدر الکبریٰ اس حقیقت کے لیے زندہ جاوید شہادت ہے۔

⑤ باطل سے برسر پیکار حامل حق و صداقت جماعت بہ اسباب دنیوی جس قدر زیادہ بے یار و مددگار ہوتی ہے خدا کی نصرت و حمایت اسی قدر زیادہ معجزانہ کرشمے دکھا کر حمایت حق کا ساتھ دیتی اور باطل کو ناکام بنا کر حق کو شاد کام کرتی ہے۔ چنانچہ بدر میں ابررحمت کا نزول، ملائکہ اللہ کا ورود نظر مسلم میں دشمن کی کثیر تعداد کا مشاہدہ قلیل اور مشرکین کی نگاہ میں مسلمانوں کی تعداد قلیل کا مشاہدہ کثیر، یہ سب معجزانہ امور اسی قانون الہی کی کرشمہ سازیاں تھیں۔

### غزوہ احد:

① جہاد مخلص و منافق کی معرفت کے لیے بے نظیر کسوٹی ہے، چنانچہ غزوہ احد اور غزوہ تبوک میں یہ حقیقت نمایاں نظر آتی ہے۔ چنانچہ احد کے موقع پر راس المنافقین عبداللہ بن ابی اپنی جماعت کے ساتھ لشکر اسلامی سے یہ کہہ کر جدا ہو گیا کہ محمد (ﷺ) نے چونکہ ہمارا مشورہ نہیں مانا اس لیے ہم کیوں میدان جہاد میں جا کر ہلاکت میں پڑیں اور غزوہ تبوک میں یہ کہہ کر لوگوں کو



فداکاری و جاں نثاری سے روکتا رہا ﴿لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ﴾ گرمی کی شدت میں جنگ کی آگ کے اندر نہ کودو اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا: ﴿نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا﴾ جہنم کی آگ کی شدت دنیا کی گرمی کی شدت سے کہیں زیادہ سخت ہے۔

② امیر خلیفہ اور اس کے نائبین کا فرض ہے کہ اہم امور میں مسلمانوں سے مشورہ کرے، اور باتفاق رائے یا بکثرت رائے جو فیصلہ ہو اسی کو اپنا "عزم" بنائے۔

نبی اکرم ﷺ پر نزول وحی ہوتا تھا اس لیے آپ ﷺ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ نہ بھی فرماتے تو کوئی قباحت نہ تھی تاہم "اسوۂ حسنہ" کو شعار بنانے کے لیے آپ ﷺ اہم امور میں برابر مسلمانوں سے مشورہ فرماتے رہے، چنانچہ غزوہ احد میں بھی مشورہ فرمایا اور اس مشورہ کی یہ خصوصیت ہے کہ خود ذات اقدس ﷺ اور معمر و تجربہ کار صحابہ رضی اللہ عنہم کو جن کی قوت و اصابت رائے پر آپ ﷺ کو اعتماد تھا کی رائے یہ تھی کہ غزوہ احد کے موقع پر مسلمانوں کو مدینہ سے نکل کر جنگ نہیں کرنی چاہیے مگر اکثریت کے لحاظ سے ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد بہت زیادہ تھی، جن کا اصرار تھا کہ ہم کو مدینہ سے باہر میدان میں نکل کر جنگ کرنی چاہیے، تو آپ ﷺ نے اکثریت کے فیصلہ کو برقرار رکھتے ہوئے باہر نکل کر جنگ کرنے کو ہی ترجیح دی اور اس عملی اسوۂ حسنہ کو اپنے مسطورہ ذیل ارشاد مبارک سے محکم و مضبوط بنا دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے یہ استفسار کیا: مال عزمیہ رسول اللہ ﷺ! اے خدا کے رسول! (قرآن میں مذکور ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ﴾ میں "عزم" سے کیا مراد ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مشاورۃ اهل الراي ثم اتباعهم)).

اہل الرائے سے مشورہ کرنے کے بعد (امام و خلیفہ کا) ان کی دی ہوئی رائے پر عمل پیرا ہونے کا نام "عزم" ہے۔

③ تمام معاملات میں عموماً اور جہاد و میدان جنگ میں خصوصاً "ضبط و نظم" اہم امور میں سے ہے، اگر کسی جماعت میں اس کا فقدان ہے تو وہ جماعت حامل حق و صداقت ہی کیوں نہ ہو، کامیابی و کامرانی کا سہرا اس کے سر نہیں ہو سکتا اور جس درجہ اس بنیادی حقیقت کار میں کمی ہوگی اسی قدر اس جماعت میں اضمحلال اور ضعف غالب ہوگا۔

غور کیجئے کہ غزوہ احد میں مشرکین کے مقابلہ میں تیر بار مسلم جماعت کے نظم و ضبط کی خلاف ورزی نے کس طرح مسلمانوں کی فتح و نصرت کو اچانک شکست کے ساتھ بدل دیا، پیغمبر خدا ہادی اعظم ﷺ شریک جنگ ہیں، مسلمان مشرکین پر غالب اور مشرکین ہزیمت سے دو چار ہو رہے ہیں کہ مال غنیمت کے شوق میں اپنے سردار کے منع کرنے کے باوجود جب تیر بار جماعت نے گھائی چھوڑ دی تو یک بیک فتح شکست سے بدل گئی اور صرف یہی نہیں بلکہ سردار دو عالم ﷺ کو بھی چشم زخم پہنچا اور دندان مبارک تک شہید ہو گیا۔ ﴿فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ﴾

④ یہ ضروری نہیں ہے کہ جب کبھی حق و باطل میں معرکہ آرائی ہو تو حق ضرور جیت جائے اور ابتدائے کار میں بھی اس کو کبھی شکست نہ ہو، اگر ایسا ضروری ہو تو حق و باطل کی آزمائش و امتحان کی کوئی سبیل باقی نہ رہے اور قبول حق و باطل اختیاری نہ رہے اضطراری بن جائے، یہی حقیقت ہے جس کو ابوسفیان کے اس جواب پر "الحرب سجال" جنگ ان دو ڈولوں کی طرح ہے جو ایک رسی میں



اس طرح بندھے ہوں کہ کبھی ایک نیچے پانی میں چلا جاتا ہے اور دوسرا ابھر آتا ہے اور کبھی پہلا ابھر آتا ہے۔ رومہ کے شہنشاہ ہرقل (ہرکلوس) نے کہا تھا کہ ”تیرا یہ قول سچ ہے کہ کبھی تم کو فتح ہو جاتی ہے اور کبھی اس مدعی رسالت (ﷺ) کو، اور کبھی تم شکست کا منہ دیکھتے ہو اور کبھی وہ، تو اے سفیان! نبی و رسول کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جنگ کے موقعہ پر کبھی بھی اس کو شکست نہ ہو، ہاں البتہ یہ از بس ضروری ہے کہ اس معرکہ آرائی کا آخری انجام حق کی فتح اور باطل کی شکست پر جا کر ختم ہو جائے گا۔“

⑤ میدان جہاد میں منافق اور ضعیف اعضاء کا جدار ہنا ہی مفید اور کامیابی کے لیے از بس ضروری ہے، اسی لیے جن غزوات میں منافقین نے مسلمانوں میں ضعف پیدا کرنے کے لیے شرکت جنگ سے پہلو تہی کی یا میدان میں نکل کر واپس ہو گئے تو ان کی یہ ناپاک حرکت مسلمانوں کو ذرہ برابر بھی نقصان نہ پہنچا سکی، بلکہ اس کے برعکس مخلص فداکاروں اور جاں نثاروں کی چھوٹی سے چھوٹی تعداد نے بھی وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ باطل کا قلع قمع ہو کر رہ گیا۔

### غزوة احزاب:

① کائنات انسانی پر خدا کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ذات اقدس محمد ﷺ کے ذریعہ ”اخوت و مساوات“ کا وہ عظیم الشان علمی و عملی نقشہ پیش کیا کہ جس کی مثال عالم انسانی کی تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے۔

غزوة خندق میں سرور دو عالم ﷺ نے اپنے جاں نثار رفقاء کے ساتھ بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کھودنے اور ٹوکری میں بھر کر اس کی مٹی منتقل کرنے میں جس طرح برابر کا حصہ لیا وہ اگر ایک طرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیوی بادشاہ شہنشاہ اور ہادی اعظم نبی و رسول کے درمیان کس قدر عظیم فرق ہے، اسی طرح یہ بھی روشن کر دیتا ہے کہ اسلام کے مقدس جھنڈے کے نیچے خدمت حق کے لیے خلیفہ و امام اور ہادی برحق تک بھی کس طرح ایک سپاہی کے دوش بدوش ادنیٰ سے ادنیٰ کام میں برابر کا شریک و سہم بن جاتا ہے۔

② کفار کی تمام جماعتوں کے متفقہ حملہ کے وقت حضرت سلمان فارسی کا مشورہ دینا کہ ایسے نازک وقت میں اہل فارس کا یہی دستور ہے اور نبی اکرم ﷺ کا ان کے دیئے ہوئے مشورہ کو قبول فرمانا دلیل ہے اس امر کی کہ ہر زمانہ میں وقت کے ترقی یافتہ وسائل دنیوی کو امر حق کی حمایت کے لیے اختیار کرنا اور اپنا نا اسلام سے انحراف نہیں بلکہ بہترین اسلامی خدمت ہے۔ بشرطیکہ وہ اسباب و وسائل اسلامی اصول و احکام سے متصادم نہ ہوں۔

③ ”جہاد“ اسلام کا اس درجہ عظیم الشان رکن اور اس کی بقاء و حفاظت کے لیے ایسا اہم فریضہ ہے کہ اس اداے فرض و مشغولیت میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا نماز جیسا اہم فریضہ قضا ہو گیا اور آپ ﷺ نے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے عصر کی نماز مغرب کے وقت ادا فرمائی۔ اور نماز کیسا اہم سے اہم تر فریضہ ہے اس حقیقت سے واضح ہوتا ہے کہ جہاد جیسے عظیم الشان فداکارانہ اور جاں نثارانہ عمل کے وقت بھی جبکہ انسان میدان جہاد میں جان ہتھیلی پر لیے مشغول جنگ ہوتا ہے، عبادت الہی سے غافل نہیں رکھا گیا اور ایسے وقت میں نص قرآنی نے ”صلوٰۃ خوف“ کی طرح ڈال کر نماز کی اہمیت و جلالت قدر پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

④ جنگ میں ایسے طریقے اختیار کرنا صحیح ہیں جن میں کذب اور خلف وعدہ جیسے قبیح امور کا دخل نہ ہوتے ہوئے دشمن کو بغیر جنگ ہی



کے نقصان و ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑ جائے، یا وہ یہ صحیح اندازہ نہ کر سکے کہ اسلامی لشکر کا رخ کس جانب ہے اور اس طرح حقیقت حال مستور ہو کر دھوکے میں پڑ جائے، چنانچہ غزوات اسلامی میں یہ دونوں پہلو عملی لباس میں صاف نظر آتے ہیں اور یہی مفہوم ہے ارشاد نبوی ((الحرب خدعة)) کا۔

## صلح حدیبیہ:

① اجتماعی مصالح اسلامیہ اگر متقاضی ہوں تو خلیفہ اور امیر المؤمنین کو اختیار ہے کہ وہ کفار مشرکین سے ایسی صلح کر لے جو اگرچہ بظاہر حال شکست خوردہ نظر آتی ہو، مگر وقت نظر اور فکر عمیق کا یہ فتویٰ ہو کہ ثمرہ اور نتیجہ کے لحاظ سے یہ مسلمانوں کے حق میں فتح مبین اور ظفر و نصر کا سبب ثابت ہوگی، جیسا کہ حدیبیہ کے صلح نامہ کی دفعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

② بسا اوقات ہماری ظاہر بین نظریں ایک معاملہ کو موجب توہین سمجھتی اور اس کو کراہت سے دیکھتی ہیں لیکن وہ خدا کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہتر اور موجب عزت بننے والی ہوتی ہے اسی طرح بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جس شے کو ہماری نظریں خیر اور موجب فلاح سمجھتی ہیں وہ ثمرہ اور نتیجہ کے اعتبار سے باعث شر اور موجب ذلت و رسوائی ہو جاتی ہے۔ اس لیے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو ہر معاملہ میں اسوۂ حسنہ بنائے اور اپنی عقل و خرد پر اعتماد کر کے ان کی

خلاف ورزی پر آمادہ نہ ہو جائے۔ ﴿وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ﴾  
 ③ معاہدات اقوام و امم میں اسلام کی امتیازی شان یہ ہے کہ ”نقض عہد، کو ”عذر“ سمجھے اور یقین کرے کہ عہد کی خلاف ورزی کرنے والا نہ دنیا میں صاحب عزت ہو سکتا ہے اور نہ عالم آخرت میں اس کو فلاح نصیب ہو سکتی ہے بلکہ روز قیامت اس کے ہاتھ میں غداری کا جھنڈا ہوگا تاکہ کائنات انسانی کے سامنے اس کے عذر کا مظاہرہ ہو سکے۔ ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۚ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝۳۳﴾

④ جو لوگ قلت تعداد اور فقدان اسباب ظاہری کے باوجود خدا کے رسول کے ہاتھ پر فداکاری اور جاں نثاری کے لیے حدیبیہ میں بیعت کر رہے تھے خدا نے ان کے اس ایثار و عقیدت حق کی جزاء عظیم یہ عطاء فرمائی کہ قرآن حکیم میں بصراحت ان کو اپنی خوشنودی کی سند بخشی اور اسی مبارک سند کی بنا پر وہ بیعت ”بیعت رضوان“ کے نام سے رہتی دنیا تک موسوم ہوئی، پس یہ واقعہ برہان قاطع ہے اس امر کے لیے کہ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝۱۱﴾

⑤ اگر آزادی ضمیر نصیب ہو اور تعصب راہ میں حائل نہ ہو تو اسلام ایسا دین فطرت ہے کہ خود بخود کائنات انسانی کو اپنے اندر جذب کرتا چلا جاتا ہے، چنانچہ ”صلح حدیبیہ“ نے اس لیے ”فتح مبین“ کا لقب پایا کہ جب مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ایک معاہدہ کے ذریعہ جنگ کا التوا ہو گیا تو مشرکین کو امن و اطمینان کے ساتھ مسلمانوں میں میل جول کا موقع ملا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دعوت اسلام کے وقت سے حدیبیہ کے وقت تک فداکاران اسلام کی جو تعداد تھی تقریباً اٹھارہ یا بائیس مہینوں کے اندر اندر اس سے زیادہ شمع اسلام کے پروانے نظر آنے لگے، ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ مشرکین نے دیکھا کہ قوم مسلم اپنے اخلاق و اعمال اور کردار و گفتار بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں صادق و عادل، حق پسند و حق آگاہ ہے اور اس کی جماعتی و انفرادی حیات کا پایہ وقت کی تمام اقوام و ملل سے بلند تر ہے۔



## فتح مکہ:

- ① مسلمان جب کسی غیر مسلم طاقت سے معاہدہ کر لیں تو جس مدت کے لیے معاہدہ ہوا ہے ان کا اسلامی فرض ہے کہ اس مدت کو اپنی جانب سے پورا کریں اور نقض عہد نہ کریں البتہ اگر معاہدہ طاقت کی جانب سے خلاف ورزی ہو تو پھر مسلمان بری الذمہ ہیں بلکہ بعض حالات میں نقض عہد کرنے والی طاقت کا استیصال از بس ضروری ہے جیسا کہ فتح مکہ کے اسباب سے ظاہر ہوتا ہے۔
- ② فتح مکہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عنوة (بہ زور طاقت) فتح ہونے کے باوجود خون ریزی سے محفوظ رہا، اور نبی اکرم ﷺ نے حرم کعبہ کے احترام و عظمت کے پیش نظر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ہدایت دیتے ہوئے ابتداء ہی میں ارشاد فرمادیا تھا کہ داخلہ حرم کے وقت ہرگز کسی پر تلوار نہ اٹھائی جائے، الا یہ کہ مشرکین میں سے کوئی از خود اقدام کرے اور اس لیے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ذریعہ رجز کے خلاف ”الیوم یوم الرمحہ“ فرما کر اس حقیقت حال کو خوب روشن کر دیا۔
- ③ دنیوی شہنشاہ اور نبی الرحمتہ کے درمیان اگر فرق و امتیاز معلوم کرنا ہو تو فتح مکہ اس کے لیے روشن برہان ہے، تاریخ سے دریافت کرو کہ جب کوئی بادشاہ شہنشاہ کسی ملک کو فتح کرتا تو اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا تھا۔ یہی کہ مفتوح قوم پر مظالم کرے، قتل و غارت کر کے ان کو غلام بنائے یا تلوار کے گھاٹ اتارے، لیکن جب نبی الرحمتہ کو اقتدار اعلیٰ نصیب ہوا اور فتح مکہ کی صورت میں مشرکین و کفار پر یہ ید قدرت حاصل ہو تو اس مقدس ہستی نے کیا کیا؟ صرف یہ کہ ان کو جمع کیا اور اعلان کر دیا:

((لا تثریب علیکم الیوم اذہبوا اتمم الطلقاء))۔

”آج تم پر گزشتہ بد اعمالیوں اور سفاکیوں پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔“

ایک شخص عمر بھر نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود جب فتح مکہ کے وقت کانپتا، خوف کھاتا اور لرزتا ہوا حاضر خدمت ہوا ہے تو اس وقت بھی نبی الرحمتہ کی زبان اقدس اس حقیقت کا اعلان کرتی ہے جس سے آپ ﷺ کی شان پیغمبری نمایاں نظر آتی ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں:

”خوف نہ کرو! میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں بلکہ تمہاری طرح خشک گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔“

- ④ کافر و مشرک گروہ اگر اسلامی طاقت کا حلیف بنا چاہے تو بہ تقاضائے مسلم مفاد اس کو حلیف بنایا جاسکتا ہے بلکہ بعض حالات میں حلیف بنانا از بس ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ حلیف کے مال اور اس کی جان و آبرو سب کو اپنے مال جان اور آبرو کی طرح سمجھے اور اسی قسم کا معاملہ کرے جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

## غزوة حنین:

- ① ایک لمحہ کے لیے بھی کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ فتح و شکست کا مدار ”کثرت تعداد“ پر سمجھے بلکہ اس کا یقین راسخ ہر حالت میں خدا کی نصرت کے ساتھ وابستہ رہنا چاہیے۔ چنانچہ بدر میں اعتماد علی اللہ نے ذلت و قلت کو عزت و کثرت کے ساتھ بدل دیا اور حنین میں اپنی کثرت تعداد پر اعتماد نے کثرت و شوکت کو مبدل بہ ہزیمت بنا دیا۔ ﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾
- ② اگر اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کا تقاضا ہو تو ایک غیر مسلم طاقت کے مقابلہ میں دوسری غیر مسلم طاقت یا غیر مسلم جماعت کا



تعاون و اشتراک حاصل کرنا بلاشبہ درست اور مشروع ہے، اسی لیے حنین میں نبی اکرم ﷺ نے ”طلاق“ کو شریک جنگ رکھا اور جنگ میں استعانت من المشرکین کے مسئلہ میں بلحاظ دلائل اگرچہ قبول و عدم قبول دونوں قسم کے اقوال موجود ہیں، لیکن قرآن حدیث کی روشنی میں جمہور کا مسلک جواز و قبول ہی کا ہے۔ چنانچہ محدثین و فقہاء امت نے کتاب الجہاد میں اس کی تصریح کر دی ہے۔

### غزوہ تبوک:

① مفاد اسلامی کے پیش نظر جب خلیفۃ المومنین نفیر عام (جہاد عام) کا اعلان کر دے تو ادائے فرض کے مقابلہ میں ہر قسم کی مشکلات ہیچ ہو جانی چاہئیں، اور اسباب و وسائل کی پریشانیاں ہرگز راہ میں حائل نہ رہنی چاہئیں غزوہ تبوک ہم کو اسی جاننا رہنمائی کرتا ہے۔

② جہاد اور نفیر عام کے موقعہ پر مالی اعانت بھی جہاد ہی کا اہم شعبہ ہے اور

گر زرِ طلبی سخن در نیست  
گر جاں طلبی مضائقہ نیست

کے خلاف عزم و عمل اور خلوص و صداقت کی روشن دلیل ہے، اس لیے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے غزوہ تبوک میں مالی اعانت کا اپیل پر ایک دوسرے سے مسابقت کی اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا کل مال راہ خدا میں دے کر صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام گھر میں باقی چھوڑا۔

③ جماعتی زندگی میں جن لوگوں کے متعلق شروع سے ہی یہ معلوم ہو کہ جماعت میں ان کی شرکت از راہ خلوص نہیں بلکہ از راہ تفاق ہے وہ اگر جہاد جیسے فداکارانہ عمل سے پہلو تہی کرنے کے لیے کوئی بہانہ کر کے میدان جہاد سے جی چرائیں تو ان سے درگزر کی جاسکتی ہے کہ ان کی عدم شرکت مفید ہی ہے نہ کہ مضرت رساں لیکن مخلص و ایثار پیشہ فرد جماعت اگر ایسے نازک موقعہ پر کوتاہی کر جائے جیسا کہ غزوہ تبوک کا اہم معاملہ تھا تو یہ کوتاہی ناقابل معافی جرم ہے تا وقتیکہ ماضی پر ندامت اور مستقبل میں ایسی شہنشاہت سے پرہیز کے عزم کے ساتھ درگاہ الہی میں عجز و نیاز سے تائب نہ ہو جائے۔

④ اسلامی احکام کی کھلی خلاف ورزی پر مسلمانوں کا کسی فرد مسلم یا جماعت مسلمہ کے خلاف سوشل اور معاشرتی مقاطعہ درست ہے بلکہ بعض اہم اور نازک حالات کے پیش نظر کبھی واجب اور ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ایک جانب مسلمانوں میں ضبط و نظم کا صحیح جذبہ پیدا ہو جائے، اور دوسری جانب مخلص و منافق کے درمیان بین تفاوت نظر آنے لگے۔





## تسبی

رسوم جاہلیت میں سے ایک رسم تسبی (گود لے کر بیٹا بنانا) بھی ہے، یہ رسم مشرکین عرب و عجم میں یکساں رائج تھی، اس رسم قبیح کے ثمرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بچہ اپنے حقیقی ماں باپ کے انتساب سے کٹ کر ایک اجنبی کے لیے صلیبی بیٹے کی طرح ہو جاتا اور اس کے خاندان کے تمام محارم اس کے محارم بن جاتے ہیں۔ نیز اس اجنبی کے حقیقی ورثاء کو محروم وراثت بنا کر خود اس کی تمام جائیداد کا مالک بن جاتا یا اپنی موت پر اپنے حقیقی ورثاء کو محروم رکھ کر اجنبی کو اپنا وارث بناتا ہے اس لیے بلاشبہ یہ رسم نسبی انتساب اور معاشرتی نظام دونوں لحاظ سے مذموم و قبیح اور خلاف فطرت ہے۔

اسلام جو کہ انسان کے ہر شعبہ حیات کو مکروہ جراثیم سے پاک کرنے اور ان میں انقلاب و اصلاح کی روح پھونک کر نظام کائنات کو بہتر و خوب تر بنانے آیا ہے اس نے اس رسم بد کے انسداد پر بھی توجہ کی اور ایک خاص واقعہ کو سامنے رکھ کر ارادہ کیا کہ معاشرت میں گندھی ہوئی اس رسم پر ایسی ضرب کاری لگائے کہ مسلمانوں میں سے ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ ہو جائے اور غیر مسلم بھی اس کی معقولیت پر سر تسلیم خم کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔

انسداد تسبی کے لیے خدائے برتر نے جس واقعہ کو منتخب فرمایا اس کی روداد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی زندگی سے وابستہ ہے۔

### حضرت زید رضی اللہ عنہ:

حضرت زید رضی اللہ عنہ کا تعارف اسد الغابہ میں ابن اثیر جزری نے اس طرح کرایا ہے: زید بن حارثہ بن شراحیل رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام (مولیٰ) ہیں اور بہت ہی محبوب صحابی ہیں۔ یہ عرب کے معزز قبیلہ بنی کلب کے ایک فرد تھے، مگر بچپن ہی میں ایک حادثہ کی وجہ سے غلام بنا لیے گئے، صورت یہ پیش آئی کہ ان کی والدہ ان کو ساتھ لیے اپنے خاندان بنی معمن میں جا رہی تھیں راہ میں قبیلہ بنی قین نے ان کو لوٹ لیا اور زید کو بھی لے گئے اور عکاظ کے بازار میں لا کر فروخت کر دیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے برادر زادہ حکیم بن حزام نے ان کو اپنی پھوپھی کے لیے خرید لیا۔ یہ ابھی آٹھ سال کے ہی تھے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو نبی اکرم ﷺ کی رفیقہ حیات ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔ اور انہوں نے زید کو حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں ہبہ کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کو آزاد کر کے اپنا بیٹا بنا لیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم اس دن سے زید کو ابن محمد ﷺ کہنے لگے اور اس وقت تک کہتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ﴾ ”مسلمانو! تم لے پا لکوں کو ان کے باپ دادا کی نسبت ہی سے پکارا کرو۔“ نبی اکرم ﷺ نے زید اور اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کے درمیان بھائی چارہ کر دیا اور وہ دونوں حقیقی بھائیوں کی طرح رہنے لگے، ادھر زید کی گم شدگی نے ان کے والد حارثہ کو غم سے نڈھال کر دیا تھا۔ حسن اتفاق کہ بنی کلب کے چند آدمی حج کی نیت سے مکہ



آئے تو زید کو دیکھا اور پہچان لیا۔ زید نے بھی ان کو پہچانا اور اپنے قبیلہ کو اپنی موجودگی کا پیغام دیا، حارثہ اور ان کا بھائی کعب دونوں نے جب یہ سنا تو فوراً بھاگے ہوئے مکہ آئے اور دربارِ قدسی میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ اب زید کو ہمارے حوالہ کر دیجئے اور زرفند یہ لے لیجئے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اس سے بہتر یہ بات ہے کہ زید آجائے اور اس کے سامنے دونوں صورتیں پیش کر دی جائیں، وہ تمہارے ساتھ جانا قبول کرتا ہے یا میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے اور جو اس کی مرضی ہو اس پر ہم بھی راضی ہو جائیں۔“

حارثہ بخوشی اس پر رضامند ہو گئے کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ بیٹا بہر حال باپ کو ہی ترجیح دے گا، چنانچہ زید بلائے گئے ذاتِ اقدس ﷺ نے دریافت فرمایا ان کو پہچانتے ہو؟ زید نے کہا کیوں نہیں، یہ میرے والد ہیں اور یہ چچا ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: یہ لینے آئے ہیں، اب تم مختار ہو، ان کے ساتھ چلے جاؤ یا میرے پاس رہو، زید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا! میں آپ پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، میرے باپ چچا جو کچھ بھی ہیں، آپ ﷺ ہی ہیں، حارثہ نے یہ سنا تو رنج و تکلیف کے ساتھ کہا: ”زید کس قدر افسوس ہے تجھ پر کہ غلامی کو آزادی پر اور باپ دادا اور خاندان پر اجنبی کو ترجیح دے رہا ہے۔“ زید نے کہا: ”اس ہستی کے ساتھ رہ کر میری آنکھوں نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے اس کے بعد میں دنیا و مافیہا کو اس کے سامنے ہیچ سمجھتا ہوں۔“

تب نبی اکرم ﷺ نے حارثہ اور حاضرین کو بتلایا کہ میں نے زید کو آزاد کر دیا ہے۔ اب وہ میرا غلام نہیں بلکہ بیٹا ہے، حارثہ نے یہ سنا تو بہت خوشی کا اظہار کیا اور باپ اور چچا دونوں مطمئن واپس گئے۔ اور گاہے گاہے آ کر دیکھ جاتے اور آنکھیں ٹھنڈی کر جایا کرتے تھے۔

ترمذی کی ایک مختصر روایت میں حارثہ کی جگہ ان کے دوسرے بیٹے جبلیہ کی آمد اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مسطورہ بالا گفتگو کا ذکر ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی مزید قدر افزائی کے لیے ان کا نکاح اپنی دودھ پلائی (حاضنہ) ام ایمن کے ساتھ کر دیا، جن کے بطن سے حضرت اسامہ پیدا ہوئے اور اس کے بعد ارادہ کیا کہ ان کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش کے ساتھ کر دیں۔ یہ ہاشمی خاندان کی بیٹی اور آپ کی پھوپھی امیہ بنت عبدالمطلب کی لخت جگر تھیں، اس لیے زینب رضی اللہ عنہا اور زینب کے بھائی اس عقد پر راضی نہیں تھے تب وحی الہی نے نازل ہو کر یہ حکم دیا کہ جس بات کا حکم اللہ اور اس کا رسول دے پھر اس کی خلاف ورزی کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلًّا مُّبِينًا ۗ﴾ (الاحزاب: ۳۶)

”جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کر دے تو پھر کسی مرد مومن اور عورت مومنہ کو ان کے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے بلاشبہ وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔“

وحی الہی کے نزول پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے بھائیوں نے آپ کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اس طرح



آپ نے خاندان سے ہی عملی طور پر فخر بالانساب کی جڑ کاٹ دی تاکہ آپ کا عمل اسوۂ حسنہ بنے۔ حضرت زید کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ قرآن میں ان کا نام بصراحت مذکور ہے۔ یہ شرف کسی اور صحابی رسول ﷺ کو نصیب نہیں ہوا۔

### انسداد تہنی:

حضرت زید اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما اگرچہ حوالہ عقد میں منسلک ہو گئے تھے لیکن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا یہ فطری رجحان مٹ نہ سکا کہ وہ قریشی ہاشمی ہیں اور ان کا شوہر آزاد شدہ غلام، اسی طرح حضرت زید رضی اللہ عنہ کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ بہر حال عرب کے معزز قبیلہ کے فرد اور نبی اکرم ﷺ کے منہ بولے بیٹے ہیں اور زینب رضی اللہ عنہا پر ان کو قوام ہونے کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ ان دو متضاد ذہنیتوں نے ان کے آپس میں محبت کا رشتہ قائم نہ ہونے دیا اور آخر کار زید اس پر آمادہ ہو گئے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دیں، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے متعدد بار اس ارادہ کا حضور اقدس ﷺ سے تذکرہ کیا، مگر آپ ﷺ نے یہ سمجھ کر کہ شاید دیر پا مدت ازدیاد محبت کا باعث ہو جائے زید کو طلاق دینے سے روکا۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ناچاقی نے اب صورت حال بدل دی اور وحی الہی نے یہ فیصلہ کر دیا کہ وقت آ گیا ہے کہ اب ”تہنی کی رسم بد“ کا خاتمہ کر دیا جائے اور جس طرح آپ ﷺ نے فخر بالانساب کے پہلو کو اپنے خاندان ہی میں سب سے پہلے شکست دی اسی طرح اس کی ابتداء بھی خود ذات اقدس ﷺ کے ہی عمل سے ہو اور یہ اس طرح کی زید رضی اللہ عنہ جب طلاق دے دیں تو پھر زینب رضی اللہ عنہا کا عقد آپ ﷺ سے ہو جائے، کیونکہ اس سے ایک طرف زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے خاندان کو جو صدمہ پہنچے اس کا اندمال ہو سکے اور دوسری جانب تہنی کی رسم بد کا انسداد ہو جائے۔

نبی اکرم ﷺ کو جب وحی الہی نے یہ نقشہ بتلایا تو بر بناء بشریت آپ ﷺ کے قلب میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ زید رضی اللہ عنہ اگر زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق نہ دے تو اچھا ہے تاکہ زینب رضی اللہ عنہا کے خاندان کو بھی تو ہین محسوس نہ ہو اور میں بھی منافقین اور مشرکین کے اس طعن و تشنیع سے محفوظ رہوں کہ وہ یہ کہیں گے ”محمد (ﷺ) نے اپنے بیٹے کی بیوی کو اپنی بیوی بنا لیا، حالانکہ دوسروں کے لیے بیٹے کی بیوی کو حرام بتاتے ہیں۔“ چنانچہ آپ برابر زید رضی اللہ عنہ کو طلاق سے باز رکھتے رہے، مگر جب کسی طرح باہم موافقت نہ ہو سکی تب زید نے طلاق دے ہی دی اور عدت گزرنے پر خدا کا حکم ہوا کہ اب زینب رضی اللہ عنہ کو آپ اپنی بیوی بنا لیں تاکہ آئندہ منہ بولے بیٹے کی رسم کا خاتمہ ہو اور مسلمانوں کی معاشرت میں یہ تنگی نہ پیدا ہو سکے کہ منہ بولے بیٹے کی بیوی کے نکاح کو صلیبی بیٹے کی بیوی کی طرح حرام سمجھا جائے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی وحی نے یہ بھی واضح کر دیا کہ خدا جو فیصلہ کر چکا ہے وہ تو ظاہر ہو کر ہی رہے گا اور تمہارے بشری خوف سے وہ ٹلنے والا نہیں ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ حکم الہی کے مقابلہ میں سماج انسانی کا خوف ہیچ دریچ ہے۔

قرآن عزیز نے انسداد تہنی کے معاملہ کو دو شقوں میں تقسیم کر دیا ہے: ایک ذہنی و علمی انقلاب اور دوسرا عملی، چنانچہ ذہنی اصلاح و انقلاب کے لیے حسب ذیل آیات نازل فرمائیں:

﴿وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ۚ ذَلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ۗ اُدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ ۚ فَإِنْ لَمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَاخْوَانِكُمْ فِي



الدِّينِ ﴿۱۷۷﴾ (الاحزاب: ۴-۵)

”اور اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (حقیقی) بیٹا نہیں بنا دیا، یہ قول تمہارے اپنے منہ کی بات ہے اور اللہ سچ بات کہتا ہے اور وہی سیدھی راہ دکھاتا ہے تم ان منہ بولے بیٹوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کی نسبت سے پکارا کرو یہی اللہ کے نزدیک انصاف کا طریقہ ہے اور اگر تم کو ان کے باپ دادوں کے نام معلوم نہ ہوں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔“

چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم تصریح کرتے ہیں کہ ہم نے اسی وقت سے حضرت زید کو ابن محمد ﷺ کہنا چھوڑ دیا اور زید بن حارثہ کہنے لگے۔ اور انس دینے کے عمل پہلو کو روشن کرنے کے لیے ان آیات کا نزول ہوا:

﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ۗ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۗ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿۱۷۷﴾﴾ (الاحزاب: ۳۷)

”اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب تم اس شخص سے کہتے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے انعام کیا کہ اپنی بیوی کو روکے رکھ (اور طلاق نہ دے) اور اللہ سے ڈر اور صورت حال یہ تھی کہ تم اپنے جی میں اس بات کو چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں (کے طعن و تشنیع) سے ڈرتے تھے اور اللہ زیادہ مستحق ہے کہ اس سے خوف کیا جائے سو جب زید اپنی حاجت پوری کر چکا (اور اس نے طلاق دے دی) تو ہم نے اس (زینب رضی اللہ عنہا) کا نکاح تجھ سے کر دیا تاکہ (آئندہ) مسلمانوں پر یہ تنگی نہ رہے کہ وہ اپنے منہ بولے بیٹے کی بیویوں سے نکاح نہ کر سکیں جب ان کے منہ بولے بیٹے اپنی حاجت پوری کر لیں (یعنی طلاق دے دیں) اور اللہ کا یہ حکم اٹل ہے۔“

قرآن عزیز کی ان آیات کا مفہوم اپنے متعلقہ مسئلہ کے ساتھ اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس میں کسی دوسرے مفہوم کی گنجائش تک نہیں اور نہ کسی قسم کی کوئی پیچیدگی ہی ہے کہ جو معاملہ کے رخ کو کسی دوسری جانب پھیرنے کا موجب ہو مگر حیرت اور حیرت سے زیادہ رنج و ملال ہے ان راویان روایت پر جنہوں نے روایت و درایت کی کسوٹی پر کسے بغیر ہی یہود بنی اسرائیل کی اسلام دشمنی اور رسل دشمنی میں گڑھی ہوئی خرافی داستان کو ان آیات کی تفسیر کے ضمن میں درج کر دیا اور یہ قطعاً محسوس نہ کیا کہ جب کہ ان بے سرو پا روایات کا نہ قرآن کی آیات سے جوڑ لگتا ہے اور نہ ذخیرہ حدیث میں کوئی ایک صحیح روایت بھی اس کی جانب اشارہ کرتی ہے تو پھر ہمارے لیے کس طرح یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ہم ایسی روایات کو بیان یا نقل کر کے ایک جانب دشمنان اسلام کے لیے غلط اور پُر از بہتان نکتہ چینی کا سامان مہیا کریں اور دوسری طرف بے علم مسلمانوں کے دینی و ذہنی انتشار کا باعث بنیں۔

### خرافی داستان:

اگر یہ خرافی داستان کتب تفسیر میں نقل نہ ہوتی اور اس کے مفاسد کا اثر موافق و مخالف دونوں جانب پر نہ پڑا ہوتا تو ایک لمحہ



کے لیے بھی قلم اس کے لیے آمادہ نہ ہوتا کہ اس ہرزہ سرائی کو روایت کہہ کر پیش کرے، مگر اصل حقیقت کو واشگاف کرنے کے بعد محض اس لیے اس داستان کو سپرد قلم کیا جا رہا ہے کہ جب کبھی اس پر نگاہ پڑے تو فوراً ذہن میں آجائے کہ یہ ایک خرافی داستان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور اس لیے دشمنان اسلام کو اس کی سند لینا محض تعصب اور اسلام دشمنی پر مبنی ہے نہ کہ حقیقت حال کی طلب و جستجو کے پیش نظر۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے یہاں تشریف لے گئے، اتفاق سے حضرت زید رضی اللہ عنہ موجود نہیں تھے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا پر اچانک نظر پڑی تو وہ بہت حسین نظر آئیں، آپ فوراً ہی یہ پڑھتے ہوئے ”سبحان مقلب القلوب“ ”پاک ہے وہ ذات جو دلوں کو پھیر دینے پر قابو رکھتی ہے“ واپس ہو گئے۔ جب زید رضی اللہ عنہ آئے تو زینب رضی اللہ عنہا نے ان سے پورا واقعہ سنایا۔ زید رضی اللہ عنہ یہ سن کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ حضور ﷺ نے پوچھا ایسا کیوں کرتے ہو؟ تو کہنے لگے اور کوئی وجہ نہیں ہے وہ خود کو بہت بلند مرتبہ سمجھتی اور مجھ کو زبان سے ایذا پہنچاتی ہے۔ یہ سن کر نبی اکرم ﷺ کے قلب میں (العیاذ باللہ) اگرچہ یہ آیا کہ زید طلاق دے دے، مگر زبان سے منع کیا کہ خدا سے ڈر اور ایسا نہ کر، تب اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ پر عتاب فرمایا اور کہا کہ تیرے دل میں جو بات تھی اس کو تو نے چھپایا، مگر اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کر کے رہے گا۔ (اعاذنا اللہ من هذه الخرافات)

اس روایت کو ابن ابی حاتم اور طبری نے قتادہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی نسبت کے ساتھ روایت کیا ہے مگر قاضی عیاض نے شفاء میں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ابن کثیر، ابن حبان، سید محمود آلوسی نے اپنی تفاسیر میں اور خفاجی نے نسیم الریاض میں اس کو روایت و درایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار اور ناقابل قبول ثابت کیا ہے اور ان دونوں بزرگوں کی جانب اس روایت کے انتساب کو باطل اور غلط قرار دیا ہے۔ فتح الباری میں ہے:

ووردت اثار اخریٰ اخر جہا ابن ابی حاتم الطبری فقلھا کثیر من المفسرین لاینبغی التشاغل بہا والذی و ردتہ منها هو المعتمد.

”اس سلسلہ میں اور بھی آثار بیان کئے جاتے ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور بہت سے مفسرین نے اس کو نقل کر دیا ہے یہ آثار ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی جانب کوئی توجہ بھی دی جائے اور قابل اعتماد آثار وہی ہیں جن کو ہم نے اس جگہ بیان کر دیا ہے۔“

اور سید محمود آلوسی اس داستان کو نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وللقصاص فی هذه القصة کلام لاینبغی ان یجعل فی حیث القبول.

”اور داستان سراؤں کے پاس اس واقعہ کے متعلق بھی گڑھی ہوئی باتیں ہیں جو ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو قبولیت کا درجہ دیا جائے۔“ اور ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے تو اس داستان کو اپنی تفسیر میں نقل کرنا بھی پسند نہیں کیا اور اس کا حوالہ دیتے ہوئے اپنا یہ محققانہ فیصلہ صادر فرمایا:



ذکر ابن ابی حاتم و ابن جریر ہہنا اثاراً عن بعض السلف رضی اللہ عنہم احببنا ان نضرب عنها صفحاً  
بعدم صحتہا فلا نوردہا۔

”ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض سلف رضی اللہ عنہم کی جانب منسوب چند آثار کو ذکر کیا ہے ہم نے یہ پسند کیا کہ  
ان کی جانب مطلق التفات نہ کریں اس لیے کہ وہ قطعاً صحیح نہیں ہیں اور اس لیے ہم ان کا اس جگہ ذکر نہیں کریں گے۔“  
اور پھر یہ تمام اہل تحقیق ان آثار کو نقل کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں بسند صحیح ثابت ہیں اور جو آیات کی وہی تفسیر کرتے ہیں  
جس کو سطور بالا میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زید کے طلاق دینے سے قبل اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی نبی اکرم ﷺ کو یہ بتلادیا  
تھا کہ انسداد تہنی کے سلسلہ میں خدا کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو زید طلاق دے گا اور تم کو اس سے نکاح کرنا ہوگا۔ یہ  
بات تھی جس کو نبی اکرم ﷺ بر بنائے بشریت دشمنوں کے طعن سے بچنے کی خاطر کہ ”کہیں گے محمد (ﷺ) نے بیٹے کی بیوی سے نکاح  
کر لیا“ اپنے دل میں چھپائے رکھا اور آپ ﷺ کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح زید رضی اللہ عنہ زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق نہ دے اسی کو قرآن  
نے ﴿تُخْفِي فِي نَفْسِكَ﴾ کہا ہے اور زید رضی اللہ عنہ کا طلاق دینا اور پھر زینب رضی اللہ عنہا کا حرم نبوی ﷺ میں داخل ہونا اس حقیقت کا اعلان  
ہے جس کو ﴿مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ﴾ میں کہا گیا ہے۔

اور عمر بن فائد نے بھی امام زہری رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر نقل کی ہے اور اسی پر تمام محدثین و مفسرین کا اعتماد ہے اور یہی صحیح ہے۔  
لیکن یہ صورت حال کیوں اختیار کی گئی اور معاملہ کو اس خاص رنگ میں کیوں رکھا گیا جو قرآن عزیز کی ان آیات سے ظاہر  
ہوتا ہے، حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ اس کے متعلق یہ حقیقت واضح فرماتے ہیں:

## حاصل کلام

والحاصل ان الذی کان یخفیہ النبی ہو اخبار اللہ ایاء انہا ستصیر زوجتہ الذی کان تحملہ علی اخفاء ذلک  
خشية قول الناس تزوج امرأة ابنه و اراد الله ابطال ما كان اهل الجاهلية عليه من احكام التبتی بامر  
ابلاغ فی ابطال منه و هو تزوج امرأة الذی یدعی ابنا و وقع ذلک من امام المسلمین لیكون ادعی لقبولہم و  
انما وقع الخبط فی تاویل متعلق الخشية. واللہ اعلم۔

”حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ صرف اس بات کو پوشیدہ رکھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انسداد تہنی کے سلسلہ میں یہ خبر  
دی ہے کہ زینب تمہارے نکاح میں آئے گی اور نبی اکرم ﷺ نے اس لیے اس بات کو پوشیدہ رکھا کہ آپ لوگوں کے اس  
طعن سے بچنا چاہتے تھے کہ محمد (ﷺ) نے بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی اور اللہ تعالیٰ یہ ارادہ کر چکا تھا کہ لے پالک کے  
جو احکام زمانہ جاہلیت میں نافذ تھے ان کو باطل کر دے اور اس کے لیے اس طریقہ سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا کہ عملاً



کسی منہ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی کرائی جائے اور اس کے لیے ذات اقدس (ﷺ) کو اس لیے چنا گیا کہ آپ امام المسلمین ہیں پس آپ کا عمل مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ اتباع اور قبولیت کا داعی ہوگا اور مسلمان اچھی طرح اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ جائیں گے (لہذا صورت حال یہ اختیار کی گئی کہ پہلے زینب رضی اللہ عنہا کی آپ کے منہ بولے بیٹے زید رضی اللہ عنہ سے شادی ہو اور پھر وہ طلاق دے اور بحکم خداوندی پھر وہ آپ کے نکاح میں آئیں) یہ ہے وہ اصل بات جو کہ اس کے لیے خطب میں پڑ گئی کہ تاویل کرنے والوں نے یہ قیاس آرائیاں کر ڈالیں کہ آیت میں خشیۃ کا متعلق کیا ہے۔

غرض اسرائیلی داستانوں میں سے یہ بھی ایک خرافانی داستان تھی جس کا پردہ فاش ہونا از بس ضروری تھا، ورنہ تو یہ روایت خرد و عقل کے نزدیک یوں بھی ناقابل اعتماد اور لغو ہے کہ زینب رضی اللہ عنہا جبکہ نبی اکرم ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور بچپن سے جوانی تک مسلسل آپ کے سامنے رہیں اور شادی کے بعد بھی آپ سے پردہ نہیں کرتی تھیں تو اس واقعہ کے دن کون سی خاص بات تھی کہ زینب رضی اللہ عنہا آپ کی نگاہ میں اجنبی بن کر نظر آنے لگیں اور آپ ﷺ نے اخلاق کریمانہ کے خلاف دل و زبان کی مطابقت بھی چھوڑ دی۔

اگر قرآن کی آیت کا یہ مطلب لیا جائے تو کیا پھر ایک لمحہ کے لیے بھی قرآن کو یہ حق ہے کہ ذات اقدس ﷺ کو ایک نبی، رسول اولوالعزم پیغمبر کی حیثیت میں پیش کر سکے۔ ﴿سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ﴾

### بصائر:

- ① باوجود اس امر کے کہ پیغمبر و رسول اس حقیقت سے آشنا ہوتے اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا کا فیصلہ اٹل اور ناقابل رد ہوتا ہے تاہم اگر کوئی امر ایسا ہو جس میں ان کی ذات وقت کے خود ساختہ اخلاقی پہلو کی بناء پر مورد طعن و تشنیع بنتی ہو تو بہ تقاضائے بشریت وہ اس کی زد سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور متوقع رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس مقصد خیر کے لیے اس صورت حال کو رونما کرنا چاہتا ہے کاش کہ وہ کسی ایسی صورت میں نمودار ہو کہ ان کی ذات اس طعن و تشنیع سے بچ جائے، لیکن جبکہ خدا کی مصلحت اسی خاص صورت حال میں مضمحل ہوتی ہے تو وقت آنے پر نبی و رسول اپنی خواہشات ذاتی کو پس پشت ڈال کر خدا کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے، قرآن عزیز نے زیر بحث واقعہ میں اسی حقیقت کو معجزانہ انداز بیان میں ادا کیا۔
  - ② قرآن عزیز کی تفسیر خصوصاً واقعات پر مبنی آیات کی تفسیر میں اجمال اس تفصیل سے بدرجہا بہتر ہے جو محض عقلی احتمالات کے پیش نظر آیات کے حقیقی مفہوم کو بھی بدل ڈالے اور لفظی تعبیرات کے اجمال سے غلط اور باطل عمارت تیار کر لے بلاشبہ ایسی تفصیل تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہے اور اسی لیے ہر مفسر کا فرض ہے کہ اس سے اپنا دامن بچائے۔
- قرآنی حقائق سے آگاہ محققین مفسرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تفسیر قرآن میں لفظی تعبیرات سے حقیقت کی جستجو کیے بغیر عقلی احتمالات بیان کر کے متضاد اقوال پیدا کر دینا تفسیر قرآن کی محمود خدمت نہیں ہے بلکہ قلوب میں تردد و اضطراب پیدا کرنے کا موجب ہے۔

تفسیر قرآن کی بہترین خدمت یہ ہے کہ اول قرآن عزیز کی تفسیر خود قرآن سے ہی کی جائے ﴿القرآن یفسر بعضہ بعضاً﴾ اور ساتھ ہی صحیح و مستند احادیث رسول سے اس کے اجمال کی شرح کرتا جائے، اور پھر اگر مزید تشریحات صحیح آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے حاصل ہو سکیں تو ان سے بھی استفادہ کیا جائے اور ان تمام تحقیقات کے بعد ایک مضبوط و مدلل اور محقق قول فیصل نقل



کرتا جائے اور احتمالات کی کشاکش سے اضطراب اقوال کا شکار نہ بنے۔ اور اگر لطائف و حکم اور نکات پر قلم اٹھائے تو ان میں بھی یہ پیش نظر رہے کہ آیت کی حقیقی روح سے جدا نہ ہو جائے بلکہ اس کے اندر محدود رہے نیز دور از کار لفظی اور تخمینی احتمالات کی راہنمائی میں بعید تاویلات سے اپنا دامن محفوظ رکھے اور غیر مستند روایات (واحادیث و آثار) اور اسرائیلیات سے ہرگز ہرگز احتمال کے طور پر بھی استشہاد و استناد نہ کرے بلکہ اس کا فرض ہے کہ حسب موقعہ ان کی تردید اور ان کا ابطال کرتا جائے تاکہ ارباب مطالعہ کو قرآنی ہدایات سے حصول سعادت اور اخذ بصیرت و موعظت کے لیے آسانی ہو۔

## بنو نضیر

یہ واقعہ ۴ ہجری میں پیش آیا۔ جو قبائل یہودیمن سے بھاگ کر حجاز (مدینہ) میں آئے تھے، ان میں سے یہ بھی مشہور قبیلہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ جب مدینہ تشریف فرما ہوئے تو آپ ﷺ نے مدینہ اور اطراف مدینہ کے یہود سے عہد و پیمانہ کر کے ”صلح و عہد“ کی طرح ڈالی یہ انصار میں سے بنی خزرج کے حلیف بھی تھے۔

یہود نے اگرچہ ظاہراً اس صلح و عہد پر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا لیکن ان کے روایتی حسد و بغض اور تاریخی منافقت نے اس عہد پر ان کو تا دیر قائم نہیں رہنے دیا اور انہوں نے نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف اندرونی اور بیرونی سازشوں کا جال بچھانا شروع کر دیا۔ اسی اثناء میں بنو نضیر کے ذمہ دار افراد نے ایک روز یہ سازش کی کہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں جا کر عرض کریں کہ ہم کو ایک معاملہ میں آپ ﷺ سے مشورہ کرنا ہے اور جب آپ تشریف لے آئیں تو دیوار کے قریب ان کو بٹھایا جائے، اور جب وہ گفتگو میں مصروف ہو جائیں تو اوپر سے ایک بھاری پتھر آپ ﷺ پر گرا کر آپ ﷺ کا خاتمہ کر دیا جائے۔

چنانچہ نبی اکرم ﷺ مدعو ہو کر تشریف لائے، ابھی آپ ﷺ دیوار کے قریب بیٹھے ہی تھے کہ وحی الہی نے حقیقت حال سے مطلع کیا اور آپ ﷺ فوراً خاموشی کے ساتھ واپس تشریف لے گئے اور وہاں جا کر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ بنو نضیر تک یہ پیغام پہنچادیں کہ چونکہ تم نے غداری کی اور نقض عہد کیا ہے اس لیے تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ حجاز مقدس کی سرزمین سے جلد جلا وطن ہو جاؤ، منافقین نے یہ سنا تو جمع ہو کر بنو نضیر کے پاس پہنچے اور کہنے لگے، تم محمد ﷺ کا فرمان ہرگز تسلیم نہ کرو اور یہاں سے ہرگز جلا وطن نہ ہو، ہم ہر طرح تمہارے شریک کار ہیں۔

بنو نضیر نے یہ پشت پناہی دیکھی تو حکم ماننے سے انکار کر دیا اور حالات کا انتظار کرنے لگے تب نبی اکرم ﷺ نے جہاد کی تیاری کی اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو مدینہ کا امیر بنا کر بنو نضیر کی گڑھی (چھوٹا قلعہ) پر حملہ آوری کے لیے نکلے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہاتھ میں اسلامی پرچم اور صحابہ رضی اللہ عنہم جلو میں تھے۔

بنو نضیر نے یہ دیکھا تو قلعہ بند ہو گئے اور یقین کر لیا کہ اب مسلمان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ چھ شبانہ روز ان کا محاصرہ کئے رہے اور پھر حکم دیا کہ ان کے ان درختوں کو کاٹ ڈالوں جو ان کے لیے پھل مہیا کرتے ہیں اور ان کا وجود ان کی



رسد رسائی کے لیے تقویت کا باعث ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر بنی نضیر کے دلوں میں رعب اور خوف طاری ہو گیا اور ان کو منافقین کی جانب سے مایوسی اور رسوائی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے درخواست کی کہ ہم کو جلا وطن ہونے کا موقع دیا جائے۔ لہذا ان کو اجازت دی گئی کہ سامان حرب کے علاوہ جس قدر سامان بھی وہ اونٹوں پر لاد کر لے جانا چاہتے ہیں لے جائیں۔ اجازت نامہ حاصل ہونے کے بعد یہ منظر بھی قابل دید تھا کہ کل کے باغی، سرکش اور فتنہ جو غدار آج اپنے ہاتھوں سے اپنے مکانات کو برباد کر کے اس وطن کو خیر باد کہہ رہے تھے جس جگہ محفوظ و مامون رہنے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے خود بنفس نفیس ایک عہد نامہ کے ذریعہ ان کو دعوت دی تھی۔

بنو نضیر نے اپنے مکانات کو اس لیے برباد کر دیا کہ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے بعد مسلمان ان کے گھروں میں آباد ہوں۔

بہر حال بنو نضیر جلا وطن ہو کر جب چلے تو ان میں سے بعض اکابر قوم مثلاً حمی بن اخطب اور ابی الحقیق تو خیبر میں مقیم ہو گئے اور اکثر شام کے نواح میں جا بسے اور دوسرے یامین بن عمرو اور ابوسعید مشرف باسلام ہو کر مدینہ ہی رہ گئے۔

### قرآن عزیز اور بنو نضیر:

اسی واقعہ کے سلسلہ میں قرآن عزیز کی سورہ حشر نازل ہوئی اور اس میں بنو نضیر کی غداری، منافقین کی فتنہ پردازی مسلمانوں پر خدا کا احسان و کرم اور جنگ کے موقعہ پر سبز درختوں کے کاٹنے کا حکم، اور ایسی صورت میں جبکہ جنگ نہ پیش آئی ہو مال غنیمت کا مصرف اور فے کا حکم، ان تمام امور کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

### بصائر:

- ① منافق کا نفاق ایک خود فریبی ہوتی ہے جو انجام کے لحاظ سے نہ خود اپنے لیے مفید ثابت ہوتا ہے اور نہ منافقین پر اعتماد کرنے والا ہی اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنی اور اپنے حلیفوں کی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کا سامان مہیا کر دیتا اور ابدی خسران کا سبب بن جاتا ہے۔ چنانچہ منافقین مدینہ یہود بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع کے حالات و واقعات تاریخی اس کے لیے زندہ جاوید شہادت ہیں۔
- ② جس قوم میں شر و فساد اور مکرو فریب، اخلاق کا درجہ لے لیتے ہیں ان کے قوی جسمانی و روحانی سے صلاح و خیر کی تمام استعداد فنا ہو جاتی ہے اور وہ نہ دنیا میں کسی عزت و شوکت کی مالک رہتی ہے اور نہ آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ خیر باقی رہتا ہے، چنانچہ ساتھی (سیمیٹک) اقوام میں سے اگر کسی قوم میں اس کو نمایاں دیکھنا ہو تو یہود کو دیکھ لینا کافی ہے۔
- ③ عام طریقے پر جنگ میں سبز درختوں اور ہری کھیتوں کو کاٹنا اور برباد کرنا اصلاحات جنگ کے منافی اور ممنوع ہے لیکن جب یہ اشیاء زمانہ جنگ میں دشمن کی مزید تقویت کا باعث ہو کر فساد و شر کے بقاء میں معاون ہوں تو ایسی حالت عام حکم سے مستثنیٰ ہیں جیسا کہ ”بنو نضیر“ کے واقعہ میں نص قرآنی ناطق ہے۔





## واقعہ افک

شعبان ۵ ہجری مطابق دسمبر ۶۲۶ء میں بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی فتنہ سامانیوں کی وجہ سے غزوہ بنی المصطلق پیش آیا، منافقین کا یہ دستور بن گیا تھا کہ جس غزوہ کے اسباب ظاہری سے غالب گمان فتح کا ہوتا، اس میں مال غنیمت کے لالچ سے ضرور ساتھ ہو جاتے۔ چنانچہ اس غزوہ میں بھی منافقین کا گروہ مع اپنے سردار عبداللہ بن ابی کے موجود تھا، واپسی پر ایک معمولی حادثہ پیش آ گیا اور عبداللہ بن ابی اور اس کے منافق گروہ نے اس پر افتراء اور بہتان کی ایک عمارت تیار کر لی مگر قرآن عزیز نے جلد ہی اس افتراء کی حقیقت آشکارا کر دی اور مفتریوں کو ذلیل و رسوا ہو جانا پڑا۔

بخاری میں اس واقعہ کی جو تفصیلات مذکور ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کامیابی کے ساتھ غزوہ بنی المصطلق سے واپس ہوئے تو مدینہ کے قریب ایک منزل پر پڑاؤ تھا کہ آخر شب میں کوچ کا اعلان ہوا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اعلان سن کر رفع حاجت کے لیے عجلت کے ساتھ قیام گاہ سے دور چلی گئیں، فارغ ہونے کے بعد واپس ہوئیں تو گلے میں جو ہار پہنے ہوئے تھیں وہ سینہ پر نہ پایا، وہ یہ سمجھ کر کہ ٹوٹ کر وہیں گر گیا ہوگا جہاں رفع حاجت کے لیے گئی تھیں، اس کو تلاش کرنے کے لیے واپس گئیں اسی اثناء میں جو جماعت ان کے ہودج کو اونٹ پر سوار کراتی تھی اس نے ہودج اٹھا کر اونٹ پر کس دیا اور چونکہ اس زمانے میں کم خوری کی وجہ سے عورتیں عموماً فرہ اندام نہیں ہوتی تھیں اور اس لیے وہ بھی بہت لاغر تھیں، لہذا ہودج پر مامور جماعت نے ان کی عدم موجودگی کا مطلق احساس نہیں کیا اور اونٹ پر ہودج رکھ کر روانہ ہو گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب ہار کو تلاش کرتی ہوئی واپس ہوئیں تو قافلہ جا چکا تھا اور اب ہار بھی ہودج کے قریب ہی مل گیا، وہ سخت پریشان ہوئیں پھر سوچا کہ جو نبی مسلمانوں کو یہ محسوس ہوگا کہ میں ہودج میں نہیں ہوں تو فوراً نبی اکرم ﷺ اسی جگہ سواری بھیج دیں گے اس لیے مناسب یہ ہے کہ قافلہ کا پیادہ پا پیچھا کرنے کی بجائے اسی جگہ انتظار کیا جائے۔ رات آخر تھی، سپیدہ سحر نمودار ہونے والا تھا کہ ان کی آنکھ لگ گئی۔

ادھر صفوان بن معطل سہمی اس خدمت پر مامور تھے کہ وہ قافلہ سے بہت پیچھے رہ کر نگرانی کرتے ہوئے اور جو چیز بھی قافلہ کی رہ جائے اس کو لیتے ہوئے آئیں وہ پیچھے سے چلتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تو انہوں نے محسوس کیا کہ یہاں کوئی انسان موجود ہے، قریب آئے تو ان کو پہچان لیا کیونکہ آیت حجاب سے پہلے وہ ان کو دیکھ چکے تھے۔

انہوں نے دیکھتے ہی فوراً بلند آواز سے ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ پڑھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آواز سن کر بیدار ہو گئیں، اور سمٹ کر بیٹھ گئیں، صفوان نے ایک لفظ کہے بغیر اونٹ کو بٹھا دیا اور وہ بھی خاموشی کے ساتھ اونٹ پر ہودج میں سوار ہو گئیں اور صفوان مہار پکڑے ہوئے روانہ ہوئے اور دوپہر کے قریب لشکر میں جا پہنچے۔

جب یہ خبر عبداللہ بن ابی کو معلوم ہوئی تو اس نے اور اس کی جماعت نے موقعہ کو غنیمت جانا اور تیزی کے ساتھ افتراء اور



بہتان کو لشکر میں پھیلا دیا مگر مسلمانوں نے کسی طرح اس کو باور نہیں کیا، البتہ صرف تین مسلمان (دو مرد اور ایک عورت) حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش اپنی سادہ لوحی سے منافقین کے جال میں پھنس گئے۔

خدا کا کرم و فضل دیکھئے کہ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی الہی (قرآن عزیز) کے ذریعہ منافقین کی خباثت کو آشکارا کر دیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاکدامنی اور عفت مابی پر مہر تصدیق ثبت کر کے بہتان لگانے والوں پر کوڑوں کی سزا (حد قذف) جاری کرنے کا حکم دیا اور اس طرح کذاب اور مفتری کیفر کردار کو پہنچے۔

اس واقعہ پر بعض مستشرقین اور یورپین مورخین نے بہت جولائی طبع کا ثبوت دیا ہے اور خوب آب و نمک لگا کر اس کو بیان کیا ہے جس کو پڑھ کر اسلام اور داعی اسلام ﷺ سے متعلق ان کے قلبی عناد کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

بہر حال قرآن عزیز نے اس واقعہ پر مسلمانوں کو صاف طور سے یہ بتلا دیا کہ یہ کذب و افتراء پر مبنی داستان سن کر تم نے خود ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ محض جھوٹ اور بہتان ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِآلِفِكَ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۗ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۗ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۗ وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝۱۱  
لَوْ لَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا ۗ وَقَالُوا هَذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ۝۱۲  
لَوْ لَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۗ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ۝۱۳  
وَلَوْ لَا فَضَّلُ اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَسَسَّكُمْ فِي مَا أَفَضْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝۱۴  
إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِالسِّنِّتِمْ ۗ وَتَقُولُونَ بِإِفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ ۗ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا ۗ وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ ۝۱۵  
وَلَوْ لَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَذَا ۗ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ۝۱۶  
يَعِظُكُمْ اللَّهُ أَنْ تَعُودُوا لِمِثْلِهِ أَبَدًا ۗ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝۱۷  
وَيُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝۱۸  
إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۗ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝۱۹  
وَلَوْ لَا فَضَّلُ اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ ۗ وَأَنَّ اللَّهَ رَعُوفٌ رَّحِيمٌ ۝۲۰﴾ (النور: ۱۱-۲۰)

”جن لوگوں نے بہتان کا یہ طوفان اٹھایا ہے وہ تم ہی میں سے ایک جماعت (منافقین کی جماعت) ہیں (اے پیغمبر) تم اس کو اپنے حق میں برانہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یعنی خدا کی مصلحت کے راز نے اس میں تمہاری بہتری کا انجام پوشیدہ رکھا ہے) ان میں سے ہر ایک آدمی کے لیے وہ سب کچھ ہے جو اس نے گناہ کمایا ہے اور جس نے اس



(گناہ) کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے اس کے واسطے بہت بڑا عذاب ہے، جب تم نے اس بہتان کو سنا تھا کیوں نہ ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتوں نے اپنے لوگوں پر نیک خیال قائم کر لیا اور کیوں یہ نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان کا طوفان ہے، وہ (طوفان اٹھانے والے اپنے بہتان پر) کیوں چار گواہ نہ لائے، پس جب وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو یہی لوگ اللہ کے یہاں سرتا سر جھوٹے ہیں اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت دنیا اور آخرت دونوں میں تم پر نہ ہوتی تو پڑ جاتی اس جھوٹا چرچا کرنے میں تم پر کوئی بڑی آفت جبکہ تم اس بہتان کو اپنی زبانوں پر جاری کرنے لگے اور ایسی بات منہ سے نکالنے لگے جس کی تم کو خبر تک نہیں اور تم اس کو ہلکی بات سمجھتے ہو حالانکہ (بہتان اور افتراء) اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے، اور جب تم نے اس کو سنا تھا تو کیوں نہ کہا ہمارے لیے زیبا نہیں کہ ایسی جھوٹی بات منہ سے نکالیں ”اللہ کے لیے پاکی ہے“ یہ تو بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تم کو سمجھاتا ہے کہ ایسا کام پھر کبھی نہ کر بیٹھنا، اگر تم واقعی سچے ایمان والے ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے لیے پتہ کی باتیں واضح کرتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے جو لوگ چاہتے ہیں کہ بدکاری کا چرچا ہو ایمان والوں میں ان چاہنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بلاشبہ اللہ (حقیقت حال کا) جاننے والا ہے اور تم جاننے والے نہیں ہو۔ اور اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تم پر اور یہ بات نہ ہوتی کہ وہ نرمی کرنے والا ہے اور مہربان تو کیا کچھ نہ ہو جاتا۔“

سورہ نور کی ان آیات نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طہارت و پاک دامنی کا ہی صرف اعلان نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو یہ تشبیہ بھی کی کہ ان کو ایک لمحہ کا انتظار کیے بغیر اس قسم کے افتراء پردازوں کے افتراء پر صاف صاف یہ کہہ دینا چاہیے تھا کہ یہ محض افتراء اور بہتان ہے۔

یہ آیات اس بناء پر ”آیات براءۃ“ بھی کہلاتی ہیں کہ ان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءۃ کا اعلان ہے اور منافقین اور معاندین کی ذلت و خذلان کا اظہار۔

### موعظت:

- ① فاسق و فاجر یا بد باطن انسانوں کی دی ہوئی خبر خصوصاً جبکہ وہ باعصمت و عفت اور صاحب تقویٰ و خیر افراد کے خلاف ہو ہرگز قابل توجہ نہیں اور اس کے لیے صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ یہ محض افتراء ہے تا وقتیکہ خبر دینے والا اس پر روشن دلیل و حجت قائم نہ کر دے۔
- ② بے گناہ پر الزام اور تہمت لگانا بہت بڑا گناہ ہے اور چونکہ اس گناہ کا مرتکب حق العباد میں سے ایک اہم حق کا تہتک کرتا ہے، اس لیے نہ صرف اخلاق کی نگاہ میں بلکہ اجتماعی قانون کی نظر میں بھی حد درجہ مجرم ہے، قرآن عزیز کی نصوص نے اس لیے حد قذف (بے گناہ پر تہمت لگانے کی سزا) کے لیے اسی کوڑے تجویز کیے ہیں تاکہ آئندہ کسی کو بھی یہ جرات نہ ہو سکے کہ وہ ایک پاکباز انسان پر بہتان لگائے یا بغیر شہادت کے اس کی تشہیر کرے۔
- ③ یہ واقعہ گو آغاز کے اعتبار سے نبی اکرم ﷺ کے لیے بہت سخت ایذا کا باعث ہوا اور اہل بیت کو اس نے بے حد پریشان خاطر بنایا، لیکن انجام کے پیش نظر اہل بیت رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ سرتا سر خیر ثابت ہوا کیونکہ اس سے ایک جانب منافقوں کی



منافقت سے کاراز فاش ہو گیا اور دوسری جانب صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور اہل بیت رسول کی عظمت شان کا بے نظیر مظاہرہ عمل میں آ گیا کہ قرآن کی دس آیات نے ان کی براءۃ کے لیے نازل ہو کر ان کی عصمت و عظمت دونوں پر عدیم النظیر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

بعض مرتبہ اشرار اور خبیث النفس انسانوں کی ہفتوات اس درجہ آب و رنگ رکھتی ہیں کہ سادہ لوح مسلمان اور نیکو کار انسان بھی مغالطے اور دھوکے میں آ جاتے ہیں اس لیے مسلمان کا فرض ہے کہ سنی سنائی بات پر اس وقت تک ہرگز ہرگز یقین نہ کرے جب تک کہ اسلامی اصول شہادت کے مطابق شنیدہ خبر کی تصدیق نہ ہو جائے۔

((قال رسول الله ﷺ: اياك والظن فان بعض الظن اثم)).

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سوء ظن سے بچو اس لیے کہ بعض بدگمانیاں گناہ کا مرتکب بنا دیتی ہیں۔“

حقوق العباد میں خدائے برتر نے جو حدود و قصاص اور تعزیرات مقرر فرمادیں ہیں، جرائم کے ارتکاب پر ان میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے اور قانون اسلامی کی نگاہ میں اس حیثیت سے تمام مجرم یکساں قابل گرفت ہیں۔ اس لیے واقعہ افک میں منافق مفتریوں کے ساتھ تین مسلمان (مرد و عورت) حسان۔ حضرت مسطح اور حضرت حمزہ بنت جحش کو بھی جھوٹی تہمت لگانے کے الزام میں کوڑے کھانے پڑے۔

## نباء فاسق

غزوہ بنی المصطلق میں جب مسلمان فتح یاب ہو گئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ کی بناء پر نبی اکرم ﷺ نے سردار قبیلہ کی بیٹی حضرت جویرہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا تو نبی اکرم ﷺ کے رشتہ مصاہرت کی وجہ سے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسیران جنگ کو رہا کر دیا اور مسلمانوں کے اس حسن سلوک و اخلاق کریمانہ اور اسلامی محاسن سے متاثر ہو کر تمام قبیلہ مشرف باسلام ہو گیا۔ تب نبی اکرم ﷺ نے ولید بن عقبہ کو اس لیے ان کے پاس بھیجا کہ وہ قبیلہ کے دولت مندوں سے ”زکوٰۃ“ وصول کر کے ان ہی کے فقراء و مساکین پر تقسیم کر دیں۔ اہل قبیلہ کو جب ولید کی اس آمد کا علم ہوا تو وہ عامل اسلام کے استقبال کے لیے تیاریاں کرنے لگے اور ایک معزز ترین ہستی کے استقبال کی طرح ساز و سامان کے ساتھ میدان میں نکلے۔

زمانہ جاہلیت میں اس قبیلہ کے اور ولید کے درمیان کچھ ناچاقی رہ چکی تھی اور پرانی عداوت کا رشتہ چلا آتا تھا، اس لیے استقبال کے اس اہتمام کو ولید نے دوسری نظر سے دیکھا اور سمجھا اور اپنی غلط رائے پر جمود کر کے اہل قبیلہ سے معاملہ کیے بغیر ہی مدینہ واپس آ گئے اور دربار قدسی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ بنی المصطلق تو مرتد ہو گئے اور انہوں نے زکوٰۃ دینے سے بھی انکار کر دیا اور وہ تو سرکشی پر آمادہ ہیں۔



نبی اکرم ﷺ کو یہ سن کر بنی المصطلق کے طرز عمل سے رنجیدہ ہوئے اور مسلمان تو برابر فروختہ ہو گئے اور جہاد کی تیاریاں نے لگیں تاکہ مرتدین کا مقابلہ کیا جائے، حتیٰ کہ وہ اسلام پر واپس آجائیں یا کفر کردار کو پہنچ جائیں۔

ادھر بنی المصطلق کو ولید کے اس عجیب طرز عمل نے حیرت میں ڈال دیا اور جب ان کو معلوم ہوا کہ ولید نے کیسی بیجا جسارت کے ساتھ ان کے متعلق دربار نبوی میں غلط بیانی کی ہے تو وہ بے حد پریشان ہوئے کیونکہ ان کے تو وہم و خیال میں بھی یہ نہیں تھا کہ ان جیسے پختہ کار اور ثابت قدم مسلمانوں پر اس قسم کی تہمت بھی لگائی جاسکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً قدمت اقدس ﷺ میں ایک موقر وفد بھیجا جس نے حاضر ہو کر کل ماجرا کہہ سنایا۔

ایک جانب اپنے عامل (ولید) کا وہ بیان اور دوسری جانب حدیث العہد مسلم جماعت کا یہ بیان، اس لیے نبی اکرم ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی اور وحی الہی کا انتظار کیا۔ آخر وحی الہی نے راہنمائی کی اور قرآن عزیز (سورہ حجرات) کی ان آیات نے نازل ہو کر نہ صرف زیر بحث معاملہ کی حقیقت ہی واضح کر دی بلکہ اس سلسلہ میں ایک مستقل قانون یا ”معیار تحقیق“ عطاء فرما دیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصِحُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نُدَامِينَ ۝۱ وَأَعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ ۗ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّشِدُونَ ۗ فَضَلَّأَ مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَ اللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝۸﴾ (الحجرات: ۶-۸)

”اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی (غلط کار) خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ نادانی کی وجہ سے کسی قوم پر (جہاد کے نام سے) حملہ آور ہو جاؤ اور پھر کل کو (اصل حال معلوم ہونے کے بعد) اپنے کیے پر پچھتانے لگو، اور جانو کہ تم میں اللہ کا رسول موجود ہے، اگر وہ تمہاری بات اکثر معاملات میں مان لیا کرے تو تم (اپنی غلط روی کی وجہ سے) مصیبت میں پڑ جاؤ لیکن اللہ نے (اپنے فضل سے) تمہارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے اور تمہارے دلوں میں اس کو زینت بخشی ہے اور تمہارے دلوں میں کفر اور گناہ اور نافرمانی کے لیے نفرت پیدا کر دی ہے۔ اور (درحقیقت) یہی لوگ ہیں اللہ کے فضل اور احسان کی وجہ سے راہ یاب اور اللہ جاننے والا ہے حکمتوں والا ہے۔“

### موعظت:

① خبروں کو بیان کرنے میں عام طور پر سنجیدہ اور مہذب جماعت بھی اس کو معیوب نہیں سمجھتی کہ جو خبر بھی ان کے کانوں تک پہنچے وہ اس کو بے تکلف نقل کرتے رہیں اور حقیقت حال کی جستجو کی زحمت قطعاً گوارا نہ کریں، خواہ اس خبر سے کسی ناکردہ گناہ پر افتراء کیا جا رہا ہو یا کسی فرد و جماعت کو مضرت پہنچ رہی ہو، حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے پُر زور الفاظ میں یہ تشبیہ فرمائی ہے:

عن ابی ہریرۃ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَفَى بِالْمَرْءِ إِثْمًا أَنْ يَحْدِثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ. (ابوداؤد)

”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: انسان کے لیے یہ گناہ کافی ہے کہ ہر شنیدہ بات کو نقل کرتا رہے۔“



یعنی یہ بھی گناہ کی بات ہے کہ سنی سنائی جھوٹی بات کی تشہیر کرے۔“

② جب کوئی ایسی خبر سنی جائے جو بلحاظ مفاد یا مضرت خبر دینے والے پر یا دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہو تو اسلامی آداب اجتماعی کا تقاضا ہے کہ پہلے اس کی تحقیق ہونی چاہیے اور جب وہ پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تب اس سے متعلق نتائج و ثمرات کی جانب متوجہ ہونا چاہیے۔

”خبر“ سے متعلق یہ حکم اخلاقی حیثیت رکھتا ہے اور معاشرتی زندگی میں روزمرہ واجب العمل ہے لیکن محاکم شرعیہ میں جب کوئی معاملہ جائے اور خبر ”شہادت“ کی حیثیت اختیار کر لے تو اس کے قبول عدم قبول میں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے دوسرے مزید شرائط ہیں جو فقہ اسلامی کے ”باب الشہادۃ“ میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔

## مسجد ضرار

منافقین کو یہ تو جرأت ہوتی نہ تھی کہ علانیہ اسلام کی مخالفت کر کے اس کو نقصان پہنچائیں، البتہ ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح درپردہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر کے ان کو ضعف و انحطاط کی راہ پر لگا دیں۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انہوں نے جہاں اور بہت سی فتنہ سامانیاں بپا کر رکھی تھیں ان میں سے ایک واقعہ جب ۶۰۹ء ہجرت میں بھی رونما ہوا۔

نبی اکرم ﷺ کو معلوم ہوا کہ تبوک کے میدان میں جو کہ مدینہ سے چودہ منزل پر براہ دمشق واقع تھا..... ہرقل شاہ روم نے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے لشکر جرار جمع کر لیا ہے اور اس کا مقدمہ ابجیش آگے بڑھ کر بلقاء تک آ پہنچا ہے، آپ نے عرب میں قحط اور گرمی کی شدت کے باوجود جہاد کے لیے منادی کر دی اور مسلمان جوق در جوق شوق جہاد میں مدینہ میں جمع ہونے لگے۔

نبی اکرم ﷺ بھی تیاریوں ہی میں مصروف تھے کہ منافقین نے وقت سے فائدہ اٹھا کر سوچا کہ مسجد قباء کے مقابلہ میں..... جو ہجرت کے بعد سب سے پہلی مسجد تھی اس حیلہ سے ایک مسجد تیار کریں کہ جو لوگ ضعف یا اور کسی عذر کی وجہ سے مسجد نبوی میں نہ جاسکیں تو یہاں نماز پڑھ لیا کریں کیونکہ اس طرح مسلمانوں کو ورغلانے کا بھی موقعہ ہاتھ آئے گا اور ایک قسم کی تفریق بھی پیدا ہو جائے گی۔

یہ سوچ کر وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم نے ضعیف و ناتواں اور معذوروں کے لیے قریب مسجد بنائی ہے۔ اب ہماری خواہش ہے کہ حضور وہاں چل کر ایک مرتبہ اس میں نماز پڑھ دیں تو وہ عند اللہ مقبول ہو جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت تو میں اہم غزوہ کے لیے جا رہا ہوں واپسی پر دیکھا جائے گا۔

مگر آپ جب بخیر و کامرانی مراجعت فرما ہوئے تو وحی الہی کے ذریعہ اس مسجد کی تعمیر کے حقیقی سبب سے آگاہ ہو چکے تھے، چنانچہ واپس تشریف لا کر سب سے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ جائیں اور اس مسجد کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیں۔

چونکہ حقیقتاً اس مسجد کی بنیاد ”تقویٰ“ اور ”وجہ اللہ“ کی جگہ ”تفریق بین المسلمین“ پر رکھی گئی تھی اس لیے بلاشبہ وہ اسی کی مستحق



تھی اور اس کو ”مسجد“ کہنا حقیقت کے خلاف تھا۔ اس لیے قرآن عزیز نے اس بظاہر مسجد و باطن بیت الشریک کی تعمیر کے متعلق حقیقت حال کو روشن کرتے ہوئے بتلادیا کہ یہ مسجد تقویٰ نہیں بلکہ ضرار کہلانے کی مستحق ہے:

﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَارْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ ۚ وَكَيْحَلْفُنَّ إِنَّ أَرْدُنَا إِلَّا الْحُسْنَى ۚ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا ۚ لَسُّجِدُّ أَسْسَ عَلَى التَّقْوَى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ ۚ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَّطَهَّرُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ ﴿۱۰۸﴾﴾ (التوبہ: ۱۰۷-۱۰۸)

”اور (منافقوں میں سے) وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس غرض سے ایک مسجد بنا کھڑی کی کہ نقصان پہنچائیں، کفر کریں، مومنوں میں تفرقہ ڈالیں اور ان لوگوں کے لیے ایک کمین گاہ پیدا کریں جو اب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکے ہیں وہ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ بھلائی ہو، لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں قطعاً جھوٹے ہیں (اے پیغمبر ﷺ) تم کبھی اس مسجد میں کھڑے نہ ہونا، اس بات کی کہ تم اس میں کھڑے ہو (اور بندگانِ الہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) وہی مسجد حق دار ہے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے (یعنی مسجد قبا اور مسجد نبوی) اس میں ایسے لوگ آتے ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک و صاف رہیں اور اللہ بھی پاک و صاف رہنے والوں کو ہی پسند کرتا ہے۔“

### موعظت:

- ① منافقت ایک ایسا مرض ہے جو انسان کی تمام خصائل حمیدہ اور اخلاق حسنہ کو تباہ و برباد کر کے اس کی انسانیت کو حیوانیت سے بدل دیتا ہے، اور اس کے افکار و اعمال میں مطابقت باہمی نہ رہنے سے اس کی زندگی کو اسفل السافلین میں گرا دیتا ہے۔
- ② ایک ہی ”عمل“ عامل کی نیت کے فرق سے ”پاک“ بھی ہو سکتا ہے اور ”ناپاک“ بھی ”طیب“ بن سکتا ہے اور ”خبیث“ بھی، تعمیر مسجد ایک عمل خیر ہے اور باعث اجر و ثواب، مگر جبکہ لوجہ اللہ ہو اور عبادت الہی کا حقیقی مقصد پیش نظر رہے۔

انما یعبّر\* مساجد اللہ من امن باللہ والیوم الآخر و اقام الصلوٰۃ و اتی الزکوٰۃ و لم یبخش الا اللہ. (ج ۹ ص ۱۸)

”اللہ کی مسجدوں کو تو بس وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور نماز ادا کی اور زکوٰۃ دی اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔“

اور یہی عمل خیر ”عمل شر“ اور لائق نفرت بن جاتا ہے، جبکہ اس کا مقصد کار شیطاں ہو یعنی تفریق بین المسلمین یا نماز کی آڑ میں اسلام کے خلاف کمین گاہ اور جاسوسی کا مرکز بنانا ہو، اسی لیے یہ عمل خیر کافروں کے ہاتھ سے انجام پانا غیر مقبول اور مردود ہے۔

”مشرکوں کا حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجد کو آباد کریں، حالانکہ وہ اپنی جانوں پر کفر کی گواہی دیتے ہیں۔“

\* تعمیر مساجد اللہ میں مساجد کی آبادی اور اس کی تعمیر دونوں کا مفہوم شامل ہے۔



## وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾

آخر وہ وقت بھی آ پہنچا جس کے تصور کے لیے نہ صرف مسلمان بلکہ دنیائے انسانیت بھی تیار نہ تھی، یہ وقت کائنات انسانی کے لیے مصیبت عظمیٰ اور واہیہ کبریٰ ثابت ہوا۔ چار دانگ عالم پر حیرت طاری تھی کہ وہ کس طرح غیر متوقع طور پر ہادی اکبر، مصلح اعظم کے فیض صحبت سے محروم ہو گئے۔ آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، قلب اس کے باور کرنے کو تیار نہ تھا اور قلب جو کچھ چاہتا تھا، آنکھیں اس نظارہ کو واپس نہ لاسکتی تھیں، دل پاش پاش تھے، جگر شق ہو رہے تھے چشم گریاں اشک کے سیلاب بہا رہی تھی کیونکہ آج روحانیت کے آفتاب عالمتاب کے اور کائنات انسانی کے درمیان موت کا لکہ ابر حائل ہو چکا تھا۔

اگر دنیا کا کرہ آفتاب درحقیقت کبھی غروب نہیں ہوتا اور رہتی دنیا تک غروب نہیں ہوگا، بلکہ دیکھنے والوں کے اور اس کے درمیان پردہ شب حائل ہو جاتا ہے تو کس کی مجال اور کس کی جرأت ہے کہ وہ آفتاب رسالت (محمد ﷺ) کے متعلق غروب ہونے کا دعویٰ کر سکے کیونکہ یہاں تو پردہ شب کو بھی حائل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

”الدين السمحة البيضاء ليلها ونهارها سواء.“

”دین اسلام آسان و روشن دین ہے۔ جس کے رات اور دن دونوں یکساں طور پر روشن ہیں۔“

یعنی یہاں شب تاریک کا گزر ہی نہیں ہے، البتہ ”موت“ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ کا پیغام بن کر اس آفتاب رسالت کے اور ہمارے درمیان لکہ ابر بن کر حائل ہو گئی۔

اس لیے اس مصیبت کبریٰ میں بھی مسلمانوں کے زخمی قلوب کے لیے مرہم اور کشتگان فراق رسول اکرم ﷺ کے لیے بہترین اکسیر و تریاق موجود تھا۔ اور وہ یہ یقین اور اذعان ہے جس کو قرآن عزیز نے یہ کہہ کر پہلے ہی ”قلب مسلم“ عطا کر دیا:

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ ... كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ... وَمَا مَحْدُوا إِلَّا

رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ﴾

”یعنی ”موت“ اس حقیقت کا نام ہے جو نبی مرسل بلکہ خاتم المرسلین کو بھی پیش آ کر رہے گی اور بقائے حقیقی تو ذات احدیت کا ہی بلا شرکت غیرے طغرائے امتیاز ہے۔“

”اللہ اللہ! وہ کیسا عجیب سماں تھا کہ جب نبی اکرم ﷺ نے ”اللهم الرفیق الاعلیٰ“ فرماتے ہوئے جان جاں آفرین کے



سپر دفر مادی تو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم رنج و غم اور صدمہ جانکاہ سے اس درجہ متحیر اور مصیبت زدہ ہو رہے تھے کہ ان کے ہوش و حواس تک بجا نہ تھے، اسی عالم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرط غم سے تلوار سونت کر یہ نعرہ لگایا کہ جو محمد ﷺ کا انتقال ہو گیا کہے گا تو اسی تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔

اسی اضطراب انگیز عالم میں خدا کا ایک بندہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آتا ہوا نظر آتا ہے، سب سے پہلے وہ حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا میں پہنچتا اور دل بریاں و چشم پر نم کے ساتھ سرور دو عالم ﷺ کی جبین نور کو بوسہ دیتا اور فراق رسول سے کرب و بے چینی کا اظہار کرتا ہے اور اس فرض عشق سے فارغ ہو کر جب باہر آتا ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس حالت کا جائزہ لے کر کہ جس میں جاہلیت و اسلام دونوں ادوار کی بے نظیر شخصیت عمر بن الخطاب بھی شامل ہے تو آگے بڑھ کر کہتا ہے: ”اے خطاب کے بیٹے بیٹھ جا“ حضرت عمر وہیں بیٹھ جاتے اور انتہائی حزن و غم سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا منہ تکلنے لگتے ہیں۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اب منبر نبوی ﷺ پر کھڑے ہو کر صدائے حق بلند کرتے ہوئے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع کو یوں خطاب کرتے ہیں: ”لوگو! جو شخص محمد ﷺ پرستش کرتا تھا اس کو معلوم ہو جانا چاہیے ”ان محمدا قدمات“ کہ محمد ﷺ نے ذائقہ موت چکھ لیا اور جو خدائے واحد کا پرستار ہے تو بلاشبہ ”ان اللہ حی لایموت“ اللہ تعالیٰ زندہ جاوید ہے اور موت سے پاک اور بری، اس کو موت نہیں ہے۔“

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ صدائے حق جب فضا میں گونجی تو سب سے اول حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد تمام صحابہ رضی اللہ عنہم پر سکون و اطمینان طاری ہو گیا اور وہ سمجھ گئے کہ بلاشبہ سردار دو عالم ﷺ اپنا فرض رسالت پورا کر کے ”رفیق الاعلیٰ“ سے جا ملے اور اب اسلام مکمل ہو چکا اس لیے اب ہمارا فرض ہے کہ رسول پاک ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور زندہ جاوید معجزہ کلام اللہ ”قرآن“ کو پیشوا بنا کر خدمت اسلام کا فرض انجام دیں۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی کیفیت تو یہ ہوئی کہ فرمانے لگے قسم بخدا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ صدائے حق بلند کرتے ہوئے جب یہ آیت تلاوت کی ﴿مَا مَحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾... الاية ﴿تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا ابھی اس وقت اس آیت کا نزول ہو رہا ہے اور عشق رسول نے فراق رسول سے جو مبہوت کر دیا تھا قرآن اور تعلیم رسول کی روشنی میں جو کچھ رفیق محترم نے کہا وہ یک بیک مثل آفتاب میرے سامنے آ گیا۔

تمام کتب احادیث و سیر کی روایات متفق ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات ماہ ربیع الاول روز دوشنبہ کو ہوئی البتہ کس تاریخ کو ہوئی؟ اس بارے میں متعدد اقوال پائے جاتے ہیں۔

واقدی اور ابن سعد صاحب طبقات الکبریٰ کی روایات ۱۲ ربیع الاول ظاہر کرتی ہیں اور یہی قول مشہور و معروف ہے اور بیہقی اور ابن کثیر میں منقول بعض روایات میں ہے کہ ۲ ربیع الاول اور بعض میں ۱۰، ۱۱ اور یکم ربیع الاول بھی منقول ہے۔

ابوالقاسم سہیلی اپنی مشہور کتاب روض الانف میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ۱۵ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن بالاتفاق



متعین ہونے کے بعد حسابی اعتبار سے وفات کی تاریخ کسی طرح (بارہ) ربیع الاول نہیں ہو سکتی، البتہ ۲ یا ۱۳ یا ۱۴ یا ۱۵ ربیع الاول میں سے کوئی تاریخ ہو سکتی ہے اور یہ اس لیے کہ جمہور کا اس پر "اجماع" ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں حج (وقوف عرفہ) جمعہ کے دن کیا ہے، پس جبکہ ۹ ذی الحجہ کو جمعہ کا دن تھا تو خواہ بعد کے تمام مہینے صرف اسی دن کے مان لیجئے یا صرف تیس دن کے، یا بعض اسی دن کے اور بعض تیس کے کسی صورت میں بھی دو شنبہ کو ۱۲ ربیع الاول نہیں ہوتی اس لیے یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

البتہ ابن جریر طبری نے ابن کلبی اور ابو مخنف کی روایت سے ۲ ربیع الاول نقل کی ہے، تو یہ اس صورت میں صحیح ہو سکتی ہے کہ محرم، صفر، ربیع الاول تینوں مہینے اسی کے تسلیم کر لیے جائیں ورنہ تو قیاس صحیح سے قریب تر روایت خوارزمی کی ہے جس میں تاریخ وفات یکم ربیع الاول منقول ہے کیونکہ یہ تاریخ تینوں میں اسی اور تیس دن کے فرق سے بھی صحیح ہو جاتی ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے سہلی کے اعتراض کو اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگرچہ علماء نے اس کے جوابات دیئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تسکین بخش نہیں ہیں۔ البتہ جواب کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ "اختلاف مطالع" کا اعتبار کیا جائے، یعنی یہ تسلیم کیا جائے کہ مکہ اور مدینہ میں روایت ہلال مختلف رہی ہو کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اہل مدینہ نے ذی الحجہ کا چاند جمعہ کے دن دیکھا اور مکہ میں جمعرات کو روایت ہوئی تو پھر اگر باقی تینوں مہینوں کو تیس تیس کا ہی تسلیم کر لیا جائے تب یہ کہا جاسکتا ہے کہ بلاشبہ دو شنبہ کو ۱۲ ربیع الاول تھی۔

تو کیا مدینہ میں ذی الحجہ کا چاند جمعہ کو دیکھا گیا اس کی تصدیق و تائید حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے لیے جب مدینہ سے نکلے تو ذی قعدہ کے ختم ہونے میں پانچ دن باقی تھے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب مدینہ سے نکلنے لگے تو ظہر کی چار رکعات پڑھ کر نکلے اور ذوالحلیفہ پہنچ کر عصر کی دو رکعات پڑھیں، پس ان دونوں مستند روایات سے واضح ہوا کہ آپ کی روانگی نہ جمعرات کو ہوئی اور نہ جمعہ کو بلکہ سپر کے دن ہوئی تھی، لہذا اس صورت میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مدینہ نے جمعہ کے دن ذی الحجہ کا چاند دیکھا۔

پس یہی ایک شکل بنی ہے جس سے تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاول سے متعلق مشہور روایت تسلیم کی جاسکتی ہے۔\*

### عبرت و موعظت:

① قرآن عزیز سورہ فاتحہ میں ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ اور دوسری جگہ سورہ نساء میں ﴿أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کی تفسیر اس طرح مذکور ہے:

﴿فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ  
وَحَسَنَ أَوْلِيَكَ رَفِيقًا ۝﴾ (النساء: ۶۹)

یہی وہ رفقاء ہیں جن کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے ((اللهم الرفیق الاعلیٰ)) کہہ کر وقت آخر اشارہ فرمایا۔



سہلی کہتے ہیں کہ چونکہ اہل جنت، جنت میں مختلف القلوب نہیں ہوں گے بلکہ ایک انسان کے قلب واحد کی طرح ہوں گے اس لیے ”الرفقاء العلیا“ نہیں فرمایا ”الرفیق الاعلیٰ“ فرمایا تاکہ اہل جنت کی ”وحدت قلبی“ کی جانب اشارہ ہو جائے۔

② ”موت“ خدائے برتر کا وہ اہل فیصلہ ہے جس سے نبی و رسل اور خاتم الانبیاء و الرسل بھی مستثنیٰ نہیں ہیں اور بقاء و حیات سرمدی و ابدی صرف ذاتِ حق کے لیے ہی مخصوص ہے۔

③ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عظمت شان و جلالت مرتبہ کا اس ایک واقعہ سے بھی واضح اعلان ہو جاتا ہے کہ وفات النبی ﷺ کے قریبی وقت میں نزاکت حالات نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی عقل و خرد پر جو اثر ڈالا اگر خدا نخواستہ وہ دیر پا ہو جاتا تو اسلام اپنی حقیقت سے خالی ہو کر رہ جاتا (عیاذ باللہ) مگر یہ سعادت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہی حصہ میں تھی کہ مسلمانوں کی اس ڈگمگاتی کشتی کو قرآن کی روشنی میں پار لگا دیا۔ اور ”اسلام“ کو ایک عظیم الشان فتنہ سے بچا لیا۔

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَن يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ ﴾

